اِنَّ اللّٰہَ وَمَلٰئِکَتَہٗ یُصَلُّوْنَ عَلَی النَّبِیِّ یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَیْہِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا

کتابِ مستطاب

سیرۃ النبی

یعنی

سوانحِ اقدس حضرت سرورِ عالم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم

حصہ اوّل دوم

مجلد دوم از ۹ھ تا ۱۱ھ جس میں اقامتِ امن، تاسیسِ خلافت، اشاعتِ اسلام، انتظاماتِ مذہبی، تکمیلِ شریعت، حجۃ الوداع، وفات، شمائل و اخلاق و عادات کی تفصیل اور ازواج و اولاد کا مختصر تذکرہ ہے

تالیف

حجۃ الملۃ والدین علامہ شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ

المتوفی ۲۸ ذی الحجہ ۱۳۳۲ھ

مع اضافہ و تکملہ

از

مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ المتوفی ربیع الاول ۱۳۷۳ھ

باہتمام: مولوی مسعود علی صاحب ندوی

در مطبع معارف شہر اعظم گڈھ مطبوع گردید

طبع ششم ۱۳۸۳ھ کتبہ اقبال احمد

فہرست مضامین

سیرۃ النبی حصہ دوم

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دیباچہ سیرۃ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم مجلد دوم

سیرۃ نبویؐ مجلد اول ۱۳۳۶ھ (۱۹۱۸ء) میں شائع ہوئی، اب مجلد دوم ۱۳۳۸ھ (۱۹۲۰ء) کے اواسط میں شائع ہوتی ہے، شائقین کا تقاضا ہے کہ جلد سے جلد اس کی جلدیں شائع ہوتی رہیں لیکن شاید اُن مشکلات کا اُن کو علم نہیں جو عالمگیر جنگ نے زندگی کے ہر شعبہ میں پیدا کر دی ہیں گو ایک سال سے زیادہ ہوا کہ جنگ کا عملاً خاتمہ ہو گیا لیکن بایں ہمہ حقیقت یہ ہے کہ صلح کا آغاز نہیں ہوا اور اس خاتمۂ جنگ سے زندگی کے مشکلات میں ایک ذرہ کمی نہیں ہوئی، جلد اول کے تکلیف دہ تجربہ کے بعد یہ طے کر لیا گیا تھا کہ دوسری جلد خود مطبع معارف میں چھپے گی، لیکن مشکل یہ تھی کہ ہمارے پاس مشین نہ تھی، بڑی تلاش وجستجو سے مشین ہاتھ آئی، تو کاغذ کا قحط نظر آیا، جلد اول میں جن اصناف کے کاغذ لگ چکے تھے، اُن کا ملنا دشوار ہو گیا، دیسی کاغذ کے ۲۰۰ ریم بھی بیک وقت نہ مل سکے یہ دقت کسی طرح ختم ہوئی تو لوح (ٹائٹل پیج) کے کاغذ کی مشکل پڑی، لکھنؤ سے لیکر کلکتہ اور بمبئی تک کے کارخانے چھان مارے گئے، مگر خاطر خواہ کاغذ دستیاب نہ ہوا، آخر جو بھی مل سکا، اور جس طرح بھی بنا یہ جلد اختتام کو پہنچی۔ والحمد للہ علی ذالک،

پہلی جلد نبوت کے پُر آشوب عہد غزوات پر مشتمل تھی، اور دوسری جلد نبوت کی سہ سالہ امن کی زندگی کی تاریخ ہے، نبوت کی بست و سہ سالہ زندگی میں پہلی جلد میں ۲۰ سال کے کارناموں کا مجموعہ تھی، اور یہ جلد بقیہ آخری تین سال کے واقعات کا ذخیرہ ہے اور اس کے بعد اخلاق و شمائل شریفہ اور ازواج مطہرات

و اولادِ کرام کا تذکرہ ہے،

مصنف مرحوم کی وفات کے بعد جب اس جلد کا تمام قلمی سرمایہ میرے ہاتھ میں آیا تو مجھے اس میں بہت سے ابواب کی کمی محسوس ہوئی جن کے اضافہ کے بغیر یہ جلد ناتمام نظر آتی تھی لیکن مصنف کے مسودہ میں اضافہ کی ہمت نہیں ہوتی تھی آخر کار مدت کے حیص بیص کے بعد میں نے طے کرلیا کہ ان کو لکھنا ہی چاہیئے چند روز کے بعد مجھے اتفاقاً مولانا کے ہاتھ کی ایک یادداشت ملی جو وفات سے پانچ ماہ پیشتر ایک سفینہ میں لکھی تھی، اس کا عنوان "یادداشتِ اخیر" تھا، اس یادداشت کو پڑھ کر میری مسرت کی انتہا نہیں رہی، جب میں نے یہ دیکھا کہ جن ابواب کو میں ضروری سمجھتا تھا، مصنف مرحوم نے بھی اپنی آخری یادداشت میں ان کا اضافہ ضروری قرار دیا تھا، اور گویا وہ ایک وصیت نامہ تھا جس کو فرشتۂ غیب نے اُن کے دست و قلم سے میری تسلی کے لئے پہلے ہی لکھوا دیا تھا،

ع حلِ ایں عقدہ ہم از روے نگار آخر شد

اخلاق کے باب کو مصنف مرحوم نے تکمیل کو نہیں پہنچایا تھا، بہت سے عنوانات سادہ تھے، بہت سے عنوانات کو شروع کرکے آیندہ اضافہ کے لئے ناتمام بصورتِ بیاض چھوڑ دیا تھا، جامع نے اُن کو لکھکر بطورِ تکملہ کتاب میں شامل کر دیا، بہت سے ضروری حواشی بھی جابجا بڑھائے گئے ہیں، چنانچہ جیسا کہ جلد اول کے دیباچہ میں ذکر کیا گیا ہے اضافہ اور تکملہ اور حواشی کی تمام عبارتیں ہلالین کے اندر کر دی گئی ہیں، تاکہ مصنف اور جامع کی عبارتیں باہم مختلط نہ ہونے پائیں،

جامع

"سید سلیمان ندوی"

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اسلام کی امن کی زندگی

۹ھ سنہ ۱۰ھ و ۱۱ھ

قیامِ امن، اشاعتِ اسلام، تاسیسِ خلافت، تکمیلِ شریعت

قیامِ امن

(گذشتہ ابوابِ[1] کے پڑھ لینے کے بعد یہ حقیقت محتاجِ بیان نہیں رہتی کہ اس وقت تک گو فطری صلاحیت و استعداد کے رو سے عرب کا ذرہ ذرہ ستارہ تھا لیکن وہ کسی ایک نظامِ شمسی کے تابع نہ تھا، تمام جزیرۂ عرب ایک واحد ملک اور ایک متحد قوم تھا، تاہم نہ تو کبھی تاریخ نے اس کے ملکی و قومی اتحاد کا نشان دیا، اور نہ سیاسی حیثیت سے کسی زمانہ میں تمام عرب ایک پرچم کے نیچے جمع ہوا، جس طرح گھر گھر کا الگ الگ خدا تھا، اسی طرح قبیلہ قبیلہ کے جدا رئیس تھے، جنوبی عرب میں حمیری اذدار، اور اقیال کی چھوٹی چھوٹی ریاستیں تھیں، شمالی عرب میں بکر، تغلب، شیبان، ازد، قضاعہ، کندہ، لخم، جذام، بنو حنیفہ، طے، اسد، ہوازن، غطفان، اوس، خزرج، ثقیف اور قریش وغیرہ کی الگ الگ ٹولیاں تھیں، جو دن رات خانہ جنگیوں میں مبتلا رہتی تھیں، بکر و تغلب کی چہل سالہ جنگ

[1] پورا باب اضافہ از ص ۱ تا ۱۰

کا ابھی ابھی خاتمہ ہوا تھا، کندہ اور حضر موت کے قبائل کٹ کٹ کر فنا ہو چکے تھے، اوس و خزرج لڑ لڑ کر اپنے ایک ایک سردار کو کھو چکے تھے، خاص حرم اور اشہر حرم میں بنو قیس اور قریش کے درمیان حرب فجار کا سلسلہ جاری تھا، اور اس طرح تمام ملک معرکہ کارزار بنا ہوا تھا،

پہاڑوں اور صحراؤں میں خود مختار جرائم پیشہ قبائل آباد تھے، تمام ملک قتل و غارتگری سفاکی، خونریزی کے خطرات میں گھرا تھا، تمام قبائل غیر مختتم سلسلۂ جنگ کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے، انتقام ثار اور خون بہا کی پیاس سینکڑوں اور ہزاروں اشخاص کے قتل کے بعد بھی نہیں بجھتی تھی، ملک کا ذریعۂ معاش غارت گری کے بعد فقط تجارت تھی لیکن تجارت کے قافلوں کا ایک جگہ سے دوسری جگہ تک گذرنا محال تھا، حیرہ کے عرب بادشاہ اگرچہ شمالی عربستان میں کافی اثر اور اقتدار رکھتے تھے، تاہم اُن کا تجارتی سامان بھی عکاظ کے بازاروں میں بآسانی پہونچ سکتا تھا، شہور حج علاً عرب کے مقدس مہینے تھے، باایں ہمہ لڑائیوں کے جواز کے لئے وہ کبھی بڑھا اور کبھی گھٹا دیے جاتے تھے، ابو علی قالی نے کتاب الامالی میں لکھا ہے،

وذالک لانہم کانوا یکرھون ان	یہ اس لئے کہ وہ پسند نہیں کرتے تھے کہ تین مہینے
تتوالی علیہم ثلاثۃ اشہر لا تمکنہم الا	متصل ان پر غارتگری کے بغیر گذر جائیں،
غارۃ فیہا لان معاشہم کان من الاغارۃ	کیونکہ غارتگری ہی ان کا ذریعۂ معاش تھا،

(ج ۱ ص ۴)

بہت سے جرائم پیشہ قبائل کے ذریعۂ معاش کے لئے یہی موسم بہار تھا، مکہ کے آس پاس اسلم و غفار وغیرہ قبائل آباد تھے، جو حاجیوں کا اسباب چرانے میں بدنام تھے[۱] نہایت ممتاز اور نامور

---

[۱] صحیح بخاری ذکر اسلم و غفار،

قبیلہ تھا، لیکن وزدان ظے بھی اپنی شہرت میں ان سے کم نہ تھے[۱] سلیک ابن السلکہ اور تابط شرا عرب کے مشہور شعراء تھے لیکن اُن کی شاعری کا تمام تر سرمایہ صرف اپنی چوری اور حیلہ گری کے پُر فخر کارنامے تھے

ملک میں اضطراب اور بدامنی کا یہ حال تھا کہ عبد القیس جو بحرین کا ایک طاقتور قبیلہ تھا، ۵ھ تک مضری قبائل کے ڈر سے اشہر حرم کے سوا اور مہینوں میں حجاز کا رُخ نہیں کر سکتا تھا[۲]

فتح مکہ کے بعد بھی جب ملک میں سکون شروع ہو چکا تھا، مدینہ سے مکہ تک سفر خطرناک تھا[۳] اور اب بھی لوگ ڈاکے ڈالتے رہتے تھے[۴] ہجرت کے پانچ چھ برس کے بعد بھی شام کے تجارتی قافلے دن دھاڑے لوٹ لئے جاتے تھے[۵] یہاں تک کہ کبھی کبھی خود دار الاسلام کے چراگاہوں میں بھی چھاپے مارے جاتے تھے[۶] انحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب لوگوں کو ملک کے امن و امان کی بشارت دیتے تھے، کہ ایک زمانہ آئے گا جب صنعاء سے ایک خاتون محمل نشین تنہا سفر کرے گی، اور خدا کے سوا کسی کا اُس کو خوف نہ ہوگا، تو لوگوں کو تعجب آتا تھا[۷] ۹ھ میں ایک شخص نے آکر شکایت کی کہ میرا مال ڈاکوؤں نے لوٹ لیا، آپ نے فرمایا کہ عنقریب وہ زمانہ آئے گا جب مکہ کو قافلہ بے نگہبان جایا کریگا[۸] اتنے بڑے ملک میں صرف حرم کی سرزمین ایسی تھی، جہاں لوگوں کو اطمینان میسر آسکتا تھا، خدا نے قرآن مجید میں اہل مکہ پر اپنا سب سے بڑا احسان یہی جتایا ہے،

فَلْيَعْبُدُوا رَبَّ هٰذَا الْبَيْتِ — ان کو چاہئے کہ اُس گھر کے اس مالک کو پوجیں

---

(۱) صحیح بخاری باب علامات النبوۃ (۲) صحیح بخاری کتاب الایمان (۳) ابوداؤد کتاب الادب باب الحذر (۴) طبقات ابن سعد جزء مغازی ص ۶۳ و ۶۴، ۶۵، (۵) دیکھو غزوۂ سویق و غزوۂ غابہ (۶) صحیح بخاری باب علامات النبوۃ (۷) بخاری ص ۱۹۰)

الَّذِیْٓ اَطْعَمَھُمْ مِّنْ جُوْعٍ وَّاٰمَنَھُمْ مِّنْ خَوْفٍ (ایلاف)

جس نے اُن کو بھوک میں کھانا دیا، اور بدامنی کو دور کر کے اُن کو امن بخشا،

اَوَلَمْ یَرَوْا اَنَّا جَعَلْنَا حَرَمًا اٰمِنًا وَّیُتَخَطَّفُ النَّاسُ مِنْ حَوْلِھِمْ (عنکبوت)

کیا یہ نہیں دیکھتے کہ ہم نے ایک امن والا حرم اُن کے لئے بنایا، اس کے باہر بدامنی کا یہ عالم ہے کہ اس کے چاروں طرف سے لوگ اُچک لیے جاتے ہیں،

خود اسلام کا کیا حال تھا؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم عام الحزن کے بعد تین برس تک متصل تمام قبائل کے سامنے اپنے آپ کو پیش کرتے رہے کہ مجھے امان میں لے کر صرف اتنا موقع دلادو کہ خدا کی آواز لوگوں تک پہنچا سکوں، لیکن کوئی ہامی نہیں بھرتا تھا، عام مسلمان عرب کی فضا میں سانس تک نہیں لے سکتے تھے، تلاشِ امن کے لئے افریقہ و حبش کے ریگستانوں میں مارے مارے پھرتے تھے، جو عرب میں رہ گئے تھے، وہ ہدفِ مظالمِ گوناگوں تھے، قرآن مجید مسلمانوں کی اسی حالت کا ذکر ان آیتوں میں کرتا ہے،

وَاذْکُرُوْٓا اِذْ اَنْتُمْ قَلِیْلٌ مُّسْتَضْعَفُوْنَ فِی الْاَرْضِ تَخَافُوْنَ اَنْ یَّتَخَطَّفَکُمُ النَّاسُ (انفال)

یاد کرو جب تم ملک میں تھوڑے اور کمزور تھے، ڈرتے تھے، کہ لوگ تم کو اُچک نہ لیں،

اسی ملکی شورش اور بے امنی کا یہ نتیجہ تھا کہ ملک میں کوئی تحریک بھی بغیر خود حفاظتی تدبیر کے کامیاب نہیں ہو سکتی تھی، سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا اصلی فرض اسلام کی دعوت تھی، اور اس کے لئے تیغ و خنجر اور فوج و لشکر کی حاجت نہ تھی لیکن ایک طرف تو دشمن حملہ کرتے چلے آتے تھے، اور دوسری طرف ہر جگہ دعاۃِ اسلام کی جانیں معرضِ خطر میں رہتی تھیں، تجارت کے قافلے جن پر

اصل میں ملک کی معاش کا دارو مدار تھا، غیر مامون تھے، چنانچہ اس قسم کے تفصیلی واقعات غزواتِ نبوئیؐ کے اسباب وانواع میں گذر چکے ہیں،

بیرونی خطرات

بہرحال یہ تو ملک کی اندرونی حالت تھی، بیرونی خطرات بھی کچھ کم نہ تھے، ملک کے تمام سرسبز و زرخیز صوبے روم و فارس دو عظیم الشان طاقتون کے پنجہ میں تھے، تقریباً ساٹھ برس سے ایرانی، یمن، عمان، اور بحرین کے مالک بن بیٹھے تھے، اور اُن کے زیرِ اقتدار برائے نام عرب رُوسا حکمران تھے، حدودِ عراق میں آلِ منذر کی حکومت کو مٹا کر ایرانیون نے اندرونِ ملک میں بھی پیش قدمی شروع کردی تھی، حجاز میں اسلام کی جو تحریک پھیل رہی تھی، اس کو بھی وہ اپنے ہی حدود میں سمجھتے تھے، چنانچہ ۶ھ میں شاہ ایران نے یمن کے ایرانی گورنر کو فرمان بھیجا، کہ "میرے غلام کو جو حجاز میں مدعیِ نبوت بنا ہے، گرفتار کرکے میرے پاس بھیجدو"

رومیوں نے حدودِ شام پر قبضہ کرلیا تھا، آلِ غسان اور چھوٹے چھوٹے عرب رُوسا نے جنھون نے مدت سے عیسائی مذہب قبول کرلیا تھا، اُن کی ماتحتی قبول کرلی تھی، ۸ھ کے بعد رومی ان عیسائی روسائے عرب کی مدد سے مدینہ پر حملہ کی تیاریاں کر رہے تھے، جس کا ظہور واقعۂ تبوک اور موتہ وغیرہ کی صورت میں ہوا،

یہودیوں کی قوت

رومیوں نے دوسری صدی عیسوی میں یہودیوں سے شام و فلسطین کی برائے نام حکومت بھی چھین لی تھی، اور وہ مجبوراً حدودِ شام سے قلبِ حجاز تک پیچھے ہٹ آئے تھے اور انہوں نے مدینہ سے شام تک متصل قلعے تعمیر کرلئے تھے، یہ مقامات اُن کے جنگی استحکامات بھی تھے، اور تجارتی گودام بھی، قریظہ، قینقاع، خیبر، فدک[1]

---

[1] معجم البلدان یاقوت میں ان مقامات کے حالات پڑھو،

تیمار وادی القرٰی[1] وغیرہ اُن کی بڑی بڑی چھاؤنیاں تھیں، قرآن مجید میں حسب ذیل آیات میں
یہودیوں کے ان ہی قلعوں کی طرف اشارہ کیا ہے،

لَا یُقَاتِلُوْنَکُمْ جَمِیْعًا اِلَّا فِیْ قُرًی	وہ قلعہ بند آبادیوں یا دھس کے پیچھے بغیر
مُّحَصَّنَۃٍ اَوْ مِنْ وَّرَآءِ جُدُرٍ (حشر)	یوں مل کر مقابلہ نہیں کر سکتے،
وَاَنْزَلَ الَّذِیْنَ ظَاھَرُوْھُمْ مِّنْ	خدا نے ان یہودیوں کو جنہوں نے اُن کی مدد
اَھْلِ الْکِتٰبِ مِنْ صَیَاصِیْھِمْ (احزاب)	کی تھی، اُن کے قلعوں سے اُتارا،

زمانہ قدیم میں مالی کاروبار کی وسعت نے سپین اور دیگر ممالک یورپ میں اُن کو جس طرح
ملک کی پالٹکس کا خطرناک عنصر بنا دیا تھا، بعینہٖ یہی حال ان کا عرب میں بھی تھا، ان چند
قلعوں کے برتے پر وہ اسلام کی قوت کو بالکل خاطر میں نہیں لاتے تھے، آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کو متعدد
لڑائیاں صرف ان کی شرارت سے لڑنی پڑیں، بدر میں جب مسلمانوں کو فتح حاصل ہوئی تو یہ فخریہ کہتے
تھے "بیچارہ مکہ کے قریش لڑنا کیا جانیں، مسلمانوں کو ہمارے قلعوں سے مقابلہ پڑے تو معلوم ہو"،

غرض عرب کا ملک اس قدر متعدد اور مختلف اندرونی اور بیرونی خطرات میں مبتلا تھا کہ اس
کی اصلاح و تدبیر کے لئے عام انسانی دست و بازو بیکار تھے، خدا کا غیر مرئی ہات محمد رسول اللہ
(صلی اللہ علیہ وسلم) کی آستین میں پوشیدہ تھا، وَمَا رَمَیْتَ اِذْ رَمَیْتَ وَلٰکِنَّ اللّٰہَ رَمٰی، ہجرت کے بعد آٹھ
برس کی متواتر کوششوں اور پیہم اصلاحات کا یہ نتیجہ ہوا کہ محال نے امکان بلکہ واقعہ کی صورت اختیار
کرلی، عرب کے سیاسی ضعف کا تمام تر راز نااتفاقی اور باہمی جنگ و جدال میں مضمر تھا، اور اس نااتفاقی

[1] کتب مغازی و سیر میں اُن کے حالات دیکھو، بخاری میں ابواب قتل کعب بن اشرف و رافع بن خدیج،

اور خانہ جنگی کا سبب صرف یہ تھا کہ تمام عرب مختلف خاندانوں اور نسلوں میں منقسم تھا، تمام ملک کے اجتماع اور اتحاد کے لئے ان میں کوئی مستحکم رشتہ موجود نہ تھا، محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے تمام عرب کی شیرازہ بندی کے لئے اسلام کا رشتہ قائم کیا، اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَۃٌ (حجرات) دفعتہً اس روحانی رشتہ نے خون، قرابت اور نسل کے تار و پود ادھیڑ دیئے، اور صرف ایک کلمہ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ کی برقی رو، اب تمام عرب کی اتحادی روح کو حرکت دی رہی ہے،

خدائے پاک نے قرآن مجید میں اس اجتماع اور اتحاد کے وجود کو اپنی مخصوص نعمت فرمایا۔

وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا (آل عمران) پ ۴ ع ۱۱

خدا کے اس احسان کو یاد کرو کہ تم باہم ایک دوسرے کے دشمن تھے، خدا نے تمہارے دلوں کو جوڑ دیا، پھر اس کے لطف و محبت سے بھائی بھائی

خدا نے خود آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کو مخاطب کر کے فرمایا کہ محمد! یہ تیرا کام نہ تھا، اس میں خود خداوند مقلب القلوب کا ہاتھ کام کر رہا تھا"

هُوَ الَّذِيْٓ اَيَّدَكَ بِنَصْرِهٖ وَبِالْمُؤْمِنِيْنَ وَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ لَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مَّآ اَلَّفْتَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ اَلَّفَ بَيْنَهُمْ اِنَّهٗ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ (انفال) پ ۱۰ ع ۴

وہ خدا ہی ہے جس نے محمد! اپنی نصرت اور مسلمانوں کے ذریعہ سے تجھکو قوت بخشی، اور اسی نے مسلمانوں کے دل باہم جوڑ دیئے، اگر تو تمام دنیا کے خزانے بھی لٹا دیتا تو بھی ان کے دلوں کو نہ جوڑ سکتا، لیکن خدا نے ان کے دل باہم جوڑ دیئے وہ زبردست حکمت

ہجرت کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مہاجرین وانصار کے درمیان جو مواخاۃ اور برادری قائم کرائی تھی، وہ اس سلسلہ کی پہلی کڑی تھی، اور اس کی آخری کڑی وہ خطبہ تھا، جو فتحِ مکہ کے موقع پر دیا گیا،

قرآن مجید نے اپنے متواتر ارشادات میں فتنہ وفساد فی الارض کو مکروہ ترین فعلِ انسانی قرار دیا، اور اس فعل کے مرتکب کے لئے سخت سزائیں مقرر کیں، چوری کے لئے قطع ید کی سزا متعین کی، رہزنی کے لئے قتل، پھانسی، قطع ید اور جلاوطنی کی تعزیریں جاری کیں، سورۂ مائدہ میں خونریزی اور قتل و سفاکی کے انسداد کے لئے قصاص کا قانون نازل ہوا، عملاً ملک میں قیامِ امن کیلئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدد بار فوجیں بھیجیں رہزن قبائل پر چھاپے مارے،[1] حجاز میں جن قبائل کا پیشہ چوری تھا، وہ تائب ہو کر مسلمان ہو گئے[2]، فوجداری اور دیوانی کے مقدمات کے فیصلے کے لئے قوانین وضع ہوئے، اور جا بجا عمّال کا تقرر ہوا،

لیکن یہ سب جو کچھ ہوا، وہ انسانوں کی ظاہری فطرت کی پابندی تھی، ورنہ ایک پیغمبر کا فرض، ایک مقنن، اور ایک عام مدبّر کے فرائض سے بدرجہا بلند ہے، اسلام کے قانون تعزیرات نے جو کچھ کام کیا، قرآن کا روحانی اثر اور خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کا فیضِ تلقین اس سے پہلے فردِ قرارداد جرم کی دفعات کو بالکل مٹا دیتا تھا، قانون وخوفِ تعزیر صرف بازاروں میں اور انسانوں کے عام مجمعوں میں جرائم سے باز رکھ سکتا ہے، لیکن دعوتِ اسلام کے فیض اثر نے دلوں کو بالکل خدا کے سامنے کر دیا، جو رات کی تاریکیوں میں بھی دیکھتا تھا، اور مقفل دروازوں

[1] دیکھو غزوات نبوی ﷺ کو بارہ نظر، [2] صحیح بخاری ذکر غفاری واسلم،

کی کھڑکیوں سے بھی جھانکتا تھا، اور اب تمام ملک میں امن وامان تھا، اور عدی بن حاتم نے شہادت دی کہ انھوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی پیشین گوئی کے مطابق لوگ صنعا سے حجاز تک تن تنہا سفر کرتے تھے، اور خشیتہ الٰہی کے سوا کوئی اور خوف راستہ میں نہ تھا[۱]، ایک یورپین مورخ جس کے قلم نے پیغمبر اسلام (صلی اللہ علیہ وسلم) کی مدح کے لئے بہت کم جنبش کی ہے، (مارگولیوس) وہ بھی ان الفاظ میں اس حقیقت کا اعتراف کرتا ہے:-

"محمد کی وفات کے وقت ان کا سیاسی کام غیر مکمل نہیں رہ گیا آپ ایک سلطنت کی جس کا ایک سیاسی و مذہبی دارالسلطنت مقرر کیا گیا تھا، بنیاد ڈال چکے تھے، آپ نے عرب کے منتشر قبائل کو ایک قوم بنا دیا تھا آپ نے عرب کو ایک مشترک مذہب عطا کیا، اور ان میں ایک ایسا رشتہ قائم کیا، جو خاندانی رشتوں سے زیادہ مستحکم اور مستقل تھا"[۲]

بیرونی خطرات کے انسداد کے لئے خدا نے عجیب وغریب سامان پیدا کر دیئے، قریش اور منافقین مدینہ کے اشتعال سے یہودیوں نے اسلام کو پامال کرنا چاہا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ خود چور ہو گئے، ۳ھ سے لیکر ۷ھ تک متواتر لڑائیاں پیش آئیں اور آخر فتح خیبر نے اُن کی سیاسی قوت کا خاتمہ ہو گیا، رومیوں نے اور حدود شام کے عیسائی عربوں نے اسلام کے استیصال کا بیڑا اٹھایا، عیسائی رؤسائے عرب میں سب سے زیادہ طاقتور اور پرزور غسانی تھے جو رومیوں کے ہاتھ میں کٹ پتلی کی طرح کام کرتے تھے، بہرا، وائل، بکر، لخم، جذام اور عاملہ وغیرہ عرب قبائل اُن کے ماتحت تھے، ان کے علاوہ دومتہ الجندل، ایلہ، جرباء، اذرح، بتالہ، اور

[۱] صحیح بخاری ۲؎ لائف آف محمد، مارگولیوس ص ۴۷۱

جرش وغیرہ کے چھوٹے چھوٹے عیسائی اور یہودی رئیس تھے، غسانیوں کے حملہ کی ابتدا جس طرح ہوئی وہ اوپر گذر چکا ہے، حارث بن عمیرؓ جو شاہ بصریٰ کے دربار میں دعوتِ اسلام کا خط لے کر گئے تھے ان کو غسانیوں نے راستہ میں قتل کر دیا، آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے تین ہزار مسلمانوں کا ایک دستہ تادیب و انتقام کے لئے روانہ فرمایا، غسانی ایک لاکھ کا ٹڈی دل لے کر میدان میں آئے، اور خبر تھی کہ رومی بھی اسی قدر فوج لئے ہوئے موقع سے قریب مواب میں پڑے ہیں، تاہم مٹھی بھر مسلمان آدمیوں کے اس جنگل سے نہ ڈرے، اور کچھ عزیز جانیں کھو کر فوج کو میدانِ جنگ سے ہٹا لائے، اس جنگ کا نام غزوۂ موتہ ہے،

اس کے بعد ۹ھ میں غزوۂ تبوک پیش آیا، دم بدم خبریں آتی رہتی تھیں کہ رومی حملہ آوری کیلئے عیسائی عربوں کی ایک فوجِ گراں ترتیب دے رہے ہیں، اور ایک سال کی پیشگی تنخواہ بھی فوج کو تقسیم کر چکے ہیں، یہ بھی خبر تھی کہ غسانی فوج کی آراستگی میں مصروف ہیں اور گھوڑوں کی نعلبندی کرا رہے ہیں، اس بنا پر آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے تیس ہزار صحابہ کیساتھ پیش قدمی فرمائی، اور بیس دن تک دشمنوں کی آمد کا انتظار کرتے رہے لیکن کوئی مقابل نہ آیا، تاہم اس پیشقدمی کا فائدہ یہ ہوا کہ غسانیوں کے علاوہ تمام رؤسا نے رومیوں کو چھوڑ کر اسلام کی حمایت قبول کر لی، ۱۱ھ میں زمانۂ مرض الموت میں آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اسامہ بن زیدؓ کے زیر افسری رومیوں کے مقابلہ کے لئے پھر فوجیں روانہ فرمائیں، لیکن اس مہم کا اختتام عہدِ صدیقی میں ہوا،

لہ اوپر کے تمام واقعات کی تفصیل اور حوالے غزوۂ موتہ اور تبوک کے ذکر میں گذر چکے ہیں،

ایرانیوں کی حکومت زندگی کے آخری دور کو پہونچ چکی تھی، ۸ھ میں دعاۃ اسلام کے پہونچنے کے ساتھ ہی بے مقابلہ و جنگ یمن، عمان، اور بحرین میں ان کی قبائے حکومت کا تار تار الگ ہو گیا،

غرض نو دس برس کی متواتر اور پیہم کوششوں اور مافوق طاقت بشری تائیدات کے سبب سے اب تمام ملک میں امن و امان قائم ہو گیا، قریش اور یہود کی سازشوں کا طلسم ٹوٹ گیا، قبائل کی خانہ جنگیاں مٹ گئیں، تمام رہزن اور ڈاکو جتھے رام ہو گئے، بیرونی خطرات کا انسداد ہو گیا، اب موقع ملا کہ صلح و آشتی کے ساتھ حسب فرمان الٰہی اصل مقصود کی طرف توجہ کیجائے

تبلیغ و اشاعتِ اسلام

سرورِ کائنات (صلی اللہ علیہ وسلم) کا اصلی کام تمام عالم میں دعوتِ اسلام کا اعلان کرنا تھا، اور نہ صرف اعلان بلکہ ہر قسم کے جائز اور صحیح وسائل سے تمام عالم کو حلقۂ اسلام میں لانا تھا، اس کیلئے تیغ و خنجر اور فوج و عسکر کی ضرورت نہ تھی بلکہ صرف اس قدر کافی تھا کہ دعوتِ حق کی صدا اطرافِ عالم میں پہونچ جانے پائے لیکن مکہ میں تیرہ برس تک اعدائے اسلام اسی کے سدِّ راہ رہے حج کے موقع پر عرب کے تمام قبائل دور دراز مقامات سے آتے تھے، آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) ایک ایک کے پاس جاتے، اور صرف یہ درخواست کرتے کہ قریش مجھکو پیغام پہنچانے سے روکتے ہیں تم اس کا موقع دلادو اور خود دو، لیکن قریش کے اثر سے ہزاروں لاکھوں میں سے ایک بھی اسکی حامی نہیں بھرتا تھا تاہم آفتابِ حق کی کرنیں ان کثیف بادلوں میں سے بھی چھن چھن کر سطحِ قلوب پر پڑتی تھیں اور اکناف و حوالی کو روشن کرتی جاتی تھیں، اسلام کو صرف اشتہار اور اعلان کی ضرورت تھی، اور یہ کام خود اعدائے اسلام نے انجام دیا، جب حج کا زمانہ آتا تو روسائے قریش عام گذرگاہوں پر خیمے لگاتے، باہر کے لوگ اُن سے ملنے آتے، اور چونکہ بعثتِ نبوی کا چرچا پھیل چکا تھا، لوگ اسکی حقیقت دریافت کرتے، اور نہ کرتے، تو قریش خود حفظ ما تقدم کے لئے ان سے کہتے کہ ہمارے شہر میں ایک بدعقیدہ پیدا ہوا ہے، جو ہمارے معبودوں کی توہین کرتا ہے، یہاں تک کہ لات و عزیٰ تک بُرا کہتا ہے"

بدعقیدہ کو عربی میں صابی کہتے ہیں، اسی مناسبت سے یا اس وجہ سے کہ اسلام کے بعض فرائض مثلاً نماز کی صورت، صابئین کے اعمال سے ملتے جلتے ہیں، قریش نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو صابی کا لقب دیا تھا، اور بالآخر اس لقب سے تمام عرب میں آپ کا نام مشہور ہوگیا[۱] صحیح بخاری کتاب المغازی میں ایک صحابی سے روایت ہے کہ "میں جب چھوٹا تھا تو مکہ کے آنے جانے والوں سے سنا کرتا تھا کہ مکہ میں ایک مدعی نبوت پیدا ہوا ہے[۱]"

ملک میں جب آپ کا نام مشہور ہوا تو اگرچہ جمہور عام پر مخالف اثر پڑا، اور ان میں سے کسی شخص نے آپ کی طرف رخ نہیں کیا، لیکن اتنا بڑا وسیع ملک ان لوگوں سے خالی نہیں ہو سکتا تھا، جن کو یہ شوق پیدا ہو کہ اصل واقعہ کیا ہے، عرب میں ایسے لوگوں کی خاصی جماعت پیدا ہو گئی تھی، جو بت پرستی سے متنفر ہو چکے تھے اور حق کے متجسس تھے، بعض لوگ اس حد سے ترقی کرکے حنفی بن گئے تھے، جن کا تذکرہ آغاز کتاب میں گذر چکا ہے، حافظ ابن حجر نے اصابہ میں متعدد ایسے صحابہ کا تذکرہ کیا ہے جو یمن وغیرہ دور دراز مقامات سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تحقیق حال کے لئے مکہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے، اور مخفی طور سے اسلام لاکر واپس گئے، حضرت ابو موسی اشعری یمنی (اور طفیل بن عمرو دوسی یمنی) کے خاندان میں، جو اسلام پھیلا، اس کی ابتداء قیام مکہ ہی کے زمانہ میں ہوئی تھی،

طفیل بن عمرو کا اسلام

طفیل بن عمرو دوسی عرب کا مشہور شاعر تھا، اور چونکہ عرب میں شعراء کا اثر بہت تھا، یعنی وہ قبیلہ کے قبیلہ کو جدھر چاہتے تھے، جھونک دیتے تھے، اس لئے قریش نے کوشش کی کہ وہ کسی طرح

[۱] صحیح بخاری کتاب ... باب التیمم ۵۲ کتاب المغازی ص ۶۱۵، ۵۳ اضافہ تا قصہ ابوذر

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں نہ پہونچنے پائے، لیکن ایک دفعہ جب اُس نے اتفاقیہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن مجید پڑھتے سنا تو وہ فوراً مسلمان ہوگیا[1]، اور اس کے اثر سے اسی زمانہ میں قبیلہ دوس میں بھی اسلام پھیلنے لگا[2] تاہم عام قبیلہ نے طفیل کی دعوت قبول نہ کی، وہ رنجیدہ ہوکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور عرض کی یارسول اللہ! دوس نے نافرمانی کی، ان پر بددعا کیجئے، آپنے ہاتھ اٹھاکر دعا مانگی کہ "خدایا دوس کو ہدایت دے، اور اُن کو بھیج"، اس کے بعد سارا قبیلہ مسلمان ہوگیا[3]،

عمرو بن عنبسہ

عمرو بن عنبسہ سلمی بھی ان ہی بزرگوں میں ہیں جنھوں نے لوگوں کی زبانی یہ سُن کر کہ مکہ میں ایک شخص پیدا ہوا ہے جو بہت سی باتیں بتاتا ہے، مشتاقانہ مکہ آئے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت قریش کے مظالم کی بنا پر چھپے رہتے تھے، عمرو بن عنبسہ کسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچ گئے اور عرض کی کہ "آپ کون ہیں؟" آپنے فرمایا "میں پیغمبر ہوں" انھوں نے کہا "پیغمبر کس کو کہتے ہیں؟" آپنے فرمایا "خدا نے مجھے بھیجا ہے"۔ انھوں نے پھر پوچھا "کیا پیغام دے کر بھیجا ہے"؟ ارشاد فرمایا "مجھے خدا نے یہ پیغام دے کر بھیجا ہے کہ قرابت کا حق ادا کیا جائے، بت توڑے جائیں خدا کو ایک مانا جائے، اور کسی کو اس کا شریک نہ ٹھہرایا جائے" عمرو نے پوچھا "اس مذہب کے کتنے پیرو ہیں"؟ آپ نے فرمایا "ایک آزاد (ابوبکرؓ) اور ایک غلام (بلالؓ)" عمرو نے کہا "میں بھی آپ کی پیروی کرتا ہوں"۔ ارشاد ہوا کہ ابھی تو یہ ممکن نہیں، تم دیکھتے ہو کہ میں کس حال میں ہوں اور لوگوں کا کیا حال ہے، میری کامیابی کا جب حال سنو تو میرے پاس آجانا، چنانچہ عمرو واپس گئے

[1] زرقانی [2] صحیح مسلم کتاب الایمان سے یہ مفہوم ہوتا ہے [3] صحیح بخاری باب قصہ دوس،

ضماد بن ثعلبہ کا اسلام

اور ہجرت کے بعد جب لوگوں کی زبانی آپ کی کامیابی کا حال معلوم ہوا تو حاضر خدمت ہوئے،[1]
ضمادؓ بن ثعلبہ قبیلہ ازدشنوہ کے رئیس اور آپکے زمانہ جاہلیت کے دوست تھے، وہ مکہ آئے
تو سُنا کہ محمد کو جنون ہو گیا ہے، وہ جھاڑ پھونک بھی کرتے تھے، وہ آپکے پاس آئے کہ لاؤ میں
تمہارا علاج کر دوں، آپنے فرمایا الحمد للہ نحمدہ ونستعینہ من یھدہ اللہ فلا مضل
لہٗ ومن یضللہ فلا ھادی لہٗ واشھد ان لا الٰہ الا اللہ وحدہٗ لا شریک لہٗ
واشھد ان محمدا عبدہٗ ورسولہ، ان فقروں نے ضماد پر غیر معمولی اثر کیا، عرض کی
دوبارہ ارشاد فرمایئے آپنے پھر اعادہ فرمایا، ضماد نے پھر تیسری بار پڑھوایا، اب وہ بالکل مسحور
تھے، بولے کہ "میں نے کاہنوں کی باتیں، جادوگروں کے منتر اور شاعروں کے قصائد سنے ہیں،
لیکن ایسا کلام میں نے نہیں سُنا، یہ تو دریا کی تہ تک میں بھی اتر کر جائے گا، لایئے ہاتھ لایئے
میں اسلام پر بیعت کرتا ہوں" آپنے اُن سے بیعت لی، پھر فرمایا، اپنے پورے قبیلہ کی طرف سے
بھی بیعت کرلو، چنانچہ انھوں نے پورے قبیلہ کی طرف سے بیعت کرلی، اور وہ اُن کی دعوت

قبیلہ ازد کا اسلام

سے مسلمان ہو گئے، ایک دفعہ ایک لڑائی میں مسلمان سپاہیوں کا اُدھر سے گذر ہوا، تو افسر نے
پوچھا کسی نے اس قبیلہ کی کوئی چیز لی ہے، ایک سپاہی نے کہا ایک لوٹا میرے پاس ہے،
اُس نے حکم دیا کہ واپس کر دو[2])

حضرت ابوذر کا اسلام

حضرت ابوذرؓ کا واقعہ اس موقع پر خاص طرح پر ذکر کے قابل ہے،
غفار کا قبیلہ جو قریش کی شامی تجارت کے راستہ میں آباد تھا جب وہاں یہ چرچا پھیلا تو

[1] صحیح مسلم باب لاوقات التی نہی عن الصلوٰۃ فیہا [2] صحیح مسلم باب تخفیف الصلوٰۃ والخطبہ،

حضرت ابوذرؓ جو بت پرستی سے متنفر ہو چکے تھے، اور حق کی تلاش میں تھے، انھوں نے اپنے بھائی (انیس) سے کہا کہ تم مکہ جاؤ، اور دیکھو کہ یہ شخص جو نبوت کا دعویٰ کرتا ہے، اسکی تعلیم اور تلقین کیا ہے انیس مکہ میں آئے، اور واپس جا کر بیان کیا کہ وہ مکارم اخلاق کی تعلیم دیتا ہے، اور جو کلام پیش کرتا ہے، وہ شاعری سے الگ ہے، حضرت ابوذرؓ کو اس مختصر جواب سے تسکین نہیں ہوئی، خود گئے، زاد سفر کیلئے مشک میں پانی اور کچھ کھانے کو لے لیا، مکہ میں آئے تو ڈر کے مارے کسی سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نام پوچھ نہیں سکتے تھے، حرم میں حضرت علیؓ سے ملاقات ہوگئی، انھوں نے گھر پر لاکر مہمان رکھا، لیکن تین دن تک اُن سے بھی کچھ پوچھنے کی ہمت نہیں ہوئی، بالآخر خود حضرت علیؓ نے پوچھا کہ "یہاں آنے کی کیا غرض ہے" انھوں نے ڈرتے ڈرتے بتایا، لیکن پھر قول و قرار لے لیا، کہ کسی پر یہ راز ظاہر نہ ہونے پائے، حضرت علیؓ اُن کو آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی خدمت میں لائے، اور آپ نے اسلام کی تلقین کی، اور فرمایا کہ اس وقت گھر واپس جاؤ، پھر میں جو کچھ کہلا بھیجوں گا، اس کی تعمیل کرنا، لیکن ان کو اسلام کا جوش تھا، عرض کی کہ "میں تو اسلام کا اعلان کر کے رہوں گا" غرض حرم میں آئے اور زور سے پکارے کہ "اشهد ان لا اله الا الله واشهد ان محمداً رسول الله" اس آواز کا سننا تھا کہ لوگ چاروں طرف سے دوڑ پڑے، اور ان کو مارنا شروع کیا، حضرت عباسؓ نے آکر بچایا، اور لوگوں سے کہا "تم یہ نہیں سمجھتے کہ تمھاری تجارت کا راستہ غفار کی آبادی سے ہو کر گذرتا ہے اور یہ اسی قبیلہ کے آدمی ہیں" اس وقت لوگوں نے چھوڑ دیا، لیکن دوسرے دن حضرت ابوذرؓ نے حرم میں جا کر پھر اسی طریقہ سے اسلام کا اعلان کیا، اور نتیجہ بھی وہی ہوا جو کل ہو چکا تھا، آج بھی اتفاق سے حضرت عباسؓ آگئے، اور انھوں نے جان بچائی،[1]

[1] یہ روایت بتمامہ صحیح بخاری سے ماخوذ ہے، صحیح مسلم میں یہ واقعہ جس طرح منقول ہے، اس میں بہت سی باتیں اس سے زائد اور مختلف ہیں، حافظ ابن حجر فتح الباری میں لکھتے ہیں کہ ان دونوں روایتوں میں تطبیق ممکن ہے،

قبیلۂ غفار کا اسلام

حضرت ابوذرؓ مکہ سے جب واپس گئے، اور اپنے قبیلہ کو اسلام کی دعوت دی تو آدھا قبیلہ اُسی وقت مسلمان ہوگیا، بقیہ آدمیوں نے کہا کہ ہم اس وقت اسلام کا اظہار کرین گے جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ میں آجائیں، چنانچہ جب آپ مدینہ میں تشریف لائے تو باقی آبادی بھی مسلمان ہوگئی[1] غفار سے قریب اسلم کا قبیلہ آباد تھا، اور دونون قبیلوں میں قدیم تعلقات تھے. غفار کے اثر سے انھوں نے بھی اسلام قبول کرلیا[2] (حالانکہ یہ دونوں قبیلے اسلام سے پہلے چوری[3] میں بدنام تھے، اور ان کو معلوم تھا کہ اسلام اس فعلِ شنیع کا دشمن ہے)

قبیلۂ اسلم کا اسلام

اوس خزرج کا اسلام

(موسم حج میں عرب کے اکثر قبائل کا اجتماع ہوجاتا تھا، آپ اس موقع پر ایک ایک قبیلہ کے قیام گاہ پر جاتے، اور اسلام کی دعوت دیتے تھے، چنانچہ مدینہ کے قبائل اوس و خزرج کی ایک معتدبہ جماعت نے اسی موقع پر اسلام قبول کیا. اس کے بعد جب حضرت مصعب بن عمیرؓ داعیِ اسلام بناکر مدینہ منورہ بھیجے گئے. تو ان کے فیضِ تلقین سے چند ہی مہینوں میں دو گھرانوں کے سوا بقیہ تمام گھرانے مسلمان ہوگئے، ہجرت کے بعد جب آپ مدینہ منورہ تشریف لائے تو آس پاس کے قبائل میں جیسا کہ اوپر گذرا، غفار و اسلم نے اسلام قبول کرلیا، کچھ ہی دنوں کے بعد بدر کا معرکہ پیش آیا جس میں قریش کو شکست ہوئی، اور ستر اشخاص مسلمانوں کے ہاتھ میں قید ہوئے، ان قیدیوں کی رہائی کے لئے قریش نے مدینہ میں آمد و رفت شروع کی، اس تقریب سے لوگوں کو مسلمانون سے ملنے جلنے کا اتفاق ہوا، اور اس اثر سے متعدد اشخاص مسلمان ہوگئے)

قیام مدینہ میں اشاعتِ اسلام

بدر کے بعد بعض قریشیوں کا اسلام

---

[1] (صحیح مسلم اسلام ابی ذر) [2] صحیح بخاری ذکر اسلم و غفار (؏[3]) بحوالۂ سابق)

(ان میں) بہت سے لوگ ایسے تھے کہ تاقیہ ان کے کانوں میں قرآن مجید کی آواز پڑگئی اور باوجود سخت عداوت کے ان کا دل پتھر سے موم بن گیا، جبیر بن مطعم بدر کے قیدیوں کو فدیہ دیکر چھڑانے کے لئے آئے تھے، اور قیدیوں کے ساتھ اسیر تھے، ایک دن آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) یہ آیتیں پڑھ رہے تھے،

اَمْ خُلِقُوْا مِنْ غَيْرِ شَيْءٍ اَمْ هُمُ	کیا یہ یوں ہی آپ سے آپ پیدا ہوگئے، یا ان لوگوں نے
الْخَالِقُوْنَ اَمْ خَلَقُوا السَّمٰوٰتِ	خود اپنے آپ کو پیدا کیا، یا ان لوگوں نے آسمان
وَالْاَرْضَ بَلْ لَّا يُوْقِنُوْنَ (طور ۲)	زمین کو پیدا کیا، بلکہ بات یہ ہے کہ ان کو یقین نہیں ہے

جبیر بن مطعم کا اسلام

جبیر بن مطعم نے یہ آیتیں سن لیں تو ان کا بیان ہے کہ مجھ کو یہ معلوم ہوتا تھا کہ میرا دل پرواز کر گیا، صحیح بخاری سورۂ طور میں یہ واقعہ مذکور ہے،

(مکہ میں روم و فارس کی جنگ کے متعلق آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے جو پیشین گوئی فرمائی تھی، وہ ٹھیک فتح بدر کے موقع پر پوری اتری، اور قرآن مجید کی پیشین گوئی کے مطابق سات برس کے بعد رومیوں نے فارس پر فتح کلی پائی، اس عظیم الشان معجزہ کا یہ نتیجہ ہوا کہ ایک خلق کثیر نے اسلام کی صداقت کا اقرار کیا،)

پیشین گوئی روم کا اثر

غرض اس طرح آپ ہی آپ لیکن نہایت آہستگی اور تدریج کیساتھ اسلام پھیلتا جاتا تھا، ۵ھ میں قریش، کنانہ، غطفان، اسد اور دیگر قبائل نے متحد ہو کر مدینہ پر حملہ کیا، اور شکست کھائی، اس معرکہ کا نام احزاب ہے جس کی تفصیل اوپر گذر چکی ہے، اس شکست نے قریش کا عالمگیر اثر کسی قدر کم کیا، اور وہ قبائل جو قبول اسلام کیلئے آمادہ تھے لیکن قریش کے ڈر سے ان کو

انظہار اسلام کی ہمت نہیں ہوتی تھی، انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں وفود بھیجے شروع کئے، سب سے پہلی جو سفارت آئی، وہ قبیلہ مزینہ کی تھی، جس میں چار سو آدمی شریک تھے انھوں نے یہ بھی خواہش ظاہر کی، کہ اگر ارشاد ہو تو ہجرت کر کے مدینہ میں آجائیں لیکن آپ نے فرمایا "تم جہاں رہو، مہاجر ہو"[1]

قبیلۂ مزینہ کا اسلام

اسی زمانہ میں قبیلۂ اشجع کے سفراء جن کی تعداد سو تھی، مدینہ میں آئے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ "ہم آپ سے لڑنا نہیں چاہتے، بلکہ یہ چاہتے ہیں، کہ صلح کا معاہدہ ہو جائے" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قبول فرمایا، اس وقت تک یہ لوگ کافر ہے لیکن جب صلح ہو چکی تو انھوں نے خود بخود اسلام قبول کر لیا[2]،

قبیلۂ اشجع کا اسلام

(جہینہ بھی ان ہی قبائل کے آس پاس آباد تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم) نے ان کو اسلام کی دعوت دی، اور وہ فوراً ایک ہزار کی جمعیت لے کر مدینہ آئے، اور مسلمان ہو گئے، اور اس کے بعد وہ اکثر غزوات میں مسلمانوں کے شریک حال رہے[3]

قبیلۂ جہینہ کا اسلام

غفار، اسلم، مزینہ، اشجع، اور جہینہ کی یہی اطاعت اور مسابقت اسلام تھی، جس کی بنا پر آپ نے اُن کے حق میں دعاے خیر فرمائی[4]،

صلح حدیبیہ کے زمانہ میں، جیسا کہ ہم حدیبیہ کے ذکر میں لکھ آئے ہیں، کفار اور مسلمان نہایت آزادی کے ساتھ آپس میں ملتے جلتے، اور اس لئے منکروں کو خلوت و جلوت میں مسلمانوں کی

صلح حدیبیہ کا اثر

---

[1] جز طبقات ابن سعد متعلق وفود جزء اول قسم ثانی ص ۳۸ [2] جز طبقات ابن سعد مذکور ص ۴۸،

([3] اصابہ تذکرہ بشیر بن عرفطہ) [4] صحیح بخاری ج اول ذکر غفار و اسلم و جہینہ،

تلقینات کے سننے کا موقع ملا، اس کا نتیجہ یہ ہوا[1] کہ اس سے پہلے باوجود غزوات اور محاربات کے جس قدر لوگ اسلام لائے تھے، صرف دو برس میں یہ تعداد اس سے اضعافاً مضاعفہ بڑھ گئی، چنانچہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صلح حدیبیہ کے سال ادائے عمرہ کے ارادہ سے مدینہ طیبہ سے نکلے، تو صرف ڈیڑھ ہزار شخص ساتھ تھے، اب دو برس کے بعد فتح مکہ کو چلے تو دس ہزار مسلمانوں کا لشکر جرار ساتھ تھا،

صلح حدیبیہ کا اثر اگرچہ تمام عرب پر محیط نہ تھا کیونکہ اس معاہدہ میں صرف قریش اور کنانہ شریک تھے، اس لئے جو لوگ براہ راست قریش کے زیر اثر یا اُن کے حلیف اور ہم عہد نہ تھے وہ اب بھی مدینہ پر حملہ کی تیاریاں کرتے رہتے تھے، اور اُن کے دفاع کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کچھ کچھ فوجیں بھیجنی پڑتی تھیں، تاہم جن موقعوں پر امن کا گمان ہوتا تھا وہاں داعیانِ اسلام بھیجے جانے لگے کہ لوگوں کو اسلام کی طرف بلائیں لیکن چونکہ حفاظت خود اختیاری کی غرض سے ان داعیوں کیساتھ تھوڑی بہت جمعیت بھی ہوتی تھی، اس لئے ارباب سیر ان تبلیغی جماعتوں کو بھی سرایا سے تعبیر کرتے ہیں:

---

[1] طبری میں امام زہری کا قول ہے،

فلما كانت الهدنة ووضعت الحرب وزارها وامن الناس كلهم بعضهم بعضا فالتقوا فتفاوضوا في الحديث والمنازعة فلم يكلم احد بالاسلام يعقل شيئا الا دخل فيه فلقد دخل في تينك السنتين في الاسلام مثل ما كان في الاسلام واكثر، (ص ۱۰۵۵)

(جب صلح ہوگئی، اور جنگ موقوف ہوگئی ایک دوسرے سے لوگ بخوف ہو کر باہم ملے جلے، باتیں چیتیں ہوئیں تو کوئی عقلمند ایسا نہ تھا جس سے اسلام کے متعلق گفتگو ہوئی اور اس نے قبول نہ کر لیا، چنانچہ جتنے لوگ ابتدا سے اس وقت تک مسلمان ہوئے تھے، صرف ان دو برسوں میں ان کے برابر بلکہ ان سے زیادہ تعداد میں لوگ مسلمان ہوگئے)

تمام عرب تولیتِ کعبہ کی وجہ سے قریش کو مذہبی رہبر سمجھتا تھا، اس لئے وہ انتظار کر رہے تھے کہ قریش کا کیا انجام ہوتا ہے، عمرو بن سلمہؓ ایک صحابی تھے، جو مدینہ سے دو ایک گذرگاہ عام پر رہتے تھے، اُن کے یہ الفاظ صحیح بخاری میں منقول ہیں،

فتحِ مکہ کا اثر

كانت العرب تلوّم بإسلامهم الفتح فيقولون اتركوه وقومه فانّه ان ظهر عليهم فهو نبي صادق فلما كانت وقعة اهل الفتح بادر كل قوم باسلامهم[۱]،

عرب قریش کے اسلام کا انتظار کرتے تھے، وہ کہتے تھے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اُن کی قوم (قریش) پر چھوڑ دو، اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم ان پر غالب آ گئے تو بے شبہ وہ سچے پیغمبر ہیں، پس جب مکہ فتح ہوا تو ہر قبیلہ نے اسلام کی طرف

ابنِ ہشام نے زیادہ صاف لکھا ہے،

وانّما[۲] كانت العرب تربّص بالاسلام امر هذا الحي من قريش وامر رسول الله صلّى الله عليه وسلّم وذلك ان قريشا كانوا امام الناس وهاديهم واهل البيت الحرام وصريح ولد اسمٰعيل بن ابراهيم عليهما السلام وقادة العرب لا ينكرون ذلك وكانت قريش هي التي نصبت لحرب رسول الله صلّى الله عليه وسلّم وخلافه فلما افتتحت مكة ودانت له قريش ودوّخها الاسلام عرفت

اور عرب اسلام کے باب میں صرف قریش کا انتظار کر رہے تھے اور وہ یوں کہ قریش تمام ملک کے سردار اور پیشوا اور کعبہ و حرم کے متولی اور حضرت اسمٰعیلؑ کی خاص اولاد اور عرب کے قائد تھے اور صرف قریش نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کے لئے جنگ برپا کی تھی تو جب مکہ فتح ہو گیا اور قریش نے سپر ڈال دی اور اسلام نے مکہ کو چھا لیا تو عرب کو یقین ہو گیا کہ ان کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جنگ اور عداوت کی طاقت نہیں ہے تو وہ خدا کے دین میں داخل ہو گئے جیسا

---

[۱] صحیح بخاری فتح مکہ [۲] سیرت ابنِ ہشام ذکر واقعات سنہ ۹ھ و وفود، ۱۲،

العرب انه لا طاقة لهم بحرب رسول الله	اللہ عزوجل نے قرآن میں کہا ہے،
صلی اللہ علیہ وسلم ولا عداوتہ فی خلوانی	(یعنی اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰہِ وَ
دین اللہ کما قال اللہ عزوجل الخ	الْفَتْحُ)

غرض اسلام کی سچائی اور سادگی اور عرب کی تیز فہمی اور ذہانت کے لحاظ سے اسلام کے پھیلنے میں جو دیر لگی وہ زیادہ تر قومی اور خاندانی مخالفت کی وجہ سے تھی، اب جب کہ باطل کا سنگِ راہ ہٹ گیا، تو حق کے آگے بڑھنے میں دیر نہ تھی،

فتح مکہ کے بعد اب دعوتِ اسلام کے لئے یہ خطرہ نہیں رہا کہ اس کے دعاۃ جہاں جائیں بے دریغ قتل کردیئے جائیں، اس بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام اطرافِ عرب میں دعاۃ بھیج دیئے کہ لوگوں کو اسلام کے فضائل و محاسن بتا کر ان کو اسلام کی ترغیب دلائیں، دعاۃ حسبِ ذیل طریقہ سے مقرر کئے گئے،

(۱) حفاظتِ خود اختیاری کی غرض سے کسی قدر فوج ساتھ کردیجاتی تھی کہ اُن کو کوئی شخص ضرر نہ پہنچانے پائے اور وہ آزادی سے تبلیغ اسلام کرسکیں، حضرت خالدؓ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یمن بھیجا، تو فوج بھی ساتھ کردی لیکن تاکید تھی کہ بہ جبر پیش نہ آئیں، چنانچہ پورے چھ مہینے تک اُن کی دعوتِ اسلام پر کسی نے توجہ نہیں کی، اور وہ کچھ نہ کرسکے، حضرت خالدؓ سپہ سالار اور فاتح تھے، واعظ اور صاحبِ ارشاد نہ تھے، اس بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اب حضرت علیؓ کو بھیجا، انھوں نے قبائل کے سامنے جب اسلام کی تبلیغ کی تو دفعۃً ملک کا ملک مسلمان تھا،

یہی وہ دعاۃ ہیں جن کو علامہ طبری نے ان لفظوں سے تعبیر کیا ہے،

قد کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بعث فیھا	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ کے اطراف میں کچھ لوگ بھیجدیئے،(؟)

حول مكة السرايا تدعوا الى الله — بھیجی تھین کہ لوگوں کو خدا کی طرف بلائیں

عزّ وجل ولم يأمرهم بقتال — لیکن ان کو لڑنے کا حکم نہیں دیا تھا،

حضرت خالدؓ کو قبیلۂ بنی جذیمہ کے پاس بھی اسی طرح دعوتِ اسلام کے لئے بھیجا تھا لیکن جب انھوں نے کشت وخون کیا، اور آنحضرت (صلّی اللہ علیہ وسلّم) کو خبر ہوئی، تو آپ کھڑے ہوگئے، اور قبلہ رُخ دونوں ہاتھ اٹھا کر کہا، خدایا! میں خالد کے فعل سے بری ہوں، پھر حضرت علیؓ کو بھیجا انھوں نے ایک ایک مقتول کا خون بہا ادا کیا، یہاں تک کہ کتوں کا بھی،

(اشاعتِ اسلام کی غرض سے جو مسلّح جماعت اطرافِ ملک مین بھیجی جاتی تھی، اس میں کبھی کبھی آپ ایک ایک فرد کا امتحان لیتے تھے، ان میں جو صاحب سب سے زیادہ حافظِ قرآن ہوتے تھے، اُن کو اس کا امیر مقرر فرماتے تھے، چنانچہ آپؐ نے ایک بار اسی قسم کی فوج روانہ کرنا چاہی[۱]، تو ایک ایک شخص سے قرآن پڑھوا کر سنا، ان لوگون میں ایک کمسن نوجوان تھے، آنحضرت (صلّی اللہ علیہ وسلّم) اُن کے پاس آئے پوچھا تمھیں کیا یاد ہے؟ انھوں نے کہا کہ مجھکو سورۂ بقرہ اور فلان فلاں سورتیں یاد ہیں، آپنے فرمایا تو تم ہی ان سب کے امیر ہو (ترغیب ترہیب جلد ا صفحہ ۲۵۹، بروایت ترمذی)

(۲) جو ممالک زیر اثر آتے تھے، اور وہاں زکوٰۃ اور جزیہ کے وصول کرنے کے لئے عمال بھیجے جاتے تھے وہ اکثر اس درجہ کے لوگ ہوتے تھے جن کا تقدس، زہد اور پاکیزگی مسلّم ہوتی تھی،

---

[۱] اس روایت میں اگرچہ یہ تصریح نہیں ہے کہ یہ فوج اشاعتِ اسلام کے لئے بھیجی گئی تھی، صرف یہ الفاظ ہیں،

بعث بعثا وهم ذو عدد، — یعنی آپ نے ایک بہت بڑی جماعت بھیجی،

تاہم قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا مقصد صرف اشاعت اسلام تھا، کیونکہ اگر لڑائی مقصود ہوتی، تو حفظ قرآن کی ضرورت نہیں ہوتی، اور نہ آپ ہر ایک سے قرآن پڑھوا کر سنتے)

اس کے ساتھ عالم اور واعظ بھی ہوتے تھے، اور اس لئے وہ تحصیل مال کے ساتھ تبلیغ اسلام کی خدمت بھی انجام دے سکتے تھے، ان میں سے بعضوں کے نام حسب ذیل ہیں.

نام	مقام	کیفیت
مہاجرؓ بن ابی امیہ	صنعاء یمن	حضرت ام سلمہؓ (زوجۂ نبویؐ) کے بھائی تھے،
زیادؓ بن لبید	حضر موت	یہ ان اصحاب میں ہیں جو غزوۂ بدر میں شریک تھے،
خالدؓ بن سعید	صنعاء یمن	سابقین اولین اور مہاجرین حبش میں ہیں، سب سے پہلے ان ہی نے کاغذات پر بسم اللہ الرحمن الرحیم لکھا،
عدیؓ بن حاتم	قبیلۂ طے (یمن)	مشہور صحابی ہیں، حاتم طائی ان ہی کا باپ تھا،
علاءؓ بن حضرمی	بحرین	
حضرت ابو موسی اشعریؓ	زبید و عدن	ان کی دعوت اسلام سے قریباً تمام لوگ مسلمان ہوگئے، مشہور صاحب علم صحابی ہیں،
حضرت معاذؓ بن جبل	جند	
جریرؓ بن عبداللہ بجلی	ذوالکلاع حمیری	جریرؓ مشہور صحابی ہیں، ذوالکلاع حمیری یمن کے سلاطین کے خاندان سے تھے، ایک موقع پر لاکھ آدمیوں نے ان کو سجدہ کیا تھا، جریرؓ کی دعوت پر یہ اسلام لائے تو اسکی خوشی میں چار ہزار غلام آزاد کیے،

(۳) بعضؒ لوگ خاص اشاعت اسلام کی غرض سے بھیجے جاتے تھے جن سے اس قسم

ؒ اضافہ تا ذکر اسلام ابنائے یمن،

گردعاۃ کے نام حسب ذیل ہیں:-

نام	مقامِ دعوت	نام	مقام دعوت
علیؓ بن ابی طالب	قبیلۂ ہمدان و جذیمہ و مذحج	خالدؓ بن ولید	اطرافِ مکہ
مغیرہ بن رضؓ شعبہ	نجران	عمرو بنؓ العاص	عمّان
وبرؓ بن یحنس	ابنائے فارس	مہاجر بنؓ ابی امیہ	بطرفِ حارث بن عبدکلال
محیصہ بنؓ مسعود	فدک		شہزادۂ یمن
اخنف	قبیلۂ سلیم (مسند جلد ۵ ص ۲۲۴)		

(۴) رؤسائے قبائل بارگاہِ نبوت میں آکر مسلمان ہو جاتے تھے، اور کچھ روز یہاں قیام کرکے اپنے اپنے قبائل میں دعوتِ اسلام کی غرض سے واپس جاتے تھے، ان اشخاص کے نام یہ ہیں:-

نام	مقام	کیفیت
طفیل بن عمرو دوسی	قبیلۂ دوس	
عروہ بن مسعود	ثقیف	
عامر بن شہر	ہمدان	
ضمام بن ثعلبہ	بنو سعد	
منقذ بن حبان	بحرین	
ثمامہ بن اثال	اطرافِ نجد	

ان مبلغین اور دعاۃ کے اثر سے اسلام ہر جگہ تیزی سے آگے بڑھ رہا تھا، فتحِ مکہ کے بعد جیسا کہ پہلے گذر چکا ہے دعاۃ اطرافِ مکہ میں بھیج دیے گئے تھے، اور لوگ خوشی خوشی مسلمان ہوتے جاتے تھے، قرآن پاک کی یہ آیتیں اسی موقع کی طرف اشارہ کرتی ہیں،

إِذَا جَاءَ نَصْرُ اللَّهِ وَالْفَتْحُ وَرَأَيْتَ النَّاسَ	جب خدا کی فتح و نصرت آئی اور تم نے دیکھ لیا کہ
يَدْخُلُونَ فِي دِينِ اللَّهِ أَفْوَاجًا	لوگ فوج در فوج خدا کے مذہب میں داخل ہو رہے ہیں،

فتحِ مکہ کے تین مہینے کے بعد ذوالحجہ ۹ھ کے موسم حج میں اعلانِ براۃ ہوا، اس واقعہ کے بعد بلا استثنا حجاز نے عام طور سے اسلام قبول کر لیا،[1]

حجاز سے باہر نبوت کے اکیس برس میں صرف قریش اور یہود کی مزاحمت سے اسلام آگے نہ بڑھ سکا اور خال خال مسلمان ادھر ادھر نظر آتے تھے، لیکن ان دیواروں کا ہٹنا تھا کہ صرف تین برس میں ۹ھ تا ۱۱ھ میں اسلام کا اثر ایک طرف یمن، بحرین، یمامہ، عمان اور دوسری طرف عراق و شام کی حدود تک وسیع ہو گیا، یہ عرب کے وہ صوبے ہیں، جہاں اسلام سے پہلے عربوں کی بڑی بڑی حکومتیں قائم تھیں، اور اس وقت بھی وہ روم و فارس دنیا کی دو عظیم الشان طاقتوں کے زیر سایہ تھیں، تاہم اسلام بغیر تلوار کی رفاقت کے صلح و امن کے سایہ میں اپنی آواز بلند کرتا چلا گیا، اور ہر گوشہ سے لبیک کی صدائیں خود بخود آنے لگیں،

یمن ملک عرب کے تمام صوبوں میں یمن سب سے زیادہ زرخیز اور سیر حاصل ہے، اور نہایت قدیم زمانہ سے تمدن و تجارت کا مرکز ہے، سبا اور حمیر کی عظیم الشان حکومتیں یہیں قائم ہوئی تھیں، ولادت نبوی سے تقریباً پچاس برس پہلے ۵۲۵ء میں حبشی عیسائیوں نے یمن پر قبضہ کر لیا تھا،

[1] طبری واقعات ۹ھ،

ولادتِ نبوی کے چند سال بعد اہلِ ایران یہاں کے مالک بن گئے تھے، ان کی طرف سے یہاں ایک گورنر ہوتا تھا، جو یمن پر حکومت کرتا تھا،

یمن میں اسلام کی تحریک کے لئے متعدد عوائق موجود تھے، مثلاً اختلافِ جنسیت کہ اہلِ یمن قحطانی تھے، داعیِ اسلام اسماعیلی، اہلِ یمن کو اپنے قدیم جاہ و جلال اور تمدنِ حکومت پر ناز تھا، اور تمام عرب بجا طور سے ان کی پیش روی کو تسلیم کرتا تھا، اور تمام عرب میں وہی حکومت کے مستحق سمجھے جاتے تھے، ملک میں جہاں کوئی باقاعدہ حکومت تھی، وہ نسلاً اسی خاندان سے شمار ہوتی تھی، چنانچہ جب یمن سے قبیلۂ کندہ کا وفد آیا ہے جو یمن کا ایک شاہی خاندان تھا، تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک عرب فرمانروا سمجھ کر رئیسِ وفد نے پوچھا کہ یارسول اللہ! کیا آپ اور ہم ہم خاندان نہیں ہیں؟ آپ نے فرمایا "ہم نضر بن کنانہ کے خاندان سے ہیں، نہ اپنی ماں پر تہمت رکھ سکتے ہیں، اور نہ اپنے باپ سے انکار کرسکتے ہیں"[1]

یمن میں اشاعتِ اسلام کا سب سے بڑا عائق یہ ہوسکتا تھا، کہ وہ پولٹیکل حیثیت سے ایرانیوں کے ماتحت تھا، اور باشندے مذہباً علی العموم یہودی یا عیسائی تھے، لیکن قبولِ حق کے لئے کوئی چیز ان میں سے مانع نہ آئی،

یمن میں اسلام کی دعوت ہجرت سے بہت پہلے پہونچ چکی تھی، یمن میں دوس ایک ممتاز قبیلہ تھا، اس قبیلہ کا رئیس طفیل بن عمرو اتفاق سے مکہ آیا، اور مسلمان ہوگیا، اسی زمانہ میں کندہ کا قبیلہ حج کے لئے مکہ آیا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اسلام کی دعوت

---

[1] ابن حنبل حدیث اشعث بن قیس وزاد المعاد جلد ا صفحہ ۳۲ مصر،

دی لیکن انھوں نے انکار کیا[1]، سنہ ۸ھ میں آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) خیبر میں تشریف فرما تھے، دوس کا قبیلہ مسلمان ہوکر دارالاسلام میں منتقل ہوگیا، یمن کا ایک مشہور قبیلہ اشعر تھا، وہ بھی مہاجرین حبشہ کی معیت میں اسی زمانہ میں بلاتحریک خود بخود اسلام لایا، اور آستانۂ نبوت پر حاضر ہوا، ابوہریرہؓ دوسی اور ابوموسیٰ اشعریؓ ان ہی قبائل کے ساتھ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے،،

یمن میں ہمدان سب سے بڑا کثیر التعداد اور صاحب اثر خاندان تھا، آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے (سنہ ۸ھ کے آخر میں) ان کو دعوت اسلام دینے کے لئے حضرت خالدؓ کو بھیجا، خالد چھ مہینے تک ان کو اسلام کی دعوت دیتے رہے، لیکن ان لوگوں نے قبول نہیں کیا، بالآخر آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے خالد کو بلالیا، اور حضرت علیؓ کو بھیجا، حضرت علیؓ نے ان لوگوں کو جمع کرکے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا نامۂ مبارک پڑھ کر سنایا، اور ساتھ ہی سارے کا سارا قبیلہ مسلمان تھا، حضرت علیؓ نے جب اس واقعہ کی اطلاع بارگاہ رسالت میں دی تو آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے سجدہ کیا اور سر اٹھا کر دو دفعہ فرمایا السلام علی ہمدان[2]

(۱) ابن ہشام ذکر عرض الاسلام علی القبائل) (۲) زرقانی بہ سند صحیح از بیہقی (اصل واقعہ بخاری جزء غزوات میں موجود ہے، لیکن ہمدان کی اس میں تخصیص نہیں، اور نہ ان کے اسلام کا اس میں ذکر ہے) اس واقعہ کے متعلق اور بھی روایتیں ہیں لیکن وہ صحیح نہیں، چنانچہ خود مواہب لدنیہ نے تسلیم کیا ہے، ان روایتوں کا یہ مفہوم ہے کہ ہمدان کے لوگوں نے حضرت علیؓ کے ڈر سے اسلام قبول کرلیا، لیکن یہ راویوں کا حسن ظن ہے، واقعہ نہیں (ایک روایت میں ہے کہ آپ نے ہمدان کو حکم دیا، کہ وہ ثقیف سے ہمیشہ لڑا کریں اور ان پر غارت گری کیا کریں لیکن حافظ ابن قیم نے تصریح کی ہے کہ یہ روایت بالکل غلط ہے ہمدان یمن کا قبیلہ تھا، اور ثقیف مکہ کے پاس طائف میں تھے، یہ حکم تو دو ہمسایہ قبیلوں کو دیا جاسکتا تھا)

(بعض روایتوں میں ہے کہ ہمدان نے جب اسلام کا غلغلہ سنا تو عامر بن شہر کو آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی خدمت میں بھیجا کہ یہ مذہب اگر تم کو پسند آئے تو ہم سب اس کے قبول کے لئے تیار ہیں، اور اگر ناپسندیدہ ٹھہرے تب بھی ہم تمھارے ساتھ ہیں، عامر بن شہر جب دربارِ رسالت سے واپس آیا تو اس کا دل نورِ اسلام سے معمور تھا، اور ساتھ ہی سارا قبیلہ بھی مسلمان تھا، ممکن ہے کہ یہ دونوں واقعے ہوں، اور دونوں کی کوشش سے یہ کامیابی حاصل ہوئی ہو،

یمن میں حضرت علیؓ سے لوگ مانوس ہو گئے تھے، ربیع الاول سنہ ۱۰ھ میں تین سو سواروں کی حفاظت میں آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے پھر ان کو یمن کے قبیلۂ مذحج میں تبلیغ اسلام کے لئے نامزد فرمایا، اور ساتھ ہی یہ تاکید فرمادی کہ جب تک وہ حملہ آور نہ ہوں، پیش دستی نہ کرنا، حضرت علیؓ جب مذحج کی سرزمین میں پہونچے تو مال گذاری وصول کرنے کیلئے ادھر ادھر لوگوں کو متعین کیا، اسی اثنا میں قبیلۂ مذحج کی ایک جمعیت نظر آئی، حضرت علیؓ نے ان کے سامنے اسلام کی دعوت پیش کی لیکن ادھر سے اس احسان کا جواب تیر اور پتھروں کی زبان سے ملا، یہ دیکھ کر حضرت علیؓ نے بھی اپنے ساتھیوں کی صف آرائی کی، مذحج اپنے بیس آدمی مقتول چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے، مسلمانوں نے ان کا تعاقب نہ کیا کہ ان کا مقصود صرف مدافعت تھا، اس کے بعد رؤسائے قبیلہ خود حاضر ہوئے اور انھوں نے اسلام قبول کیا، اور دوسروں کی طرف سے نیابۃً اسلام کا اعلان کیا،[1])

[1] حضرت علیؓ کی مہم یمن کا واقعہ تمام حدیث کی کتابوں میں مذکور ہے لیکن یہ تفصیل ابن سعد جزء مغازی سے ماخوذ ہے،

یمن میں فارس کے جو رؤسا، قیام پذیر ہو گئے تھے، ان کو ابنار کہتے تھے، آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے سنہ ۱۰ھ میں دبر بن یحنس کو ان کے پاس دعوتِ اسلام کے لئے بھیجا، وہ نعمان بن بزرج (بزرگ) کے گھر ان کے مہمان ہوئے، اور فیروز دیلمی، مرکبود، وہب بن منبہ کے پاس دعوتِ اسلام کے خطوط بھیجے، سب نے اسلام قبول کیا، صنعاء میں سب سے پہلے جس نے قرآن مجید حفظ کیا، وہ مرکبود کے صاحبزادے عطاء اور وہب بن منبہ تھے،

(عام یمن میں تبلیغِ اسلام کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم) نے معاذ بن جبل اور ابو موسیٰ اشعری کو نامزد فرمایا، دونوں صاحب یمن کے ایک ایک ضلع میں بھیجے گئے، چلتے وقت آپ نے ان لوگوں کو جو باتیں تعلیم فرمائیں، وہ درحقیقت اسلامی تبلیغ کے اصول ہیں، آپ نے فرمایا سہولت سے کام کرنا، سختی گیری نہ کرنا، لوگوں کو خوشخبری سنانا، نفرت نہ دلانا، دونوں مل کر کام کرنا، تم کو ایسے لوگ ملیں گے، جو پہلے سے کوئی مذہب رکھتے ہیں، جب اُن کے ہاں پہونچنا تو پہلے ان کو توحید اور رسالت کی دعوت دینا، جب وہ اس کو تسلیم کر لیں تو کہنا کہ خدا نے تم پر روز و شب میں پانچ وقت کی نماز بھی فرض کی ہے، جب یہ بھی مان لیں تو اُن کو سمجھانا کہ تم پر زکوٰۃ بھی واجب ہے، تم میں جو امیر ہوں اُن سے لے کر جو غریب ہیں ان کو دے دی جائے گی، دیکھو جب وہ زکوٰۃ دینا منظور کر لیں تو چن چن کر اچھی اچھی چیزیں نہ لینا، مظلوموں کی بددعا سے ڈرتے رہنا کہ اس کے اور خدا کے درمیان کوئی پردہ حائل نہیں۔" حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ نے پوچھا یا نبی اللہ! ہمارے ملک یمن میں جو اور شہد

ف طبری ص ۱۷۶۳ (ف اضافہ تابجریں)

کی شراب بنتی ہے کیا یہ بھی حرام ہے ؟ آپ نے فرمایا ہر شے جو نشہ پیدا کرے حرام ہے[۱]"

نجران

(یمن کے پاس ہی نجران کا ضلع ہے، نجران عرب میں عیسائیت کا خاص مرکز تھا آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے مغیرہ بن شعبہؓ کو جو صلح حدیبیہ ۶ھ سے پہلے اسلام لا چکے تھے، دعوتِ اسلام کے لئے نجران بھیجا، عیسائیوں نے قرآن پر اعتراضات شروع کئے، یہ جواب نہ دے سکے، اور واپس چلے آئے[۲]، اس کے بعد آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے دعوتِ اسلام کا ان کو خط بھیجا، جس میں تحریر تھا کہ اگر اسلام قبول نہ ہو تو اسلام کی سیاسی اطاعت قبول کرو، اور جزیہ دو[۳]، اہلِ نجران نے راہبوں اور مذہبی پیشواؤں کی ایک جماعت کو دریافت حال کے لئے مدینہ بھیجا، اس وفد کا تفصیلی بیان آگے آئے گا،

نصاریٰ کے علاوہ نجران میں مشرکین کی بھی کچھ آبادی تھی، ان میں ایک قبیلہ بنو حارث ابن زیاد تھا، جو مدان نام ایک بت کو پوجتا تھا، اور اس لئے عبدالمدان کے نام سے مشہور تھا، ربیع الآخر ۱۰ھ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خالد بن ولیدؓ کو وہاں دعوتِ اسلام کے لئے بھیجا، حضرت خالدؓ وہاں پہونچے تو سارا قبیلہ مسلمان ہو گیا، حضرت خالدؓ نے یہاں تھوڑے دن قیام کیا، اور قرآن اور احکامِ اسلام کی تعلیم دی[۴]،

اہل یمن کے لئے دعائے خیر

اہلِ یمن کا بغیر کسی ترغیب و ترہیب کے خلوص دل سے قبولِ اسلام کوئی ایسا واقعہ نہ تھا، جو خاص رحمتِ الٰہی کا مستوجب نہ ہو، جب اشعریین کی آمد کی خبر ہوئی، تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

---

(۱) یہ پورا واقعہ بخاری جزء غزوات میں مذکور ہے ہم نے بخاری کی مختلف روایتوں کو یکجا کر لیا ہے (۲) ترمذی تفسیر سورہ مریم (۳) زرقانی بحوالہ بیہقی (۴) زرقانی جلد ۳ صفحہ ۱۹۶

مسلمانون کو بشارت دی، کہ "کل اہل یمن آتے ہیں، جو رقیق القلب اور نرم دل ہیں[1]"، جب ہمدان مسلمان ہوا، تو آپنے سجدۂ شکر ادا کیا، اور ان کو سلامتی کی دعا دی[2]، حمیر اور تمیم کا وفد آیا، تو آپنے پہلے تمیم کی طرف خطاب کیا، "تم بشارت قبول کرو، تو تمیم نے کہا" یا رسول اللہ! ہم نے بشارت تو قبول کر لی، کچھ عطا بھی فرمایئے"، آپ نے منہ پھیر لیا، کہ بشارت سے بڑھ کر کیا چیز ہو سکتی تھی، پھر اہل یمن کی طرف رُخ کر کے فرمایا، "اے اہل یمن! تمیم نے بشارت قبول نہ کی، تم قبول کر لو،" اہل یمن بے اختیار بول اٹھے، "اے خدا کے رسول! ہم نے قبول کیا[3]" پھر آپنے عام طور سے فرمایا، "ایمان یمن کا ایمان ہے، اور دانائی یمن کی دانائی ہے[4]"

مبلغین یمن میں سے حضرت علیؓ اور ابو موسیٰؓ حجۃ الوداع کے موقع پر یمن سے واپس آئے، اور آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ حج ادا کیا، ان مبلغین کے ساتھ یمن کے بہت سے نومسلم بھی حج و زیارت کو آئے،)

بحرین میں اسلام

بحرین سنہ ۸ھ | بحرین ایران کی حدود و حکومت میں داخل تھا، عرب کے قبائل وادیوں میں آباد تھے، جن میں مشہور اور با اثر خاندان عبد القیس، بکر بن وائل اور تمیم تھے، ان میں سے عبد القیس کے قبیلہ میں سے منقذ بن حبان تجارت کے لئے نکلے، راہ میں مدینہ پڑتا تھا، وہاں ٹھہرے، آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کو معلوم ہوا تو ان کے پاس تشریف لے گئے، اور اسلام کی دعوت دی، انھون نے اسلام قبول کیا، اور سورۂ فاتحہ اور اقرأ سیکھی، آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ان کو ایک فرمان عنایت کیا، وہ سفر سے واپس گئے تو چند روز

[1] بخاری قدوم الاشعریین واہل الیمن، [2] زرقانی بحوالہ بیہقی [3] بخاری کتاب بدء الخلق و قدوم الاشعریین

تک کسی سے اس کا اظہار نہیں کیا، لیکن اُن کی بیوی نے اُن کو نماز پڑھتے دیکھا تو اپنے باپ منذر بن عائذ سے شکایت کی، انھوں نے منقذ سے دریافت کیا، بحث و مباحثہ کے بعد منذر بھی مسلمان ہوگئے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نامۂ مبارک لوگوں کو سنایا، سب نے اسلام قبول کرلیا۔[۱]

صحیح بخاری (کتاب الجمعہ) میں روایت ہے کہ مسجد نبوی کے بعد سب سے پہلا جمعہ جس مسجد میں ادا کیا گیا وہ بحرین کی مسجد تھی، جو جواثی میں واقع ہے، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ بحرین میں ابتدائی زمانہ میں اسلام کی اشاعت ہوچکی تھی،

اسلام قبول کرنے کے بعد ان لوگوں نے چودہ شخصوں کی ایک سفارت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بھیجی، جس کے افسر منذر بن الحارث تھے، ان کا قافلہ کاشانۂ نبوت کے قریب آیا تو یہ لوگ اس قدر بیتاب ہوئے کہ سواریوں سے کود پڑے۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ چومے، لیکن منذر کو پاسِ ادب ملحوظ تھا، انھوں نے قیام گاہ پر جاکر کپڑے بدلے پھر خدمت میں حاضر ہوکر دست بوسی کی،[۲]

(۱) زرقانی بحوالۂ کرمانی قبیلہ عبدالقیس کی ایک سفارت کا ذکر صحیح بخاری میں ہے، اور وہ اس زمانہ کے بعد کی ہے، بخاری کی روایت سے بھی اس قدر ثابت ہوتا ہے کہ عبدالقیس اس سفارت سے پہلے ایمان لاچکے تھے، اصابہ میں ابن شاہین سے جو روایت ہے وہ گو زرقانی کی روایت سے مختلف ہے اور اس میں سفارت کے نام میں اختلاف ہے تاہم اس قدر روایتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ پہلی سفارت چھٹی صدی ہجری سے پہلے کی ہے (۲) زرقانی بہ روایت بیہقی بہ سند جید)

سنہ ۸ھ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے علاء حضرمیؓ کو تبلیغ اسلام کے لئے بحرین بھیجا،
اس زمانہ میں یہاں ایران کی طرف سے منذر بن ساوی گورنر تھا، اس نے اسلام قبول
کیا، اور اس کے ساتھ تمام عرب اور کچھ عجم جو یہاں مقیم تھے مسلمان ہوگئے،[۱]

بحرین کے علاقہ میں "ہجر" ایک مقام ہے، یہاں ایران کی طرف سے سیبخت حاکم تھا،
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے نام بھی خط بھیجا تھا، اور اس نے بھی اسلام قبول کیا،[۲]

عمان میں اسلام

عمان سنہ ۸ھ | اس شہر پر قبیلہ ازد کا قبضہ تھا، اور عبید و جعفر یہاں کے رئیس تھے سنہ ۸ھ
میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ابو زید انصاریؓ کو جو حافظ قرآن تھے، اور عمرو بن العاصؓ
کو دعوت اسلام کا خط دیکر بھیجا، دونوں رئیسوں نے اسلام قبول کیا، اور وہاں کے
تمام عرب ان کی ترغیب سے اسلام لائے،[۳]

حدود شام میں اسلام

عرب شام سنہ ۹ھ | شام کے اطراف میں جو عرب آباد تھے، ان میں متعدد ریاستیں تھیں،
ان میں سے معان اور اس کے اضلاع فروۃ بن عمرو کے زیر حکومت تھے، لیکن خود فروۃ
رومی سلطنت کی طرف سے گویا گورنر تھے، انھوں نے اسلام سے واقفیت پیدا کی تو مسلمان
ہوگئے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اظہار اسلام کے ساتھ ایک خچر ہدیہ کے طور
پر بھیجا (عیسائی) رومیوں کو ان کے اسلام کا حال معلوم ہوا تو ان کو گرفتار کرکے سولی
دیدی، اس وقت یہ شعر ان کی زبان پر تھا،[۴]

---

[۱] فتوح البلدان [۲] فتوح البلدان ذکر بحرین [۳] فتوح البلدان ذکر فتح عمان، [۴] ابن ہشام
اسلام فروۃ، ذکر وفود،

بلغ سراة المسلمين بانني　　　سلم لربي اعظمي ومقامي

(مسلمان سرداروں کو میرا یہ پیغام پہنچا دو کہ میرا جسم اور میری عزت سب پروردگار کے نام پر نثار ہے)

(شام اور عرب کے درمیان عذرہ، بلی، جذام وغیرہ قبائل آباد تھے، قبیلۂ بلی میں حضرت عمرو بن العاص رضؓ کا ننہال تھا، اس لئے ایک جماعت کیساتھ وہ ان اطراف میں بھیجے گئے، جب وہ جذام کے تالاب پر پہنچے تو اُن کو حملہ کا خوف ہوا، دربارِ نبوت میں اطلاع کی، وہاں سے حضرت ابو عبیدہ رضؓ کی ماتحتی میں بغرض حفاظت کچھ فوج بھیج دی گئی، اسی کو اہلِ سیر کی اصطلاح میں غزوۂ ذات السلاسل کہتے ہیں،)

وفودِ عرب

(جن لوگوں نے مبلغینِ اسلام کی دعوت قبول کرلینے کے بعد خود بارگاہ نبوت میں جاکر اسلام کا اعلان کرنا چاہا، اربابِ سیر"وفود" کے عنوان سے ان کا ذکر کرتے ہیں، اس قسم کے وفود کی تعداد بہت زیادہ ہے، ابن اسحاق نے صرف پندرہ وفود کا حال لکھا ہے، ابن سعد میں ستر وفود کا تذکرہ ہے، دمیاطی، مغلطائی، زین الدین عراقی بھی یہی تعداد بیان کرتے ہیں، لیکن مصنف سیرت شامی نے زیادہ استقصا کیا ہے اور ایک سو چار وفود کے حالات بہم پہنچائے ہیں، اگرچہ ان میں کہیں کہیں ضعیف روایتوں سے استناد کیا گیا ہے، اور اکثر وفود کے نام مبہم ہیں، تاہم یہ مسلم ہے کہ اصل تعداد ابن اسحاق کی روایت سے کہیں زیادہ ہے، حافظ ابن قیم اور قسطلانی نے نہایت تحقیق اور احتیاط کے ساتھ ان میں سے صرف ۳۴ وفود کی تفصیل کی ہے)

اصل یہ ہے کہ تمام عرب مکہ کے فیصلۂ اخیر کا انتظار کر رہا تھا، مکہ فتح ہو چکا تو یہ انتظار جاتا رہا، اب ہر قبیلہ نے چاہا کہ خود دارالاسلام میں جاکر کوئی فیصلہ کرے، اہل عرب کو یہ بات تو معلوم ہو چکی تھی کہ اب وہ اسلام کے مقابلہ میں سرکشی نہیں کرسکتے، لیکن خیبر وغیرہ کی نظیروں سے یہ بھی جانتے تھے کہ اسلام لانے پر وہ مجبور نہیں ہیں بلکہ جزیہ یا کسی اور طریقہ سے صلح کرکے اُن کی سابق حالت قائم رہ سکتی ہے، فتح مکہ کے ساتھ ہی ہر طرف سے سفارتیں آنی شروع ہوگئیں، اور بجز چند کے باقی جس قدر

سفارتیں آئیں، انھوں نے بارگاہِ نبوت میں پہنچکر وہ کچھ دیکھا کہ واپس آئے تو ایمان کی دولت سے مالامال آئے،

عرب کے سب سے طاقتور قبیلے جن کا اثر دور تک پھیلا ہوا تھا، بنوتمیم، بنوسعد، بنوحنیفہ، بنواسد، کندہ، سلاطین حمیر، ہمدان، ازد اور طے تھے، ان تمام قبائل کی سفارتیں دربارِ نبوت میں آئیں ان میں سے بعض ملکی حیثیت رکھتی تھیں یعنی جن کا مقصد صرف یہ تھا کہ بحیثیت فاتح کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ معاہدہ کرلیں، لیکن اکثر اس غرض سے آئیں کہ اسلام کی حقیقت سے مطلع ہوکر اسکے حلقہ میں آجائیں، یہ وفود زیادہ تر فتحِ مکہ کے بعد ۸ھ و ۹ھ اور ۱۰ھ میں آئے لیکن تسلسل بیان کیلئے اس سے پہلے کے چند وفود کا تذکرہ کرنا بھی موزوں ہوگا،

مزینہ یہ ایک بڑا قبیلہ تھا، جو مضر تک پہنچکر قریش کے خاندان سے مل جاتا ہے، نعمان بن مقرن مشہور صحابی جو فتحِ مکہ میں قبیلہ مزینہ کے علمبردار تھے، اسی قبیلہ سے تھے، اصفہان انہی نے فتح کیا تھا، ۵ھ میں اس قبیلہ کے چار سو شخص قبیلہ کے سفیر بنکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے اور اسلام لائے[1]، عراقی نے سیرۃِ منظوم میں لکھا ہے،

اول وفد وفد المدینۃ	سنۃ خمس وفدوا مزینہ
سب سے پہلا وفد جو مدینہ میں آیا	وہ مزینہ کا قبیلہ تھا جو ۵ھ میں آیا

بنوتمیم بنوتمیم کے وفود بڑی شان وشوکت سے آئے، قبیلہ کے تمام بڑے بڑے رؤسا مثلاً اقرع بن حابس، زبرقان، عمرو بن الاہتم، نعیم بن یزید سب اس سفارت میں شامل تھے،

[1] اصابہ فی احوال الصحابہ (ترجمۂ نعمان بن مقرن) و ابن اسعد جزء وفود صفحہ ۳۰

عیینہ بن حصن فزاری جو مدینہ کے حدود تک حملہ آور ہوا کرتا تھا، وہ بھی ساتھ تھا،

یہ لوگ اگرچہ اسلام قبول کرنے کی غرض سے آئے تھے، تاہم عربی فخر و غرور کا نشہ سر میں اب بھی باقی تھا، دربار نبوت یعنی مسجد نبوی میں پہنچے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم گھر میں تشریف رکھتے تھے آستانۂ اقدس پر جا کر پکارے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) باہر آؤ، آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) باہر تشریف لائے تو بولے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہم اس لئے آئے ہیں کہ تم سے مفاخرہ کریں، آپ نے اجازت دی، عطارد ابن حاجب جو مشہور خطیب تھا، اور جس نے نوشیرواں کے دربار سے حسن تقریر کے صلہ میں کمخواب کا خلعت[1] حاصل کیا تھا، اٹھا اور اپنی قوم کے مفاخر پر ایک پُرزور تقریر کی جس کا خلاصہ یہ تھا:-

"خدا کا شکر ہے جس کے الطاف کی بدولت ہم صاحب تاج و تخت، خزانہ ہائے گراں بہا کے مالک اور مشرق میں تمام قوموں سے معزز تر ہیں، ہماری برابری آج کون کر سکتا ہے، ہماری ہمسری کا جس کو دعویٰ ہو وہ یہ خصائص اور اوصاف گنائے جو ہم نے گنائے ہیں"

عطارد خطبہ دے کر بیٹھ گیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ثابت بن قیس کو جواب دینے کا اشارہ کیا، انھوں نے جو تقریر کی، اس کا ماحصل یہ تھا:-

"اس کی تعریف جس نے زمین و آسمان بنائے، اس نے ہم کو بادشاہت دی، اور اپنے بندوں میں سے بہترین شخص کو انتخاب کیا، جو سب سے زیادہ شریف النسب سب سے زیادہ راست گفتار، سب سے زیادہ شریف الاخلاق تھا، وہ تمام عالم کا انتخاب تھا، اسلئے خدا نے اس پر کتاب نازل کی، اس نے لوگوں کو اسلام کی دعوت دی تو سب سے پہلے مہاجرین نے اور ان کے بعد ہم (انصار) نے دعوت اسلام پر لبیک کہا ہم لوگ انصار الٰہی اور وزراء رسالت ہیں"

[1] اصابہ فی احوال الصحابہ۔

تقریریں ہوچکیں تو اشعار کی باری آئی، سفارت کی طرف سے تمیم کے مشہور شاعر زبرقان ابن بدر نے قصیدہ پڑھا،

نحن الکرام فلا حی یعادلنا   منا الملوک وفینا تنصب البیع

ہم شرفا کی قوم ہیں کوئی قبیلہ ہمارا ہمسر نہیں ہو سکتا   ہم میں تخت نشیں ہیں اور ہم کلیساؤں کے بانی ہیں

روایتوں میں آیا ہے کہ ایک شخص نے مدینہ میں آکر خطبہ دیا تو اس کی خوبی تقریر نے تمام حاضرین کو حیرت زدہ بنا دیا، اس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ان من البیان لسحرا یعنی بعض بعض تقریروں میں جادو ہوتا ہے، اصابہ فی احوال الصحابہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے زبرقان ہی کی تقریر پر یہ الفاظ ارشاد فرمائے تھے، غرض جب زبرقان تقریر کر چکے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دربار رسالت کے شاعر یعنی حسان بن ثابتؓ کی طرف دیکھا انھوں نے برجستہ کہا،

ان الذوائب من فہر واخوانہم   قد بینوا سنۃ للناس یتبعوا

شرفائے قبیلۂ فہر و برادران فہر نے لوگوں کو   وہ راستہ بتا دیا ہے جس کی وہ پیروی کرتے ہیں

ارکان سفارت میں اقرع بن حابس عرب کا مشہور حکم تھا، یعنی قومی مقدمات کا مرافعہ اس کے پاس جاتا تھا، اور اس کے فیصلوں پر لوگ گردن جھکا دیتے تھے، وہ اسلام لانے سے پہلے مجوسی تھا، اس کا دعویٰ تھا کہ جب سفارت کے ساتھ دربار رسالت میں آیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا[1]:-

ان حمدی لزین وان   میں جس کی تعریف کر دوں وہ چمک جاتا ہے

ذمی لشین   اور جس کو برا کہدوں اسکو داغ لگ جاتا ہے

[1] اصابہ تذکرۂ اقرعؓ بن حابس،

نظم ونثر کی معرکہ آرائی ہو چکی تو سفارت نے اعتراف کیا کہ دربارِ رسالت کے خطیب ور شاعر دونوں ہمارے شاعر اور خطیب سے افضل ہیں، پھر سب نے اسلام قبول کیا،

بنو سعد | بنو سعد نے ضمام بن ثعلبہ کو سفیر بنا کر بھیجا، وہ جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دربار میں آئے اور جس طریقہ سے سفارت ادا کی اس سے عرب کی اصلی سادگی اور آزادروی کا اندازہ ہو سکتا ہے صحیح بخاری میں متعدد موقعوں پر اس کا ذکر ہے کتاب العلم کی روایت حسب ذیل ہے:-

حضرت انس بن مالکؓ کہتے ہیں کہ ہم لوگ دربارِ رسالت میں حاضر تھے، ایک شخص ناقہ پر سوار آیا، اور صحن مسجد میں آکر ناقہ سے اترا، پھر حاضرین سے پوچھا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کس کا نام ہے" لوگوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ "یہ گورے رنگ کے جو تکیہ لگائے بیٹھے ہیں" پاس آکر کہا "اے عبد المطلب کے بیٹے!" آپ نے فرمایا کہ "میں جواب دیچکا" بولا کہ "میں تم سے کچھ باتیں پوچھوں گا لیکن سختی سے پوچھوں گا، اس پر ناراض نہ ہونا!" ارشاد ہوا کہ جو پوچھنا ہو پوچھو" بولا کہ "اپنے خدا کی قسم کھا کر کہو، کیا خدا نے تم کو تمام دنیا کے لئے پیغمبر بنا کر بھیجا" ہے" آپ نے فرمایا، ہاں، پھر قسم دلا کر پوچھا کہ کیا تمکو خدا نے پنج وقتہ نماز کا حکم دیا ہے؟ اسی طرح زکوٰۃ، روزہ، حج کی نسبت پوچھا، اور آپ برابر ہاں فرماتے جاتے تھے، جب سب احکام سُن لئے تو کہا کہ میرا نام ضمام بن ثعلبہ ہے اور مجھ کو میری قوم نے بھیجا ہے میں جاتا ہوں اور جو تم نے بتایا ہے میں اس سے ایک ذرہ نہ زیادہ کروں گا نہ کم"۔ وہ جا چکا تو آپ نے ارشاد فرمایا کہ "اگر یہ سچ کہتا ہے تو اس نے فلاح پائی[1]" ضمام نے واپس جا کر اپنی قوم سے کہا کہ لات و عزی کوئی چیز نہیں "لوگوں نے کہا کیا کہتے ہو

[1] یہ روایت صحیح بخاری میں مختلف ابواب میں منقول ہے،

تم کو جنون یا جذام نہ ہو جائے" انھوں نے کہا خدا کی قسم وہ نہ کچھ فائدہ پہنچا سکتے ہیں نہ ضرر، میں تو خدا اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پر ایمان لاتا ہوں" اُن کی مختصر تقریر کا یہ اثر تھا کہ شام نہیں ہونے پائی تھی کہ قبیلہ کا قبیلہ زن و مرد بچے سب مسلمان تھے،[1]

اشعریین ۷ھ

یمن کا ایک نہایت معزز قبیلہ اشعریین کا تھا، ابو موسیٰ اشعریؓ اسی قبیلہ سے ہیں، ان لوگوں نے جب آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بعثت کی خبر سُنی تو ترپن شخصوں نے مدینہ کی ہجرت کا قصد کیا، اسی قافلہ میں حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ بھی تھے، یہ لوگ جہاز میں سوار ہو کر چلے لیکن ہوائے مخالف نے جہاز کو حبش میں پہنچا دیا، وہاں حضرت جعفر طیارؓ موجود تھے، وہ اپنے ساتھ لیکر عرب کو روانہ ہوئے، اس زمانہ میں خیبر فتح ہو چکا تھا، اور آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) یہیں تشریف فرما تھے، چنانچہ یہیں لوگوں نے شرف باریابی حاصل کیا،

یہ صحیح مسلم (فضائل اشعریین) کی روایت ہے، صحیح بخاری میں ہے کہ جب اشعریوں کا وفد آیا تو آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے صحابہ سے فرمایا کہ تمھارے یہاں یمن کے لوگ آتے ہیں جو نہایت رقیق القلب اور نرم دل ہیں،

مسند احمد بن حنبل میں حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ جب اشاعرہ کا وفد آیا تو یہ لوگ جوشِ مسرت سے یہ رجز پڑھتے تھے،

غداً نلقی الاحبّۃ   محمداً و حزبہ

(کل ہم دوستوں سے ملیں گے   محمدؐ اور پیروانِ محمدؐ سے)

(بارگاہِ نبوت میں پہونچے تو عرض کی یا رسول اللہ! ہم اس لئے حاضر ہوئے ہیں کہ آپ سے

[1] ابن ہشام

مذہب کے کچھ احکام سیکھیں، اور ابتداے کائنات کے کچھ حالات پوچھیں، آپ نے فرمایا "پہلے خدا تھا، اور کچھ نہ تھا، اس کا تخت پانی پر تھا"[1])

دوس سنہ ؁ | دوس عرب کا ایک مشہور قبیلہ ہے حضرت ابو ہریرہؓ اسی قبیلہ سے ہیں، اس قبیلہ کے مشہور شاعر اور رئیس طفیل بن عمرو تھے، وہ ہجرت سے پہلے مکہ گئے، قریش نے اُن کو منع کیا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس نہ جائیں لیکن اتفاقاً ایک دفعہ یہ حرم میں گئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھ رہے تھے، قرآن مجید سُن کر متاثر ہوئے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کی کہ آپ مجھکو اسلام کی حقیقت سمجھائیں، آپنے اسلام کی تبلیغ کی، اور قرآن کی آیتیں سُنائیں، وہ نہایت خلوص سے اسلام لائے، وطن جاکر لوگوں کو اسلام کی دعوت دی لیکن ان کے قبیلہ میں زنا کا بہت رواج تھا، لوگ سمجھے کہ اسلام کے بعد اس آزادی سے محروم ہوجائیں گے اسلیے لوگوں نے تامل کیا، طفیل نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آکر یہ حقیقت بیان کی، آپنے دعا فرمائی کہ "خدایا! دوس کو ہدایت دے"، پھر طفیل سے ارشاد فرمایا کہ جاکر نرمی اور ملاطفت سے لوگوں کو اسلام کی دعوت دو، غرض (دعاے نبوی کی برکت اور) طفیل کی ترغیب اور ہدایت سے لوگوں نے اسلام قبول کیا، اور اسّی خاندان جن میں ابو ہریرہؓ بھی تھے، ہجرت کرکے مدینہ چلے آئے،[2]

بنو حرث بن کعب سنہ ۹ھ | یہ نجران کا ایک نہایت معزز خاندان تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خالدؓ کو انکے پاس دعوتِ اسلام کے لئے بھیجا، یہ لوگ نہایت خلوص کے ساتھ اسلام لائے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن لوگوں کو مدینہ میں بلا بھیجا، چنانچہ قیس بن الحصین و یزید بن عبدالمدان وغیرہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

(1) صحیح بخاری باب بدء الخلق (2) اصابہ اور زاد المعاد و ابن سعد جزء وفود،

کی خدمت میں حاضر ہوئے، چونکہ اکثر معرکوں میں قبائل عرب پر غالب رہے تھے، آپ نے اُن سے پوچھا کہ تمہارے غلبہ کے اسباب کیا تھے، بولے ہم ہمیشہ متفق ہو کر لڑتے تھے، اور کسی پر ظلم نہیں کرتے تھے، آپ نے قیس کو اُن کا رئیس مقرر کیا[۱]،

قبیلہ طے ۹؁ھ | یمن میں طے نہایت نامور قبیلہ تھا، اس قبیلہ کے رؤسا زید الخیل و عدی ابن حاتم طائی تھے، اور اُن کے حدود حکومت الگ تھے،

زید زمانۂ جاہلیت کے مشہور شاعر، خطیب، خوش جمال، فیاض، بہادر تھے، ۹؁ھ میں یہ چند معزز اشخاص کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے آپ نے اُن کو اسلام کی دعوت دی، انھوں نے مع اپنے ساتھیوں کے نہایت صدق دل سے اسلام قبول کیا، شہسواری کی وجہ سے یہ زید الخیل کے لقب سے مشہور تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس لقب کو زید الخیر سے بدل دیا[۲]،

عدی بن حاتم ۹؁ھ | عدی مشہور حاتم طائی کے بیٹے اور قبیلۂ طے کے سردار اور مذہباً عیسائی تھے، سلاطین عرب کی طرح اُن کو بھی آمدنی کا چوتھا حصہ ملتا تھا، جس زمانہ میں اسلامی فوجیں یمن گئیں، یہ بھاگ کر شام چلے گئے، اُن کی بہن گرفتار ہو کر مدینہ میں آئیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کو بڑی عزت حرمت سے رخصت کیا، وہ اپنے بھائی کے پاس گئیں اور کہا کہ جس قدر جلد ہو سکے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو، وہ پیغمبر ہوں یا بادشاہ ہر حال میں انکے پاس جانا مفید ہے، غرض عدی مدینہ آئے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں تھے، عدی نے مسجد میں جا کر سلام کیا، آپ نے جواب سلام کے بعد نام پوچھا، پھر ان کو لیکر گھر کی طرف چلے، اسی اثنا میں ایک بڑھیا آگئی، اُس نے

[۱] اصابہ و زاد المعاد [۲] ایضاً،

آپ کو روک لیا اور دیر تک آپ سے کسی کام کے متعلق باتیں کرتی رہی، عدی خود رئیس تھے، شام میں میں رومیون کا دربار دیکھا تھا اُن کو حیرت ہوئی کہ شہنشاہ عرب ایک بڑھیا کے ساتھ اس مساوات سے پیش آتا ہے اسی وقت ان کو خیال ہوا کہ یہ شخص بادشاہ نہیں ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم گھر میں تشریف لائے، چمڑے کا ایک گدا تھا، اس کو عدی کی طرف بڑھایا، یا اصرار کے بعد اس پر بیٹھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، کیوں عدی! تم اپنی قوم سے مرباع لیتے تھے لیکن یہ تو تمہارے مذہب (نصرانیت) میں جائز نہیں ہے"[1]

پھر فرمایا کہ خدا کے سوا کوئی اور خدا ہے؟ بولے نہیں، پھر پوچھا کہ خدا سے کوئی بڑا ہے؟ بولے کہ نہیں، آپنے فرمایا کہ یہودیوں پر خدا کا غضب نازل ہوا ہے، اور عیسائی گمراہ ہوگئے ہیں"[2]

غرض عدی نے اسلام قبول کیا، اور اس قدر ثابت قدم رہے کہ ردّہ کے زمانہ میں بھی ان پر کچھ اثر نہیں پڑا،

باپ کی سخاوت کا اثر اُن پر بھی تھا، ایک دفعہ ایک شخص نے اُن سے سو روپیئے طلب کئے بولے کہ تم حاتم کے بیٹے سے اس قدر حقیر رقم مانگتے ہو، بخدا ہرگز نہ دوں گا،[3]

وفد ثقیف (یاد ہوگا) جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم طائف کا محاصرہ چھوڑ کر روانہ ہونے لگے تو صحابہ نے عرض کی تھی کہ آپ اُن کے حق میں بد دعا فرمائیں، آپنے جن لفظوں میں دعا فرمائی تھی یہ تھی:-

اللّٰھم اھد ثقیفا وائت بھم — اے خدا ثقیف کو ہدایت دے اور ان کو میرے پاس بھیج

(یہ دعائے نبوی کا اعجاز تھا کہ وہ قبیلہ جو تلوار سے زیر نہ ہو سکا تھا، دفعۃً جلالِ نبوت نے اسکی گردن آستانۂ اسلام پر جھکا دی، اور پورا قبیلہ مسلمان ہوگیا،)

۱؎ ابن ہشام اسلام عدی بن حاتم ۲؎ مسند امام احمد حدیث عدی، ترمذی تفسیر فاتحہ ۳؎ اصابہ فی احوال الصحابہ ذکر عدی،

طائف دو رئیسوں کے قبضہ میں تھا جن میں ایک عروہ بن مسعود تھے، جن کی نسبت کفارِ مکہ کہا کرتے تھے کہ کلام الٰہی اترتا تو ان پر اترتا، عروہ اگرچہ اب تک اسلام نہیں لائے تھے لیکن مادہ قابل رکھتے تھے، حدیبیہ کی صلح بھی انہی کی سفارت سے انجام پائی تھی، آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) جب طائف سے واپس چلے تو خدا نے اُن کو اسلام کی توفیق دی آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) مدینہ نہیں پہنچے پائے تھے کہ وہ خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئے، اور اسلام لاکر واپس گئے، واپس جاکر انھوں نے اسلام کا اظہار کیا اور لوگوں کو اسلام کی ترغیب دی، لوگوں نے اُن کو بہت برا بھلا کہا، صبح کو جب اپنے بالاخانہ پر اذان دی تو ہر طرف سے تیروں کا مینھ برسا، یہانتک کہ وہ شہید ہوگئے، مرتے وقت وصیت کی کہ محاصرۂ طائف میں جو مسلمان شہید ہوچکے ہیں، ان ہی کے پہلو میں دفن کئے جائیں،

(عروہ کا خون رائگان نہیں جاسکتا تھا صخر بن عیلہ رئیس احمس یہ سُن کر کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) طائف کا محاصرہ کئے ہوئے ہیں، کچھ سوار لیکر چل کھڑا ہوا تھا، اتفاق سے اُس وقت پہنچا جب آپ طائف چھوڑکر مدینہ کی طرف مراجعت فرما چکے تھے، صخر نے عہد کیا کہ جب تک اہلِ طائف آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اطاعت نہ قبول کرلیں گے، میں قلعہ کا محاصرہ نہ چھوڑوں گا، آخر اہلِ طائف نے اطاعت قبول کرلی صخر نے خدمتِ نبوی میں اطلاع کی تو آپ نے مسجد نبوی میں تمام لوگوں کو جمع کیا اور احمس کے لئے دس بار دعا فرمائی[1]) چند روز کے بعد اہلِ طائف نے باہم مشورہ کیا کہ تمام عرب اسلام لاچکا اب ہم اکیلے کیا کرسکتے ہیں، غرض یہ رائے قرار پائی کہ چند سفیر مقرر کرکے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی خدمت میں بھیجے جائیں،

---

[1] (ابوداؤد باب اقطاع الارضین)

اُن کی سفارت نے مدینہ کا رُخ کیا تو مسلمانوں کو اس قدر مسرت ہوئی کہ سب سے پہلے مغیرہ ابن شعبہ دوڑے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جا کر خبر کریں، راہ میں حضرت ابوبکرؓ مل گئے، اُن کو معلوم ہوا تو مغیرہ کو قسم دلائی کہ یہ خوشخبری مجھ کو پہنچانے دو،

مغیرہ نے ان لوگوں کو تعلیم دی کہ دربار رسالت میں جانا تو اس طریقہ سے سلام عرض کرنا لیکن یہ لوگ اسی قدیم دستور کے موافق آداب بجالائے،

عبد یالیل طائف کا مشہور رئیس امیر الوفد تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو (حالانکہ اب تک وہ کافر تھا) مسجد نبوی میں اُتارا (کہ مسلمانوں کی محویت و استغراق کو دیکھ کر متاثر ہو)[1] یہ لوگ صحن مسجد میں خیمے نصب کرا کر ٹھہرائے گئے، نماز اور خطبہ کے وقت یہ لوگ موجود رہتے تھے، گو خود شریک نہیں ہوتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول تھا کہ خطبہ میں اپنا نام نہیں لیتے تھے، ان لوگوں نے آپس میں تذکرہ کیا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہم سے تو اپنی پیغمبری کا اقرار لیتے ہیں لیکن خطبہ میں خود اپنی پیغمبری کا اقرار نہیں کرتے، آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے سُنا تو فرمایا کہ "میں سب سے پہلے شہادت دیتا ہوں کہ میں فرستادہ الٰہی ہوں"،

جماعت سفراء میں عثمان بن ابی العاص سب سے کم عمر تھے، سفراء دربار نبوی میں آتے تو اُن کو بچہ سمجھ کر قیام گاہ میں چھوڑ آتے، عثمان گو کمسن تھے لیکن سب سے زیادہ تیز فہم اور مائل تحقیق تھے، اُن کا معمول تھا کہ جب سفراء دن کو قیلولہ کرتے تو یہ چپکے سے، آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی خدمت میں حاضر ہوتے، اور قرآن مجید اور مسائل اسلام سیکھتے یہانتک کہ اکثر ضروری مسائل سیکھ لئے

---

[1] ابوداؤد، باب ماجاء فی خبر الطائف،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ ان لوگوں کو اسلام کی تبلیغ کرتے، (نماز عشاء کے بعد ان کے پاس تشریف لیجاتے، اور کھڑے کھڑے اُن سے باتیں کرتے، زیادہ تر مکہ میں قریش کے ہاتھ سے جو اذیتیں اٹھائی تھیں، اُن کو بیان فرماتے، مدینہ میں جو لڑائیاں پیش آئیں اُن کا بھی تذکرہ فرماتے) بالآخر اُن لوگوں نے اسلام پر آمادگی ظاہر کی لیکن یہ شرطیں پیش کیں،

۱۔ زنا ہمارے لئے جائز رکھا جائے، کیونکہ ہم میں سے اکثر مجرد رہتے ہیں اور اس لئے ان کو اس سے چارہ نہیں،

۲۔ ہماری قوم کا تمام کاروبار اور ذریعۂ معاش سود ہے، اس لئے سود خواری جائز رکھی جائے،

۳۔ شراب نہ روکا جائے، ہمارے شہر میں کثرت سے انگور پیدا ہوتا ہے اور یہ ہماری بڑی تجارت ہے،

لیکن یہ تینوں درخواستیں نامنظور ہوئیں، بالآخر اُن لوگوں نے کہا اچھا ہم یہ شرطیں واپس لیتے ہیں لیکن ہمارے معبود (طائف کا سب سے بڑا بت جس کا نام لات تھا) کی نسبت کیا ارشاد ہے؟ آپنے فرمایا کہ وہ توڑ دیا جائیگا، یہ سُن کر اُن کو سخت حیرت ہوئی، کہ کیا کوئی شخص اُن کے خدائے اعظم کو ہاتھ بھی لگا سکتا ہے! بولے کہ اگر ہمارے معبود کو معلوم ہو جائیگا کہ آپ کا یہ ارادہ ہے تو وہ تمام شہر کو تباہ کر دے گا، حضرت عمرؓ سے ضبط نہ ہو سکا، بولے کہ تم لوگ کس قدر جاہل ہو، مناۃ صرف ایک پتھر ہے، اُن لوگوں نے کہا عمر! ہم تمہارے پاس نہیں آئے، یہ کہہ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کی کہ ہم مناۃ کو ہاتھ نہیں لگا سکتے آپ جو چاہیں کریں لیکن

(۱؎ ابوداود باب تحزیب القرآن)

ہم کو اس جرأت سے معاف رکھا جائے، آپ نے یہ درخواست منظور کر لی۔[1]

ان لوگوں نے نماز، زکوٰۃ اور جہاد سے مستثنیٰ ہونے کی بھی درخواست کی، نماز سے معافی تو کسی حالت میں ممکن نہ تھی، وہ ہر روز پانچ دفعہ ادا کرنے کی چیز ہے لیکن زکوٰۃ سال بھر کے بعد واجب ہوتی ہے، اور جہاد فرض کفایہ ہے، ہر شخص پر واجب نہیں، اور واجب بھی ہو تو اس کے خاص مواقع ہیں، روز کا کام نہیں، اس بنا پر اس وقت ان دونوں باتوں پر ان کو مجبور نہیں کیا گیا، کیونکہ یہ معلوم تھا کہ جب وہ اسلام قبول کر لیں گے، تو رفتہ رفتہ خود ان میں صلاحیت آجائے گی، حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ میں نے اس واقعہ کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے سنا کہ جب یہ ایمان لاچکیں گے تو زکوٰۃ بھی دینے لگیں گے، اور جہاد بھی کریں گے،[2] (چنانچہ دو ہی برس کے بعد حجۃ الوداع کا موقع آیا تو کوئی ثقفی ایسا نہ تھا جس نے اسلام نہ قبول کر لیا ہو)[3]

سفارت جب واپس چلی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوسفیان اور مغیرہ بن شعبہ کو بھیجا کہ شرط کے موافق طائف کے صنم اعظم (لات) کو جا کر توڑ آئیں۔ مغیرہ نے طائف پہنچکر بتکدہ کو ڈھانا چاہا تو مستورات روتی ہوئی ننگے سر گھروں سے نکل آئیں، اور یہ اشعار پڑھتی جاتی تھیں[4]

الا ابکین دفاع	(لوگوں پر روو کہ پست ہمتوں نے
اسلمها الرضاع	اپنے بتوں کو دشمنوں کے سپرد
لم یحسنوا المصاع	کر دیا، اور معرکہ آرائی نہ کر سکے)

---

[1] زاد المعاد، بحوالہ مغازی موسیٰ بن عقبہ [2] ابوداؤد کتاب الخراج والامارۃ باب ما جاء فی خبر الطائف، [3] اصابہ ترجمہ جبیر بن حیہ ثقفی [4] تاریخ طبری،

عربوں میں کثیر الازواجی کی عام عادت تھی، قبیلۂ ثقیف کے ایک نامور سردار غیلان بن سلمہ کے دس بیویاں تھیں، جب وہ مسلمان ہوا تو احکامِ اسلام کے مطابق چار کے سوا تمام بیویوں سے اس کو مفارقت کرنی پڑی[۱]

وفدِ نجران ۹ھ نجران مکہ معظمہ سے یمن کی طرف سات منزل پر ایک وسیع ضلع کا نام ہے، جہاں عیسائی عرب آباد تھے، یہاں عیسائیوں کا ایک عظیم الشان کلیسا تھا، جس کو وہ کعبہ کہتے تھے اور حرم کعبہ کا جواب سمجھتے تھے، اس میں بڑے بڑے مذہبی پیشوا رہتے تھے، جن کا لقب سید اور عاقب تھا، عرب میں عیسائیوں کا کوئی مذہبی مرکز اس کا ہمسر نہ تھا، اعشیٰ اسی کی شان میں کہتا ہے،

وکعبۃ نجران حتم علیک ۔۔۔ حتی تناخی با بوا بھا

تزور یزید ا وعبد المسیح ۔۔۔ وقیسا ھم خیرا ربابھا

یہ کعبہ تین سو کھالوں سے گنبد کی شکل میں بنایا گیا تھا، جو شخص اس کے حدود میں آجاتا تھا، وہ مامون ہوجاتا تھا، اس کعبہ کے اوقاف کی آمدنی دو لاکھ سالانہ تھی،[۲]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو دعوتِ اسلام کا خط لکھا تو اس کعبہ کے محافظ اور ائمۂ مذہب ساٹھ آدمیوں کے ساتھ مدینہ میں آئے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو مسجد میں اتارا، تھوڑی دیر کے بعد نماز کا وقت آیا تو ان لوگوں نے نماز پڑھنی چاہی، صحابہ نے روکا، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ پڑھنے دو، چنانچہ ان لوگوں نے مشرق کی طرف منہ کرکے نماز ادا کی، ابوحارثہ جو لارڈ بشپ تھا، نہایت محترم اور فاضل شخص تھا، قیصر روم نے اسکو یہ منصب عطا کیا تھا، اور اس کیلئے گرجے

[۱] جامع ترمذی وابو داؤد کتاب النکاح، [۲] یہ تمام تفصیل معجم البلدان میں ہے، پہلا فقرہ فتح الباری سے ماخوذ ہے جہاں وفد نجران کا ذکر ہے

اور معبد بنوائے تھے، [1]

ان لوگوں نے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) سے مختلف مسائل پوچھے، اور آپ نے وحی کی رُو سے اُن کا جواب دیا،

اُن کے زمانۂ قیام میں سورۂ آل عمران کی ابتدا کی اسّی آیتیں اتریں، اُن آیتوں میں اُن کے سوالات کا جواب تھا، جس آیت میں دعوتِ اسلام کی تشریح تھی، وہ یہ ہے،

قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا إِلَىٰ كَلِمَةٍ	کہدے کہ اے اہل کتاب! ؤ ایک ایسی بات کو
سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَلَّا نَعْبُدَ إِلَّا	مان لیں جو ہم تم دونوں میں مشترک ہو، وہ یہ
اللَّهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهِ شَيْئًا وَلَا يَتَّخِذَ	ہم خدا کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں، اور
بَعْضُنَا بَعْضًا أَرْبَابًا مِنْ دُونِ اللَّهِ	کسی کو خدا کا شریک نہ بنائیں، اور ہم میں
فَإِنْ تَوَلَّوْا فَقُولُوا اشْهَدُوا	کوئی کسی کو خدا کے سوا رب نہ قرار دے، پھر
بِأَنَّا مُسْلِمُونَ (آل عمران)	اگر یہ لوگ نہ مانیں تو کہدو کہ تم گواہ رہو

آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے جب ان کو اسلام کی دعوت دی تو ان لوگوں نے کہا ہم تو پہلے سے مسلمان ہیں، آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا کہ جب تک تم صلیب پوجتے ہو، عیسیٰؑ کو خدا کا بیٹا کہتے ہو کیونکر مسلمان ہو سکتے ہو؟ جب یہ لوگ اس پر راضی نہ ہوئے تو آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے وحی کے مطابق اُن سے کہدیا کہ اچھا مباہلہ کرو، یعنی ہم تم دونوں اپنے اہل وعیال کو لے کر آئیں اور دعا کریں کہ جو شخص جھوٹا ہو اس پر خدا کی لعنت ہو،

---

[1] زاد المعاد ابن قیم،

فَمَنْ حَاجَّكَ فِيْهِ مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَكَ	تو جو شخص تجھ سے علم آئے پیچھے جھگڑا کرتا ہی اس سے
مِنَ الْعِلْمِ فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ اَبْنَآءَنَا وَ	کہدو کہ آؤ اپنی اولاد اور اپنی عورتوں کو اور
اَبْنَآءَكُمْ وَنِسَآءَنَا وَنِسَآءَكُمْ وَاَنْفُسَنَا	خود اپنے آپ کو بلائیں، پھر مباہلہ کریں اور
وَاَنْفُسَكُمْ ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَّعْنَتَ اللّٰهِ	خدا سے دعا کریں کہ ہم میں سے جو جھوٹا ہو اس
عَلَى الْكَاذِبِيْنَ ، (اٰلِ عمران)	پر خدا کی لعنت ہو،

لیکن جب آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) حضرت فاطمہ زہرا، اور امام حسن وحسین علیہما السلام کو لے کر مباہلہ کے لئے نکلے تو خود اُن کی جماعت میں سے ایک شخص نے رائے دی کہ مباہلہ نہیں کرنا چاہئے، اگر یہ شخص واقعی پیغمبر ہے تو ہم لوگ ہمیشہ کے لئے تباہ ہو جائیں گے، غرض ان لوگوں نے کچھ سالانہ خراج قبول کر کے صلح کرلی،

بنو اسد ۹ھ یہ وہ قبیلہ ہے جو لڑائیوں میں قریش کا دست وبازو تھا، طلیحہ بن خویلد جس نے حضرت ابوبکرؓ کے زمانہ میں نبوت کا دعویٰ تھا، اسی قبیلہ سے تھا، ۹ھ میں یہ لوگ بھی اسلام لائے اور سفارت بھیجی لیکن اب تک اُن کے دماغ میں فخر کا نشہ باقی تھا، سفراء دربار رسالت میں آئے تو احسان کے لہجہ میں کہا کہ آپنے ہمارے پاس کوئی مہم نہیں بھیجی، بلکہ ہم نے خود اسلام قبول کیا، اس پر یہ آیت نازل ہوئی،

يَمُنُّوْنَ عَلَيْكَ اَنْ اَسْلَمُوْا قُلْ لَّا تَمُنُّوْا	یہ لوگ تم پر احسان رکھتے ہیں کہ ہم اسلام لائے
عَلَيَّ اِسْلَامَكُمْ بَلِ اللّٰهُ يَمُنُّ عَلَيْكُمْ اَنْ هَدٰىكُمْ	کہدو کہ مجھ پر اپنے اسلام کا احسان نہ رکھو بلکہ
لِلْاِيْمَانِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (سورۂ حجرات)	خدا تم پر احسان رکھتا ہی، کہ تم کو ایمان لائے

بنو فزارہ ۹ھ یہ نہایت سرکش اور زور آور قبیلہ تھا، عیینہ بن حصن اسی قبیلہ سے تھے، اس قبیلہ نے رمضان ۹ھ میں جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تبوک سے واپس تشریف لائے اپنا وفد بھیجا اور اسلام قبول کیا[1]،

کندہ ۱۰ھ یہ حضر موت (یمن) کے اضلاع میں سے ایک شہر تھا، یہاں کندی خاندان کی سلطنت تھی، اس زمانہ میں اس خاندان کے حاکم اشعث بن قیس تھے، یہ ۱۰ھ میں اسی سواروں کے ساتھ بڑی شان وشوکت سے، حیرہ کی چادریں جن کے سنجاف حریر کے تھے، کاندھوں پر ڈالے بارگاہ نبوی میں حاضر ہوئے، یہ پہلے اسلام قبول کر چکے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کو دیکھکر فرمایا، کیا تم اسلام نہیں لا چکے ہو؟ بولے "ہاں" آپ نے فرمایا کہ "پھر یہ حریر کیسا"؟ ان لوگوں نے فوراً چادریں پھاڑ کر زمین پر ڈال دیں[2]"،

حضرت ابوبکرؓ نے اپنے زمانۂ خلافت میں اپنی بہن ام فردہ سے ان کی شادی کر دی تھی، نکاح ہو چکا تو فوراً اٹھ کر اونٹوں کے بازار میں پہونچے اور جو اونٹ سامنے آیا تلوار سے اُن کی کوچیں اڑا دیں، تھوڑی دیر میں بیسیوں اونٹ زمین پر پڑے تھے، لوگوں کو حیرت ہوئی انھوں نے کہا میں اپنی دار الریاست میں ہوتا تو اور ہی سر و سامان ہوتا، یہ کہکر اونٹوں کے دام دیدیئے، اور لوگوں سے کہا یہ آپ کی دعوت ہے[3]،

یہ جنگ قادسیہ و یرموک میں شریک تھے، اور صفین میں حضرت علیؓ کے ساتھ تھے،

عبد القیس یہ قبیلہ جیسا کہ اوپر گذر چکا، بحرین کا باشندہ تھا، یہاں اسلام کا اثر بہت پہلے پہنچ چکا تھا، سب

[1] زرقانی، [2] ابن ہشام وفد کندہ، [3] اصابہ،

پہلے اس قبیلہ کے تیرہ آدمی ۵ھ میں یا اس سے آگے پیچھے زمانہ میں خدمت نبویؐ میں حاضر ہوئے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا تم کون لوگ ہو؟ عرض کی یا رسول اللہ! ہم خاندان ربیعہ سے ہیں، فرمایا "مرحبا لا خزایا ولا ندامی" پھر ان لوگوں نے عرض کیا، یا رسول اللہ! ہمارا ملک بہت دور ہے (بحرین) اور بیچ میں کفار مضر کی آبادیاں ہیں، ہم اشہر حرم کے سوا اور مہینوں میں نہیں آسکتے، چند ایسی باتیں تلقین فرمائیے، جن پر ہمیشہ عمل کریں، اور اپنے اہل وطن کو بھی ان کی تعلیم دیں! ارشاد ہوا کہ میں تم کو چار باتوں کا حکم دیتا ہوں، خدا کو ایک جانو، نماز پڑھو، روزہ رکھو اور خمس دو، اور چار چیزوں سے منع کرتا ہوں، دبا، حنتم، نقیر، مزفت،

دُبا، حنتم، نقیر، مزفت، یہ عرب میں چار قسم کے برتن ہوتے تھے، جن میں رکھ کر شراب بنائی جاتی تھی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت شریف یہ جاری تھی کہ جس قبیلہ میں جو مخصوص عیوب ہوتے تھے، اُن کے پند و موعظت میں انہی کا خصوصیت کے ساتھ ذکر فرماتے تھے، لوگوں کو تعجب تھا کہ حضورؐ نے ان ظروف کا کیوں مخصوص طور سے ذکر فرمایا، چنانچہ انھوں نے پوچھا کہ "یا رسول اللہ! نقیر کے متعلق آپ کو کیا معلوم ہے"؟ ارشاد فرمایا "ہاں کھجور کی موٹی لکڑی کو اندر سے کھود کے تم اس میں پانی ڈالتے ہو، جب اُبال کم ہو جاتا ہے، تو اس کو پی کر اپنے بھائیوں پر تلوار چلاتے ہو" اتفاق یہ کہ وفد میں ایک صاحب ایسے تھے جن پر یہی واقعہ گذرا تھا، اُن کی پیشانی پر تلوار کا داغ بھی تھا، اس کو وہ شرم سے چھپائے تھے[1]

بعض روایتوں میں ہے کہ عبدالقیس نے خود پوچھا کہ یا رسول اللہ! ہم کو کیا پینا چاہیے[2]

---

[1] صحیح بخاری وصحیح مسلم باب الایمان [2] صحیح مسلم باب الایمان،

اس کے جواب میں آپنے ان چار چیزوں کا ذکر فرمایا،[۱]

بنو عامر ۹ھ

(بنو عامر کا قبیلہ عرب کے مشہور قبیلہ قیس عیلان کی شاخ تھا، بنو عامر میں اس وقت تین رئیس تھے، عامر بن طفیل اربد بن قیس اور جبار بن سلمی، عامر اور اربد صرف حصول جاہ کے خواہاں تھے، یہ عامر وہی شخص تھا جو اس سے پہلے متعدد فتنوں کا باعث ہو چکا تھا، اور اس وقت بھی شر کی نیت سے آیا تھا، جبار اور قبیلہ کے عام لوگ خلوصِ قلب سے صداقت کے طالب تھے،

عامر مدینہ پہونچکر خاندانِ سلول کی ایک خاتون کا مہمان ہوا، جبار اور مشہور صحابی کعبؓ بن مالک میں پہلے کے مراسم تھے، اس لئے وہ تیرہ آدمیوں کے ساتھ ان ہی کے گھر مہمان اترے، اور اسی تقریب سے کعبؓ ان کو لیکر خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئے، بنو عامر نے سلسلۂ کلام میں آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) سے خطاب کرکے کہا، "انت سیدنا" حضور ہمارے آقا ہیں، آپنے فرمایا السید اللہ آقا خدا ہی، انھوں نے پھر عرض کی، حضور ہم میں سب سے افضل اور سب سے بڑھکر فیاض ہیں ارشاد ہو بات بولو تو اس کا لحاظ رہے کہ شیطان تم کو ہنکا نہ لیجائے یعنی یہ تکلف در تملق بھی ایک قسم کا جھوٹ ہے،[۲]

عامر بن طفیل نے کہا "محمد، تین باتیں ہیں، اہل بادیہ پر تم حکومت کرو، اور شہر میرے قبضہ میں

---

[۱] مسلم اور دیگر کتب صحاح میں عبد القیس کے اسی وفد کا ذکر ہی، ابن مندہ و دولابی وغیرہ نے اسی قبیلہ کے ایک وفد کا ذکر کیا ہی جس میں ۴۰ آدمی شریک تھے، اس بنا پر علامہ قسطلانی نے اسی قبیلہ کے دو وفد قرار دئیے ہیں، پہلا تقریباً ۵ھ میں اور دوسرا سنہ ۸ھ میں، حافظ ابن حجر نے کتاب المغازی میں بعینہٖ یہی تحقیق کی ہی لیکن کتاب الایمان کی شرح میں دونوں روایتوں کو ایک ثابت کرنے کی کوشش کی ہی، [۲] اضافہ [۳] مشکوٰۃ باب المفاخرہ بحوالہ ابو داؤد

ہوں، اگر یہ نہیں تو اپنے بعد مجھے اپنا جانشین بنا جاؤ، اگر یہ بھی منظور نہ ہو تو میں غطفان کو لیکر چڑھ آؤں گا"۔ عامر نے اربد کو یہ سمجھا دیا تھا کہ میں ادھر محمد کو باتوں میں لگا دوں گا، اُدھر تم اُن کا کام تمام کر دینا، اب عامر نے جو دیکھا تو اربد میں جنبش تک نہ تھی، نبوت کے غیر مرئی جاہ و جلال نے اسکی آنکھیں خیرہ کر دی تھیں، دونوں اُٹھ کر چلے آئے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، "خدایا اُن کے شر سے بچانا"، عامر کو طاعون ہو گیا، عرب میں صاحبِ فراش ہونا شرم کی بات تھی، عامر نے کہا مجھے گھوڑے پر بٹھا دو، گھوڑے پر بٹھا دیا گیا، اور اسی پر اُس نے دم توڑا،

جبار اور عامر اشخاص ایمان کی دولت سے مالا مال ہو کر دارالاسلام سے واپس آئے[1]

حمیر وغیرہ کی سفارت | حمیر میں مستقل سلطنت نہیں رہی تھی، سلاطین حمیر کی اولاد نے چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم کر لی تھیں، اور برائے نام بادشاہ کہلاتے تھے، عربی میں اُن کا لقب قیل تھا، یہ لوگ خود نہیں آئے لیکن قاصد بھیجے کہ ہم نے اسلام قبول کر لیا ہے،

اسی زمانہ میں بہرا، بنو بکا، وغیرہ کی سفارتیں بھی آئیں،

---

[1] عام واقعات ابن اسحاق و زرقانی سے ماخوذ ہیں، عامر کی تقریر اور اسکی موت کا واقعہ صحیح بخاری میں مذکور ہے)

تاسیس حکومت الٰہی

استخلاف فی الارض

لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ

[1](تیرہ و تار راتوں کے بعد سپیدۂ صبح نمودار ہوتا ہے، گھنگھور گھٹائیں جب چھٹ جاتی ہیں، تو خورشید تاباں ضیا گستری کرتا ہے، دنیا گنہگاریوں اور ظلم وستم کی تاریکیوں سے گھری ہوئی تھی کہ دفعۃً صبحِ سعادت نے ظہور کیا، اور حق وصداقت کا آفتاب پرتو افگن ہوا، عرب جس طرح ایک خدا کو پوجنے لگا تھا، اب وہ صرف ایک ہی حکومت کے ماتحت تھا،

خدائے پاک نے وعدہ فرمایا تھا،

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِينَهُمُ الَّذِي ارْتَضَىٰ لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ أَمْنًا يَعْبُدُونَنِي لَا يُشْرِكُونَ بِي شَيْئًا۔ (نور)

خدا نے تم میں سے ایمانداروں اور نیکوکاروں سے وعدہ کیا ہے کہ ان کو بے شبہ زمین میں اپنی خلافت اسی طرح عطا کریگا جس طرح کہ گذشتہ امتوں کو اس نے اپنی خلافت عطا کی تھی، اور اُن کے اس مذہب کو جس کو اس نے اُن کیلئے پسند کیا ہے یقیناً قوت بخشے گا اور اُن کی بے امنی کو امن سے بدل دیگا [illegible]

[1] یہ پورا باب اضافہ ہے، "س"

حکومتِ الٰہی و استخلاف فی الارض نبوت کے ضروری لوازم نہیں لیکن جب دعوتِ الٰہی سیاستِ ملکی کی دیواروں سے آکر ٹکراتی ہے، یا جب اصلاحات کا دامن ملک کی بدامنی و انتشارِ حال کے کانٹوں میں اُلجھ جاتا ہے تو پیغمبر ابراہیم[۱] اور موسیٰ کے قالب میں آگے بڑھتا ہے اور قوم و ملک کو نمارده و فراعنہ کی غلامی سے آزادی دلاتا ہے، پیغمبروں میں عیسیٰ اور یحییٰ بھی گذرے ہیں جن کو حکومت کا کوئی حصہ نہیں ملا تھا، اور موسیٰ اور داؤد و سلیمان بھی جو قوموں اور ملکوں کی قسمت کے مالک تھے لیکن محمد رسول اللہ عیسیٰ و یحییٰ بھی تھے، اور موسیٰ و داؤد بھی، عرب کے خزانے دستِ تصرف میں تھے لیکن کاشانۂ نبوت میں نہ کوئی نرم بستر تھا، نہ غذائے لطیف، نہ جسم مبارک پر خلعتِ شاہانہ تھا، نہ جیبِ آستین میں درہم و دینار، عین اُس وقت جب اس پر کسریٰ و قیصر کا دھوکا ہوتا تھا، وہ گلیم پوش، مکہ کا یتیم اور آسمان کا معصوم فرشتہ نظر آتا تھا،

اسلام کی حکومت کی غرض و غایت جس کو خدا نے خود اپنے الفاظ میں ظاہر فرمایا ہے یہ تھی،

اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّھُمْ ظُلِمُوْا	مسلمان جن سے (بلا سبب) جنگ کیجاتی ہے اب اُنکو بھی
وَاِنَّ اللّٰہَ عَلٰی نَصْرِھِمْ لَقَدِیْرُ الَّذِیْنَ	جنگ کی اجازت دیگئی کہ وہ مظلوم ہیں، اور خدا
اُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِھِمْ بِغَیْرِ حَقٍّ اِلَّآ اَنْ	اُن کی مدد پر قادر ہے، وہ جو ناحق اپنے گھروں سے نکالدیے گئے
یَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰہِ	سوا اسکے اُن کا اور کوئی قصور نہ تھا کہ وہ یہ کہتے تھے کہ
النَّاسَ بَعْضَھُمْ بِبَعْضٍ لَّھُدِّمَتْ	ہمارا پروردگار ہی ہمارا خدا ہے، اگر دنیا میں ایک قوم
صَوَامِعُ وَبِیَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ یُذْکَرُ	کو دوسری قوم سے بچایا نہ جاتا تو بہت سی خانقاہیں

[۱] حضرت ابراہیم اپنے قبیلہ کے شیخ تھے، چار سو غلاموں کی فوج ساتھ رہتی تھی، شام و اطراف بابل کے کئی بادشاہوں سے ان کو لڑنا پڑا، اور خدا نے اُن سے وعدہ کیا کہ ان کی اولاد کو ارضِ مقدس کی حکومت عطا کریگا، (توراۃ سفر تکوین)،

فِيهَا اسْمُ اللَّهِ كَثِيرًا ۗ وَلَيَنصُرَنَّ اللَّهُ مَن يَنصُرُهُ ۗ إِنَّ اللَّهَ لَقَوِيٌّ عَزِيزٌ ۝ الَّذِينَ إِن مَّكَّنَّاهُمْ فِي الْأَرْضِ أَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ وَأَمَرُوا بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنكَرِ ۗ وَلِلَّهِ عَاقِبَةُ الْأُمُورِ (سورۃ الحج)

(پ ۱۷ ع ۱۰)

کلیسے عبادتگاہیں، مسجدیں جنمیں اکثر خدا کا نام لیا جاتا ہو برباد کردیجائیں جو خدا کی مدد کرتا ہو خدا اسکی مدد کرتا ہو خدا طاقت ور اور غالب ہو مسلمان وہ ہیں جنکو اگر خدا زمین میں قوت عطا کرے تو عبادت الٰہی کریں مستحقین کی مالی اعانت کریں (زکوٰۃ) لوگوں کو نیکیوں کی تاکید کریں، برائیوں سے روکیں، انجام کار

ان آیتوں میں بالاجمال یہ بتایا گیا ہو کہ اسلام میں غزوات کی ابتدا کیوں اور کیونکر ہوئی؟ اسلام کی حکومت کے کیا اغراض و مقاصد تھے، اور استخلاف فی الارض کے کیا فرائض ہیں؟ اور دنیا کی عام حکومتوں سے وہ کن امور میں ممتاز ہو؟ ان مباحث کا اصولی اور مفصل بیان کتاب کے دوسرے حصوں میں آئیگا، یہاں عرب کے نظم و نسق کے متعلق عام اور جزئی باتیں بیان کرنی منظور ہیں،

صفحات بالا سے معلوم ہوچکا ہو کہ اب تمام عرب میں امن و امان قائم ہو، سیاسی مشکلات کا خاتمہ ہوچکا ہو، ملک کے ہر گوشہ میں دعاۃ اسلام پھیلے ہوئے ہیں، قبائل دور دراز صوبوں سے بارگاہ نبوت کا رخ کر رہے ہیں، فتح مکہ اسلام کی شہنشاہی کا پہلا دن تھا، جو رمضان ۸ھ کا واقعہ ہو، اسی کے بعد آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے قبائل میں محصلین زکوٰۃ کا تقرر فرمایا، لیکن اصل خلافت الٰہی کے تمام اجزاء اواخر ۱۰ھ میں زمانہ حجۃ الوداع کے قریب تکمیل پائے،

یورپ کی نا آشنا نگاہ میں اگرچہ آپ کی زندگی کا یہ دور جدید ایشیائی شاہانہ زندگی کا ایک طرب انگیز منظر تھا لیکن آشنایان حقیقت کو شہنشاہ عرب پھٹے پرانے کپڑوں میں مدینہ کی گلیوں

کے اندر غلاموں اور مسکینوں کے کام کرتا ہوا نظر آتا ہے، وہ تاج و تخت سے بے نیاز، قصر و ایوان سے مستغنی، حاجب و دربان سے بے پروا، مال و زر سے خالی، خدم و حشم کے بغیر دلوں پر حکومت کر رہا تھا، نہ اس کی حکومت میں پولیس تھی، نہ بڑے بڑے انتظامی دفاتر، نہ کثیر التعداد ارباب مناصب نہ وزراے شورہ، نہ امراے سیاست، نہ الگ الگ حکام و قضاۃ، وہ ایک ہی ذات تھی، جو ہر فرض و خدمت کی خود ذمہ دار تھی، لیکن بایں ہمہ وہ اپنے آپ کو عام مسلمانوں سے اونٹ کے ایک بال کے برابر بھی زیادہ مستحق نہیں سمجھتا تھا، اس کے عدل و انصاف کے آگے فاطمہؓ جگر گوشۂ نبوت اور عام مجرم برابر تھے،[۲]

آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اصل بعثت کا مقصد دعوتِ مذہب، اصلاحِ اخلاق، اور تزکیۂ نفوس تھا، اس کے علاوہ اور تمام فرائض محض ضمنی تھے، اس بنا پر انتظاماتِ ملکی آپ نے اسی حد تک قائم کئے جہاں تک ملکی بدامنی کے باعث دعوتِ توحید کے لئے عوائق پیش آتے تھے تاہم یہ کام بھی کچھ اہم نہ تھا،

انتظام ملکی (عمر شریف اس وقت ساٹھ برس کی تھی لیکن اس عمر میں بھی اس حکومت کے تمام کام خود انجام دیتے تھے، ولاۃ اور عمال کا تقرر، موذنین اور ائمہ کا تعین، محصلین زکوٰۃ و جزیہ کی نامزدگی، غیر قوموں سے مصالحت، مسلمان قبائل میں جائدادوں کی تقسیم، فوجوں کی آراستگی، مقدمات کا فیصلہ، قبائل کی خانہ جنگیوں کا انسداد، وفود کے لئے تعین وظائف، اجراے فرامین، نومسلموں کے انتظامات، مسائل شرعیہ میں افتا، جرائم کے لئے اجراے تعزیر، ملک کے بڑے بڑے سیاسی انتظامات

---

[۱] ابوداؤد کتاب الصلوٰۃ باب صلوٰۃ القاعد [۲] صحیح بخاری کتاب الحدود

عہدہ داروں کی خبر گیری اور احتساب، دور کے صوبوں میں متعدد صحابہ گورنر اور والی بنا کر بھیج دیے گئے تھے لیکن خود مدینہ اور اطرافِ مدینہ کے فرائض آپ خود انجام دیتے تھے،

خلافتِ الٰہی کے ان فرائض و اعمال نے آپکے دل و دماغ پر جو بارِ عظیم ڈالا، اُس نے آپکے نظام جسمانی کو چور چور کر دیا، عام روایتوں سے ثابت ہو کہ آپ آخر زندگی میں تہجد کی نماز بیٹھ کر پڑھا کرتے تھے، جو ضعفِ جسمانی کا اقتضا تھا، لیکن یہ ضعفِ جسمانی خود کس چیز کا نتیجہ تھا، اس کا جواب حضرت عائشہؓ کی زبان سے سننا چاہیے جن سے بڑھکر آپکے اعمالِ زندگی کا کوئی ترجمان نہیں ہو سکتا،

عن عبد اللہ بن شقیق قال سألت عائشۃ افکان یصلّی قاعداً قالت حین حطمہ الناس[۱]،	عبد اللہ بن شقیق کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عائشہؓ سے پوچھا کہ کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بیٹھکر نماز پڑھتے تھے؟ انھوں نے کہا ہاں لیکن اسوقت جب لوگوں نے آپ کو چور چور کر دیا تھا،

امیر العسکری

(چھوٹے چھوٹے غزوات و سرایا کے امیر الجیش اگرچہ اکابر صحابہ ہوتے تھے، لیکن جو بڑے معرکے پیش آتے تھے، ان کی قیادت خود آپ بہ نفس نفیس فرماتے تھے، چنانچہ، بدر، احد، خیبر، فتح مکہ، تبوک میں خود آپ ہی امیر العسکر تھے، اس کا مقصد صرف فوج کا لڑانا اور آخری فتح و ظفر حاصل کرنا نہ تھا، بلکہ فوج کی عام اخلاقی اور روحانی نگرانی کرنا تھا، چنانچہ آپنے مجاہدین اسلام کی جن جزئی جزئی بے اعتدالیوں پر گرفت فرمائی ہو، وہ احادیث میں بہ تصریح مذکور ہیں، اور اسلام کا قانون جنگ اسی دار و گیر کے ذریعہ سے وجود میں آیا ہے،)

---

[۱] ابو داؤد کتاب الصلوٰۃ،

افتا (آپ کے عہدِ مبارک میں اگرچہ متعدد صحابی بھی بطور خود فتویٰ دیتے تھے، لیکن زیادہ تر آپ ہی اس فرض کو بھی ادا کرتے تھے، فتویٰ دینے کے لئے آپ نے کوئی خاص وقت مقرر نہیں فرمایا تھا بلکہ چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے، غرض جس وقت لوگ آپ سے احکامِ اسلام کے متعلق سوالات کرتے تھے، آپ ان کا جواب دیتے تھے، چنانچہ امام بخاری نے کتاب العلم میں ان فتاوی کو اس قسم کے متعدد ابواب میں تقسیم کردیا ہے، خلافت کا یہی فرض تھا، جس کو حضرت عمرؓ نے اپنے زمانہ میں نہایت ترقی دی، اور اس کا ایک مستقل صیغہ قائم کردیا،)

فصل قضایا (اگرچہ آپ کے عہدِ مبارک میں عہدۂ قضارت قائم ہوچکا تھا، اور حضرت علیؓ اور حضرت معاذ بن جبلؓ کو آپ نے خود یمن کا قاضی مقرر فرما کے بھیجا تھا، تاہم مدینہ اور اس کے حوالی و مضافات کے تمام مقدمات کا آپ خود فیصلہ کرتے تھے، اس کے لئے کسی قسم کی روک ٹوک اور پابندی نہ تھی، امام بخاری نے ایک خاص باب باندھا ہے، جس کا عنوان یہ ہے)

باب ما ذکران النبی صلی اللہ علیہ وسلم لم یکن لہٗ بواب، — یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دروازہ پر دربان نہ تھا،

اس بنا پر گھر کے اندر بھی آپ اطمینان و سکون کے ساتھ نہیں بیٹھ سکتے تھے، عورتوں کے معاملات عموماً زنانخانہ ہی میں پیش ہوتے تھے، احادیث کی کتابوں میں آپ کے فیصلوں کا اتنا ذخیرہ موجود ہے کہ اگر ان کا استقصا کیا جائے تو ایک ضخیم جلد تیار ہو جائے، عموماً احادیث کی کتاب البیوع میں دیوانی کے مقدمات اور کتاب القصاص والدیات وغیرہ میں فوجداری کے مقدمات مذکور ہیں،

توقیعات و فرامین (یہ اس قدر اہم کام تھا کہ عہدِ مبارک میں اگرچہ اور صیغوں کا کوئی مستقل دفتر نہیں

قائم ہوا تھا، تاہم توقیعات و فرامین کے لئے اس کی ابتدائی شکل قائم ہو چکی تھی، چنانچہ اس خدمت پر حضرت زید بن ثابتؓ، اور آخر میں معاویہؓ مامور ہوئے، اُن کے علاوہ اور دوسری صحابہ بھی وقتاً فوقتاً یہ خدمت انجام دیتے تھے، آپنے سلاطین و ملوک کو دعوتِ اسلام کے جو خطوط ارسال فرمائے، غیر قوموں کے ساتھ جو معاہدے کئے، مسلمان قبائل کو جو احکام بھیجے، عمال و محصلین کو جو تحریری فرامین عنایت کئے، فوج کا جو رجسٹر مرتب کرایا، بعض صحابہ کو جو حدیثیں لکھوائیں وہ سب اسی سلسلہ میں داخل ہیں، زرقانی وغیرہ نے آپکے احکام و فرامین تحریری کا ایک مستقل باب قائم کیا ہے۔)

مہمانداری (منصبِ نبوت کے بعد آپ کی ذاتی حیثیت تقریباً فنا ہو گئی تھی، اس لئے آپ کی خدمت میں جو لوگ حاضر ہوتے تھے، ان کا تعلق بھی خلافت الٰہی یا نبوت ہی کے ساتھ ہوتا تھا اور آپ اسی حیثیت سے اُن کی مہمانداری فرماتے تھے، مہمانوں کی زیادہ تر تعداد قبولِ اسلام کے لئے آتی تھی، جن کی مہمانداری کے لئے آپنے ابتدائے نبوت ہی سے خاص طور پر حضرت بلالؓ کو مامور فرمادیا تھا، چنانچہ جب کوئی تنگدست مسلمان آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا اور آپ اُس کو برہنہ تن دیکھتے تو حضرت بلالؓ کو حکم دیتے اور قرض لیکر اس کے کھانے اور کپڑے کا انتظام کرتے جب آپکے پاس کہیں سے کچھ مال آتا، تو اُس کے ذریعہ سے وہ قرض ادا کیا جاتا، یہانتک کہ اگر کوئی شخص آپ کو ذاتی طور پر ہدیہ دیتا تو وہ بھی اسی صیغہ میں صرف کیا جاتا[1]، کبھی کبھی اس غرض کے لئے آپ تمام صحابہ کو صدقہ و خیرات کی ترغیب دیتے، اور جو رقم وصول ہوتی، وہ اُن مفلوک الحال مہاجرین

---

[1] ابوداؤد کتاب الخراج والامارۃ باب فی الامام یقبل ہدایا المشرکین،

کی اعانت میں صرف ہوتی، چنانچہ ایک بار مہاجرین کی ایک برہنہ پا و سر جماعت آپ کی خدمت میں حاضر ہوئی، ہر شخص کے بدن پر صرف ایک چادر اور گلے میں ایک تلوار حمائل تھی، آپ نے اُن کی پریشان حالی دیکھی، دیکھا تو چہرہ کا رنگ بدل گیا، فوراً حضرت بلالؓ کو اذان کا حکم دیا، نماز سے فارغ ہونے کے بعد ایک خطبہ میں تمام صحابہ کو ان لوگوں کی اعانت کی ترغیب دی، اس کا اثر یہ ہوا کہ ایک انصاری اٹھے، اور ایک توڑا جو اس قدر جو اس قدر وزنی تھا، کہ اُن سے بمشکل اُٹھ سکتا تھا، لاکر آپ کے آگے ڈال دیا، اس سے تمام لوگوں میں اور بھی جوش پیدا ہوا، اور تھوڑی دیر میں ان بے سر و سامان مہاجرین کے آگے غلہ اور کپڑے کا ڈھیر لگ گیا،[۱]

فتح مکہ کے بعد تمام اطراف ملک سے بکثرت ملکی و مذہبی وفود آنے لگے، آپ بنفسِ نفیس اُن کی خاطر مدارات کرتے تھے، اور ان کے لئے حسب حاجت وظائف اور سفر کے مصارف ادا فرماتے تھے، قبائل پر اس کا بہت اچھا اثر پڑتا تھا، آپ اس کا اس قدر لحاظ فرماتے تھے کہ وفات کے وقت آپ نے جو آخری وصیتیں فرمائی تھیں، ان میں ایک یہ بھی تھا

اجیزوا الوفود بنحو ما کنت اجیزھم،[۲] جس طرح میں وفود کو عطیہ دیا کرتا تھا تم بھی اسی طرح دیا کرنا

وفود کے حالات آگے آتے ہیں)

عیادتِ مرضیٰ

مریضوں کی عیادت اور ان کی تجہیز و تکفین میں بھی شریک ہونا اگرچہ ایک مذہبی فرض تھا، اور مذہبی حیثیت سے اس کی ابتدا بھی ہوئی، چنانچہ جب آپ مدینہ تشریف لائے تو یہ عام دستور ہو گیا کہ دم نزع، میت کے اعزّہ آپ کو اطلاع دیتے آپ اُن کے پاس آکر ان کے

[۱] مسند احمد حنبل جلد ۴ صفحہ ۳۵۸، [۲] صحیح بخاری جلد اول باب اخراج الیھود من جزیرۃ العرب،

لئے دعاے مغفرت کرتے[1] لیکن بعض حیثیتوں سے اس کا تعلق خلافت کے ساتھ بھی ہوگیا تھا، کیونکہ بعض صحابہ اس حالت میں اپنی جائداد کو وقف یا صدقہ کرنا چاہتے تھے، آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) اس موقع پر اُن کا صحیح طریقہ بتاتے تھے جن لوگوں پر قرض آتا تھا، آپ اُن کے جنازہ میں شریک نہیں ہوتے تھے، اس لئے اُن کے ورثہ یا دوسری صحابہ کو مجبوراً یہ قرض ادا کرنا پڑتا تھا، اور اس طرح بعض معاملات ونزاعات کا فیصلہ ہو جاتا تھا، چنانچہ احادیث میں اس قسم کی متعدد مثالیں موجود ہیں،

احتساب (تمدن اسلام کے دور ترقی میں محکمۂ احتساب ایک مستقل محکمہ تھا، جو نہایت وسیع پیمانہ پر تمام قوم کے اخلاق و عادات، بیع و شرا، اور معاملات داد و ستد کی نگرانی کرتا تھا، لیکن آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے عہد مبارک میں یہ محکمہ قائم نہیں ہوا تھا، بلکہ خود ہی آپ اس فرض کو ادا فرماتے تھے، ہر شخص کے جزئیاتِ اخلاق اور فرائض مذہبی کے متعلق آپ وقتاً فوقتاً دار و گیر فرماتے رہتے تھے، تجارتی معاملات کی بھی نگرانی فرماتے تھے، عرب میں تجارتی معاملات کی حالت نہایت قابلِ اصلاح تھی، اور مدینہ میں آنے کے ساتھ ہی آپنے ان اصلاحات کو جاری کر دیا لیکن تمام لوگوں سے اصلاحات پر عمل کرانا صیغۂ احتساب سے تعلق رکھتا تھا، چنانچہ نہایت سختی کے ساتھ ان معاملات کی نگرانی فرماتے تھے، اور تمام لوگوں سے ان پر عمل کراتے تھے، اور جو لوگ باز نہیں آتے تھے، ان کو سزائیں دلاتے تھے، صحیح بخاری کتاب البیوع میں ہے،

لقد رأیت الناس فی عہد النبی صلی اللہ علیہ وسلم یتبایعون جزافا یعنی الطعام	حضرت عبد اللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں دیکھا کہ جو لوگ تخمیناً غلہ خریدتے تھے

---

[1] مسند جلد ۳ صفحہ ۶۶،

یضربون ان یبیعوہ فی مکانھم حتی یوودہ الی رحالھم ترجمہ: ان کو اس بات پر سزا دیجاتی تھی کہ انکو گھروں میں منتقل کرنے سے پہلے اس کو خود اسی جگہ بیچ ڈالیں جہاں اسکو

کبھی کبھی تحقیقِ حال کے لئے آپ خود بازار تشریف لیجاتے، ایک بار آپ بازار میں گذرے تو غلہ کا ایک انبار نظر آیا، اس کے اندر ہاتھ ڈالا تو نمی محسوس ہوئی، دوکاندار سے دریافت فرمایا کہ یہ کیا ہے؟ اس نے جواب دیا کہ بارش سے بھیگ گیا ہے، ارشاد ہوا کہ پھر اس کو اوپر کیوں نہیں کر لیا تاکہ ہر شخص کو نظر آئے جو لوگ فریب دیتے ہیں وہ ہم میں سے نہیں ہیں[۱]"

فرائضِ احتساب میں آپ کا سب سے بڑا فرض عمّال کا محاسبہ تھا یعنی جب عمال زکوٰۃ اور صدقہ وصول کر کے آتے تھے، تو آپ اس غرض سے اُن کا جائزہ لیتے تھے کہ انھوں نے کوئی ناجائز طریقہ تو نہیں اختیار کیا ہے، چنانچہ ایک بار آپنے ابن اللتبیہ کو صدقہ وصول کرنے کے لئے مامور فرمایا، وہ اپنی خدمت انجام دے کر واپس آئے، اور آپنے اُن کا جائزہ لیا، تو انھوں نے کہا یہ مال مسلمانوں کا ہے، اور یہ مجھکو ہدیۃً ملا ہے، آپنے فرمایا کہ گھر بیٹھے بیٹھے تم کو یہ ہدیہ کیوں نہیں ملا؛ اس کے بعد آپنے ایک عام خطبہ دیا جس میں اس کی سخت ممانعت فرمائی[۲]

اصلاح بین الناس اسلام تمام دنیا کے تفرقوں کو عموماً، اور عرب کے اختلافات کو خصوصاً مٹانے کے لئے آیا تھا، اس بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو اپنا ایک ضروری فرض قرار دیا تھا، اور جب آپ کو اس قسم کے منازعات کی خبر ہوتی تھی، تو آپ اصلاح کو تمام مذہبی فرائض پر مقدم رکھتے تھے، چنانچہ ایک بار قبیلہ بنو عمرو بن عوف کے چند اشخاص کے درمیان نزاع پیدا ہوئی آپکو معلوم ہوا

---

[۱] صحیح مسلم جلد ۱ ص ۵۳ کتاب الایمان [۲] بخاری جلد ۲ صفحہ ۱۰۶۲ کتاب الاحکام،

تو چند صحابہ کے ساتھ ان میں مصالحت کرانے کے لئے تشریف لے گئے، آپ کو اس معاملہ میں دیر ہوئی اور نماز کا وقت آگیا حضرت بلال رضؓ نے اذان دی لیکن اذان کے بعد بھی آپ تشریف نہیں لائے، تھوڑی دیر کے انتظار کے بعد انھوں نے حضرت ابو بکر رضؓ کو امام بنا کر نماز شروع کر دی آپ اسی حالت میں تشریف لائے اور صفوں کو چیرتے ہوئے اگلی صف میں جا کھڑے ہوئے حضرت ابو بکر رضؓ اگرچہ نماز میں ادھر اُدھر نہیں دیکھتے تھے لیکن جب لوگوں نے زور زور سے تالیاں بجانی شروع کیں، تو انھوں نے پیچھے مڑ کر دیکھا کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کھڑے ہیں، آپ نے اگرچہ ہات سے اشارہ کیا کہ کھڑے رہیں لیکن آپ کی موجودگی میں انھوں نے امامت کرنا سوء ادب خیال کیا اس لئے پیچھے ہٹ آئے، اور آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) آگے بڑھ کر ان کی جگہ کھڑے ہو گئے۔[1]

ایک بار اہل قبا کے درمیان نزاع قائم ہوئی، اور نوبت یہاں تک پہونچی کہ لوگوں نے باہم سنگ اندازی کی، آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کو خبر ہوئی تو آپ صحابہ کیساتھ مصالحت کرانے کی غرض سے تشریف لے گئے،[2] (یہ دونوں واقعات گو امام بخاری نے الگ لکھے ہیں لیکن شراح حدیث کی تحقیق میں یہ ایک ہی واقعہ کے دو حصے ہیں) بخاری کی دوسری روایتوں میں ہے کہ آپ اپنی نو دریدل گئے تھے

ابن ابی حدرد پر حضرت کعب بن مالک کا کچھ قرض تھا، انھوں نے مسجد میں تقاضا کیا، حدرد قرض کا ایک حصہ معاف کرانا چاہتے تھے لیکن وہ اس پر راضی نہ ہوتے تھے، بات زیادہ بڑھی، اور شور و غل ہوا، تو آپ گھر کے اندر سے نکل آئے، اور کعب کو پکارا، کعب نے لبیک کہا تو آپ نے فرمایا کہ "نصف معاف کر دو" وہ راضی ہو گئے، تو آپ نے حدرد سے کہا کہ "جاؤ اور بقیہ حصہ ادا کر دو۔"

---

[1] بخاری ج ۱ ص ۳۷۰، کتاب الصلح [2] بخاری کتاب الصلح

اس قسم کے سیکڑوں جزئی واقعات روزانہ پیش آیا کرتے تھے،

مدینہ میں اور مدینہ سے باہر دیگر فرائض کی انجام دہی کے لئے اکابر صحابہ اور ارباب استعداد کو مختلف عہدوں پر نصب فرمایا، کتابت وحی، نامہ وپیام، اجرائے احکام وفرامین کیلئے سب پہلی ضرورت عہدۂ انشاء اور کتابت کی تھی، اسلام سے پہلے عرب میں عام طور پر لکھنے پڑھنے کا رواج نہ تھا لیکن اسلام عرب کے لئے رحمتوں کا جو خزانہ لایا تھا، اس میں ایک یہ شے بھی تھی،

اسیران بدر میں نادار لوگوں کا فدیہ صرف یہ قرار دیا گیا کہ وہ مدینہ کے بچوں کو لکھنا سکھا دیں حضرت زید بن ثابتؓ نے جن کے متعلق کتابتِ وحی کی مقدس خدمت تھی، اسی طریقہ پر تعلیم پائی تھی، ابوداؤد کی ایک روایت سے ثابت ہوتا ہے کہ اصحاب صفہ کو جو تعلیم دی جاتی تھی، اس کا ایک جز کتابت کی تعلیم بھی تھی)

کتاب (عہدۂ انشاء گویا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حیثیت سے نیابت تھی، اس لئے مختلف اوقات میں بڑے بڑے صحابہ اس خدمت پر مامور کئے گئے، جن میں شرحبیل بن حسنہ کندیؓ سب سے پہلے اس شرف سے ممتاز ہوئے، یہ نہایت قدیم الاسلام تھے، مکہ میں انہی نے سب سے پہلے کتابتِ وحی کا فرض انجام دیا، قریش میں سب سے پہلے کاتب عبداللہ بن ابی سرح تھے، مدینہ میں اس کی اولیت کا شرف حضرت ابی بن کعبؓ کو حاصل ہوا،

حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت زبیرؓ، حضرت عامر بن فہیرہؓ حضرت عمرو بن العاصؓ، حضرت عبداللہ بن ارقمؓ، حضرت ثابت بن قیسؓ بن شماس، حضرت حنظلہؓ ابن الربیع الاسدیؓ، حضرت مغیرہ بن شعبہؓ، حضرت عبداللہ بن رواحہؓ، حضرت خالد بن ولیدؓ

حضرت خالد بن سعید بن العاص حضرت علاء بن حضرمی، حضرت حذیفہ بن الیمان، حضرت معاویہ بن ابی سفیان، حضرت زید بن ثابت مختلف اوقات میں اس منصب پر مامور ہوئے،

اگرچہ تمام بزرگوں کو کبھی کبھی یہ خدمت ادا کرنی پڑتی تھی، چنانچہ صلحنامہ حدیبیہ حضرت علی نے اپنے ہات سے لکھا تھا، امرا، اور سلاطین کے نام خطوط حضرت عامر بن فہیرہ لکھتے تھے، اور امرای عمان کے نام آپنے جو مکتوب بھیجا تھا، وہ حضرت ابی بن کعب کا لکھا تھا، تعلن بن حارثہ کو جو خط بارگاہ نبوت سے بھیجا گیا تھا، وہ حضرت ثابت بن قیس نے لکھا تھا، لیکن عام طور پر یہ خدمت حضرت زید بن ثابت کے متعلق تھی، اور صحابہ کے گروہ میں ان کا نام اسی حیثیت سے زیادہ نمایاں ہے[1]

حضرت زید بن ثابت نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد سے ان تمام بزرگوں پر ایک خاص امتیاز حاصل کیا، کہ عبرانی زبان سیکھی جس کی ضرورت یہ پیش آئی کہ مدینہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو زیادہ تر یہود سے تعلق رہتا تھا جن کی مذہبی زبان عبرانی تھی، اس بنا پر آپنے حضرت زید بن ثابت کو عبرانی زبان سیکھنے کا حکم دیا، اور انھوں نے پندرہ دن میں اس میں مہارت حاصل کر لی)

حکام اور ولاۃ (فصل قضایا، اقامت عدل، بسط امن، رفع نزاع کے لئے متعدد ولاۃ وحکام کی ضرورت تھی، اس غرض سے آپنے متعدد صحابہ کو مختلف مقامات کا حاکم ووالی مقرر فرمایا، چنانچہ ان کے ناموں کی تفصیل حسب ذیل ہے،

باذان بن ساسان بہرام گور کے خاندان سے تھے، اور سلاطین عجم میں سب سے پہلے مشرف باسلام ہوئے اسکے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

---

[1] ان بزرگوں کے نام اور تفصیلی حالات زرقانی جلد ۳ ص ۳۰۳ میں مذکور ہیں،

	نے اُن کو یمن کا والی مقرر فرمایا،
شہر بن باذانؓ	باذان بن سامان کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کو صنعاء کا والی مقرر فرمایا،
خالد بن سعیدؓ بن العاص	شہرؓ بن باذان مارے گئے تو اُن کے بعد آپ نے اُن کو صنعاء کا عامل مقرر فرمایا،
مہاجر بن امیہؓ المخزومی	آپ نے اُن کو کندہ و صدف کا والی مقرر فرمایا تھا، لیکن وہ ابھی روانہ بھی نہ ہوئے تھے، کہ آپ نے انتقال فرمایا،
زیاد بن لبید الانصاریؓ	حضرموت کے والی تھے،
ابوموسیٰ اشعریؓ	زبید، عدن، زمعہ وغیرہ کے والی تھے،
معاذ بن جبلؓ	والی جند
عمرو بن حزمؓ	والی نجران
یزید بن ابی سفیانؓ	والی تیما،
عتاب بن اسیدؓ	والی مکہ
علی بن ابی طالبؓ	متولی اخماس یمن،
عمرو بن العاصؓ	والی عمان
علاء بن حضرمیؓ	والی بحرین،

ان ولاۃ یعنی گورنروں کا تقرر ملک کی وسعت اور ضروریات کے لحاظ سے ہوتا تھا، آنحضرت

صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک میں عرب کے جو حصے اسلام کے زیر اثر آئے، ان میں یمن سب سے زیادہ وسیع اور متمدن تھا، اور مدت تک ایک باقاعدہ سلطنت کے زیر سایہ رہ چکا تھا، اس بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو پانچ حصوں میں منقسم فرمایا، اور ہر ایک کے لئے علٰحدہ علٰحدہ گورنر مقرر فرمائے خالد بن سعید کو صنعاء پر، مہاجر بن ابی امیہ کو کندہ پر، زیاد بن لبید کو حضرموت پر، معاذ بن جبل کو جند پر، ابوموسیٰ اشعری کو زبید، زمعہ، عدن اور سواحل پر۔[1]

عموماً جب کسی مہاجر کو کہیں کا عامل مقرر فرماتے تھے تو اسی کے ساتھ ایک انصاری کا تقرر بھی فرماتے تھے،[2] ملکی انتظام، فصل مقدمات اور تحصیل خراج وغیرہ کے علاوہ ان عمال کا سب سے مقدم فرض اشاعتِ اسلام، اور سنن و فرائض کی تعلیم تھی، اس لحاظ سے جیسا کہ پہلے گذر چکا ہے، یہ لوگ حاکم ملک اور والی صوبہ ہونے کے ساتھ مبلغِ دین، اور معلمِ اخلاق کی حیثیت بھی رکھتے تھے، استیعاب تذکرہ معاذ بن جبل میں ہے،

وبعثه رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو یمن کے ایک حصہ
قاضیاً الی الجند من الیمن یعلم الناس	یعنی جند کا قاضی بنا کر روانہ فرمایا کہ لوگوں کو قرآن
القرآن وشرائع الاسلام ویقضی	اور شرائع اسلام کی تعلیم دیں اور جو عمال یمن میں
بینهم وجعل الیه قبض الصدقات	تھے اُن کے صدقات کے جمع کرنے کی خدمت
من العمال الذین بالیمن	بھی اُن کے متعلق تھی،

چنانچہ جب یہ لوگ روانہ ہوتے تھے، تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان فرائض کی تعیین فرمادیتے تھے

[1] استیعاب تذکرہ معاذ بن جبل [2] مسند ابن حنبل جلد ۵ صفحہ ۱۸۶،

معاذ بن جبل رض کو روانہ فرمایا، تو یہ وصیت کی،

انک تاتی قوما من اهل الکتاب فادعهم الی شهادة ان لا اله الا الله وانی رسول الله فان هم اطاعوا لک بذلک فاعلمهم ان الله افترض علیهم خمس صلوات فی کل یوم ولیلة فان هم اطاعوا لک بذلک فاعلمهم ان الله افترض علیهم صدقة توخذ من اغنیائهم وترد الی فقرائهم فان هم اطاعوا لذلک فایاک وکرائم اموالهم واتق دعوة المظلوم فانه لیس بینها وبین الله حجاب

تم اہلِ کتاب کے پاس جاتے ہو پہلے انکو کلمۂ توحید کی دعوت دو اگر وہ اسکو قبول کریں تو ان کو بتاؤ کہ خدا نے رات اور دن میں ان پر پانچ نمازیں فرض کی ہیں، اگر وہ اسکو بھی مان لیں تو ان کو بتاؤ کہ خدا نے ان پر صدقہ فرض کیا ہے جو انکے امراء سے لیکر ان کے غرباء پر تقسیم کر دیا جائیگا، اگر وہ اس کو بھی تسلیم کر لیں تو اُن کے بہتر مال سے احتراز کرنا، اور مظلوم کی بد دعا سے بچنا، کیونکہ اس میں اور خدا کے درمیان کوئی پردہ نہیں ہے،

ان فرائض کے ادا کرنے کے لئے سب سے زیادہ ضرورت تبحر علمی، وسعتِ نظر اور اجتہاد کی تھی، اس بنا پر آپ ان لوگوں کے تبحر علمی اور طرز عمل کا امتحان لیتے تھے، چنانچہ جب حضرت معاذ رض کو روانہ فرمایا تو پہلے ان کی اجتہادی قابلیت کے متعلق اطمینان فرمالیا، ترمذی میں ہے،

قال رسول الله صلی الله علیه وسلم لمعاذ بن جبل حین وجهه الی الیمن بم تقضی قال بما فی کتاب الله قال فان لم تجد بما فی سنة رسول الله قال فان لم تجد

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب معاذ بن جبل رض کو یمن کی طرف بھیجا تو فرمایا کس چیز سے مقدمات کا فیصلہ کرو گے، انھوں نے کہا قرآن مجید سے آپ نے فرمایا اگر اس میں فیصلہ نہ ملے انھوں نے کہا احادیث سے پھر آپ نے فرمایا اگر احادیث میں بھی

قال اجتھد برائی فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الحمد للہ الذی وفق رسول رسول اللہ لما یحب رسول اللہ

اس کے متعلق ہدایت نہ ملے تو انھوں نے کہا میں اپنی رائے سے اجتہاد کرونگا، اس پر آپ نے فرمایا اس خدا کا شکر جس نے رسول کے رسول کو اس چیز کی توفیق دی جسکو خود اسکا رسول

لیکن اہل عرب کے دلوں کے مسخر کرنے کے لئے ان تمام چیزوں سے زیادہ رفق و ملاطفت، نرمی اور خوشخوئی کی ضرورت تھی جن کی آمیزش سیاست اور حکومت کے اقتدار کے ساتھ تقریبًا ناممکن ہو جاتی ہے، اس لئے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) گورنروں کو بار بار اس کی طرف متوجہ فرماتے رہتے تھے، چنانچہ جب معاذ بن جبلؓ کو ایک صحابی کے ساتھ یمن کی گورنری پر روانہ فرمایا تو پہلے دونوں کو عام طور سے وصیت فرمائی،

یسرا ولا تعسرا وبشرا ولا تنفرا وتطاوعا ولا تختلفا۔ (مسلم جلد ۲ صفحہ ۶۳ کتاب الایمان)

آسانی پیدا کرنا، دشواری نہ پیدا کرنا، لوگوں کو بشارت دینا اور اُن کو وحشت زدہ نہ کرنا، باہم اتفاق رکھنا

اس پر بھی تسکین نہ ہوئی تو معاذ بن جبلؓ جب رکاب میں پاؤں ڈال چکے تو اُن سے خاص طور پر یہ الفاظ فرمائے،

احسن خلقک للناس (ابن سعد تذکرہ معاذ بن جبل)

لوگوں کے ساتھ خوش خلقی کیساتھ برتاؤ کرنا،

اگرچہ اصول صحیح ہے کہ کوئی حکومت کتنی ہی رحمدل کیوں نہ ہو لیکن ابتدا میں جب وہ کسی ملک کو اپنے قبضۂ اقتدار میں لاتی ہے تو سرکش لوگوں کے مطیع کرنے کے لئے اس کو مجبورًا سختیاں کرنی پڑتی ہیں، تو عرب سب سے زیادہ اس کا مستحق تھا، لیکن آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اسی مقدس تعلیم کا نتیجہ تھا کہ ریگستان عرب کا ایک ذرہ بھی ولاۃ کے مظالم کے سنگ گراں سے نہ دبا، بیشک کہ آخر زمانہ میں جب

صحابہ عمالِ حکومت کے مظالم کو دیکھتے تھے تو اُن کو سخت استعجاب ہوتا تھا، اور وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تلقینات کے ذریعہ سے اُن کو روکتے تھے، چنانچہ ایک بار ہشام بن حکیم بن حزام نے دیکھا کہ شام کے کچھ نبطی دھوپ میں کھڑے کئے گئے ہیں، انھوں نے لوگوں سے اس کی وجہ پوچھی، لوگوں نے کہا کہ جزیہ وصول کرنے کے لئے ان لوگوں کے ساتھ یہ سختی کی جا رہی ہے، انھوں نے یہ سُن کر کہا کہ

اشھد لسمعت رسول اللّٰہ صلی اللہ علیہ وسلم	میں گواہی دیتا ہوں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ
یقول ان اللّٰہ یعذب الذین یعذبون	علیہ وسلم کو یہ کہتے سُنا ہے کہ خدا اُن لوگوں کو عذاب
النّاس فی الدنیا،	دیگا جو لوگوں کو دنیا میں عذاب دیتے ہیں[1]

محصلین زکوٰۃ وجزیہ

عرب کا خلوص اور جوشِ ایمان اگرچہ خود اُن کو صدقہ و زکوٰۃ کے ادا کرنے پر آمادہ کر دیتا تھا، چنانچہ اسلام لانے کے ساتھ ہی ہر قبیلہ اپنی قوم کا صدقہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں خود پیش کرتا، اور آپ کی دعا سے برکت اندوز ہوتا تھا، لیکن ایک وسیع ملک اور ایک وسیع حکومت کیلئے یہ طریقہ کافی نہ تھا، اس لئے ولاۃ کے علاوہ یکم محرم ۹ھ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صدقہ و زکوٰۃ کے وصول کرنے کیلئے ہر قبیلہ کے لئے الگ الگ محصلین مقرر فرمائے جو قبائل کا دورہ کر کے لوگوں سے زکوٰۃ اور خراج وصول کر کے آپ کی خدمتِ مبارک میں پیش کرتے تھے، عموماً خود روسائے قبائل اپنے اپنے قبیلوں کے محصل ہوتے تھے، اور احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ عموماً ان کا تقرر وقتی ہوتا تھا بہرحال آپ نے اس فرض کی انجام دہی کیلئے حسبِ ذیل اشخاص کو مختلف قبائل و شہروں میں متعین فرمایا[2]

---

[1] صحیح مسلم باب الوعید الشدید لمن عذاب الناس بغیر حق [2] اس فہرست کے اکثر اقسام ابن سعد جزء مغازی صفحہ ۱۱۵ میں مذکور ہیں عمر فاروق رضی اللہ عنہ اور عبیدہ بن جراح کا ذکر بخاری کتاب الصدقات اور بعض کا ابوداؤد کتاب الخراج میں ہے بقیہ کے لئے زاد المعاد ذکر مقدمین و امرائے نبوی اور فتوح البلدان بلاذری دیکھو۔

نام	مقام تقرر	نام	مقام تقرر
عدی بن حاتم	طے و بنی اسد	ابوجہم بن حذیفہ	بنو لیث
صفوان بن صفوان[1]	بنی عمرو	ایک ہذلی	بنو ہذیم
مالک بن نویرہ	بنو حنظلہ	عمر فاروق رض	شہر مدینہ
بریدہ بن حصیب الاسلمی	عقار و اسلم	عبیدہ بن جراح رض	شہر نجران
عباد بن بشر الاشہلی	سلیم و مزینہ	عبداللہ بن رواحہ رض	شہر خیبر
رافع بن مکیث جُہنی	جہینہ	زیاد بن لبید	حضر موت
زبرقان بن بدر	بنو سعد	ابو موسیٰ اشعری رض،	صوبہ یمن
قیس بن عاصم	”	خالد رض	”
عمرو بن عاص	بنو فزارہ	ابان بن سعید	بحرین
ضحاک بن سفیان کلابی	بنو کلاب	عمرو بن سعید بن العاص	تیماء
بسر بن سفیان کلابی	بنو کعب	محمیہ بن جزء الاسدی	تحصیل خمس
عبداللہ بن اللتبیہ	بنو ذبیان	عیینہ بن حصن فزاری	بنو تمیم

ان محصلین کے تقرر میں آپ حسب ذیل امور کی پابندی فرماتے تھے،

(۱) ان کو ایک فرمان عطا ہوتا تھا جس میں بہ تصریح بتایا جاتا تھا کہ کس قسم کے مال کی کتنی تعداد میں زکوٰۃ کی کیا مقدار ہے چھانٹ کر مال لینے کی یا حق سے زیادہ لینے کی اجازت نہ تھی، عام حکم تھا کہ

[1] اصابہ باب صفوان،

ایاک وکرائم اموالھم، یہ عمال نہایت شدت کے ساتھ اس فرمان پر عمل کرتے تھے، اور اس سے سرمو تجاوز جائز نہیں رکھتے تھے، بعض لوگوں نے بخوشی حق سے زیادہ دینا چاہا لیکن انھوں نے قبول نہیں کیا، سوید بن غفلہ کا بیان ہے کہ ہمارے پاس آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کا محصل آیا، میں جاکر اس کے پاس بیٹھا تو اس نے پہلے جانوروں کے اُن اقسام کو بیان کیا جن کے لینے کی فرمان میں اجازت نہ تھی، چنانچہ اسی وقت ایک شخص ایک نہایت عمدہ کوہان دار اونٹنی لیکر حاضر ہوا، اور اس کی خدمت میں پیش کیا، لیکن اس نے انکار کردیا،[1] اسی طرح جب ایک شخص نے ایک محصل کو بچے والی بکری دی، تو اُس نے کہا کہ ہم کو اُس کے لینے کی ممانعت کی گئی ہے،[2]

(۲) عرب کے مال ودولت کی کل کائنات بکریوں کے ریوڑ اور اونٹوں کے گلے تک محدود تھی، جو جنگلوں میں، بیابانوں میں پہاڑوں کے دامنوں میں چرتے رہتے تھے لیکن بجائے اس کے کہ دنیوی حکومتوں کی طرح جابرانہ احکام کے ساتھ لوگ خود زکوٰۃ کے جانور لاکر محصلین کے سامنے پیش کرتے تھے محصلوں کو خود ان دروں میں جاکر زکوٰۃ وصول کرنا پڑتا تھا، ایک صحابی کا بیان ہے کہ میں پہاڑ کے ایک درہ میں بکریاں چرا رہا تھا، کہ دو شخص اونٹ پر سوار ہوکر آئے، اور کہا کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے قاصد ہیں، یہاں تمھاری بکریوں کا صدقہ وصول کرنے کیلئے آئے ہیں، میں نے ایک بچہ والی شیر دار بکری پیش کی لیکن انھوں نے کہا کہ ہم کو اس کے لینے کا حکم نہیں، میں نے ایک دوسرا بچہ دیا تو انھوں نے اس کو اپنے اونٹ پر لادلیا، اور چلتے ہوئے۔[3]

(۳) اگرچہ صحابہؓ اپنے تقدس اور پاک باطنی کی بنا پر ہر قسم کے ناجائز مال لینے سے خود احتراز

---

[1] نسائی صفحہ ۳۹۰ [2] ایضاً ص ۳۹۳ [3] ایضاً،

کرتے تھے، چنانچہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبد اللہ بن رواحہ کو خیبر کے یہودیوں کے پاس بھیجا، کہ وہاں کی زراعت کی نصف پیداوار حسب معاہدہ تقسیم کراکے لائیں تو انھوں نے اُن کو رشوت دینی چاہی تو انھوں نے یہ کہکر انکار کردیا کہ اے خدا کے دشمنو! کیا مجھے حرام مال کھلانا چاہتے ہو"[1] لیکن باایں ہمہ زہد و تقدس جب محصل اپنے دورہ سے واپس آتے تھے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود ان کا محاسبہ فرماتے تھے، چنانچہ ایک بار آپ نے ابن اللتبیہ کو صدقہ وصول کرنے کیلئے روانہ فرمایا جب وہ واپس آئے، اور آپ نے اُن کا محاسبہ کیا تو انھوں نے کہا یہ آپ کا مال ہے، اور یہ مجھے ہدیہ ملا ہے، یہ سُن کر آپ نے فرمایا کہ تم کو گھر بیٹھے ہدیہ کیوں نہیں ملا، اس پر بھی تسکین نہیں ہوئی تو ایک عام خطبہ دیا، اور تمام لوگوں کو اس قسم کے مال لینے سے سختی کے ساتھ ممانعت فرمائی،[2]

(۴) چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے خاندان پر صدقہ وزکوٰۃ کا مال حرام کردیا تھا، اسلئے خاندان نبوت کا کوئی شخص صدقہ کا محصل مقرر نہیں ہوا، ایک بار عبد المطلب بن زمعہ بن حارث اور فضل بن عباس نے کہ عم زاد بھائی اور بھتیجے تھے، آپ کی خدمت میں درخواست کی کہ اب ہمارا سن نکاح کے قابل ہوگیا ہے تمام لوگوں کی طرح ہم کو بھی صدقہ کا عامل مقرر فرمادیجئے تاکہ اسکے معاوضہ سے کچھ جمع کرکے نکاح کے لئے سرمایہ مہیا کریں لیکن آپ نے فرمایا کہ صدقہ آل محمد کیلئے جائز نہیں ہے وہ لوگوں کا میل ہے[3]

(۵) عمال کا انتخاب خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے، اور جو لوگ اپنے آپ کو اس خدمت کے لئے خود پیش کرتے تھے، اُن کی درخواست نامنظور ہوتی تھی، چنانچہ ابو موسیٰ اشعریؓ کیساتھ دو شخص آئے اور عامل بننے کی درخواست کی، آپ نے حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا کہ تم کیا کہتے

---

[1] فتوح البلدان صفحہ ۳۱ [2] صحیح مسلم ج ۲ ص ۱۱۳ [3] صحاح کتاب الصدقات،

انھون نے کہا کہ مجھ کو یہ خبر نہ تھی کہ یہ لوگ اس غرض سے آئے ہیں، آپنے ان دونوں کی درخواست نامنظور کی، اور فرمایا کہ جو لوگ خود خواہش کرتے ہیں ہم اُن کو عامل مقرر نہیں کرتے، لیکن اسی وقت حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کو بلا درخواست یمن کا عامل مقرر کر کے روانہ فرمایا[1]،

(۶) عمّال کو صرف بقدر ضرورت معاوضہ ملتا تھا، آپنے عام منادی فرما دی تھی کہ جو شخص ہماری مقررہ شرح سے زیادہ لیگا وہ خیانت مالی ہے، مقدار ضرورت کی تصریح خود آپنے فرما دی تھی

من کان لنا عاملا فلیکتسب زوجۃ فان	جو شخص ہمارا عامل ہو اسکو ایک بی بی کا خرچ
لم یکن لہ خادم فلیکتسب خادما وان	لینا چاہئے، اگر اس کے پاس نوکر نہ ہو تو نوکر
لم یکن لہ مسکن فلیکتسب مسکنا	کا، اگر مکان نہ ہو تو گھر کا، لیکن اگر کوئی اس سے
ومن اتخذ غیر ذلک فھو غال	زیادہ لیگا تو وہ خائن ہوگا،

آپکے زمانہ میں حضرت عمر فاروقؓ کو بھی اس قسم کا معاوضہ ملا تھا، چنانچہ اُن کے عہد خلافت میں جب صحابہ نے زہد و تقدس کی بنا پر معاوضہ لینے سے انکار کیا، تو انھون نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اسی طرز عمل سے استدلال کیا،)

قضاۃ (ان مناصب کے علاوہ بعض اور عہدے بھی سادہ طور سے قائم ہو گئے تھے مثلاً فصل مقدمات کا کام اگرچہ زیادہ تر آپ خود انجام دیتے تھے، لیکن کبھی کبھی آپکے حکم سے حسب ذیل صحابہ نے بھی اس فرض کو انجام دیا ہے، حضرت ابو بکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ، حضرت عبدالرحمٰن ابن عوفؓ، ابی بن کعبؓ، معاذ بن جبلؓ،)

[1] صحیح مسلم جلد ۲ صفحہ ۱۰۹، ۲ ابو داؤد جلد ۲ باب ارزاق العمال میں دونوں حدیثیں ہیں،

پولیس

(اگرچہ خلفائے راشدینؓ کے زمانہ میں بھی باضابطہ طور پر پولیس کا محکمہ قائم نہیں ہوا، اور اس کی ابتدا بنوامیہ کی سلطنت میں ہوئی، تاہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک میں بھی اس کا ابتدائی نمونہ قائم ہوچکا تھا، چنانچہ آپ کے عہدِ مبارک میں قیس بن سعدؓ اس خدمت کو انجام دیتے تھے، اور اس غرض سے ہمیشہ آپ کے ساتھ رہتے تھے[۱])

جلاد

مجرموں کی گردن مارنے کی خدمت حضرت زبیرؓ، حضرت علیؓ، مقداد بن الاسودؓ، محمد بن مسلمہ، عاصم بن ثابت، ضحاک بن سفیان کلابی کے سپرد تھی[۲]،)

غیر قوموں سے معاہدہ

(عرب میں اب کفر وشرک کا بالکل وجود نہ تھا کہیں کہیں صرف مجوس، نصاریٰ اور یہود کی آبادیاں تھیں، اُن میں سے معتد بہ افراد نے گو نورِ ایمان سے قلوب کو روشن کرلیا تھا لیکن مجموعی حیثیت سے وہ ابتک تاریکی میں تھے تاہم خلافتِ الٰہی کی ہمہ گیر قوت سے وہ سرتابی نہ کرسکے، حجاز کے یہودیوں کے سوا عرب کی تمام قوموں نے بخوشی اسلام کی اطاعت قبول کی اسلئے اسلام نے بھی اُن کی جان ومال عزت وآبرو اور مذہب کی حفاظت کی تمام ذمہ داری اپنے سر لے لی، اور اس کے مقابلہ میں جزیہ کی ایک خفیف رقم (یعنی ہر مستطیع عاقل بالغ مرد پر ایک دینار سالانہ) ان پر مقرر کی، اس رقم کا نقد روپیہ کی صورت میں ادا ہونا ضروری نہ تھا، بلکہ عموماً جہاں جس چیز کی پیداوار ہوتی تھی، یا جو چیز بنتی تھی، وہی چیز جزیہ قرار پائی[۳]،

غیر قوموں میں سب سے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ۷ھ میں خیبر، فدک، وادی القریٰ تیمار کے یہودیوں سے مصالحت فرمائی، اس وقت تک آیت جزیہ کا نزول نہیں ہوا تھا، اس بنا پر

۱؎ فتح الباری جلد ۱۳ صفحہ ۱۰۶، ۲؎ بخاری کتاب الاحکام ۳؎ زاد المعاد ابن قیم ۴؎ ایضاً جلد فصل جزیہ،

باہمی رضامندی سے جو شرائط قرار پا گئے تھے، وہ آیت جزیہ کے نزول کے بعد بھی قائم رہے[1]، اصل شرط یہ تھی کہ وہ رعایا کی حیثیت سے کام کریں گے اور پیداوار کا نصف حصہ خود لیں گے، اور نصف مالکوں کو ادا کریں گے،[2]

۹ھ میں جزیہ کی آیت نازل ہوئی، اس کے بعد تمام معاہدے اسی کی رو سے قرار پائے، نجران کے عیسائیوں نے مدینہ میں آکر مصالحت کی درخواست کی جس کو آپ نے منظور فرمایا، شرائط صلح یہ تھے، کہ "وہ مسلمانوں کو سالانہ دو ہزار کپڑے دیں گے، اور ان کو دو قسطوں میں یعنی آدھا ماہ صفر اور آدھا ماہ رجب میں ادا کریں گے، اگر یمن میں کبھی بغاوت یا شورش ہوگی، تو وہ عاریۃً تیس زرہیں، تیس گھوڑے، تیس اونٹ اور تیس تیس عدد ہر قسم کے ہتھیار دیں گے، اور مسلمان اُن کی واپسی کے ضامن ہوں گے، اس کے معاوضہ میں جب تک وہ سودی لین دین یا بغاوت نہ کریں گے، نہ اُن کے گرجے ڈھائے جائیں گے، نہ اُن کے پادری نکالے جائیں گے، نہ اُن کو اُن کے مذہب سے برگشتہ کیا جائیگا"[3]

حدود شام میں بہت سے عیسائی اور یہودی گاؤں میں آباد تھے، رجب ۹ھ میں غزوۂ تبوک کے موقع پر دومۃ الجندل، ایلہ، مقنا، جربا، اذرح، تبالہ اور جرش کے جو عیسائی اور یہودی زمیندار اسلام نہیں لائے، بلکہ جزیہ دینا قبول کیا، اُن میں سے ہر بالغ مرد پر ایک دینار سالانہ مقرر ہوا، اور مسلمان جب اُدھر سے گذریں تو اُن کی ضیافت بھی ان پر لازمی قرار دی گئی،[4]

یمن کے جن یہودیوں نے اسلام قبول نہیں کیا، ان پر بھی جزیہ کی یہی مقدار مقرر کی گئی، ان کو

---

[1] زاد المعاد ابن قیم جلد اول [2] بخاری و مسلم و ابو داؤد، ذکر خیبر و فتوح البلدان بلاذری ذکر فدک و وادی القریٰ و تیماء [3] ابو داؤد کتاب الخراج باب اخذ الجزیہ [4] فتوح البلدان بلاذری۔

ایک آسانی یہ بھی دی گئی کہ اگر نقد نہ ادا کر سکیں تو اسی کے برابر معافری کپڑے دیا کریں،[۱] بحرین کے مجوسیوں سے بھی جزیہ کی اسی شرح مقدار پر مصالحت کی گئی[۲]،)

اصنافِ محاصل و مخارج (مختلف اغراض و مصالح کی بنا پر اسلام میں آمدنی کے صرف پانچ ذرائع تھے، غنیمت، فیٔ، زکوٰۃ، جزیہ، خراج، اول و دوم کے سوا بقیہ ذرائعِ آمدنی سالانہ تھے،

غنیمت غنیمت کا مال صرف فتوحات کے موقع پر آتا تھا، عرب میں قاعدہ تھا کہ رئیسِ فوج غنیمت کا چوتھا حصہ خود لیتا تھا، جس کو اصطلاح میں مرباع کہتے تھے اور بقیہ جو جس کے ہاتھ لگ جاتا تھا لے لیتا تھا، تقسیم کا کوئی نظام نہ تھا، غزوۂ بدر کے بعد خدا نے غنیمت کو خود اپنی مِلک قرار دیا، جس میں خمس یعنی پانچواں حصہ خدا اور رسول کے نام سے حکومتِ الٰہی کے مصالح و اغراض کے لئے مخصوص فرمایا،

يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْاَنْفَالِ قُلِ الْاَنْفَالُ لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ، (انفال)	اے پیغمبر! لوگ تجھ سے مالِ غنیمت کی نسبت پوچھتے ہیں کہدے کہ وہ خدا اور رسول کی مِلک ہے،

خدا اور رسول کی ملکیت سے مقصود یہ ہے کہ وہ سپاہیوں کی شخصی ملکیت نہیں ہے، بلکہ مصالح کی بنا پر صاحبِ خلافت جس طرح مناسب سمجھے، اس کو صرف کر سکتا ہے، اسی طرح خمس کی نسبت ارشاد ہوا ہے،

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ (انفال)	مسلمانو! جان لو کہ تم کو جو مالِ غنیمت ہاتھ آئے اس کا پانچواں حصہ خدا اور رسول، اہلِ قرابت اور یتیموں اور مسکینوں کا ہے،

---

[۱] ابو داؤد، باب اخذ الجزیہ [۲] ابو داؤد اخذ الجزیہ من المجوس و تاریخ بلاذری ذکر بحرین،

ایک دو استثنائی واقعہ کے سوا جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مال غنیمت مخصوص مہاجرین کو یا مکہ کے نومسلموں کو عنایت فرمایا، ہمیشہ آپ کا یہ طرز عمل رہا، کہ خمس کے بعد ایک ایک حبہ سپاہیوں پر برابر برابر تقسیم فرمادیتے تھے، سواروں کو تین حصے اور پیادہ کو ایک حصہ، بعض روایتوں میں ہے کہ سواروں کو صرف دو حصے ملتے تھے[1]، خمس کا بھی عموماً بہت کم حصہ ذاتی مصرف میں آتا تھا، آیت بالا میں جن ارباب استحقاق کا ذکر ہے، زیادہ تر ان ہی پر صرف کردیا جاتا تھا۔

زکوٰۃ۔ صرف مسلمانوں پر فرض تھی، اور وہ چار مدوں سے وصول ہوتی تھی، نقد روپیہ، پھل، اور پیداوار، مویشی، (بجز گھوڑا) اسباب تجارت[2]، دوسو درہم چاندی بیس مثقال سونے اور پانچ اونٹ سے کم پر زکوٰۃ نہ تھی، پیداوار سے جو زکوٰۃ وصول کی جاتی تھی، اس کے لئے ضروری تھا کہ اس کی مقدار ۵ وسق (۳۰۰ صاع بتحقیق امام ترمذی) یا پانچ وسق سے زیادہ ہو، سونا اور چاندی کا چالیسواں حصہ وصول کیا جاتا تھا، مویشیوں کا نرخ زکوٰۃ بھی مختلف جنس کی مختلف تعداد پر مقرر تھا، جو حدیث اور فقہ کی تمام کتابوں میں مفصل مذکور ہے، اراضی کی دو قسمیں کی گئیں، ایک وہ جس کی سیرابی صرف بارش یا بہتے پانی سے ہوتی ہے[3]، اس قسم کی اراضی کی پیداوار میں دسواں حصہ (عُشر) وصول ہوتا تھا، اور جس کو آب پاشی کے ذریعہ سے سیراب کیا جاتا تھا، اس میں نصف عشر یعنی بیسواں حصہ لیا جاتا تھا[4]، سبزی پر کوئی زکوٰۃ نہ تھی[5]، زکوٰۃ کے آٹھ مصرف تھے، جن کی تفصیل خود قرآن مجید نے کردی تھی، فقرا، مساکین، نومسلم، غلام

---

۱ ابوداؤد حکم ارض خیبر بروایت مجمع، ۲ ابوداؤد کتاب الزکوٰۃ باب العروض اذا کانت للتجارۃ ۳ صحیح بخاری جلد ا ص ۲۰۱، ۴ ترمذی کتاب الزکوٰۃ ۵ ایضاً،

جن کو خرید کر آزاد کرانا ہے، مقروض، مسافر، محصلین زکوٰۃ کی تنخواہ، دیگر کار خیر، عموماً جہاں سے زکوٰۃ کی رقم وصول کی جاتی تھی، وہیں کے مستحقین پر صرف کردیجاتی تھی، صحابہ اس حکم کے اس قدر عادی ہوگئے تھے کہ ایک صحابی کو زیاد نے عامل بناکر ایک مقام میں بھیجا، جب وہ واپس آئے تو زیاد نے ان سے رقم کا مطالبہ کیا، انھوں نے جواب میں کہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ سے جس طرح ہم کرتے آئے تھے، وہی ہم نے کیا[۱] معاذ بن جبل رضی جب عامل بناکر یمن بھیجے گئے، تو زکوٰۃ کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، وصدقۃ توخذ من اغنیائھم وترد علیٰ فقرائھم،

جزیہ غیر مسلم رعایا سے اُن کی حفاظت اور ذمہ داری کے معاوضہ میں لیا جاتا تھا، اس کی مقدار متعین نہ تھی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے زمانہ میں ہر مستطیع بالغ مرد سے ایک دینار وصول کرنے کا حکم دیا تھا، بچے اور عورتیں اس میں داخل نہ تھیں، ایلہ کے جزیہ کی مقدار ۳۰۰ دینار تھی، عہد نبوی میں جزیہ کی سب سے بڑی مقدار بحرین سے وصول ہوتی تھی،

خراج غیر مسلم کاشتکاروں سے حقِ مالکانہ کے معاوضہ میں زمین کی پیداوار کا جو مخصوص حصہ باہمی مصالحت سے طے ہوگیا ہو، اس کا نام خراج ہے، خیبر، فدک، وادی القریٰ، تیماء وغیرہ سے خراج ہی وصول ہوتا تھا، پھل یا پیداوار کے تیار ہونے کا وقت جب آتا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کسی صحابی کو بھیجدیتے تھے، وہ باغوں اور کھیتوں کو دیکھ کر تخمینہ لگاتے تھے، رفع اشتباہ کیلئے تخمینہ میں سے ثلث کم کردیا جاتا تھا[۲] بقیہ بر حسب شرائط خراج وصول کیا جاتا، خیبر وغیرہ میں آدھی پیداوار پر صلح ہوئی تھی،

جزیہ اور خراج کی رقم سپاہیوں کی تنخواہ اور جنگی مصارف میں صرف ہوتی تھی، تمام صحابہ ضرورت

---

[۱] ابوداؤد کتاب الزکوٰۃ باب الصدقۃ تحمل [۲] فتوح البلدان بلاذری بحوالہ مذکور باب فی الخرص،

کے وقت والنٹیر سپاہی تھے، جو کچھ وصول ہو کر آتا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سب کو اسی وقت تقسیم فرما دیتے، اول آپ ان لوگوں کو عطا فرماتے تھے، جو پہلے غلام رہ چکے تھے، ایک جسٹر پر لوگوں کے نام لکھے ہوتے تھے، اسی ترتیب سے نام پکارے جاتے تھے، جو لوگ صاحب اہل و عیال ہوتے تھے اُن کے دو حصے اور مجرد لوگوں کو ایک حصہ ملتا تھا،

جاگیریں اور افتادہ زمینوں کی آبادی

ملک عرب کا اکثر حصہ ریگستانی پتھریلا شور اور بنجر تھا، جو سرسبز قطعات تھے، ان پر بیرونی قومیں قابض تھیں، بقیہ افتادہ زمینیں تھیں، مدینہ اور طائف میں البتہ کاشتکاری ہوتی تھی، بقیہ عام عرب تجارت یا لوٹ مار پر زندگی بسر کرتے تھے عربوں کی غیر مامون زندگی کا راز یہی تھا، کہ وہ مستقل پیشہ ور نہ تھے، اس بنا پر قیام امن کے لئے بھی ضروری تھا کہ زمین کا نئے سرے سے بندوبست کیا جائے، حجاز، یمن میں غیر قوموں کے انخلا کے سبب سے یوں بھی بہت سی زمینیں خالی ہو گئی تھیں جن کا انتظام ضروری تھا،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عام طور پر صحابہ کو اس کی ترغیب دی،

من احیا ارضا میتۃ فھی لہٗ — جس شخص نے افتادہ زمینوں کو آباد کیا وہ اسکی

من احاط حائطاً علی ارض فھی لہٗ — ملک ہے جس شخص نے کسی زمین کو گھیر لیا وہ اسکی

ترغیب عام کے ساتھ خاص خاص انتظامات بھی فرمائے، بنو نضیر اور قریظہ کے نخلستان اور کھیت خاص بارگاہ نبوت کی ملک قرار پائے، اور آپ نے اپنی طرف سے اُن کو مہاجرین اور بعض انصار میں تقسیم فرما دیا، خیبر کی زمین کچھ خالصہ رہی، اور بقیہ ان مہاجرین و انصار میں تقسیم فرما دی جو حدیبیہ میں شریک

سلہ ابوداؤد کتاب الخراج باب قسم الفئی،

تھے، لیکن عملاً یہودیوں کے ساتھ ان کا بندوبست رہا، پیداوار کا نصف حصہ وہ خود لیتے تھے اور نصف مالکوں کو ادا کرتے تھے، اور جو زمینیں آباد تھیں، اُن کو بعض شرائط پر اصل مالک کے ہاتھ میں رہنے دیا، چنانچہ ملک، ذوخیوان اور ایلہ، اذرح، نجران وغیرہ میں اسی طرح معاملات طے پائے، افتادہ زمینیں بھی صحابہ کو بطور جاگیر عطا فرما دیں، حضرت وائل رضؓ کو حضر موت میں ایک قطعۂ زمین عنایت فرمایا، بلال رضؓ بن حارث مزنی کو قابلِ زراعت زمین کا ایک بہت بڑا ٹکڑا اور کانیں مرحمت فرمائیں، حضرت زبیر رضؓ کو مدینہ کے پاس اور حضرت عمر رضؓ کو خیبر میں جاگیریں عطا کیں، بنو فاءہ کو دومۃ الجندل کے پاس زمین عنایت کی،

یہ جاگیریں اس فیاضی اور وسعت کے ساتھ دیجاتی تھیں کہ ہر شخص حسبِ طاعت ان کا انتخاب اور ان کے رقبہ کی تحدید کر سکتا تھا، ایک بار آپ نے حضرت زبیر رضؓ کو حکم دیا کہ جہاں تک اُن کا گھوڑا دوڑ سکے وہ زمین اُن کی جاگیر میں داخل ہوگی، چنانچہ انھوں نے گھوڑا دوڑایا، جب گھوڑا ایک خاص حد تک پہنچکر رُک گیا، تو انھوں نے اپنا کوڑا پھینکا، اور وہ جس نقطے پر گرا، وہی انکی جاگیر کا رقبہ قرار پایا، عرب کی خشک زمین میں سب سے زیادہ ضرورت چشمہائے آب کی تھی، چنانچہ ایک بار جب آپ نے حکم دیا، من سبق الی ماء لم یسبقہ الیہ مسلم فھولہ، یعنی جو شخص ایسے چشمہ پر قبضہ کرے جس پر کسی مسلمان نے قبضہ نہیں کیا ہے تو وہ اس کا ہے" تو تمام لوگوں نے دوڑ دوڑ کر اپنے اپنے چشموں کے حدود مقرر کر لئے،

اس فیاضی کی اس قدر شہرت ہوئی کہ لوگوں نے دور دور سے آکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے جاگیروں کی درخواست کرنا شروع کی، ابیض بن حمال یمن سے خدمتِ مبارک میں حاضر ہوئے، اور ایک نمک کی کان کی درخواست کی جس کو آپ نے منظور فرمالیا، لیکن ایک صحابی نے کہا کہ آپ نے انکو

جو کچھ جاگیر میں عطا فرمایا ہے، وہ پانی کا ایک بہت بڑا چشمہ ہے، چونکہ وہ ایک پبلک چیز تھی، اس بنا پر آپ نے اس کو واپس لے لیا،

یہ تمام فیاضیاں صرف ان ہی چیزوں کیساتھ مخصوص تھیں جن کا تعلق پبلک کے ساتھ نہیں ہوسکتا تھا لیکن جو چیزیں رفاہ عام کے کام میں آسکتی تھیں اُن کو آپنے اسی قدیم حالت پر چھوڑ دیا، عرب کا قدیم دستور تھا، کہ اپنے مویشیوں کیلئے چراگاہیں متعین کر لیتے تھے، جن کو حمیٰ کہتے تھے، عرب میں پیلو کا درخت اونٹوں کی عام غذا تھی، اور اُس کے متعلق کسی قسم کی روک ٹوک نہ تھی، لیکن ابیض بن حمال نے جب اس کو اپنے حمیٰ میں داخل کرنا چاہا تو آپنے منع فرمایا، لا حمی فی الاراک،

عرب میں یہ بھی دستور تھا کہ مویشیوں کے چرانے کے لئے رؤسا اور ارباب اقتدار اپنے لئے چراگاہ مخصوص کر لیتے تھے، اور وہاں کسی دوسرے کو نہیں آنے دیتے تھے، چونکہ اس سے عام لوگوں کو تکلیف ہوتی تھی، اس لئے اس طریقہ کو بھی روک دیا[1]،

اسی طرح عرب میں ایک مقام دہنا ہے، جس کے ایک طرف بکر بن وائل کا قبیلہ تھا اور دوسری طرف بنو تمیم رہتے تھے، حریث بن حسان نے بکر بن وائل کے لئے اس زمین کی درخواست کی، آپنے فرمان لکھنے کا حکم دیا، اتفاق سے اس وقت ایک تمیمیہ موجود تھی، آپنے اس کی طرف دیکھا، اس نے عرض کی یا رسول اللہ! وہ اونٹوں اور بکریوں کی چراگاہ ہے، اور اسی کے پاس بنو تمیم کی عورتیں اور بچے بھی رہتے ہیں، آپنے فرمایا بیچاری سچ کہتی ہے، فرمان نہ لکھو، ایک مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے، ایک چشمہ اور ایک چراگاہ سب کو کافی ہوسکتا ہے"

---

[1] یہ تمام واقعات ابوداؤد کتاب الخراج کے مختلف ابواب میں مذکور ہیں،

مذہبی انتظامات

ملک میں امن قائم رکھنے کی غرض سے جو بعض ضروری انتظامات سرانجام پائے تھے، اُن سے زیادہ ضروری مسلمانوں کے مذہبی امور کے انتظامات کا مسئلہ تھا، یہودیوں میں مذہبی فرائض کے ادا کرنے کے لئے ایک مخصوص خاندان مقرر تھا، اس کے علاوہ کسی اور کو ان خدمات کی بجاآوری کا حق حاصل نہیں ہو سکتا تھا، عیسائیوں میں گو خاندان کی تخصیص نہ تھی لیکن ان میں ایک خاص طبقہ پیدا ہو گیا تھا جس نے ان خدمات کو اپنا حق قرار دے لیا تھا، ہندوؤں میں غیر برہمن کسی مذہبی خدمت کا مستحق نہیں، دنیا کی دوسری قوموں کا بھی یہی حال تھا لیکن جو شریعت محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا میں قائم کی، اس میں مخصوص اشخاص مخصوص خاندان، اور مخصوص طبقہ کی حاجت نہ تھی، بلکہ ہر شخص جو اسلام کا کلمہ گو تھا، اس رتبہ کا مستحق ہو سکتا تھا،

دعاۃ اور معلمین اسلام ایک مشہور مغربی مورخ نے لکھا ہے کہ "مدینہ میں آکر اسلام نبوت کا منصب چھوڑ کر سلطنت بن گیا تھا، اور اب اسلام کے معنی بجائے اسکے کہ خدا پر ایمان لایا جائے یہ رہ گئے تھے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی حکومت تسلیم کر لیجائے"[1] اسلام کا مقصد وہ تھا جو خدا نے قرآن مجید میں بیان کیا ہے،

اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِى الْاَرْضِ اَقَامُوا	وہ لوگ جن کو ہم زمین میں اگر طاقت دیں تو نماز
الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ	قائم کریں، زکوٰۃ دیں، اچھی باتوں کا حکم دیں

[1] دیکھو ولہاوسن صاحب آرٹیکل اسلام پر (انسائیکلوپیڈیا)

وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ (حج) اور بری باتوں سے روکیں)

اس بنا پر ہر مسلمان واعظ بھی ہوتا تھا، اور محتسب بھی، داعی مذہب بھی اور ماہر شریعت بھی،

یہی وجہ ہے کہ یا تو اسلام سے پہلے عرب میں اس قدر جہالت پائی جاتی تھی، کہ شرفا میں لکھنا پڑھنا عیب خیال کیا جاتا تھا، یا ایک ایک گھر فقہ، حدیث اور تفسیر کا دار العلم بن گیا، تاہم چونکہ ہر شخص کو تفقہ و تدریس کا کافی وقت نہیں مل سکتا تھا، اس لئے یہ ضروری قرار دیا گیا کہ جماعت اور ہر قبیلہ میں کچھ ایسے لوگ موجود رہیں، جو تعلیم وارشاد کا فرض انجام دے سکیں، اسی بنا پر قرآن مجید میں حکم آیا،

وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُوْنَ لِيَنْفِرُوْا كَافَّةً فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ وَلِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ اِذَا رَجَعُوْآ اِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُوْنَ (توبہ - ۱۴)

اور سب کے سب مسلمان تو سفر کرکے (مدینہ) نہیں آسکتے اسلئے ہر قبیلہ سے ایک گروہ کو آنا چاہئے تاکہ وہ شریعت (دین) میں تفقہ حاصل کریں، اور تاکہ واپس جاکر اپنی قوم کو ڈرائیں، شاید یہ لوگ بری باتوں سے بچیں،

ان کی تعلیم و تربیت

چونکہ مقصد یہ تھا کہ ایک ایسی جماعت تیار کی جائے جو نہ صرف شریعت کے اوامر و نواہی سے واقف ہو، بلکہ شب و روز آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی خدمت میں رہنے سے تمام تر اسلامی رنگ میں ڈوب جائے جس کی گفتار، کردار، بات چیت نشست و برخاست، قول و عمل ایک ایک چیز تعلیم نبوی کے پرتو سے منور ہو جائے، تاکہ وہ تمام ملک کے لئے اسوۂ حسنہ اور نمونۂ عمل بن سکے، اس لئے عرب کے ہر قبیلہ سے ایک جماعت آتی تھی، اور آپ کی خدمت میں رہ کر تعلیمات سے بہرہ اندوز ہوتی تھی،

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے،

کان ینطلق من کل حی من العرب عصابۃ

عرب کے ہر قبیلہ کا ایک گروہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس

فیاتون النبی صلی اللہ علیہ وسلم فیسألونه	جاتا تھا، اور آپ سے مذہبی امور دریافت
عما یریدون من امر دینھم	کرتا تھا، اور دین میں تفقہ حاصل
ویتفقھوا فی دینھم[۱]	کرتا تھا،

داعیان اسلام جو اطراف عرب میں بھیجے جاتے تھے، اُن کو ہدایت کی جاتی تھی کہ لوگوں کو اس بات پر آمادہ کریں کہ وطن چھوڑ کر مدینہ میں آجائیں، اور یہیں بود و باش اختیار کریں، اس کا نام ہجرت تھا، اس بنا پر بیعت کی دو قسمیں کر دی گئی تھیں، بیعت اعرابی اور بیعت ہجرت بیعت اعرابی صرف اُن بدوؤں کے لئے تھی، جن کو کچھ دنوں مدینہ منورہ میں رکھ کر تعلیم دینا مقصود تھا، مختصر مشکل الآثار میں روایت ہے کہ عقبہ جہنی جب اسلام لائے، تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے دریافت کیا کہ بیعت اعرابی کرتے ہو یا بیعت ہجرت، اس کے بعد مصنف لکھتا ہے:-

ان البیعة من المھاجر توجب الاقامة	ہجرت کی بیعت کرنے سے لازم ہو جاتا ہو کہ آنحضرت
عندہ صلی اللہ علیہ وسلم لیصرف فیما	صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس قیام کرے تاکہ آنحضرت صلی اللہ
یصرفه فیه من امور الاسلام	علیہ وسلم ان کو اسلامی امور میں لگائیں اور بیعت اعرابی
بخلاف البیعة الاعرابیة	میں یہ ضرور نہیں،

اسی بنا پر عرب کے بہت سے خاندان اپنے گھروں سے ہجرت کرکے مدینہ میں چلے آئے تھے حضرت ابو موسیٰ اشعری آئے تو اسی شخصوں کو لے کر آئے، اور مدینہ میں آباد ہوئے خلاصة الوفا سے معلوم ہوتا ہے، کہ مدینہ میں جہینہ وغیرہ قبائل کی الگ الگ مسجدیں تھیں، یہ وہی قبائل تھے

---

[۱] تفسیر خازن سورہ توبہ آیت وما کان المومنون لینفروا کافة،

جو ہجرت کرکے مدینہ آگئے تھے، اور چونکہ مسجد نبوی سب کے لئے کافی نہ تھی، اس لئے الگ الگ مسجدیں بن گئی تھیں،

تعلیم وارشاد کے مختلف طریقے تھے،

ایک یہ کہ دس بیس دن یا مہینہ دو مہینہ رہ کر عقائد اور فقہ کے ضروری مسائل سیکھ لیتے تھے اور اپنے قبائل میں واپس جاتے تھے، اور اُن کو تعلیم دیتے تھے، مثلاً مالک بن الحویرثؓ جب سفارت لے کر آئے تو بیس دن قیام کیا، اور ضروری مسائل کی تعلیم حاصل کی، جب چلنے لگے تو آپ نے فرمایا:۔

ارجعوا الی اھلیکم فعلموھم ومروھم	اپنے خاندان میں واپس جاؤ، ان میں رہکر
وصلوا کما رأیتمونی اصلی،	اُن کو احکام شریعت کی تعلیم دو، اور جس طرح
(بخاری باب رحمۃ البھائم)	مجھ کو نماز پڑھتے دیکھا ہے اسی طرح نماز پڑھو

دوسرا مستقل طریقہ درس کا تھا، یعنی لوگ مستقل طریقہ سے مدینہ میں رہتے تھے، اور عقائد شریعت اور اخلاق کی تعلیم پاتے تھے؛ اُن کے لئے صفہ خاص درسگاہ تھی، اور اس میں زیادہ تر وہ لوگ قیام کرتے تھے، جو تمام دنیاوی تعلقات سے آزاد ہو کر شب و روز زہد و عبادت اور زیادہ تر خدمت علم میں مصروف رہتے تھے،

مشکوٰۃ کتاب العلم میں روایت ہے کہ ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں تشریف لیگئے، اس وقت مسجد میں دو حلقے تھے، حلقۂ ذکر، اور حلقۂ درس، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حلقۂ درس میں جاکر بیٹھ گئے، اس وقت کی اصطلاح میں ان طالبان علم کو قرأ کہتے تھے، چنانچہ صحیح بخاری وغیرہ میں ہر جگہ

یہی نام آتا ہی، عرینہ میں جو لوگ تعلیم و ارشاد کے لئے گئے تھے، اور کفار نے اُن کو دھوکے سے شہید کر دیا تھا، وہ اسی درس گاہ کے تربیت یافتہ تھے، اور کتبِ حدیث میں ان کا نام اسی لقب (قراء) کیساتھ آیا ہی، اربابِ سیر نے لکھا ہی کہ ان لوگوں میں سے جب کوئی شادی کر لیتا تھا، تو اس جماعت سے نکل آتا تھا، اور اُن کے بجائے دوسرے لوگ داخل ہوتے تھے،

اصحابِ صفہ اگرچہ اس قدر مفلس اور نادار تھے کہ کسی کے پاس ایک کپڑے سے زیادہ نہیں ہوتا تھا جس کو گردن سے باندھ کر گھٹنوں تک چھوڑ دیتے تھے، کہ چادر اور تہمد دونوں کا کام دیتا تھا، تاہم یہ لوگ پاؤں توڑ کر نہیں بیٹھتے تھے، بلکہ جنگل میں جاکر لکڑیاں چُن لاتے تھے،[1] اور ان کو بیچکر آدھا خیرات کر دیتے تھے، اور آدھا اخوانِ طریقت میں تقسیم ہوتا تھا، اس بنا پر تعلیم اور درس کا وقت رات کو مقرر کیا گیا، بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہی کہ اس درسگاہ کے معلمین میں حضرت عبادہ بن الصامت بھی تھے، جو مشہور صاحبِ علم تھے، اور جن کو حضرت عمرؓ نے زمانۂ خلافت میں تعلیم فقہ و قرآن کے لئے فلسطین بھیجا تھا، ابو داؤد میں حضرت عبادہ بن الصامت سے روایت ہی،

علّمت ناسًا من اھل الصفة القرآن	میں نے اصحابِ صفہ میں سے چند لوگوں کو
والکتاب فاھدیٰ الی رجل منھم	قرآن مجید اور لکھنے کی تعلیم دی اس کے صلہ
قوسًا، (ص ۱۲۹ جلد دوم)	میں مجھکو ایک شخص نے ایک کمان تحفہ میں دی،

ایک روایت میں یہ بھی ہی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عبادہؓ کو اس تحفہ کے قبول کرنے کی اجازت نہیں دی، بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ درسگاہ صفہ کے علاوہ اور بھی کوئی جگہ تھی، جہاں

[1] صحیح بخاری غزوۂ بیر معونہ،

اصحابِ صفہ رات کو تعلیم پاتے تھے، مسند امام ابن حنبل میں ہے:

عن انس کانوا سبعین فکانوا اذا جنھم	حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ اصحابِ صفہ میں سے
اللیل انطلقوا الی معلم لھم بالمدینۃ	ستر شخص رات کو ایک معلم کے پاس جاتے تھے
فیدرسون اللیل حتی یصبحوا (جلد ۳ ص ۱۳۷)	اور صبح تک درس میں مشغول رہتے تھے،

عرب میں لکھنے پڑھنے کا رواج بہت کم تھا، لیکن اسلام آیا تو تحریر وکتابت کا فن بھی گویا ساتھ لیکر آیا، سب سے بڑی ضرورت قرآن مجید کے ضبط وتدوین کی تھی، اس بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے شروع ہی سے کتابت کی ترویج کی طرف توجہ فرمائی، جنگِ بدر کے ذکر میں گذر چکا ہے کہ اسیرانِ جنگ میں سے جو لوگ فدیہ نہیں ادا کر سکے، ان کو اس شرط پر رہا کیا گیا کہ مدینہ میں رہکر لوگوں کو لکھنا سکھا دیں، ابوداؤد کی مذکورۂ بالا حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ اصحابِ صفہ کو جو تعلیم دیجاتی تھی، اس میں لکھنا بھی داخل تھا، چنانچہ حضرت عبادہؓ قرآن مجید کے ساتھ لکھنے کی بھی تعلیم دیتے تھے،

مساجد کی تعمیر | (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم) اگرچہ ترفہ وجاہ پرستی سے طبعاً نفور تھے، اور اسلیے اینٹ اور مٹی پر صرفِ زر ناپسند فرماتے تھے، تاہم چونکہ اسلام کی تمام تحریکات کا مقصد صرف رفع ذکر اور تسبیح و تقدیسِ الٰہی تھا، اس بنا پر ہر قبیلہ کو مسلمان ہونے کے ساتھ سب سے پہلے مسجد کی ضرورت پیش آتی تھی، ایک سبب اس کا یہ بھی تھا کہ یہ مسجدیں صرف نماز ہی پڑھنے کے کام میں نہیں آتی تھیں بلکہ درحقیقت یہ تمام قریہ یا اہلِ محلہ کو دن رات میں پانچ بار ایک جگہ جمع کر کے اُن کی اجتماعی اور اتحادی قوت کو روز بروز اور زیادہ ترقی دینے کا ذریعہ بھی بنتی تھیں، اس لئے آپ باجماعت نماز پڑھنے کی سخت تاکید فرماتے تھے،

لہ اضافہ تا ختم باب "موذنین"

(النبی)

خود مدینہ کے اندر بہت سے قبائل آباد تھے، ہر قبیلہ کا الگ الگ محلہ تھا، اور ہر محلہ میں ایک ایک مسجد تھی،

ابوداؤد نے کتاب المراسیل میں بسند لکھا ہے کہ صرف مدینہ کے اندر آپکے زمانہ میں ۹ مسجدیں تھیں، جہاں الگ الگ جماعتیں ہوتی تھیں، اُن کے نام یہ ہیں، [1] مسجد بنی عمرو، [2] مسجد بنی ساعدہ، [3] مسجد بنی عبید، [4] مسجد بنی سلمہ، [5] مسجد بنی رایح، [6] مسجد بنی زریق، [7] مسجد غفار، [8] مسجد اسلم، [9] مسجد جہینہ، ان کے علاوہ متفرق روایات میں مختلف قبائل کی حسب ذیل مسجدوں کا اور پتہ لگتا ہے، [10] مسجد بنی خدارہ، [11] مسجد بنی اُمیہ، (انصار کا ایک قبیلہ تھا) [12] مسجد بنی بیاضہ [13] مسجد بنی الحبلی، [14] مسجد بنی عصیہ [15] مسجد ابی فیصل، [16] مسجد بنی دینار، [17] مسجد ابی ابن کعب، [18] مسجد النابغہ [19] مسجد ابن عدی، [20] مسجد بلحارث بن خزرج، [21] مسجد بنی حطمہ [22] مسجد الفضیح، [23] مسجد بنی حارثہ، [24] مسجد بنی ظفر، [25] مسجد بنی عبدالاشہل، [26] مسجد واقم، [27] مسجد بنی معاویہ، [28] مسجد عاتکہ، [29] مسجد بنی قریظہ [30] مسجد بنی وایل، [31] مسجد الشجرہ، [1]

روایتوں سے یہ بھی ثابت ہے کہ اشاعتِ اسلام کیساتھ مدینہ سے باہر عرب کے گوشہ گوشہ میں مسجدیں بنتی جاتی تھیں، جہاں دن میں پانچ بار خدا کا نام پکارا جاتا تھا، آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے غزوات میں معمول کرلیا تھا کہ رات بھر انتظار فرماتے تھے، صبح کو جہاں سے اذان کی آواز آتی، وہاں حملہ نہ فرماتے، چنانچہ ایک سفر جہاد میں آپکے کانوں میں ایک طرف سے اللہ اکبر کی آواز آئی، تو آپ نے فرمایا یہ تو فطری شہادت ہے، اس کے بعد آپنے اَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللہ کی آواز سُنی تو فرمایا آگ سے نجات ہوگی، صحابہ نے ادھر اُدھر نگاہ دوڑائی تو معلوم ہوا کہ بکری کے چرواہے کی آواز ہے، [2]

تمام مجاہدین اسلام کو بھی یہی حکم تھا، چنانچہ ایک بار آپنے ایک سریہ کو روانہ کیا تو یہ وصیت فرمائی

---

[1] یہ تمام تفصیل عینی شرح بخاری جلد ۲ ص ۴۶۸ سے ماخوذ ہے [2] صحیح مسلم جلد اول کتاب الاذان باب الامساک عن الاغارہ علی قوم فی دار الکفر اذا سمع فیھم الاذان،

اذا رأیتم مسجدًا او سمعتم	اگر کہیں مسجد دیکھو یا اذان کی آواز
صوتًا فلا تقتلوا احدًا [۱]	سنو تو وہاں کسی شخص کو قتل نہ کرو،

ان روایتوں سے ایک طرف تو عہدِ نبوت میں اشاعتِ اسلام کی وسعت کا اندازہ ہوتا ہے، اور دوسری سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جو قبائل اسلام لائے تھے، انھوں نے الگ الگ مسجدیں تعمیر کر لی تھیں، اور ان میں پنج وقتہ غلغلۂ تکبیر و اذان بلند ہوا کرتا تھا،

اگرچہ اس وقت کی عام غربت اور سادگی کی وجہ سے جو مسجدیں تعمیر ہوئی تھیں، وہ ایک زمانۂ ممتد تک قائم نہیں رہ سکتی تھیں، اس نے ان باقیات صالحات کا بہت بڑا حصہ صفحۂ ہستی سے مٹ گیا، اور اُن کے ساتھ ان کا نام اور اُن کی تاریخ بھی مٹ گئی، تاہم جو مسجدیں مدتوں قائم رہیں، ان کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے، کہ عرب کا کوئی گوشہ ان مذہبی یادگاروں سے خالی نہ تھا،

عرب کے عام قبائل سے بحرین کا ایک قبیلہ عبد القیس اسلام لا چکا تھا، اس قبیلہ نے ایک مسجد تعمیر کی تھی، چنانچہ اسلام میں مسجد نبوی کے بعد سب سے پہلے جمعہ کی نماز اسی مسجد میں ادا کی گئی، بخاری کتاب الجمعہ میں ہے،

عن ابن عباس انہ قال ان اول جمعۃ جمعت بعد جمعۃ فی مسجد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی مسجد عبد القیس بجواثی من البحرین.	حضرت عبد اللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ مسجد نبوی کے بعد پہلا جمعہ قبیلہ عبد القیس کی مسجد میں پڑھا گیا، جو بحرین کے ایک گاؤں

بخاری کتاب الجمعہ

اہل طائف جب اسلام لائے تو آپ نے ہدایت فرمائی کہ خاص اس جگہ مسجد تعمیر کرائیں،

[۱] ابوداؤد کتاب الجہاد فی دعاء المشرکین، ج۱، نسائی کتاب المساجد ص ۱۱۸۔

جہاں ان کا بت نصب تھا[1] حضرت طلق بن علیؓ سے روایت ہے کہ جب ہماری قوم کے لوگ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور ہم نے عرض کی کہ ہماری ملک میں ایک گرجا ہے تو آپ نے اپنے وضو کا پانی عنایت فرمایا، اور ہدایت کی کہ گرجے کو توڑ ڈالو، اور وہاں یہ پانی چھڑک کر مسجد بنالو، چنانچہ جب وہ لوگ واپس آئے تو حسب ارشاد مسجد تعمیر کرلی،[2]

اس قسم کی مسجدیں اگرچہ عرب کے گوشہ گوشہ میں تعمیر ہوئی ہوں گی، لیکن عموماً احادیث کی کتابوں سے صرف اُن مسجدوں کا حال معلوم ہوسکتا ہے جو مدینہ اور حوالیِ مدینہ میں تعمیر ہوئیں، صحیح مسلم میں ہے کہ حوالیٔ مدینہ میں انصار کے جو گاؤں آباد تھے، عاشورا کے دن آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ایک دن ان میں منادی کرادی کہ جو لوگ روزہ دار ہیں، وہ اپنے روزے کو پورا کرلیں، اور جو لوگ افطار کر چکے ہیں، وہ بقیہ دن روزہ رکھیں، اس اعلان کے بعد صحابہ نے اس پر اس شدت کے ساتھ عمل کیا کہ خود روزے رکھتے تھے، اور اپنے بچوں سے روزے رکھواتے تھے، یہاں تک کہ ان کو گھر سے باہر مسجد میں لیجا کر رکھتے تھے، اور جب وہ کھانے کے لئے روتے تھے، تو اُن کو اُن کے بنے ہوئے کھلونوں سے بہلاتے تھے،[3]

امام بخاری نے صحیح بخاری میں ایک مستقل باب باندھا ہے، کہ "مساجد کو اشخاص کی طرف منسوب کیا جاسکتا ہے یا نہیں؟" اور اس باب کے تحت میں جو حدیث لائے ہیں، اُس میں بہ تصریح مسجد بنی زریق کا نام لیا ہے، حضرت انس بن مالکؓ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ عصر کی نماز

---

[1] زاد المعاد جلد اول ص ۵۰۴ بروایت ابو داؤد الطیالسی [2] سنن نسائی کتاب المساجد ص ۱۱۰ [3] صحیح مسلم کتاب الصیام باب من اکل فی عاشوراء فلیکف بقیہ یومہ

پڑھ کر اپنے محلہ میں آتے تھے، یہاں لوگ مسجد میں منتظر رہتے تھے، وہ آکر کہتے تھو کہ مسجد نبویؐ میں نماز ہو چکی، تب لوگ یہاں نماز پڑھتے تھے[1]، ان روایتوں سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ ان قبائل کی مسجدیں الگ الگ تھیں، صحاح کی روایتوں سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ بعض لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ شریک جماعت ہوتے تھے، اور پھر اپنے محلہ کی مسجد میں جاکر اپنی قوم کی امامت کرتے تھے، چنانچہ حضرت معاذ بن جبلؓ کا اسی پر عمل تھا، مدینہ میں جو قبائل آباد تھے، اُن کے علاوہ جو قبائل ہجرت کرکے آتے تھے، وہ بھی اپنی مسجد تعمیر کر لیتے تھے، چنانچہ طبقات ابن سعد میں ہے،

ولجهينة مسجد بالمدينة،[2] مدینہ میں جہینہ کی ایک مسجد ہے،

قبائل کی ضروریات کے علاوہ مسجدوں کی تعمیر کا ایک بڑا سبب یہ ہوتا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم راہ میں جہاں کہین نماز پڑھتے تھے، وہاں صحابہ تبرکاً مسجد تعمیر کر لیتے تھے، امام بخاری نے صحیح بخاری میں مستقل باب باندھا ہے، جس کا عنوان یہ ہے باب المساجد التی علی طرق المدینة و المواضع التی صلی فیها النبی صلی اللہ علیہ وسلم، یعنی وہ مسجدیں جو مدینہ کے راستوں اور اُن مقامات میں واقع ہیں، جہاں آپ نے نماز پڑھی ہے، اور اس کے تحت میں اس قسم کی متعدد مسجدوں کا نام لیا ہے، اور حافظ ابن حجر نے ان کے حسب ذیل نام گنائے ہیں،

مسجد قبا، مسجد الفضیح، مسجد بنی قریظہ، مشربہ ام ابراہیم، مسجد بنی ظفر، یا مسجد بغلہ، مسجد بنی معاویہ، مسجد فتح، مسجد قبلتین، حافظ ابن حجر نے یہ بھی لکھا ہے[3] کہ مدینہ اور اطراف مدینہ میں جو مسجدیں منقش پتھروں سے تعمیر ہوئی ہیں، ان سب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز ادا فرمائی ہے، کیونکہ حضرت

---

[1] مسند ابن حنبل ج ۳ ص ۲۳۲ [2] طبقات ابن سعد جزء رابع ص ۷۱ [3] فتح الباری ج اول ص ۴۷۱،

عمر بن عبدالعزیزؓ نے جب ان مساجد کی تجدید کی تھی، تو اہل مدینہ سے اسکی تحقیق کر لی تھی)[1]

ائمۂ نماز کا تقرر (مساجد کی تعمیر کے ساتھ ساتھ یہ بھی ضروری تھا کہ مختلف قبائل کے لئے الگ الگ امام مقرر کر دیئے جائیں، عموماً عادتِ شریف یہ جاری تھی کہ جو قبیلہ مسلمان ہو جاتا، اس میں جو شخص سب سے زیادہ حافظ قرآن ہوتا، وہی امام مقرر کر دیا جاتا، اور اس شرف میں چھوٹے بڑے غلام آقا سب برابر تھے، آپ کی تشریف آوری سے پہلے مدینہ میں جو مہاجرین آچکے تھے، ان کے امام حضرت ابو حذیفہؓ کے آزاد کردہ غلام سالمؓ تھے، جرم کا قبیلہ جب اسلام لایا تو عمرو بن سلمہ جرمی اس وقت سات یا آٹھ برس کے کم سن بچہ تھے، لیکن چونکہ اپنے قبیلہ میں قرآن کے سب سے بڑے حافظ وہی تھے، اس لئے وہی امام قرار پائے،

امامت کے انتخاب کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے چند اصول مقرر فرما دیئے تھے

عن ابی مسعود الانصاری قال	ابو مسعود انصاریؓ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ
قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یؤم القوم	علیہ وسلم نے فرمایا کہ جماعت کی امامت وہ کرے
اقرأهم لکتاب اللہ فان کانوا فی القرآۃ	جو سب سے زیادہ کلام اللہ پڑھا ہو، اگر اس میں
سواء فاعلمھم بالسنۃ فان کانوا فی	سب برابر ہوں تو جو سنت سے سب سے زیادہ واقف
السنۃ سواء فاقدمھم ھجرۃ فان کانوا	ہو، اگر اس میں بھی مساوات ہو تو جس نے پہلے
فی الھجرۃ سواء فاقدمھم سناً (مسلم)	ہجرت کی تھی، اور اس میں بھی سب برابر ہوں تو

(یہ بعض کی عمر زیادہ ہو)

جب کوئی ایسا قبیلہ خدمت اقدس میں حاضر ہوتا تو آپ پوچھتے کہ تم میں سب سے زیادہ

[1] فتح الباری جلد اول ص ۷۰۴،

حافظِ قرآن کون ہے، اگر کوئی ایسا شخص ہوتا، تو لوگ اس کا نام لیتے، اور آپ اس کو اس عہدہ پر خود ممتاز فرماتے، چنانچہ اہلِ طائف کے امام عثمان بن ابی العاص اسی طرح مقرر ہوئے تھے[1] اور سب مساوی الحیثیت ہوتے، تو ارشاد ہوتا، تم میں جو بڑا ہو، وہ جماعت کی امامت کرے، مالک بن حویرث رضؓ جب اپنی قوم کی طرف سے بارگاہ نبوت میں حاضر ہوئے، تو آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے بھی ارشاد فرمایا،

مدینہ میں مدینہ سے باہر اطراف میں، عرب کے مختلف صوبوں میں جہان جہان مسجدین تعمیر ہوئی تھیں، ظاہر ہی کہ وہان ہر جگہ الگ الگ امام مقرر ہوئے ہوں گے جن قبائل میں عمّال مقرر ہوتے تھے، وہی ان کے امام بھی ہوتے تھے، بڑے بڑے مقامات میں یہ دونوں عہدے الگ الگ ہوتے تھے، عمّان میں حضرت عمرو بن العاص رضؓ عامل تھے، اور ابو زید انصاری رضؓ امام[2] لیکن افسوس ہے کہ احادیث وسیر کی کتابوں میں نام بنام ان کی یکجا تفصیل مذکور نہیں ہے ضمنی واقعات میں جہانتک انکا سراغ لگ سکا ہے، وہ حسب ذیل ہے،

نام	مقام تقرر	کیفیت
مصعب بن عمیر رضؓ	مدینہ منورہ	ہجرت نبوی سے پہلے انصار کی امامت کرتے تھے، (ابن ہشام ذکر بیعت عقبہ)
سالم مولی ابی حذیفہ رضؓ	"	آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی تشریف آوری سے پہلے مہاجرین کے امام تھے (بخاری وابوداود)

[1] مسند ابن حنبل، جلد ۴ صفحہ ۲۱۸ [2] فتوح البلدان بلاذری،

نام	مقام تقرر	کیفیت
ابن ام مکتوم رض	مدینہ منورہ	جب آپ مدینہ سے باہر غزوات میں تشریف فرما ہوتے تو اکثر صحابہ بھی ہمرکاب ہوتے لیکن چونکہ یہ آنکھوں سے معذور تھے، اس لئے مدینہ ہی میں رہتے تھے، اس سبب سے اس موقع پر انہی کو آپ امام مقرر فرما جاتے (ابوداؤد)
ابوبکر صدیق رض	"	آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی عدم تشریف آوری پر مسجد نبوی میں امام ہوتے تھے، (صحیح بخاری)
عتبان بن مالک رض	بنو سالم	اپنے قبیلہ کے امام تھے، (ابوداؤد ونسائی)
معاذ بن جبل رض	بنو سلمہ	" (بخاری وغیرہ)
ایک انصاری	مسجد قبا	" (بخاری)
عمرو بن سلمہ رض	بنو جرم	(ابوداؤد ونسائی)
اسید بن حضیر رض		" (ابوداؤد)
انس بن مالک رض یا کوئی	بنو نجار	" (امام کا نام مشکوک ہے)
دوسرے صحابی	.	(مسند جلد ۳ صفحہ ۲۳۲)
مالک بن حویرث رض	.	" (ابوداؤد)
عتاب بن اسید رض	مکہ معظمہ	" (نسائی[1])

[1] کتب مذکورہ کی کتاب الصلوٰۃ سے یہ نام ملتقط ہیں،

نام	مقام تقرر	کیفیت
عثمان رضؓ بن ابی العاص	طائف	اپنے قبیلہ کے امام تھے، (ذکر وفد طائف)
ابو زید انصاری رضؓ	عمان	" (بلاذری ذکر عمان)

موذنین (عام طور پر اذان کے لئے کوئی خاص شخص منتخب نہیں کیا جاتا تھا، تاہم چند مثالوں سے قیاس ہوتا ہے کہ بڑی بڑی مسجدوں میں یہ عہدہ الگ آپ نے قائم فرمایا تھا، چنانچہ مکہ معظمہ اور مدینہ طیبہ میں اس عہدہ پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان صاحبوں کو ممتاز فرمایا تھا،

بلال بن رباح رضؓ	مدینہ منورہ	موذن مسجد نبوی
عمرو بن ام مکتوم قرشی رضؓ	"	"
سعد القرظ	عوالی مدینہ	موذن مسجد قبا
ابو محذورہ[۱] جمحی قرشی رضؓ	مکہ مکرمہ	موذن مسجد حرام)

[۱] نسائی صفحہ ۱۰۰

تاسیس وتکمیلِ شریعت

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا

آج ہم نے تمہارا مذہب کامل کر دیا اور اپنی نعمت تم پر تمام کردی، اور اسلام کو تمہارے لئے مذہب پسند کیا،

(یہ تمام انتظامات اور نظم ونسق اسلام کا حقیقی نصب العین نہ تھا، بلکہ جیسا کہ بہ تفصیل اوپر بیان کیا جا چکا ہے، یہ اس لئے تھا کہ ملک میں امن وامان پیدا ہو، اور ایک منتظم اور باقاعدہ حکومت کا وجود ہو، تاکہ مسلمان بے روک ٹوک اور بلا مزاحمت اپنے مذہبی فرائض انجام دے سکیں، صحیح بخاری میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے کسی نے اس آیت کے معنی پوچھے،

وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ	ان کافروں سے جہاد کرو یہانتک کہ
وَيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ،	فتنہ نہ رہے، اور مذہب تمامتر خدا کیلئے ہو جائے

انھوں نے فرمایا کہ "یہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے زمانہ میں تھا جب اسلام کم تھا، آدمی اپنے مذہب کی بنا پر فتنہ میں مبتلا ہو جاتا تھا، لوگ اس کو قتل کر دیتے تھے، اب جب اسلام ترقی کر گیا، تو کوئی فتنہ نہیں رہا[1]")

ہجرت سے آٹھ برس تک کا زمانہ تمامتر ان ہی فتنوں کی دار وگیر، مخالفوں کی شورشوں اور ہنگاموں کی مدافعت اور ملک میں امن وامان قائم کرنے میں گذرا، اسی لئے آٹھ برس کی وسیع

---

(۱) بخاری جلد ۲ ص ۶۷۰ تفسیر سورۂ انفال)

مدت میں فرائضِ اسلام سے ہٹ کے جو چیز ہر جگہ اور ہر موقع پر نمایاں نظر آتی ہے وہ صرف جہاد ہے
یہی وجہ ہے کہ تاریخ میں ایک ایک غزوہ کی تفصیل سیکڑوں صفحات میں ہے لیکن نماز، روزہ، زکوٰۃ
کے متعلق دو دو چار چار سطروں سے زیادہ واقعات نہیں ہیں وہ بھی اس طرح کہ جب کوئی سنہ ختم
ہوتا ہے تو اس قدر لکھ دیتے ہیں کہ اسی سال فرض نماز کی رکعتیں دو سے چار ہوگئیں،

اس کی وجہ یہ نہیں کہ خدانخواستہ اربابِ سیر دیگر فرائض کی اہمیت اور عظمت پیش نظر نہیں
رکھتے تھے، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ غزوات کی مصروفیت (اور ملک کی بدامنی) کی وجہ سے اکثر فرائض دیر
میں فرض ہوئے اور جو پہلے فرض ہو چکے تھے، اُن کی تکمیل بھی بتدریج اسی زمانہ میں ہوتی رہی جس کے
لیل و نہار زیادہ تر مخالفین کے تیر باران کے روکنے میں بسر ہو گئے،

(جن احکام کا تعلق قانون ملکی سے تھا، وہ اس وجہ سے نازل نہ ہو سکے، کہ ابتک اسلام
کوئی حکمراں طاقت نہ تھا، خالص مذہبی فرائض اور احکام بھی رفتہ رفتہ اسی زمانہ میں نازل ہوتے
رہے اور بتدریج جیسے جیسے اُن کے مناسب حالات پیدا ہوتے جاتے تھے، وہ تکمیل کو پہنچ رہے تھے،
سب سے بڑا نکتہ احکام کے تدریجی نزول میں یہ تھا کہ اُن سے مقصود محض عربوں کو انکا بتا دینا نہیں تھا،
بلکہ عملاً اُن کی زندگی کو اُن پر کاربند بنا دینا تھا، اس لئے نہایت آہستہ آہستہ بتدریج ترتیب کے
ساتھ اُن کو آگے بڑھایا گیا، اسی نکتہ کو حضرت عائشہؓ نے نہایت خوبی سے بیان فرمایا ہے کہ
"پہلے عذاب و ثواب کی آیتیں نازل ہوئیں، جب دلوں میں استعداد اور رقت پیدا ہوگئی تو
احکام نازل ہوئے ورنہ اگر پہلے ہی دن یہ حکم ہوتا کہ شراب نہ پیو[1] تو کون مانتا ہے"

[1] صحیح بخاری باب تالیف القرآن،

الغرض ان مختلف اسباب کی بنا پر اسلام کے اکثر فرائض اور احکام اُس وقت تکمیل کو پہونچے جب تمام ملک میں امن و امان قائم ہوگیا) مکہ معظمہ کے قیام تک روزہ سرے سے فرض نہیں ہوا، مدینہ منورہ میں روزے فرض ہوئے لیکن زکوٰۃ کی فرضیت سات آٹھ سال کے بعد ہوئی، اس کی وجہ یہی تھی کہ رات دن کی معرکہ آرائیوں سے مالی حالت اس حد تک پہونچنے کہاں پائی تھی کہ زکوٰۃ کی فرضیت کا موقع آئے، فتح مکہ سے پہلے مسلمان اس سرزمین مقدس پر قدم نہیں رکھ سکتے تھے، اسلئے اُس وقت تک حج بھی فرض نہ ہوا، نماز روزانہ کا فرض ہے، اور یہ فرض اسلام کے وجود کیساتھ آیا لیکن اسکی تکمیل بتدریج ہجرت کے چھ سات برس کے بعد ہوئی، ۵ھ تک نماز میں بات چیت کرنا جائز تھا، اور کوئی باہر کا آدمی سلام کرتا تو نمازی عین نماز میں جواب دیتے تھے، جیسا کہ ابو داؤد وغیرہ میں متعدد روایتیں[۱] مذکور ہیں؛ غرض فتح مکہ کے بعد جب کفر کا زور ٹوٹ گیا، اور تمام ملک میں امن و امان قائم ہوگیا تو یہی احکام کی تفصیل اور نظامِ شریعت کی تکمیل کا موقع آیا احکام بہت سے ایسے تھے جو سرے سے ابھی شروع ہی نہیں ہوئے تھے مثلاً زکوٰۃ، حج، حرمتِ ربا وغیرہ بہت سے ایسے تھے کہ ابتدائی ارکان قائم ہوگئے تھے لیکن تکمیل نہیں ہوئی تھی[۲]

---

[۱] ابو داؤد، باب ردّ السلام فی الصلوٰۃ) [۲] اسلام کے بعض احکام کے نزول اور تدریجی تکمیل کی تاریخ جلد اول کے واقعات متفرقہ کے تحت میں بھی ضمناً گذر چکی ہے، ناظرین ایک دو جگہ احکام کی تاریخ اور سنین میں یہاں سے اختلاف پائینگے، اسکے متعلق عرض ہے کہ جلد اول میں عام مورخین اور ارباب سیر کی تقلید کی گئی ہے اور یہاں احادیث اور کتب شانِ نزول سے استقراء کرکے جو امر محقق نظر آیا ہے اس کی تفصیل کی گئی ہے، اور اصل یہ ہے کہ احکام کے سنین اور تاریخیں کتب حدیث میں بالتصریح مذکور نہیں ہیں، محدثین اور ارباب روایت کے قیاسات اور استنباطات ہیں، اور اسی بنا پر باہم ان میں اختلافات ہیں، ہم نے کوشش کی ہے کہ صحیح اور معتبر دلائل کی رہنمائی سے اس راستہ کو طے کریں، والعصمۃ بید اللہ - س)

عقائد اور اسلام کے اصول اولین

(اسلام کے فرائض اولین عقائد ہیں یعنی توحید، رسالت، ملائکہ، قیامت، حشر و نشر وغیرہ پر ایمان لانا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم) پر اول اول جو وحی نازل ہوئی یعنی اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ۔ اس میں خدا کی بڑائی کے سوا کسی مخصوص عقیدہ کی تعلیم نہ تھی لیکن دوسری بار جو وحی نازل ہوئی وہ تھی

يَا أَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ قُمْ فَأَنذِرْ وَرَبَّكَ — اے چادر اوڑھنے والے اٹھ، لوگوں کو ڈرا،

فَكَبِّرْ وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ (مدثر) — اپنے پروردگار کی بڑائی کر اور بتوں کو چھوڑ دے،

اس کے بعد مکہ معظمہ کے قیام کے زمانہ میں جس قدر آیتیں نازل ہوئیں وہ بیشتر عقائد کے متعلق تھیں، شرک اور بت پرستی کی برائی، خدا کی عظمت و جلال کا اظہار، قیامت کے ہولناک سماں، اور جنت و دوزخ کا پُر اثر بیان، رسالت کے خواص اور اس کی ضرورت کے دلائل، مکہ میں تیرہ برس تک زیادہ تر یہی مطالب ادا ہوتے رہے۔

غرض عقائد کے تمام اجزا اگرچہ آغاز اسلام ہی میں لوگوں کو سنائے جا چکے تھے لیکن مکی آیتوں کے استقصار سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہر ایک کا بیان الگ الگ ہوتا تھا، عقائد کا مسلسل بیان سورہ بقرہ اور سورہ نساء میں ہے۔ اور یہ دونوں سورتیں مدینہ میں نازل ہوئیں، مکی سورتوں میں زیادہ تر زور توحید، قیامت کے اعتقاد اور رسول کی صداقت پر صرف ہوا ہے لیکن مدینہ میں

۱؎ اضافہ از خاتم باب تمیم ۲؎ صحیح بخاری تفسیر سورۂ مدثر ۳؎ صحیح بخاری باب تالیف القرآن،

آگرا اسلام کے تمام عقائد اور اصول اوّلین کی مجموعی تعلیم شروع ہوجاتی ہے،

ایمان اور اسلام کے اصولِ اوّلین کے متعلق سورۂ بقرہ کی سب سے پہلی آیت یہ ہے :-

اَلَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ وَیُقِیْمُوْنَ	جو بن دیکھے ایمان لاتے ہیں نماز کھڑی کرتے ہیں،
الصَّلٰوۃَ وَمِمَّا رَزَقْنٰھُمْ یُنْفِقُوْنَ، وَ	ہم نے جو روزی دی ہے اس سے خرچ کرتے ہیں اور
الَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ وَمَآ	جو ان باتوں پر ایمان رکھتے ہیں جو اے محمد تجھ پر
اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِکَ وَبِالْاٰخِرَۃِ ھُمْ یُوْقِنُوْنَ،	اتاری گئیں، اور تجھ سے پہلے نازل ہوئیں، اور

وسط سورہ میں یہ اصول دوبارہ ادا ہوتے ہیں،

لٰکِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ	لیکن نیکی یہ ہے کہ کوئی خدا پر، روز قیامت پر
وَالْمَلٰئِکَۃِ وَالْکِتٰبِ وَالنَّبِیّٖنَ،	فرشتوں پر، کتاب پر، پیغمبروں پر ایمان لائے

اس کے بعد نماز، روزہ، زکوٰۃ، اور بعض اخلاقی احکام گنائے گئے ہیں، یہ آیتیں تحویل قبلہ کی آیت کے ساتھ سنہ ۲ھ میں نازل ہوئیں،

اسی کی تفصیل سورہ کے آخر میں کی گئی ہے، یہ آیتیں ہجرت کے چند سال بعد غالباً نازل ہوئی ہیں، جیسا کہ حضرت عائشہؓ[1] اور ابن عباسؓ[2] کی روایتوں سے ثابت ہے،

اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْہِ مِنْ رَّبِّہٖ	پیغمبر اس پر ایمان لایا جو اس کے رب کی طرف سے
وَالْمُؤْمِنُوْنَ کُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰہِ وَمَلٰئِکَتِہٖ	اترا، اور تمام مسلمان خدا پر، خدا کے فرشتوں
وَکُتُبِہٖ وَرُسُلِہٖ،	پر، اس کی کتابوں پر اور اس کے پیغمبروں پر سب

[1] صحیح بخاری تفسیر محق اللہ الربوا، [2] اسباب النزول سیوطی، بحوالہ صحیح مسلم و مسند احمد،

سورۂ نساء کی آیت یہ ہی جس میں بالتفصیل بتایا گیا ہے کہ جو لوگ مسلمان ہو چکے ہیں، ان کے

کیا عقائد ہونے چاہئیں،

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا آمِنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ	اے وہ لوگو جو ایمان لاچکے ہو، ایمان لاؤ خدا پر،
وَالْكِتَابِ الَّذِي نَزَّلَ عَلَىٰ رَسُولِهِ وَ	اس کے رسول پر، اور اس کتاب پر جو اس نے اپنے رسول پر
الْكِتَابِ الَّذِي أَنزَلَ مِن قَبْلُ وَمَن	اتاری اور اس کتاب پر جو اس سے پہلے اتاری، اور
يَكْفُرْ بِاللَّهِ وَمَلَائِكَتِهِ وَكُتُبِهِ وَرُسُلِهِ	جو شخص خدا کا اور اس کے فرشتوں کا، اور اس کی کتابوں
وَالْيَوْمِ الْآخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلَالًا بَعِيدًا،	کا، اس کے پیغمبروں کا، اور روز آخرت کا انکار کریگا،

نساء ع ۲۰

احادیث کتاب الایمان میں بہت سے ایسے واقعات ہیں، جن میں لوگوں نے آپ سے

اسلام اور ایمان کے معنی دریافت کئے ہیں، اور آپ نے سائل کی یا وقت کی مناسبت سے مختلف جوابات

دیے ہیں، آپ نے فرمایا کہ "مجھ کو حکم دیا گیا ہو کہ میں اس وقت تک لڑوں جب تک لوگ یہ گواہی

نہ دیں کہ خدا ایک ہی، محمد خدا کا پیغمبر ہے، نمازیں پڑھیں اور زکوٰۃ دیں"،

ایک دفعہ کسی دیہات سے ایک مسلمان حاضر خدمت ہوا، اور دریافت کیا کہ اسلام کی

حقیقت کیا ہے؟ آپ نے تین چیزیں بتائیں، رات دن میں پانچ وقت کی نماز، رمضان کے روزے

اور زکوٰۃ، عبد القیس کے وفد نے ۵ھ میں حاضر ہو کر عرض کی کہ ہم دشمنوں کی مزاحمت کے سبب سے

ہمیشہ نہیں حاضر ہو سکتے، اس لئے ایسے احکام بتا دیے جائیں، جو ان لوگوں کو بھی سنا دیے جائیں

جو شرف حضوری حاصل نہیں کر سکتے، آپ نے فرمایا،

شَهَادَةُ أَن لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَأَنَّ مُحَمَّدًا	اس بات کی شہادت کہ خدا ایک ہی، محمد خدا کے

رسول اللہ واقام الصلوٰۃ وایتاء الزکوٰۃ	پیغمبر ہیں، نماز پڑھنا، زکوٰۃ دینا، رمضان کے روزے
وصیام رمضان وان تعطوا من المغنم الخمس	رکھنا اور مال غنیمت میں سے پانچواں حصہ دینا،

ایک دفعہ آپ صحابہؓ کے مجمع میں تشریف فرما تھے، اس اثنا میں ایک شخص نے آکر سوال کیا، ایمان کیا چیز ہے؟ آپ نے فرمایا "ایمان یہ ہے کہ خدا پر، فرشتوں پر، خدا کی ملاقات پر، اس کے پیغمبروں پر اور مرنے کے بعد جی اٹھنے پر یقین ہو" اس نے پوچھا اور اسلام کیا ہے؟ فرمایا "اسلام یہ ہے کہ صرف خدا کو پوجو کسی کو اس کا شریک نہ بناؤ، نماز پڑھو، فرض زکوٰۃ ادا کرو، رمضان کے روزے رکھو" اس نے پھر دریافت کیا کہ احسان کس کو کہتے ہیں؟ ارشاد ہوا، کہ خدا کی اس طرح عبادت کرو گویا کہ تم اس کو دیکھ رہے ہو، کیونکہ اگر تم اس کو نہیں دیکھتے، تو وہ تم کو دیکھ رہا ہے"

یہ اصول اسلام کا تقریباً کامل نقشہ ہے غالباً یہ سوال وجواب فتح مکہ یعنی ۸ھ سے پہلے کا واقعہ ہے، کیونکہ اس میں حج کا ذکر نہیں ہے تاہم اس قدر اطمینان حاصل ہو چکا تھا، کہ تکمیل عبادت کے لئے خضوع وخشوع کی قید بھی اضافہ کیجا سکی، اصول اسلام کا آخری اعلان یہ ہے:-

بنی الاسلام علی خمس شہادۃ ان لا الٰہ	اسلام کی بنا پانچ باتوں پر ہے، اس بات کی گواہی
الا اللہ وان محمداً رسول اللہ واقام	کہ خدا کے سوا کوئی اور خدا نہیں، محمد اس کا پیغمبر ہے،
الصلوٰۃ وایتاء الزکوٰۃ والحج وصوم رمضان	نماز پڑھنا، زکوٰۃ دینا، حج کرنا، رمضان کے روزے

رفتہ رفتہ ایمان اور اسلام کے اصول کلیہ کی جب تکمیل ہو چکی تو اس کے جزئیات اور دیگر لوازم کی بھی تعلیم دی گئی، آپ نے فرمایا کہ "ایمان کی کچھ اوپر ساٹھ شاخیں ہیں، جن میں ایک شاخ حیا ہے" ایک دفعہ فرمایا کہ "بہترین اسلام یہ ہے کہ مسلمان اس کی زبان اور ہاتھ سے محفوظ رہے" ایک در صاحب

کے جواب میں فرمایا کہ "بہترین اسلام یہ ہے کہ محتاجوں کو کھانا کھلاؤ اور کسی سے جان پہچان ہو یا نہ ہو مگر اس کو سلام کرو" یہ بھی فرمایا کہ "اس وقت تک تم مومن نہیں جبتک اپنے بھائی کے لئے وہی پسند نہ کرو جو تم اپنے لئے پسند کرتے ہو"[1]

غرض اسلام کے تمام اصول و فروع کی تعلیم اسی طرح بتدریج تکمیل کو پہونچتی گئی، اور آخر ۹ ذی الحجہ ۱۰ھ جمعہ کے روز وہ ساعت آئی، جب خدا نے فرمایا،[2]

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ — آج ہم نے تمہارا مذہب مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی

عبادات

(اوپر یہ حدیث گذر چکی ہے کہ اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر قائم کی گئی ہے، ان میں سے توحید و رسالت کے علاوہ بقیہ چار چیزیں، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ عبادت میں داخل ہیں، ان میں سب سے اول شے نماز ہے، نماز کی صحت کیلئے متعدد شرطیں ہیں، سب سے اول اور ضروری شرط طہارت ہے

طہارت — طہارت کے معنی یہ ہیں کہ جسم اور لباس، ظاہری اور معنوی ہر قسم کی نجاستوں سے پاک ہو، طہارت کو اسلام میں جو اہمیت حاصل ہے اس کا اندازہ اس سے کرو کہ دوسری ہی دفعہ کی وحی سے جب احکام اور فرائض کا آغاز ہوا تو توحید کے بعد دوسرا حکم طہارت ہی کا دیا گیا،

يَا أَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ قُمْ فَأَنْذِرْ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ (مدثر) — اے چادر اوڑھنے والے اٹھ اور ڈرا اور اپنے پروردگار کی بڑائی کر اور اپنے کپڑے پاک کر اور ناپاکی کو چھوڑ دے

اگرچہ مفسرین نے عموماً کپڑے کی طہارت سے دل کی طہارت اور "ناپاکی" سے بت پرستی مراد لی ہے،

---

[1] یہ تمام حدیثیں صحیح بخاری کتاب الایمان میں ہیں [2] صحیح بخاری تفسیر آیت مذکور،

تاہم اس سے ظاہری طہارت اور پاکیزگی کی اہمیت کا اندازہ بھی ہو سکتا ہے، نماز سے پہلے وضو کرنا فرض ہے، اس فرضیت کا ثبوت ابتدائے اسلام سے ثابت ہوتا ہے، تاریخ و سیر اور بعض روایات حدیث میں ہے کہ وضو کا طریقہ آغاز وحی ہی میں حضرت جبرئیلؑ نے آپ کو سکھایا تھا،[۱] حاکم نے مستدرک میں حضرت ابن عباسؓ سے ایک روایت کی ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ ہجرت سے پہلے بھی وضو فرماتے تھے،[۲] لیکن قرآن میں وضو کا حکم باتفاق محدثین مدینہ میں نازل ہوا،

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا قُمْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ	مسلمانو! جب نماز کے لئے کھڑے ہو تو منھ اور کہنیوں
فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ وَ اَیْدِیَكُمْ اِلَى الْمَرَافِقِ	تک ہاتھ دھولو، سر پر مسح کرو اور گھٹنوں تک
وَ امْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ وَ اَرْجُلَكُمْ اِلَى الْكَعْبَیْنِ	پاؤں دھولو،

یہ آیت سورۂ مائدہ میں ہے اور اس سورہ کی اکثر آیتیں ہجرت کے چار پانچ سال بعد کی ہیں، اس آیت کے متعلق بخاری میں تصریح ہے کہ وہ آیت تیمم کے ساتھ اتری ہے، آیت تیمم ۵ھ میں نازل ہوئی، اسی بنا پر اکثر علماء کی رائے یہ ہے کہ وضو پر عمل تو پہلے سے تھا، لیکن قرآن میں اس کی فرضیت ہجرت کے چار پانچ سال کے بعد نازل ہوئی، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابتداءً لوگ نہایت جلدی جلدی وضو کر لیتے تھے، کچھ حصہ بھیگتا تھا، کچھ نہیں بھیگتا تھا، ۶ھ میں یا اسکے بعد کے کسی سفر میں آپ مکہ سے واپس آرہے تھے، کچھ لوگ جھٹ کر تالاب کے پاس پہونچے اور جلدی جلدی ہاتھ منھ دھولیا، ایڑیاں کچھ بھیگیں، کچھ خشک رہیں، آپ نے فرمایا[۳]

ویل للاعقاب من النار اسبغوا الوضؤ	ان ایڑیوں پر دوزخ کی پھٹکار ہو، وضو کو کامل کرو،

۱؎ ابن ہشام و فتح الباری بحوالہ مغازی ابن لہیعہ ۲؎ امام احمد جلد ۴ ص ۱۶۱، و ابن ماجہ ۳؎ فتح الباری جلد ۱ ص ۲۰۵ و طبرانی فی الاوسط ۴؎ صحیح مسلم باب وجوب غسل الرجلین،

اس وقت سے "اسباغِ وضو" یعنی سکون و طمانیت کے ساتھ وضو کے تمام فرائض ادا کرنا لازم قرار دیا گیا، اسباغِ وضو کے فضائل آپ نے بیان فرمائے، ابتداءً وضو ٹوٹے یا نہ ٹوٹے، ہر نماز کے وقت تازہ وضو کرتے تھے لیکن آخر عام مسلمانوں پر جبر ہونے کے خیال سے ہر وقت ضروری نہ رہا[1] اور اس کا اعلان آپ نے عملاً فتح مکہ کے وقت فرمایا،[2]

تیمم (وضو کے لئے پانی کی ضرورت ہے لیکن ہر وقت سفر میں اس کا ملنا مشکل ہے، نیز بیماری کی حالت میں پانی کا استعمال کبھی مضر ہے، اس لئے ۵ھ میں تیمم کی آیت نازل ہوئی،

وَاِنْ کُنْتُمْ مَّرْضٰٓی اَوْ عَلٰی سَفَرٍ اَوْ جَآءَ اَحَدٌ مِّنْکُمْ مِّنَ الْغَآئِطِ اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً فَتَیَمَّمُوْا صَعِیْدًا طَیِّبًا فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِکُمْ وَاَیْدِیْکُمْ مِّنْهُ مَا یُرِیْدُ اللّٰهُ لِیَجْعَلَ عَلَیْکُمْ مِّنْ حَرَجٍ وَّلٰکِنْ یُّرِیْدُ لِیُطَهِّرَکُمْ وَلِیُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَیْکُمْ لَعَلَّکُمْ تَشْکُرُوْنَ (مائدہ)

اگر تم بیمار ہو یا سفر میں ہو یا تم میں سے کوئی جائے ضرور سے آئے یا تم نے عورتوں سے مقاربت کی ہو اور پانی میسر نہ آئے تو طاہر مٹی لے کر تیمم یعنی منھ اور ہاتھوں کا اس سے مسح کر لو، اللہ تم پر کسی طرح تنگی کرنا نہیں چاہتا، بلکہ یہ چاہتا ہے کہ تم کو پاک و صاف کر دے اور اپنا احسان تم پر پورا کر دے تا کہ تم شکر گذار ہو،

اس آیت کا شانِ نزول یہ ہے کہ غزوہ بنی مصطلق (۵ھ) سے آپ واپس آ رہے تھے ام المومنین حضرت عائشہؓ ساتھ تھیں، مدینہ کے قریب جب قافلہ پہنچا تو اتفاقاً ام المومنینؓ کا ہار کہیں گر گیا، سارا قافلہ وہیں اتر پڑا، نماز کا وقت آیا تو پانی نہ ملا، تمام صحابہ پریشان خاطر تھے

---

[1] فتح الباری بحوالہ ابو داؤد و احمد [2] صحیح مسلم،

آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کو خبر ہوئی، اتنے میں یہ آیت نازل ہوئی، مسلمانوں کو اس اجازت سے بڑی خوشی ہوئی، اسیدؓ بن حضیر ایک صحابی نے کہا "اے آل ابی بکرؓ تم لوگوں کے لیے سرمایہ برکت ہو")

نماز — آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے ساتھ فرض ہوئی[1]، چنانچہ دوسری ہی وحی میں حکم ہوا،

وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ، (مدثر) اپنے پروردگار کی بڑائی (تکبیر) بیان کر،

اس تکبیر سے مقصود بجز نماز کے اور کیا ہو سکتا ہے؟ لیکن چونکہ تین برس تک دعوت اسلام مخفی رہی اور کفار کے ڈر سے علانیہ نماز پڑھنا ممکن نہ تھا، اس لئے صرف رات کو دیر تک نماز پڑھتے رہنے کا حکم تھا، دن میں کوئی نماز فرض نہیں ہوئی، چنانچہ سورۂ مزمل میں جو ابتدائی سورتوں میں سے ہے، یہ حکم بہ تصریح مذکور ہے،

يَا أَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ قُمِ اللَّيْلَ إِلَّا قَلِيلًا نِصْفَهُ	اے کملی اوڑھ کر سونے والے! رات کو کھڑا رہا کر
أَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِيلًا أَوْ زِدْ عَلَيْهِ وَرَتِّلِ	مگر تھوڑی سی رات یعنی نصف رات یا اس نصف سے کسی
الْقُرْآنَ تَرْتِيلًا إِنَّا سَنُلْقِي عَلَيْكَ قَوْلًا	قدر کم کر دو یا نصف سے کچھ بڑھا دو، اور قرآن
ثَقِيلًا إِنَّ نَاشِئَةَ اللَّيْلِ هِيَ أَشَدُّ وَطْأً	ٹھہر ٹھہر کر پڑھ، ہم تجھ پر عنقریب ایک بھاری بات ڈالنے والے

[1] نماز کے بیان تاریخ میں محدثین مختلف الرائے ہیں، ابن حجر نے فتح الباری (جلد ۱ ص ۳۹۲) میں جو خلاصہ مباحث نقل کیا ہے، اس کا لفظی ترجمہ حسب ذیل ہے "ایک جماعت اس طرف گئی ہے کہ معراج سے پہلے رات کی غیر موقت نماز کے علاوہ کوئی اور نماز فرض نہ تھی، حربی کی رائے ہے کہ صبح و شام دو دو رکعتیں فرض تھیں، امام شافعی نے بعض اہل علم سے روایت کی ہے کہ پہلے رات کی (دیر تک) نماز فرض تھی بعد ازیں فَاقْرَءُوا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْآنِ کی آیت سے یہ منسوخ ہو گیا اور صرف تھوڑی رات تک نماز فرض رہ گئی، اس کے بعد نماز پنجگانہ نے اس حکم کو بھی منسوخ کر دیا" ہم نے نماز کی تاریخ بیان کی ہے وہ ان ہی چند سطروں کی تفصیل ہے جس کی تطبیق قرآن مجید کی چند آیتوں سے کر دی گئی ہے، اس تفصیل سے یہ گرہ بھی کھل جاتی ہے کہ قرآن مجید میں اوقات نماز کے مختلف بیانات کیوں ہیں، "س"

وَاَقْوَمُ قِيْلًا ۝ اِنَّ لَكَ فِی النَّهَارِ سَبْحًا طَوِيْلًا ۝ وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ اِلَيْهِ تَبْتِيْلًا ۝ (مزمل پہلا رکوع)

ہیں، رات کا اٹھنا نفس کو خوب زیر کرتا ہے اور وقت دعا کیلئے مناسب بھی زیادہ ہے، دن کو تجھ کو زیادہ شغل رہتا ہے، اپنے پروردگار کا نام لے۔

اس کے بعد صبح و شام کی دو دو رکعتیں اور فرض ہوئیں،

وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا ۝ وَمِنَ الَّيْلِ فَاسْجُدْ لَهٗ وَسَبِّحْهُ لَيْلًا طَوِيْلًا ۝ (دہر)

صبح و شام خدا کا نام لیا کرو اور رات کے وقت دیر تک اس کی تسبیح کیا کرو اور اسکی تسبیح بیان کرو،

رات کو دیر تک نماز پڑھنے کا جو حکم تھا ایک سال تک قائم رہا، چنانچہ حضرت عائشہؓ بیان کرتی ہیں کہ آپ کا اور اکثر صحابہؓ کا ایک سال تک اسی پر عمل رہا، نماز پڑھتے پڑھتے اُن کے پاؤں سوج جاتے تھے، ایک سال کے بعد فرضیت منسوخ[1] ہو گئی، اور حکم ہوا

اِنَّ رَبَّكَ يَعْلَمُ اَنَّكَ تَقُوْمُ اَدْنٰى مِنْ ثُلُثَیِ الَّيْلِ وَنِصْفَهٗ وَثُلُثَهٗ وَطَآئِفَةٌ مِّنَ الَّذِيْنَ مَعَكَ ۝ وَاللّٰهُ يُقَدِّرُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ ۝ عَلِمَ اَنْ لَّنْ تُحْصُوْهُ فَتَابَ عَلَيْكُمْ فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ ۝ عَلِمَ اَنْ سَيَكُوْنُ مِنْكُمْ مَّرْضٰى ۙ وَاٰخَرُوْنَ يَضْرِبُوْنَ فِی الْاَرْضِ يَبْتَغُوْنَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ ۙ وَاٰخَرُوْنَ يُقَاتِلُوْنَ

تیرا پروردگار جانتا ہے کہ دو تہائی رات سے کم اور آدھی رات اور تہائی رات تک نماز پڑھا کرتا ہے اور کچھ لوگ بھی تیرے ساتھ، خدا ہی رات اور دن کا انداز کرتا ہے اُس نے جان لیا کہ تم اس کو گن نہیں سکتے تم پر اُس نے مہربانی کی، اب جتنا ہو سکے اتنا ہی قرآن نماز میں پڑھو اس نے جان لیا کہ تم میں بیمار بھی ہونگے مسافر بھی ہونگے جو خدا کی روزی ڈھونڈھنے کو سفر کریں گے، اور کچھ لوگ خدا کی

---

[1] ابوداؤد باب فی صلوٰۃ اللیل حنبل احمد جلد ۶ ص ۵۴،

فِي سَبِيْلِ اللّٰهِ فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنْهُ	راہ میں سفر جہاد کریں گے پس اب جتنا ہو سکے اتنا ہی پڑھو

رات کی اس نفل نماز کا نام تہجد ہے، نماز نفل کے تہجد ہو جانے کے بعد، فجر، مغرب اور عشا تین وقت کی نمازیں فرض ہوئیں،

ترجمہ:

اَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ وَ	دن کے دونوں ابتدائی اور انتہائی کناروں میں
زُلَفًا مِّنَ الَّيْلِ (ھود - ۱۰)	(یعنی فجر و مغرب) اور رات تھوڑی گذرنے کے بعد

معراج میں جو نبوت کے پانچویں[1] سال ہوئی پانچ وقت کی نمازیں فرض ہوئیں[2] اور سورۂ اسرا میں جو معراج کے بیان پر مشتمل ہے، یہ آیت اتری،

اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ اِلٰى	نماز کے اوقات زوال آفتاب سے لیکر ظلمت شب تک
غَسَقِ الَّيْلِ وَقُرْاٰنَ الْفَجْرِ اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ	ہیں (ظہر، عصر، مغرب، عشاء) اور صبح کی نماز کہ صبح
كَانَ مَشْهُوْدًا وَّمِنَ الَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ	کی نمازیں سب جمع ہوتے ہیں، اور رات کو تہجد پڑھ
نَافِلَةً لَّكَ	یہ تیرے لئے مزید ہے)

لیکن رکعتیں دو ہی رہیں، مدینہ منورہ میں آکر جب نسبتہً کسی قدر اطمینان ہوا تو اس فرض نے وسعت حاصل کی، اور دو کے بجائے چار رکعتیں فرض ہو گئیں[3]۔

باایں ہمہ نمازیں خضوع و خشوع اور تمکین و وقار کے جو ارکان ضروری ہیں، ان کیلئے جس اطمینان کی ضرورت تھی، وہ مدت تک نصیب نہیں ہوا، اس لئے فوراً وہ ارکان اور آداب لازمی نہیں قرار پائے، بلکہ رفتہ رفتہ ان کی تکمیل کی گئی، پہلے لوگ نماز میں آنکھ اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھ لیا کرتے تھے، بالآخر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

[1] ہماری تحقیق میں معراج نبوت کے بارہویں سال ہوئی اس
[2] فتح الباری، مصری جلد ۱، ص ۵۵
[3] صحیح بخاری، باب الہجرۃ،

ما بال اقوام یرفعون البصر الی السماء فی صلوٰتھم[1]	یہ کیسے لوگ ہیں کہ نماز میں آسمان کی طرف نظر اٹھا کر دیکھا کرتے ہیں،

ایک مدت تک یہ حالت تھی کہ نماز پڑھنے میں کوئی کام یاد آجاتا تو کسی سے کہہ دیتے یا کوئی سلام کرتا تو نماز ہی میں جواب دیتے، پاس پاس کے آدمی نماز میں باہم باتیں کیا کرتے، جب مہاجرین حبش سنہ ھ میں واپس آکر خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئے، تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں مشغول تھے، معمول کے موافق لوگوں نے سلام کیا لیکن جواب نہیں ملا، نماز کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ خدا نے اب حکم دیا ہے کہ نماز میں باتیں نہ کرو[2] اس وقت سے بات چیت کرنا یا سلام کا جواب دینا بالکل منع ہو گیا، معاویہ بن حکم کا بیان ہے کہ ایک دفعہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز ادا کی ایک صاحب کو چھینک آئی، میں نے یرحمک اللہ کہا، لوگوں نے تیز نگاہوں سے میری طرف دیکھا، میں نے کہا:- "آپ لوگ کیا دیکھتے ہیں؟" لوگوں نے زانو پر ہات مارے اس وقت میں سمجھا کہ بات کرنے سے روکنا چاہتے ہیں، میں چپ ہو گیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز سے فارغ ہو کر (خلق احمدی) سے مجھ کو نہ سزا دی نہ ڈانٹا نہ برا کہا صرف یہ فرمایا کہ "نماز تسبیح و تکبیر و قرأت کا نام ہے اس میں بات چیت جائز نہیں"[3] تشہد کا جو طریقہ اب ہے، پہلے نہ تھا، مختلف اشخاص کے نام لیکر کہتے تھے، السلام علیٰ فلاں و فلاں، بالآخر التحیات کے خاص الفاظ سکھائے گئے، جواب نماز میں معمول بہا ہے،[4] حدیثوں میں آیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم چھوٹے بچوں کو نماز میں کندھے پر چڑھا لیتے سجدہ میں جاتے وقت اتار دیتے، دوسری رکعت میں کھڑے ہوتے تو پھر چڑھا لیتے حضرت عائشہؓ باہر سے آئیں اور

[1] بخاری کتاب الصلوٰۃ باب رفع البصر الی السماء فی الصلوٰۃ [2] ابوداؤد کتاب الصلوٰۃ [3] ایضاً [4] ابوداؤد کتاب الصلوٰۃ باب التشہد

دروازہ کھٹکھٹاتیں، آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نماز پڑھتے ہوئے عین اسی حالت میں جاکر دروازہ کھولدیتے[1]۔ ان حدیثوں کی بنا پر بہت سے فقہا کی رائے یہ ہے کہ یہ سب افعال نماز نفل میں جائز ہیں نفل کی تخصیص اسلئے کہ جن نمازوں میں آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے افعال کئے وہ فرض نہ تھیں، بلکہ نفل تھیں لیکن ہمارے نزدیک یہ تاویل صحیح نہیں، ایک حدیث میں صاف موجود ہے، کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) امامہ بنت ابوالعاص کو کاندھے پر چڑھائے مسجد میں آئے اور نماز ادا کی[2]، ہمارے نزدیک یہ تمام روایتیں اسی زمانہ کی ہیں، جبکہ نماز میں بات چیت اور اس قسم کے حرکات ممنوع نہیں قرار پائے تھے،

رفتہ رفتہ نماز تکمیل کی اس حد کو پہنچی کہ وہ تمامتر خضوع و خشوع و مراقبہ و محویت بن گئی، قرآن مجید میں آیت اُتری قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ هُمْ فِیْ صَلٰوتِهِمْ خَاشِعُوْنَ یعنی فلاح پانے والے مسلمان وہ مسلمان ہیں جو خشوع کے ساتھ نماز ادا کرتے ہیں"، اس بنا پر نماز میں ادھر اُدھر دیکھنا یا کوئی حرکت خضوع و خشوع کے خلاف کرنا منع ہوگیا، نماز کے تمام ارکان کا نہایت سکون اور اطمینان کیساتھ ادا کرنا لازمی قرار پایا، یہانتک کہ ایک شخص نے آکر آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے سامنے نماز ادا کی، اور تمام ارکان ٹھہر ٹھہر کر اچھی طرح نہیں ادا کئے، تو آپ نے اس سے فرمایا کہ تم نے نماز نہیں پڑھی. جاکر پھر پڑھو"، اس نے دوبارہ اسی طرح ادا کی، آپنے پھر فرمایا کہ"نماز نہیں ہوئی" تیسری دفعہ اُس نے پوچھا کہ کیونکر پڑھوں"، آپ نے رکوع، سجدہ، قیام، سب کی نسبت ہدایت کی کہ نہایت اطمینان کے ساتھ ادا کئے جائیں، چنانچہ صحیح بخاری وغیرہ[3] میں یہ روایت تفصیل کیساتھ مذکور ہے،

غرض یا تو یہ حالت تھی کہ ایک دفعہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) مسجد میں نماز پڑھ رہے تھے، اتفاقاً

---

[1] ابوداؤد کتاب الصلوٰۃ باب العمل فی الصلوٰۃ [2] ایضاً [3] صحیح بخاری باب امر النبی صلی اللہ علیہ وسلم من لایتم الصلوٰۃ بالاعادۃ

شام سے تجارت کا قافلہ آیا، بارہ آدمیوں کے سوا جس قدر لوگ نماز میں شریک تھے، اٹھ کر قافلہ کی طرف دوڑے، اس پر یہ آیت اتری،[1]

وَاِذَا رَاَوۡا تِجَارَةً اَوۡ لَهۡوَا انْفَضُّوۡٓا اِلَيۡهَا	اور جب لوگ تجارت یا کھیل تماشا دیکھ پاتے ہیں تو
وَتَرَكُوۡكَ قَآئِمًا قُلۡ مَا عِنۡدَ اللّٰهِ خَيۡرٌ مِّنَ	ٹوٹ کر اس پر گرتے ہیں، اور تجھ کو کھڑا چھوڑ دیتے
اللَّهۡوِ وَمِنَ التِّجَارَةِ (جمعہ - ۲)	ہیں، کہدے کہ جو کچھ خدا کے ہاں ہے وہ تجارت اور

[illegible]

اور یا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تربیت و تعلیم سے یہ حالت ہوئی کہ ایک انصاری نماز کی حالت میں تین دفعہ تیر کا زخم کھاتے ہیں لیکن نماز نہیں توڑتے، کہ جو سورہ انھوں نے شروع کیا تھا اس کی لذت معنوی اس درد زخم سے زیادہ تھی (اس سے بڑھکر یہ) کہ حضرت عمرؓ فاروق نماز میں زخم کھا کر گرتے اور تڑپتے ہیں، یہ قیامت خیز منظر سب کے سامنے ہے لیکن ایک شخص مڑ کر نہیں دیکھتا، کیونکہ خشیت الٰہی اور محویت کا عالم جو دلوں پر طاری ہے، وہ اور کسی طرف متوجہ ہونے نہیں دیتا،

نماز جمعہ اور عیدین

مکہ میں چار شخصوں کا یکجا ہو کر نماز ادا کرنا ناممکن تھا، اس لئے جمعہ کی نماز فرض نہ تھی، (کیونکہ جمعہ کی پہلی شرط جماعت ہے) لیکن مدینہ منورہ میں انصار کی ایک بڑی جماعت اسلام لا چکی تھی، اور کوئی شخص ادائے نماز میں خلل انداز نہیں ہو سکتا تھا، اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے قبل جو مسلمان مدینہ آچکے تھے، اسعد بن زرارہ کی تحریک سے بنی بیاضہ کے محلہ میں انھوں نے جمعہ کی سب سے پہلی نماز ادا کی[2]، مصعبؓ بن عمیر امام تھے اور کل چالیس مسلمان نمازی تھے، اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

[1] صحیح بخاری کتاب البیوع تفسیرات مذکور، [2] ابوداؤد و ابن ماجہ و دار قطنی کتاب الجمعہ نیز عبد الرزاق و احمد و خزیمہ بحوالہ فتح الباری [3] ابن اسحاق [4] ابوداؤد و ابن ماجہ وغیرہ کتاب الجمعہ،

جب مدینہ تشریف لائے تو پہلے قبا میں قیام فرمایا، یہاں سے روانگی کے لئے آپ نے قصداً جمعہ کا دن متعین فرمایا، بنی سالم کے محلہ میں پہونچے تو نماز کا وقت آگیا، چنانچہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے سب سے پہلے نماز جمعہ یہیں ادا فرمائی، یہ اواخر ربیع الاول سنہ ۱ھ کا واقعہ ۱؎ ہے، مدینہ سے باہر عرب کے دوسرے حصوں میں مسلمانوں کی یکجا تعداد سب سے زیادہ جواثی میں تھی، جو بحرین میں واقع تھا، حضرت ابن عباس کی روایت ہے کہ مسجد نبوی کے بعد سب سے پہلے نماز جمعہ یہیں قائم ہوئی ۲؎

لیکن بظاہر نماز جمعہ کا اہتمام مسلمانوں میں پہلے اتنا نہ تھا، جتنا کہ ہونا چاہئے، ابھی اوپر گذر چکا ہے کہ ایک دفعہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) مسجد میں جمعہ کی نماز پڑھا رہے تھے، اور ایک روایت میں ہے کہ جمعہ کا خطبہ دے رہے تھے کہ اتفاقاً شام سے غلہ کے بیوپاری آگئے، سب لوگ اٹھ کر چلے گئے، جماعت میں صرف بارہ آدمی اور دوسری روایت کی رو سے چالیس آدمی ۳؎ ۴؎ رہ گئے، اس پر یہ آیتیں نازل ہوئیں،

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا نُودِيَ لِلصَّلَاةِ مِنْ	ایمان والو! جب نماز جمعہ کیلئے پکارا جائے تو یاد الٰہی کی طرف
يَوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا إِلَىٰ ذِكْرِ اللَّهِ وَذَرُوا الْبَيْعَ	دوڑو، اور خرید فروخت چھوڑ دو، یہ تمہارے لئے بہتر ہے
ذَٰلِكُمْ خَيْرٌ لَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ فَإِذَا	اگر تم کو علم ہو، جب نماز سے فراغت ہو جائے تو زمین میں
قُضِيَتِ الصَّلَاةُ فَانْتَشِرُوا فِي الْأَرْضِ وَابْتَغُوا	چلو پھرو اور خدا کی روزی تلاش کرو، اور خدا کو اکثر
مِنْ فَضْلِ اللَّهِ وَاذْكُرُوا اللَّهَ كَثِيرًا لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ	یاد کیا کرو تاکہ فلاح پاؤ، جب لوگ تجارت اور کھیل تماشہ
وَإِذَا رَأَوْا تِجَارَةً أَوْ لَهْوًا انْفَضُّوا إِلَيْهَا	دیکھ پاتے ہیں، تو ٹوٹ کر اس پر گرتے ہیں اور تجھ کو
وَتَرَكُوكَ قَائِمًا قُلْ مَا عِنْدَ اللَّهِ خَيْرٌ	بیٹھا کھڑا چھوڑ دیتے ہیں، کہدو کہ جو کچھ خدا کے پاس ہے

۱؎ طبری صفحہ ۱۲۵۶ ۲؎ صحیح بخاری باب الجمعہ ۳؎ ایضاً ۴؎ دارقطنی کتاب الجمعہ،

مِّنَ اللَّهْوِ وَمِنَ التِّجَارَةِ وَاللّٰهُ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ (جمعہ)

وہ تجارت اور کھیل تماشہ سے بہتر ہے اور خدا بہتر روزی دینے والا ہے،

اس کے بعد یہ حالت ہو گئی کہ نماز کے سامنے تمام دنیا کی دولت کا خزانہ بھی اُن کے آگے ہیچ ہو گیا، خدا نے اُن کی مدح فرمائی،

رِجَالٌ لَّا تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ

یہ وہ لوگ ہیں جن کو تجارت اور خرید فروخت خدا کی یاد سے غافل نہیں کرتی،

عید کی نماز بھی مدینہ ہی میں آکر قائم ہوئی، لیکن جس سال آپ تشریف لائے اس سال عید کی نماز نہیں ہوئی، بلکہ ۲ھ میں مسنون ہوئی[۱] جس کی وجہ یہ ہے کہ عید کی نماز، روزہ رمضان کے تابع ہے اور رمضان کے روزے دوسرے سال فرض ہوئے،

صلوٰۃ خوف | نماز کسی حالت میں قضا نہیں کی جا سکتی، خوف کی حالت میں مثلاً جنگ میں یہ حکم ہے کہ تمام فوج کے دو ٹکڑے کر دیئے جائیں، پہلے ایک جماعت ہتھیاروں سے مسلح ہو کر امام کے پیچھے کھڑی ہو اور نماز قصر ادا کرے، پھر بہ ترتیب یہ آگے بڑھے اور دوسری جماعت جو دشمن کے مقابلہ میں تھی وہ پیچھے ہٹے، اور وہ بھی قصر نماز ادا کرے، امام اپنی جگہ پر قیام کرے، راویوں میں ہے کہ ہر جماعت دو دو رکعت امام کے ساتھ ادا کرے، یا ایک ایک رکعت امام کے ساتھ، اور دوسری رکعت علیحدہ علیحدہ پڑھے، یا صرف ایک ہی رکعت اس حالت میں فرض ہے، ابوداؤد نے صلوٰۃ الخوف کی تمام صورتیں بروایت صحابہ الگ الگ لکھی ہیں، ہمارے نزدیک ان میں کوئی اختلاف نہیں ہے،

[۱] طبری ص ۱۲۸۱ یورپ،

یہ جنگ کی حالت پر موقوف ہے، امام جس وقت جو مناسب سمجھے کرے، اگر لڑائی پوری زور اور شدت پر ہو تو ہر سپاہی اپنی اپنی جگہ پر اشارات سے نماز ادا کریگا، سورۂ نسا میں صلوٰۃ الخوف کی صورت تفصیل سے کی ہے صلوٰۃ الخوف کا حکم غزوۂ ذات الرقاع ۵ھ میں نازل ہوا، اسی غزوہ کا نام بعض راویوں نے غزوۂ نجد بتایا ہے، ابو داؤد میں ابو عباس زرقی کی ایک روایت ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ صلوٰۃ الخوف کی آیت صلح حدیبیہ کے موقع پر مقام عسفان میں نازل ہوئی، یعنی ۶ھ میں لیکن زیادہ تر رواۃ حدیث اور اہلِ سیر غزوہ ذات الرقاع کو اس حکم کا زمانہ سمجھتے ہیں[۱])

روزہ

اسلام سے پہلے قریش عاشورا کے دن روزہ رکھتے تھے، (اس دن خانہ کعبہ پر غلاف چڑھایا جاتا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی اس دن روزہ رکھتے تھے[۲]، اور عجب نہیں کہ آپ کی تبعیت میں دوسرے صحابہ بھی روزہ رکھتے ہوں، ۵ نبوی میں یعنی ہجرت سے آٹھ برس پہلے حضرت جعفرؓ نے حبش کے نجاشی کے سامنے اسلام پر جو تقریر کی تھی اس میں روزہ کا ذکر بھی موجود ہے، وہ غالباً اسی دن کا روزہ ہوگا، اسکے بعد) جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ میں تشریف لائے تو دیکھا کہ یہود بھی اس دن روزہ رکھتے ہیں آپ نے لوگوں سے وجہ پوچھی لوگوں نے بیان کیا کہ حضرت موسیٰ نے اسی روز فرعون کے ہاتھ سے نجات پائی تھی آپ نے فرمایا، تو ہم کو موسیٰ کی تقلید کا زیادہ حق ہے، چنانچہ آپنے (یہاں بھی) عاشورہ کا روزہ رکھا (اور صحابہ کو بھی رکھنے کا حکم دیا) پھر ۲ھ میں رمضان کے روزے فرض ہوئے، تو عاشورا کا روزہ مستحب ہوگیا، یعنی جس کا جی چاہتا تھا رکھتا تھا، اور جو نہیں چاہتا تھا نہیں رکھتا تھا[۳] لیکن آپ نے

(۱) دیکھو کتب احادیث صلوٰۃ الخوف اور طبری جلد ۳ ص ۴۵ و ابن سعد جلد ۲ ص ۴۳) (۲) مسند ابن حنبل جلد ۶ صفحہ ۲۴۴ (معجم کبیر طبرانی) (۳) ابوداؤد کتاب الصوم،

بنفس نفیس اس دن کا روزہ برابر رکھا، سنہ ۱۱ھ میں لوگوں نے عرض کی، یا رسول اللہ! یہود تو اس دن کی بڑی عزت کرتے ہیں، فرمایا آیندہ سال ۱۰ کے بجائے ۹ کو روزہ رکھوں گا، لیکن افسوس کہ آپ نے اسی سال وفات پائی[۱]

یہود اس طرح روزہ رکھتے تھے کہ نماز عشاء کے بعد پھر نہیں کھاتے تھے اور اس کو حرام سمجھتے تھے، عورت کے ساتھ ہم بستری بھی منع تھی، ابتدائے اسلام میں مسلمان بھی اسی طریقہ کے موافق مامور ہوئے، اسلام کے تمام احکام میں سب سے مقدم یہ اصول ملحوظ رہتے تھے،

يُرِيدُ اللهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ (بقرہ) خدا تمھارے حق میں آسانی چاہتا ہے سختی نہیں چاہتا،

لَا صَرُورَةَ فِي الْإِسْلَامِ (ابو داؤد ج ۱) اسلام میں جوگی پن نہیں ہے،

اسی بنا پر یہ آیت نازل ہوئی،

أُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ إِلَىٰ نِسَاءِكُمْ[۲] روزہ کی راتوں میں تمھارے لئے عورتوں سے لطف

وَكُلُوا وَاشْرَبُوا حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ اٹھانا حلال کر دیا گیا ہے، اور جبتک صبح کی سپید لکیر

الْأَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْأَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ (بقرہ) (رات کی) سیاہ لکیر سے الگ نہ ہو جائے تم کھاتے پیتے رہو،

اہل عرب روزہ کے بہت کم خوگر تھے، اول اول روزہ ان پر شاق ہوا[۳]، اسلئے نہایت تدریج کیساتھ روزہ کی تکمیل کی گئی، اول اول آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ میں تشریف لائے تو سال میں تین روزے رکھنے کا حکم دیا، پھر روزہ کی فرضیت نازل ہوئی، تو یہ اختیار رہا کہ جو شخص چاہے روزہ رکھے

۱؎ یہ تمام واقعات صحیح بخاری صحیح مسلم اور ابو داؤد کتاب الصوم میں بتفصیل مذکور ہیں، ۲؎ ابو داؤد کتاب الصوم باب مبدأ فرض الصیام واسباب النزول للسیوطی صفحہ ۲، ۳؎ صحیح بخاری میں ہے:- نزل رمضان فشق علیھم،

اور جو چاہے روزہ کے بدلے ایک غریب کو کھانا کھلا دی، رفتہ رفتہ جب لوگ روزے کے خوگر ہو چلے تو یہ آیت اُتری،

فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ.[۱] جو رمضان کا مہینہ پائے وہ ضرور روزہ رکھے،

اب بالتعین روزہ فرض ہو گیا، اور فدیہ کی اجازت جاتی رہی، البتہ جو شخص بیمار ہو یا سفر میں ہو اس کے لئے یہ حکم ہوا کہ اس وقت روزہ توڑ دے، اور اُن کے بدلے کسی اور وقت قضا کر دی، چونکہ اور تمام قوموں میں خصوصاً عیسائیوں میں رہبانیت بڑی فضیلت کی بات سمجھی جاتی تھی، اس لئے جو لوگ زیادہ خدا پرست تھے، وہ روزہ میں زیادہ سختی برداشت کرتے تھے لیکن آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) وقتاً فوقتاً اس سے روکتے رہتے تھے، ایک دفعہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) سفر میں تھے ایک شخص کو دیکھا کہ اس کے گرد بھیڑ لگی ہوئی ہے، اور اس پر لوگوں نے سایہ کر رکھا ہے، سبب پوچھا معلوم ہوا کہ گرمی میں اس شخص نے روزہ رکھا ہے، آپنے فرمایا کہ "سفر میں روزہ رکھنا کچھ ثواب کی بات نہیں"[۲]،

بعض لوگوں نے صوم وصال رکھنا چاہا، یعنی رات دن روزہ رکھیں، بیچ میں افطار نہ کریں" آپنے اس سے منع فرمایا،

روزہ کا مقصد عام طور پر صرف یہ سمجھا جاتا تھا، کہ اپنے آپ کو تکلیف میں ڈالنا ثواب کی بات ہی، اس لئے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ہر طرح کی آسانیوں کا حکم دیا، سفر اور بیماری میں روزہ رکھنا فرض نہ تھا،

راتوں کو صبح صادق تک کھانے پینے اور تمام اشغال کی اجازت تھی، سحر کھانے کی فضیلت

---

[۱] ابو داؤد کتاب الصلوٰۃ باب کیف الاذان [۲] صحیح بخاری کتاب الصوم

بیان کی اور یہ بھی فرمایا کہ صبح کے قریب کھائی جائے، تاکہ دن بھر قوت باقی رہے،

روزہ کا مقصد صرف معاصی سے کفِ نفس تھا، اور روزہ اس کا معین تھا، اسلئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص روزہ میں جھوٹ فریب نہیں چھوڑتا، خدا کو اسکی فاقہ کشی کی کوئی حاجت نہیں[۱]،

زکوٰۃ

خیرات اور زکوٰۃ کی ترغیب اور تحریص اسلام میں ابتدا ہی سے معمول بہ تھی، مکہ میں جو سورتیں اتریں، ان میں زکوٰۃ کا لفظ تصریحاً مذکور ہے، اور خیرات نہ دینے والے پر عتاب ہے،

اَرَاَیْتَ الَّذِیْ یُکَذِّبُ بِالدِّیْنِ فَذٰلِکَ	تم نے اس شخص کو دیکھا جو قیامت کو جھٹلاتا ہے،
الَّذِیْ یَدُعُّ الْیَتِیْمَ وَلَا یَحُضُّ عَلٰی طَعَامِ	یہی شخص وہ ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے اور مسکین کے
الْمِسْکِیْنِ ۵ (ماعون)	کھانا کھلانے کی لوگوں کو ترغیب نہیں کرتا،

مدینہ منورہ میں زیادہ تاکیدی آیتیں نازل ہوئیں، ۲ھ میں عید کے دن صدقۂ فطر دینا واجب قرار پایا[۲]، ہجرت کے ابتدائی زمانہ میں عام مسلمان اور خصوصاً مہاجرین سخت فقر و فاقہ میں مبتلا تھے، حدیثوں میں صحابہ کے فقر و تنگ دستی کے جو واقعات کثرت کے ساتھ مذکور ہیں، اسی زمانہ کے ہیں، اس بنا پر یہ حکم ہوا کہ جس شخص کے پاس ضروری مصارف سے جو کچھ بچے سب کو خیرات کر دینا چاہئے، ورنہ عذاب ہوگا، چنانچہ خاص آیت نازل ہوئی[۳]،

وَالَّذِیْنَ یَکْنِزُوْنَ الذَّھَبَ وَالْفِضَّۃَ	جو سونا چاندی جمع کرتے ہیں اور خدا کی راہ
وَلَا یُنْفِقُوْنَھَا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ،	میں خیرات نہیں کرتے،

اس آیت کا بھی یہی مطلب ہے،

---

۱ ایضاً بحوالۂ بالا ۲ طبری مطبوعہ یورپ صفحہ ۱۲۸۰ ۳ صحیح بخاری مقولہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ،

يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ قُلِ الْعَفْوَ | لوگ تجھ سے پوچھتے ہیں کہ کیا خیرات دیں کہدو کہ جو کچھ مصارف سے بچ رہے

بہت سے لوگ خیرات کرتے تھے لیکن عمدہ مال کو محفوظ رکھتے تھے بیکار یا ردی چیزیں خیرات میں دیتے تھے، اس پر حکم ہوا،

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ | مسلمانوں اپنی کمائی میں سے اور اس چیز میں سے جو ہم نے

مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّآ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ | تمہارے لئے زمین میں پیدا کیا، اچھا حصہ خیرات دو،

مزید تاکید کے لئے یہ حکم ہوا کہ جو شخص اپنی محبوب چیز نہ دیگا، اس کو ثواب نہ ملے گا،

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ | تم لوگ ثواب نہیں پا سکتے جبتک کہ وہ چیز خیرات نہ کرو جو تمکو عزیز ہو

اب صدقہ اور خیرات کی طرف یہ عام رغبت پیدا ہوئی کہ جو لوگ نادار تھے، وہ صرف اس لئے بازار میں جا کر مزدوری کرتے، اور کندھوں پر بوجھ لاد کر لوگوں کے پاس پہنچاتے تھے کہ مزدوری ملے تو خیرات کریں،[1]

بایں ہمہ ۸ھ تک زکوٰۃ فرض نہیں ہوئی، فتح مکہ کے بعد اسکی فرضیت ہوئی تو اس کے مصارف بیان کئے گئے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام ممالک مقبوضہ میں زکوٰۃ کے وصول کرنے کے لئے (محرم ۹ھ میں) محصلین مقرر کئے،[2] زکوٰۃ کے مصارف حسب ذیل تھے،

اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسٰكِيْنِ وَ | زکوٰۃ ان مصارف کیلئے ہے، فقراء، مساکین، زکوٰۃ

الْعٰمِلِيْنَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ وَفِي | کے وصول کرنے والے، مؤلفۃ القلوب، غلام جن کو

الرِّقَابِ وَالْغٰرِمِيْنَ وَفِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَابْنِ السَّبِيْلِ | آزاد کرانا ہے، مقروض، مسافر، اور خدا کی راہ

فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ (توبہ) | میں، یہ خدا کا فرض ہے، اور خدا علیم و حکیم ہے،

[1] بخاری کتاب الزکوٰۃ [2] طبری مطبوعۂ یورپ جلد ۳ صفحہ ۱۷۲۲ (ابن سعد جزء مغازی ص ۱۱۵)

زکوٰۃ کی شرح نہایت تفصیل سے فرامین نبویؐ میں منقول ہے، فقہ میں کتاب الزکوٰۃ ان ہی فرامین سے ماخوذ ہے،

حج دنیا میں سب سے پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خدا پرستی کے لئے عبادتگاہ عام بنایا، اور تمام دنیا کو وہاں آکر عبادت کرنے کی دعوت دی،

وَاِذْ بَوَّاْنَا لِاِبْرٰهِيْمَ مَكَانَ الْبَيْتِ اَنْ	اور جبکہ ہم نے ابراہیم کیلئے کعبہ کی جگہ مقرر کردی کہ
لَا تُشْرِكْ بِيْ شَيْئًا وَّطَهِّرْ بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ	ہماری ساتھ کسی کو شریک نہ کرو اور ہمارے گھر کو طواف
وَالْقَآئِمِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ وَاَذِّنْ فِي النَّاسِ	کرنیوالوں اور قیام و رکوع اور سجود کرنیوالوں
بِالْحَجِّ يَاْتُوْكَ رِجَالًا وَّعَلٰى كُلِّ ضَامِرٍ	کے لئے پاک صاف رکھو اور حج کی منادی کردو تو
يَّاْتِيْنَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيْقٍ لِّيَشْهَدُوْا	لوگ ہر طرف سے دوڑے آئیں گے کچھ پیدل اور کچھ دبلی
مَنَافِعَ لَهُمْ وَيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ فِيْ	اونٹنیوں پر سوار تاکہ فائدہ اٹھائیں اور نام
اَيَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ ۔ (حج)	ایام مقررہ میں خدا کا ذکر کریں،

حضرت ابراہیمؑ کی دعوتِ عام پر دنیا نے لبیک کہا، اور ہر سال عرب کے دور دراز اطراف سے لوگ حج کو آتے تھے لیکن ایک طرف تو یہ افسوسناک انقلاب ہوا کہ جو گھر خالص توحید کے لئے تعمیر ہوا تھا، وہ تین سو ساٹھ بتوں کا تماشاگاہ بن گیا، دوسری طرف اس گھر کی تولیت کا سب سے زیادہ جس کو حق تھا، وہ یہاں سے نکلنے پر مجبور ہوا، اور پوری آٹھ برس تک ادھر آنکھ اٹھا کر دیکھ بھی نہ سکا، بالآخر ظہورِ حق کا وقت آیا، مکہ فتح ہوا، اور جانشین ابراہیمؑ اور ان کے متبعین کو موقع ملا کہ شعائر ابراہیمی کو پھر زندہ کیا جائے، چنانچہ ۹ھ میں حج فرض ہوا[1] تاہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سال

[1] زاد المعاد جلد ۱ ص ۱۸۰

یہ فرض ادا نہیں کیا کہ عرب ننگے ہوکر طوافِ کعبہ کرتے تھے، اور آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) ایسی بیحیائی کا منظر آنکھ سے دیکھنا گوارا نہیں فرما سکتے تھے، اسلئے حضرت ابوبکرؓ اور حضرت علیؓ ایامِ حج میں روانہ کئے گئے کہ کعبہ میں جاکر منادی کردیں کہ آیندہ سے کوئی شخص عریاں ہوکر کعبہ کا طواف نہ کرنے پائے گا،[1]

ایک اور وجہ یہ تھی کہ نسی کے قاعدہ سے حج کا مہینہ ہٹتے ہٹتے ذوقعدہ میں آگیا تھا، چنانچہ ۹ھ کا حج اسی مہینہ میں ادا ہوا لیکن حج کا اصلی مہینہ ذوالحجہ تھا، اسلئے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ایک سال کا انتظار فرمایا، اور اس وقت حج ادا کیا جب وہ اپنے اصلی مرکز پر آگیا،[2]

حج کے اصلاحات

حج کی رسم اگرچہ کفار نے قائم کر رکھی تھی، لیکن اس کی صورت بالکل بدل دی تھی اور اس میں اس قدر بدعات اضافہ کردیئے تھے، کہ ثواب کے بجائے عذاب کا کام بن گیا تھا، سب سے مقدم یہ کہ حج اور تمام عبادات کا مقصد خدا کا ذکر اور توجہ الی اللہ ہے لیکن اہلِ عرب حج میں جمع ہوتے تھے، تو خدا کے بجائے اپنے باپ دادا کے مفاخر اور کارنامے بیان کرتے تھے، اسی بنا پر یہ آیت اتری

فَاِذَا قَضَيْتُمْ مَّنَاسِكَكُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ اٰبَآءَكُمْ اَوْ اَشَدَّ ذِكْرًا (بقرہ)	[3]	پھر جب حج کے ارکان پورے کر چکو تو خدا کا ذکر کرو جس طرح اپنے باپ دادا کا ذکر کرتے تھے، بلکہ اس

خاص اہلِ مدینہ نے یہ طریقہ اختیار کیا تھا کہ منات جو بت تھا، اس کا طواف کرتے تھے اور اس بنا پر جب کعبہ کا حج کرتے تھے، تب بھی صفا و مروہ کا طواف نہیں کرتے تھے، حالانکہ حج کے مقاصد میں سے

۱؎ صحیح مسلم کتاب الحج باب لا یحج البیت مشرک و لا یطوف بالبیت عریان ۲؎ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے خطبہ میں یہ الفاظ فرمائے تھے، الزمان قد استدار کہیئتہ یوم خلق اللّٰہ السمٰوٰت والارض السنۃ اثنا عشر شہرا منہا اربعۃ حرم ثلث متوالیات ذوالقعدۃ وذوالحجۃ والمحرم ورجب مضر الذی بین جمادی و شعبان" اس سے اسی طرف اشارہ تھا، ۳؎ اسباب النزول للواحدی،

ایک بڑا مقصد یہ بھی ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی یادگاریں قائم رکھی ہیں، اور صفا و مروہ کا طواف اسی عہد کی یادگار ہے، اسی بنا پر یہ آیت اتری،

اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَائِرِ اللّٰهِ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ اَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا (بقرہ - ۱۹)

صفا اور مروہ خدا کی یادگاریں ہیں، اسلئے جو شخص حج یا عمرہ کرے تو اس کو ان دونوں مقاموں کا بھی طواف کرنا چاہئے۔[1]

ایک طریقہ یہ جاری ہو گیا تھا، کہ اکثر لوگ (آج کل کی طرح) جن کے پاس زادِ سفر نہیں ہوتا تھا، یونہی چل کھڑے ہوتے تھے، اور کہتے تھے کہ ہم متوکل ہیں، ان لوگوں کو اکثر راہ میں گداگری اور دوستوں کی دستگیری کا محتاج ہونا پڑتا تھا، اس بنا پر یہ آیت نازل ہوئی،

وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى،[2]

اور گھر سے زادِ سفر لیکر چلو کیونکہ اچھا زادِ سفر تقویٰ ہے

احرامِ حج میں سر کے بالوں کا منڈوانا یا ترشوانا منع ہے لیکن اس میں اہلِ جاہلیت نے بہت سختی کر دی تھی، یہاں تک کہ بعض صاحبوں کے بالوں میں اس قدر جوئیں پڑ گئیں کہ منہ پر گرتی جاتے رہنے کا خوف ہو گیا، تاہم وہ بال نہ ترشوا سکے، اسلام میں چونکہ سب سے مقدم یہ امر پیشِ نظر ہے کہ اس کی عبادات اور احکام تکلیف مالایطاق نہ بنجائیں، اس لئے حکم ہوا:۔

فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ بِهٖۤ اَذًى مِّنْ رَّاْسِهٖ فَفِدْيَةٌ مِّنْ صِيَامٍ اَوْ صَدَقَةٍ اَوْ نُسُكٍ۔ (بقرہ ۲۴)

تو جو شخص بیمار ہو یا اس کے سر میں کچھ عارضہ ہو تو وہ (اگر بال منڈائے) تو فدیہ ادا کر دے یعنی روزہ

---

[1] قرآن مجید میں جناح کا لفظ ہے اسکا عام ترجمہ "حرج" یا "نقصان" ہے اس بنا پر ترجمہ یہ ہونا چاہئے کہ صفا اور مروہ کے طواف میں کچھ حرج نہیں لیکن لاجناح کا لفظ واجب و مستحب کے معنوں میں بھی آیا ہے۔ [2] بخاری کتاب الحج باب تزودوا فان خیر الزاد التقوی۔

قربانی جو کرتے تھے، اس کا خون لیکر کعبہ کے درودیوار پر ملتے تھے، اور اس کو ثواب سمجھتے تھے، اس پر یہ آیت نازل ہوئی،[1]

لَنْ یَّنَالَ اللّٰہَ لُحُوْمُھَا وَلَادِمَاءُھَا — خدا کو قربانی کا گوشت اور خون نہیں پہنچتا بلکہ

وَلٰکِنْ یَّنَالُہُ التَّقْوٰی مِنْکُمْ، — تمہاری پرہیزگاری اس تک پہنچتی ہے،

اس آیت میں صرف اس فعل سے نہیں روکا گیا، بلکہ یہ بھی بتا دیا گیا کہ قربانی کوئی مقصود بالذات چیز نہیں، بلکہ اصل چیز جس کو خدا قبول کرتا ہے، وہ تقویٰ اور پرہیزگاری ہے،

رسوم حج میں ایک بڑی چیز جو قریش نے اصولِ اسلام کے خلاف قائم کر دی تھی، یہ تھی کہ وہ عرفات جو حج کا اصلی عبادتگاہ عام تھا نہیں جاتے تھے، اور کہتے تھے کہ ہم اہلِ حرم ہیں، ہم حدودِ حرم سے نہیں جا سکتے، یہ ہمارے خاندان کی توہین ہے، اسلئے وہ صرف مزدلفہ تک جا کر ٹھہر جاتے تھے، باقی تمام عرب عرفات میں جمع ہوتے تھے، اور وہاں سے چل کر مزدلفہ اور منیٰ میں آتے تھے، چونکہ اسلام کا اصولِ اصلی مساواتِ عامہ ہے، اور عباداتِ میں سب یکساں ہیں، اس لئے حکم آیا کہ[2]

فَاِذَا اَفَضْتُمْ مِّنْ عَرَفَاتٍ فَاذْکُرُوا اللّٰہَ — پھر جب عرفات سے لوٹو تو مشعر حرام (مزدلفہ) کے

عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ وَاذْکُرُوْہُ کَمَا — پاس خدا کا ذکر کرو، جس طریقہ سے اس نے تمکو ہدایت

ھَدٰکُمْ وَاِنْ کُنْتُمْ مِّنْ قَبْلِہٖ لَمِنَ الضَّآلِّیْنَ — کی ہے، اور اس سے پہلے بیشک تم گمراہ تھے، پھر وہیں سے

ثُمَّ اَفِیْضُوْا مِنْ حَیْثُ اَفَاضَ النَّاسُ — چلو جہاں سے اور لوگ چلتے ہیں، اور خدا سے معافی مانگو

[1] تفسیر بیضاوی (یہ رسم یہودیوں سے آئی تھی، لاوین ۱۷-۶، تاریخ دوم ۲۹-۲۲) [2] صحیح بخاری جلد کتاب الحج ص ۲۲۶

وَاسْتَغْفِرُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ
وہ غفور اور رحیم ہے،

قربانی کے جانور کو چونکہ سمجھتے تھے کہ خدا پر چڑھا دیا گیا ہے، اس لئے اس پر سوار نہیں ہوتے تھے، اور پیدل چلنے کی تکلیف گوارا کرتے تھے، یہ رسم اسلام کے ذریعہ تک قائم رہی، ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک صاحب کو سفر حج میں دیکھا کہ قربانی کے اونٹ کے ساتھ ہیں، لیکن خود پیدل جا رہے ہیں، آپ نے اُن سے فرمایا، کہ سوار ہو لو" بولے یہ قربانی کے اونٹ ہیں" آپ نے دوبارہ فرمایا، انھوں نے دوبارہ وہی عذر کیا، آپ نے زجر کے ساتھ حکم دیا کہ بیٹھ لو"[1]

ایک قسم کا حج ایجاد کر لیا تھا جس کو حج مصمت کہتے تھے، یعنی جو شخص حج کرتا تھا، وہ آغاز حج سے اخیر تک منھ سے کچھ بولتا نہ تھا، اسلام نے اس تکلیف مالایطاق سے منع کیا، صحیح بخاری میں ہے، کہ ایک دفعہ حضرت ابو بکرؓ نے اَحمس کی ایک عورت کو جس کا نام زینب تھا، دیکھا کہ کسی سے بات چیت نہیں کرتی، دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ حج مصمت کی نیت کی ہے، حضرت ابو بکرؓ نے اس سے کہا کہ یہ جائز نہیں، یہ زمانۂ جاہلیت کی بات ہے"[2]

(سب سے بڑی بیحیائی کی بات یہ تھی کہ قریش (حمس) کے سوا عام عرب مرد و زن کعبہ کا برہنہ طواف کرتے تھے، حدود حرم میں آکر تمام لوگ اپنے اپنے کپڑے اتار ڈالتے تھے، اور عاریۃً کسی قریشی سے کپڑے مانگ لیتے تھے اگر نہ ملتے تو ننگے کعبہ کے گرد گھومتے تھے، عورتیں بھی اسی طرح ننگی طواف کرتی تھی اور یہ شعر گاتی جاتی تھیں،

اَلْیَوْمَ یَبْدُوْ بَعْضُہٗ اَوْ کُلُّہٗ وَمَا بَدَا مِنْہُ فَلَا اُحِلُّہٗ

آج کچھ حصہ اس کا یا پورا کھلے گا اور جو کھلا ہے اس کو میں حلال نہیں کرتی

---

[1] بخاری کتاب الحج [2] بخاری جلد اصفحہ ۵۴۱،

اس پر یہ آیت نازل ہوئی؛[۱]

یَا بَنِیْ آدَمَ خُذُوْا زِیْنَتَکُمْ عِنْدَ کُلِّ مَسْجِدٍ اے آدم کے بیٹو! مسجدوں میں کپڑے پہن لیا کرو،

(اس بنا پر ۹ھ میں آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو بھیجا، انھوں نے عین موسم حج میں اعلان کیا کہ آیندہ کوئی برہنہ حج نہ کرنے پائے گا؛[۲])

معاملات

شریعت کی تکمیل میں جو تدریج ملحوظ رہی، اس کے لحاظ سے وراثت، نکاح وطلاق، قصاص وتعزیرات (وغیرہ) کے احکام، بعثت سے بہت بعد آئے، (سبب یہ ہے کہ ان احکام کے اجرا کے لئے ایک نافذ الامر قوت کی ضرورت تھی، جو ابتک اسلام کو حاصل نہیں ہوئی تھی، غزوۂ بدر کے بعد سے اسلام کی سیاسی طاقت کا نشو و نما شروع ہوا، ہجرت کے پہلے اور دوسرے سال میں جو احکام نازل ہوئے وہ تحویل قبلہ، فرضیت روزہ، زکوٰۃ فطر، نماز عید اور قربانی تھی، تیسرے سال سے جب سلام کے کاروبار زیادہ پھیلنے شروع ہوئے تو سب سے پہلے توریث کا قانون قرآن مجید میں نازل ہوا،

وراثت — (مسلمان جب ابتدأً مدینہ آئے ہیں، تو اس وقت یہ حالت تھی کہ باپ مسلمان ہے تو بیٹا کافر ہے، ایک بھائی کافر ہے تو دوسرا بھائی مسلمان ہے اس حالت میں اقربا، اور اعزہ کی وراثت کا قانون کیونکر نافذ ہوسکتا تھا، اس لئے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) جب مدینہ تشریف لائے، تو آپ نے مہاجرین اور انصار میں مواخاۃ (برادری) قائم کردی جس کے رو سے یہ قاعدہ مقرر ہوگیا، کہ کوئی انصار مرتا تو اسکی وراثت مہاجرین

---

[۱] یہ پورا واقعہ اور شان نزول نسائی، کتاب مناسک الحج میں ہے، [۲] صحیح مسلم وصحیح بخاری اور تمام حدیث کی کتابوں میں باب لایطوف بالبیت عریاناً میں مذکور ہے،

کو ملتی، عرب میں پہلے بھی دستور تھا کہ دو آدمی آپس میں عہد کرلیتے کہ ہم دونوں آپس میں ایک دوسرے کے وارث ہوں گے، ان میں سے جب کوئی مرتا تو دوسرا وارث ہوتا لیکن ۳ھ میں قرآن کی اس آیت نے اس قاعدہ کو منسوخ کردیا،[1]

وَاُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰی بِبَعْضٍ (انفال) قرابت مند ایک دوسرے سے زیادہ قریب ہیں!

اس کے روسے مواخاۃ کی بنا پر وراثت موقوف ہوگئی، اور خاندان اور ذوی الارحام میں وراثت محدود ہوگئی،

(آیت توریث کے نزول سے پہلے قرآن نے وصیت کا قاعدہ جاری کیا تھا یعنی مرنے والا اپنے مال وجائداد کی نسبت یہ وصیت کرجاتا، کہ اس میں سے اتنا اس کو دیا جائے اور اتنا اس کو ملے) مرنے کے بعد اسی طریقہ سے اس کی جائداد تقسیم کردیجاتی، مرنے سے پہلے ہر مسلمان اس وصیت کا مکمل کرجانا فرض تھا،

كُتِبَ عَلَيْكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ اِنْ تَرَكَ خَيْرَ ا ۨالْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ بِالْمَعْرُوْفِ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ (بقرہ) [illegible]

مسلمانو! تم کو حکم دیا جاتا ہے کہ جب تم میں سے کسی کو موت آنے لگے اور وہ کچھ مال چھوڑنے والا ہو تو ماں باپ اور رشتہ داروں کیلئے بطریق مناسب وصیت کرجائے

جو لوگ حالتِ مسافرت میں جاتے، اُن کیلئے گواہی اور شہادت کا قانون قرآن میں مقرر کیا گیا، گواہی کو چھپانا یا بدل دینا قانوناً جرم تھا، چنانچہ سورہ البقرہ و مائدہ میں اسکی پوری تفصیل ہے، غزوہ بدر

[1] یہ مفسرین کا بیان ہے لیکن صحیح بخاری وغیرہ میں حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ یہ حکم حسب ذیل آیت کریمہ سے منسوخ ہوا:
وَلِكُلٍّ جَعَلْنَا مَوَالِيَ مِمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ وَالَّذِيْنَ عَقَدَتْ اَيْمَانُكُمْ فَاٰتُوْهُمْ نَصِيْبَهُمْ (نساء) دیکھو صحیح بخاری تفسیر آیت مذکور،

کے بعد مسلمانوں کی تعداد میں کافی ترقی ہو تی گئی خاندان کے خاندان مسلمان ہو گئے، اسلئے وراثت کے مخصوص قانون کی ضرورت ہوئی، پھر وصیت کے قاعدہ میں بڑی دقت یہ تھی کہ ناگہانی موت کے موقع پر تقسیم جائداد کا کوئی اصول جاری کرنا ممکن نہ تھا، مثلاً جہاد میں سیکڑوں مسلمان شریک ہوئے اب کس کو معلوم ہو کس کو شہادت ہوگی، اس حالت میں وصیت نہ کرجانے سے رشتہ داروں میں جس کا قابو چل جاتا وہ جائداد پر قبضہ کرلیتا، چنانچہ غزوۂ احد میں یہی موقع پیش آیا، سعد بن الربیع جو بہت دولتمند صحابی تھے، (اس جنگ میں شہید ہوئے، اُن کی بیوی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئیں کہ سعد آپ کی خدمت میں شہید ہوئے، انھوں نے دو لڑکیاں چھوڑی ہیں لیکن سعد کے بھائی نے سعد کی ساری جائداد پر قبضہ کرلیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "خدا فیصلہ کرے گا"، پھر (غالباً سنہ ۳ھ میں) یہ آیت نازل[1] ہوئی،) جس میں وراثت کے تمام احکام مذکور ہیں،

يُوْصِيْكُمُ اللّٰهُ فِيْٓ اَوْلَادِكُمْ لِلذَّكَرِ مِثْلُ	خدا تم کو تمھاری اولاد کی نسبت حکم دیتا ہے کہ
حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ، الخ	لڑکے کو دو لڑکیوں کے برابر حصہ ملے (آخر تک)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سعد کے بھائی کو بلا کر فرمایا کہ سعد کے متروکہ میں سے دو تہائی انکی بیٹیوں

(1) آیت میراث کی شان نزول میں احادیث میں تین واقعے مروی ہیں اول یہ کہ حضرت جابرؓ سنہ ۸ھ میں بیمار پڑے تو آیت اُتری، یہ روایت تمام صحاح ستہ میں ہے لیکن درحقیقت اس روایت میں راویوں سے کسی قدر مسامحت ہوئی ہے، کیونکہ وراثت سنہ ۸ھ سے پہلے جاری ہو چکی تھی، اور دوسرے یہ کہ حضرت جابرؓ اس وقت تک لا ولد تھے اسلئے صحیح یہ ہے کہ حضرت جابرؓ کا واقعہ وراثت کی ایک خاص صورت لا ولدیت یعنی (کلالہ) سے متعلق ہے، جیسا کہ مسلم کی دوسری روایتوں میں (کتاب الفرائض) اسکی تصریح ہے، دوسرا شان نزول یہ بیان کیا جاتا ہے کہ حضرت حسانؓ کے بھائی عبدالرحمٰن کی وفات کے بعد انکی بیوی ام کجہ کی فریاد پر آیت اتری، یہ روایت طبری وغیرہ کی ہے جو گو ضعیف ہے لیکن بالکل ممکن ہے کہ سعد بن ربیع کے علاوہ اور واقعے بھی اس قسم کے پیش آئے ہوں، تیسرا شان نزول یہی سعد بن ربیع کا واقعہ ہے جو ابوداؤد، ترمذی حاکم اور مستدرک میں مذکور ہے،

اور آٹھواں حصہ اُن کی بیوی کو دو، اس کے بعد جو بچ رہے، وہ تمھارا حق ہے،

اہلِ عرب عورتوں کو وراثت سے محروم رکھتے تھے، کہ وراثت اس کا حق ہو جو تلوار چلائے؛ دنیا کی اور اکثر قوموں میں بھی یہی دستور تھا، یہ پہلا دن ہے کہ اس صنفِ ضعیف کی دادرسی کی گئی

وصیت

احکامِ وراثت کے بعد بھی وصیت کی اجازت باقی رہی لیکن چونکہ اس سے مستحقین وراثت کی حق تلفی کا اندیشہ تھا، اس لئے وصیت کی تحدید کی ضرورت تھی، سنہ ھ میں حضرت سعدؓ (معاذ کے والد) بیمار ہوئے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اُن کی عیادت کو گئے، انھوں نے عرض کی کہ میں مر رہا ہوں اور میرے صرف ایک ہی لڑکی ہے، چاہتا ہوں کہ صرف دو تہائی مال خیرات کر دوں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت نہیں دی انھوں نے کہا تو نصف، آپنے اس کو بھی قبول نہیں کیا، انھوں نے کہا ایک تہائی آپ نے فرمایا یہ بھی بہت ہی، وارثوں کو غنی چھوڑ کر مرنا اس سے اچھا ہی کہ وہ بھیک مانگتے پھریں[1]، تاہم یہ مقدار آپنے جائز رکھی، اس وقت سے وصیت ایک ثلث سے زیادہ ممنوع ہو گئی،

وقف

(وقف شریعت کا ایک بہت بڑا مسئلہ ہی، اسلام نے اس مسئلہ کو جس حد تک صاف کیا اس کا دوسری مذاہب کے قوانین میں شائبہ تک موجود نہیں، اسی بنا پر شاہ ولی اللہ صاحب نے حجۃ اللہ البالغہ میں دعوی کیا ہی کہ اسلام طریقۂ وقف کا موجد ہی، اسلام میں وقف کی تاریخ نہایت قدیم ہی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کے پہلے ہی سال مدینہ میں مسجد نبوی کی بنیاد جس زمین میں رکھی تھی وہ دو یتیموں کی ملکیت تھی، آپنے قیمت دینی چاہی لیکن انھوں نے کہا

لا واللہ لا نطلب ثمنہ الا الی اللہ — نہیں ہم خدا کی قسم قیمت نہیں لیں گے ہم اسکی قیمت اُسی خدا سے لیں گے،

یہ اسلام کا پہلا وقف تھا، اور نہایت سادہ صورت میں تھا، چنانچہ امام بخاری اس حدیث کو

[1] بخاری جلد ۱ کتاب الوصایا

وقف مشاع (مشترکہ جائداد کا وقف) کے ثبوت میں لائے ہیں، اُس کے بعد ۳ھ یا ۴ھ میں جب یہ آیت نازل ہوئی،

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ،

تم نیکی اس وقت تک نہیں پاسکتے جب تک وہ خدا کی راہ میں نہ دیدو جو تم کو سب سے محبوب ہے،

تو ابو طلحہؓ صحابی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے، اور عرض کی یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بیرحا[1] مجھکو سب سے زیادہ محبوب ہے. میں اس کو خدا کی راہ میں صدقہ کرتا ہوں، اور اس کا ثواب و اجر خدا سے چاہتا ہوں، آپ جس مصرف میں چاہیں اس کو رکھیں[2]، چنانچہ آپکے مشورہ سے انھوں نے اس کا منافع اپنے اعزہ پر وقف کیا،

اب تک وقف کے لیے جو الفاظ استعمال ہوئے تھے، وہ صرف یہ تھے کہ وہ ذاتی تصرف سے نکال کر خدا کی ملکیت میں دیا گیا لیکن ۷ھ میں غزوۂ خیبر کے بعد اس کی حقیقت بالکل واضح کردی گئی، خیبر میں حضرت عمرؓ کو ایک زمین ملی تھی، حضرت عمرؓ نے اس کو وقف کرنا چاہا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، آپنے فرمایا،

اِنْ شِئْتَ حَبَسْتَ اَصْلَهَا وَتَصَدَّقْتَ بِهَا

اگر چاہو اصل جائداد باقی رکھو اور منافع صدقہ کردو،

چنانچہ ان شرائط کے ساتھ وہ جائداد وقف ہوئی ہے،

اِنَّهٗ لَا يُبَاعُ اَصْلُهَا وَلَا يُوْهَبُ وَلَا يُوْرَثُ

اصل جائداد نہ بیچی جائے نہ ہبہ کیجائے اور نہ وراثت میں بانٹی جائے،

نکاح و طلاق

نکاح کے متعلق جو اصلاحی احکام آئے اُن کی تفصیل اصلاحات کے عنوان کے نیچے

[1] ایک زمین کا نام ہے جو مدینہ میں واقع تھی، [2] یہ تمام حدیثیں بخاری باب الوقف میں ہیں،

آئے گی، یہاں اس قدر لکھنا کافی ہے کہ اسلام سے پہلے عرب میں کئی قسم کے نکاح کے طریقے جاری تھے جن میں سے ایک کے سوا سب زنا کے مشابہ تھے، سب سے پہلے اسلام نے اُن کو ناجائز ٹھہرایا، متعہ جو زمانۂ جاہلیت سے چلا آتا تھا، بار بار حرام اور حلال ہوتا رہا، یہانتک کہ سنہ ۷ھ غزوۂ خیبر میں قطعاً حرام ہوگیا، اگرچہ اس پر بھی اسکی ضرورت پیش آئی کہ حضرت عمرؓ نے اپنے زمانۂ خلافت میں منبر پر کہا کہ "میں متعہ کو حرام کرتا ہوں یعنی متعہ کی حرمت جو اچھی طرح اب بھی ملک میں شائع نہ ہو سکی میں آج اس کا اعلان کرتا ہوں"

(نکاح اور طلاق کے دیگر احکام مثلاً محرماتِ شرعی کا بیان، منھ بولے بیٹے کی بیوی کا حرام نہ ہونا، کثرتِ ازدواج کی تحدید، تعداد طلاق کی تعیین، زمانۂ عدت کا بیان، مہر کا ضروری ہونا، ظہار یعنی ایک طریقۂ طلاق جس میں اپنی بیوی کو محرمات سے تشبیہ دیتے تھے اور لعان یعنی شوہر کا اپنی بیوی کی عصمت پر شبہہ کرنا، اور باہم اپنی سچائی اور دوسرے کی دروغگوئی کا دعویٰ کرنا، یہ تمام تفصیلیں اصلاحات کے تحت میں آئیں گی، یہاں صرف اس قدر بتا دینا کافی ہے کہ یہ تمام احکام قرآن مجید میں مذکور ہیں، اور اُن کے نزول کا زمانہ سنہ ۴ھ اور ۵ھ ہے)

حدود و تعزیرات

دنیا[2] کے مادی خزانہ میں انسان کی جان سے زیادہ کوئی قیمتی شے نہیں، حدود اور تعزیرات کے اکثر قوانین ہجرت کے چند برس بعد نازل ہوئے لیکن انسان کی جان کی حرمت کا حکم مکہ ہی میں آچکا تھا، معراج کے سلسلہ میں جو اخلاقی احکام بارگاہِ الٰہی سے عطا ہوئے اُن میں سے ایک یہ بھی تھا:

وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ اللّٰهُ إِلَّا بِالْحَقِّ	خدا نے جس جان کو حرام کیا ہے، اس کو ناحق نہ مارو اور جو
وَمَنْ قُتِلَ مَظْلُومًا فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِيِّهٖ	ناحق مارا جائے اسکے وارث کو ہم نے اختیار دیا ہے کہ

[1] محدود الوقت نکاح، [2] (اضافہ تا ختم باب حلال وحرام)

سُلْطٰنًا فَلَا یُسْرِفْ فِّی الْقَتْلِ اِنَّهٗ كَانَ مَنْصُوْرًا (بنی اسرائیل)

وہ قصاص میں زیادتی نہ کرے، اس کی مدد کی جائے،

عرب میں اسلام سے پہلے بھی قتل و قصاص کے کچھ قوانین موجود تھے، یہود جو اس ملک میں ممتاز حیثیت رکھتے تھے، تورات کے حدود و تعزیرات کا مجموعہ اُن کے پاس بھی موجود تھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ عرب میں چونکہ منتظم حاکمانہ طاقت اور اخلاقی روح نہ تھی، اس لئے وہ ان احکام کا نفاذ نہیں کر سکتے تھے، مدینہ پہونچنے کے ساتھ ہی یہود نے فصلِ مقدمات کے لئے بارگاہ نبوت کی طرف رجوع کیا، آپ اُن کے مقدمات عموماً تورات کے احکام کے مطابق فیصل کر دیتے تھے،

عرب میں ایک شخص کا قتل صدہا قبائل کی خانہ جنگی کا سلسلہ چھیڑ دیتا تھا، اس لئے غزوہ بدر کے بعد جب اسلام کے بازوؤں میں حاکمانہ زور آچلا تھا، قصاص کا حکم نازل ہوا، یاد ہوگا کہ اطراف مدینہ میں بنو قریظہ اور بنو نضیر دو یہودی قبائل رہتے تھے، ان دونوں میں بنو نضیر معزز سمجھے جاتے تھے، اس لئے کوئی قرظی کسی نضیری کو مار ڈالتا، تو اس کو بنو نضیر مار ڈالتے تھے، اور اگر کسی نضیری کے ہاتھ سے کوئی قریظی قتل ہو جاتا تو چھوہاروں کے سَو وسق خونبہا دیدیتے، مدینہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری کے بعد اسی قسم کا ایک واقعہ پیش آیا، لوگوں نے اس کا مرافعہ آپ کی خدمت میں پیش کیا، اس پر سورۂ مائدہ کی چند آیتیں اتریں، ان میں سے ایک آیت[1] یہ ہے

وَكَتَبْنَا عَلَیْهِمْ فِیْهَآ اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ وَالْعَیْنَ بِالْعَیْنِ وَالْاَنْفَ بِالْاَنْفِ وَالْاُذُنَ بِالْاُذُنِ وَالْجُرُوْحَ قِصَاصٌ، (مائدہ)

ہم نے ان کو توراۃ میں حکم دیا تھا، کہ جان کے بدلے جان، آنکھ کے بدلے آنکھ، ناک کے بدلے ناک، کان کے بدلے کان، اور زخموں کے بدلے ہم

[1] ابوداؤد، کتاب الدیات

یہ حکم گو یہودیوں کے لئے تھا، لیکن ایک اور آیت نے اس مسئلہ کو بالکل واضح کردیا،

یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُتِبَ عَلَیْکُمُ الْقِصَاصُ فِی الْقَتْلٰی الخ — مسلمانو! تم پر مقتولین میں مساوات اور برابری کا حکم دیا جاتا ہے،

اس حکم نے مساوات اور عدل کے پلے کو دنیا میں ہمیشہ کے لئے برابر کردیا،

یہودیوں میں خون بہا (دیت) کا قانون[1] نہ تھا، لیکن عرب میں یہ قانون تھا، اور اسلام نے چند اصلاحات کے ساتھ اس کو باقی رکھا،

فَمَنْ عُفِیَ لَہٗ مِنْ اَخِیْہِ شَیْءٌ فَاتِّبَاعٌ بِالْمَعْرُوْفِ وَاَدَاءٌ اِلَیْہِ بِاِحْسَانٍ (بقرہ) — اسکے بھائی (یعنی وارث مقتول) کیطرف سے کچھ معاف کردیا جائے تو اسکی پابندی خوبی کیساتھ کرنا اور بطور احسن اسکو ادا (کرنا)

اب تک قتل عمد اور قتل شبہ (یعنی غلطی سے قتل) میں کوئی تفریق نہ تھی ۶ھ میں ایک مسلمان غلطی سے ایک مسلمان کے ہاتھ سے مارا گیا، اور ایک مسلمان انصاری کے ہاتھ سے ایک قریشی قتل ہوا،[2] آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مقتول کے بھائی کو خونبہا دیکر راضی کرلیا، اس کے بعد وہ منافقانہ اسلام لایا، اور غداری سے انصاری کو قتل کرکے قریش میں جاکر مل گیا، ان واقعات کی بناء پر قتل شبہ کے متعلق متعدد احکام نازل ہوئے،

وَمَا کَانَ لِمُؤْمِنٍ اَنْ یَّقْتُلَ مُؤْمِنًا اِلَّا خَطَأً وَمَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَأً فَتَحْرِیْرُ رَقَبَۃٍ مُّؤْمِنَۃٍ وَّدِیَۃٌ مُّسَلَّمَۃٌ اِلٰٓی اَھْلِہٖٓ اِلَّآ — کسی مسلمان کو سزاوار نہیں کہ کسی دوسرے مسلمان کو مار ڈالے لیکن غلطی سے اگر کسی مسلمان کو غلطی سے قتل کیا تو ایک مسلمان غلام آزاد اور خونبہا اسکے ورثاء

[1] صحیح بخاری کتاب التفسیر آیۃ کتب علیکم القصاص،

أَنْ يَصَّدَّقُوا فَإِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ عَدُوٍّ	ادا کرنا چاہیے لیکن یہ کہ وہ معاف کریں تو خیر، اگر
لَكُمْ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ مُؤْمِنَةٍ	مقتول خود مسلمان ہو، وہ کسی دشمن قوم سے تو صرف
وَإِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِيثَاقٌ	ایک غلام آزاد کرو، اور اگر ایسی قوم سے ہو جس سے تم سے
فَدِيَةٌ مُسَلَّمَةٌ إِلَى أَهْلِهِ وَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ	معاہدہ ہو تو خونبہا دینا اور ایک غلام آزاد کرنا چاہیے
مُؤْمِنَةٍ فَمَنْ لَمْ يَجِدْ فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ	اگر قاتل کو یہ مقدور نہ ہو تو پے درپے دو مہینے کے
مُتَتَابِعَيْنِ تَوْبَةً مِنَ اللَّهِ وَكَانَ اللَّهُ	روزے رکھنے چاہئیں کہ خدا اسکی طرف رجوع ہو، خدا
عَلِيمًا حَكِيمًا وَمَنْ يَقْتُلْ مُؤْمِنًا مُتَعَمِّدًا	علم اور حکمت والا ہے اور جو کسی مومن کو جان بوجھ کر
فَجَزَاؤُهُ جَهَنَّمُ خَالِدًا فِيهَا وَغَضِبَ اللَّهُ	قتل کرے تو اسکی جزا دوزخ ہے ہمیشہ اس میں
عَلَيْهِ وَلَعَنَهُ وَأَعَدَّ لَهُ عَذَابًا عَظِيمًا	رہیگا، خدا اس پر اپنا غضب اور لعنت بھیجے گا

اور اس کے لئے بڑا عذاب تیار کیا ہے (نساء - ۱۳)

حضرت ابن عباسؓ کی روایت ہے، کہ قصاص قتل کے متعلق یہ سب سے آخری حکم تھا، حفاظت جان کا اعلان فتحِ مکہ کے موقع پر ہوا، جب آپ نے ارشاد فرمایا کہ زمانۂ جاہلیت کے تمام خون میرے دونوں پاؤں کے نیچے ہیں۔" اس کے بعد قتلِ خطا شابہ بہ قتلِ عمد کے خونبہا کی تحدید[1] فرمائی۔ قتل خطا کا خونبہا اہلِ قریہ کے لئے ۴۰۰ دینار مقرر کیا۔[2]

[illegible] تک رہزنوں کے لئے کوئی حد مقرر نہ تھی، [illegible] میں عکل و عرنیہ کے قبیلہ کے کچھ لوگ مدینہ آکر مسلمان ہوئے، یہاں کی آب و ہوا اُن کو راس نہ آئی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے شہر سے باہر چراگاہ میں اُن کو قیام کی اجازت دی، ایک موقع پر مسلمان چرواہوں کو طرح طرح

[1] ابوداؤد کتاب الدیات، باب فی دیۃ الخطا شبہ العمد [2] ابوداؤد دیات الاعضاء۔

سے عذاب دے کر بڑی بیرحمی سے مار ڈالا اور مویشی لوٹ کر لے گئے، وہ گرفتار ہو کر آئے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اُن کو اسی طرح عذاب کے ساتھ قتل کا حکم دیا، گویہ برابر کا انتقام تھا تاہم اس میں کسی قدر بیرحمی تھی، اس لئے خدا تعالیٰ کی طرف سے عتاب ہوا، اور ڈاکوؤں کے لئے علیحدہ احکام نازل ہوئے[1]۔

اِنَّمَا جَزَاءُ الَّذِیْنَ یُحَارِبُوْنَ اللّٰہَ وَ رَسُوْلَہٗ وَیَسْعَوْنَ فِی الْاَرْضِ فَسَادًا، اَنْ یُّقَتَّلُوْا اَوْ یُصَلَّبُوْا اَوْ تُقَطَّعَ اَیْدِیْھِمْ وَاَرْجُلُھُمْ مِنْ خِلَافٍ اَوْ یُنْفَوْا مِنَ الْاَرْضِ (مائدہ)	ان لوگوں کی سزا جو خدا اور اس کے رسول سے لڑائی لڑتے ہیں، اور ملک میں فساد مچاتے ہیں یہ ہے کہ قتل کئے جائیں، یا پھانسی دئے جائیں یا اُن کے ادھر کے ہاتھ اور ادھر کے پاؤں کاٹ ڈالے جائیں، یا ملک سے الگ کر دیئے جائیں

جان کے بعد مال کا درجہ ہے اسلام سے پہلے عرب میں چوروں کے لئے قطعِ ید کی سزا جاری تھی، اسلام نے بھی اس کو باقی رکھا اَلسَّارِقُ وَالسَّارِقَۃُ فَاقْطَعُوْا اَیْدِیَھُمَا، سنہ میں فتح مکہ کے موقع پر قبیلۂ مخزوم کی ایک عورت نے اس جرم کا ارتکاب کیا، چونکہ وہ ایک شریف خاندان سے تھی، اس لئے مسلمانوں میں بڑا اضطراب پیدا ہوا، حضرت اسامہؓ بن زید آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بہت چہیتے تھے، ان سے سفارش کرائی گئی، آپ بہت برہم ہوئے، اور لوگوں کو جمع کر کے ایک خطبہ دیا، جس میں فرمایا کہ تم سے پہلے لوگوں کی ہلاکت کا یہی سبب ہوا، کہ وہ نیچے طبقہ کے لوگوں پر تو احکام جاری کرتے لیکن اوپر درجہ کے لوگ جب جرم کا ارتکاب کرتے تو اُن سے درگذر کرتے، خدا کی قسم اگر محمد کی بیٹی فاطمہ

[1] ابو داؤد کتاب الحدود باب المحاربہ،

بھی چوری کرتی تو میں اس کا ہاتھ بھی کاٹ لیتا۔" اس تقریر کا یہ اثر ہوا کہ لوگوں نے بے چون و چرا اس حکم کی تعمیل کی،[1]

عربوں میں زنا کی کوئی سزا مقرر نہ تھی، یہودیوں میں توراۃ کی رو سے زانی کی سزا "رجم" یعنی (سنگسار کرنا) مقرر تھی لیکن اخلاقی کمزوری کی بنا پر اس حکم کو جاری نہیں رکھ سکتے تھے، اطراف مدینہ میں جو یہود آباد تھے، رجم کے بجائے انھوں نے یہ سزا مقرر کی تھی، کہ مجرم کے منھ میں کالک لگا کر کوچہ و بازار میں اسکی تشہیر کرتے تھے، جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لائے تو انھوں نے ایک مجرم کا مقدمہ آپ کی خدمت میں پیش کیا، غالباً یہ ۳ھ کے اندر کا واقعہ ہے آپنے استفسار فرمایا کہ تمھاری شریعت میں اس جرم کی کیا سزا ہے، انھوں نے اپنا رواج بتایا، آپنے توراۃ منگوا کر ان سے پڑھوایا، انھوں نے رجم کی آیت پر انگلی رکھ کر چھپا دی، آخر ایک مسلمان یہودی نے نکال کر وہ آیت سنائی، آپنے فرمایا خداوندا! یہ تیرا حکم ہے جس کو ان لوگوں نے مردہ کردیا ہے میں سب سے پہلا شخص ہوں جو تیرے اس حکم کو زندہ کرونگا،[2]" چنانچہ آپنے اس کے سنگسار کرنے کا حکم دیا، اور وہ سنگسار کیا گیا،

۵ھ میں سورۂ نور نازل ہوئی جس میں زنا کی سزا "سو درے" قرار دی گئی، حضرت عمرؓ کا بیان ہے کہ رجم کی سزا ابھی قرآن نے باقی رکھی تھی، اسکی تلاوت[3] منسوخ ہوگئی، بہرحال احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ بن بیاہے کے سو درے اور بیاہوں کیلئے رجم کا حکم ہے،[4] چنانچہ ۸ھ میں ایک مسلمان نے اس جرم کا ارتکاب کیا، اور گو لوگوں کو اس کا علم نہ تھا، لیکن دنیا کی سزا کو آخرت کے عذاب پر اس نے ترجیح دی، اور مجمع عام میں آکر بارگاہ نبوت میں عرض پرداز ہوا کہ یا رسول اللہ! میں

---

[1] صحیح بخاری غزوۃ الفتح [2] ابوداؤد باب فی رجم الیہودیین [3] صحیح بخاری رجم المحصن [4] تمام کتب حدیث میں یہ مذکور ہے

گنہگار ہوں، مجھے پاک کیجئے" آپنے تحقیق فرمائی اور اس کے رجم کا حکم دیا،[1]

شراب ۳ھ میں حرام ہوئی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں شرابخوری کی کوئی خاص سزا مقرر نہ تھی، چالیس دُرّے تک لوگوں کو اس جرم میں مارے گئے ہیں، حضرت عمرؓ نے اپنے زمانہ میں اسی دُرّے کردیے تھے[2] قذف یعنی پاکدامن عورتوں پر تہمت لگانے کی سزا ۵ھ میں نازل ہوئی،[3]

وَالَّذِينَ يَرْمُونَ الْمُحْصَنَاتِ ثُمَّ لَمْ يَأْتُوا	جو لوگ پاکدامن عورتوں پر زنا کی تہمت لگائیں
بِأَرْبَعَةِ شُهَدَاءَ فَاجْلِدُوهُمْ ثَمَانِينَ	پھر چار گواہ نہ لاسکیں تو ان کو اسی دُرّے مارو،
جَلْدَةً وَلَا تَقْبَلُوا لَهُمْ شَهَادَةً أَبَدًا (نور)	اور پھر کبھی اُن کی گواہی نہ قبول کرو،

دنیا میں تین چیزیں ہیں، جان، مال اور آبرو، جن حدود و تعزیرات کا اوپر ذکر ہوا، وہ ان ہی تین چیزوں کے تحفظ کے لئے ہیں، اسی لئے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ان قوانین کے نزول کے بعد ۱۰ھ میں حجۃ الوداع کے موقع پر حرم کے اندر ماہ حرام کی تاریخوں میں فرمایا،

"مسلمانو! ہر مسلمان کی جان، مال اور آبرو اسی طرح قابل حرمت ہے جس طرح اس محترم شہر میں، اس احاطۂ حرم کے اندر یہ مقدس دن قابل حرمت ہے")

حلال و حرام

ماکولات میں حلال و حرام (عرب میں کھانے پینے میں کسی چیز کا پرہیز نہ تھا، اور نہ کوئی شے حلال یا حرام

---

[1] ۷ھ کی تحدید میں کہیں تفصیل مذکور نہیں ہے، یہ سنہ اس قیاس سے شارحین حدیث نے اختیار کیا ہے کہ اس وقت حضرت ابوہریرہؓ مدینہ میں موجود تھے، اور یہ ثابت ہے کہ وہ اسی سال بزمانہ فتح خیبر مدینہ میں آئے تھے، [2] ابوداؤد اذا تتابع فی الخمر [3] واقعۂ افک اسی سال ہوا تھا، اور یہ آیت اسی تعلق سے نازل ہوئی ہے اسلئے اس کیلئے یہ ۵ھ کا زمانہ متعین کیا گیا

تھی، مردار اور حشرات الارض تک کھاتے تھے، البتہ بعض بعض جانور جن کو بتوں کے نام پر چھوڑ دیتے تھے، ان کا ذبح کرنا گناہ سمجھتے تھے بعض جانوروں میں یہ نذر مانتے تھے، کہ مرد کھا سکتے ہیں عورتیں نہیں، اگر بچہ مردہ پیدا ہوا، تو مرد عورت دونوں کھا سکتے ہیں، اور زندہ ہو تو صرف مرد کھائیں اسی قسم کے اور بعض بت پرستانہ رسوم تھے، سورۂ انعام میں جو مکہ میں نازل ہوئی تھی، ان رسوم کا بہ تفصیل ذکر ہے۔ اسلام کے اکثر احکام گو مدینہ میں اترے لیکن ماکولات کی حلت و حرمت کے احکام مکہ ہی میں اترنے شروع ہو چکے تھے، چنانچہ سورۂ انعام میں مشرکین کے ان رسوم کی تردید کے بعد حکم آیا،

قُلْ لَّآ اَجِدُ فِيْمَآ اُوْحِيَ اِلَيَّ مُحَرَّمًا عَلٰى طَاعِمٍ يَّطْعَمُهٗٓ اِلَّآ اَنْ يَّكُوْنَ مَيْتَةً اَوْ دَمًا مَّسْفُوْحًا اَوْ لَحْمَ خِنْزِيْرٍ فَاِنَّهٗ رِجْسٌ اَوْ فِسْقًا اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَاِنَّ رَبَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ.

کہدے کہ مجھ پر جو وحی اتری ہے اس میں کسی کھانیوالے پر کوئی شے حرام نہیں ہے، ہاں اگر حرام ہے تو مردار یا بہتا ہوا خون یا سوٴر کا گوشت، کیونکہ یہ چیزیں ناپاک ہیں یا وہ گناہ (کا جانور) جو غیر خدا کے نام پر چڑھایا جائے وہ بھی حرام ہے، لیکن جو بھوک سے لاچار ہو کر نافرمانی اور گناہ کے ارادے سے نہیں ان میں کچھ کھائے تو تمہارا پروردگار بخشنے والا مہربان ہے۔

مشرکین کو سب سے زیادہ تعجب اس پر ہوا کہ جو آپ سے مر جائے اس کو حرام کہتے ہیں اور جس کو خود اپنے ہاتھ سے ماریں اس کو حلال جانتے ہیں، حالانکہ دونوں میں کوئی فرق نہیں اس پر یہ آیت اتری

فَكُلُوْا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ اِنْ كُنْتُمْ بِاٰيٰتِهٖ مُؤْمِنِيْنَ وَمَا لَكُمْ اَلَّا تَاْكُلُوْا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ وَقَدْ فَصَّلَ لَكُمْ

جو جانور خدا کا نام لیکر ذبح کیا گیا ہو وہ کھاؤ جو خدا کا نام لیکر ذبح کیا گیا ہو کیوں نہ کھاؤ خدا نے تم پر جو حرام کیا ہے، اس کو تو وہ بیان ہی

مَا حَرَّمَ عَلَيْكُمْ، (انعام) کر چکا

اس کے بعد مکہ معظمہ ہی میں سورہ نحل کی آیت فَكُلُوا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ الخ نازل ہوئی جس میں اسی حکم سابق کا اعادہ کیا گیا، اور یہی چار چیزیں مردار، خون، سور، اور بتوں پر چڑھاوے حرام بیان کی گئیں، مدینہ طیبہ میں آکر پہلے سورہ بقرہ میں اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ تیسری بار یہ محرمات اربعہ بیان کئے گئے، عرب میں حلال وحرام کی تمیز کم تھی، وحشت جہالت کے علاوہ اس کا ایک سبب عام غربت اور افلاس تھی، اس لئے مسلمانوں کی مالی حالت جیسے جیسے درست ہوتی جاتی تھی، حلال وحرام کی تفریق بڑھتی جاتی تھی، لوگ عموماً مردار اسی کو سمجھتے تھے، جو بیمار ہو کر اپنی موت سے مرجائے اس لئے اگر اور کسی سبب سے جانور مرجاتا، تو اس کو حرام نہیں سمجھتے، ہجرت کے چار پانچ سال کے بعد سورہ مائدہ میں مردار (میتہ) کی تفصیل بیان کی گئی یعنی یہ کہ یا وہ گلا گھٹنے سے مرا ہو الْمُنْخَنِقَةُ یا گردن ٹوٹنے سے مرا ہو، وَالْمَوْقُوْذَةُ یا اوپر سے گر کے مرا ہو، وَالْمُتَرَدِّيَةُ یا کسی جانور کا سینگ لگ کر مرگیا ہو وَالنَّطِيْحَةُ، یا کسی جانور نے اس کو پھاڑ ڈالا ہو وَمَا اَكَلَ السَّبُعُ، صرف وہ جانور حلال ہے جس کو تم نے ذبح کیا، اِلَّا مَا ذَكَّيْتُمْ،

سنہ ھ میں جب مسلمانوں کو خیبر کی فتوحات اور جاگیریں ہاتھ آئیں تو جانوروں میں بھی حلال وحرام کی تفریق کی گئی اور اعلان کیا گیا کہ آج سے گدہا، درندہ جانور، اور پنجہ دار پرند حرام ہیں، سنہ ھ میں فتح مکہ کے بعد طے کے قبیلہ نے جو عیسائی تھا اسلام قبول کیا اور شام کے بعض عیسائی مسلمان ہوئے، یہ لوگ شکاری کتے پالتے تھے، اور ان سے شکار کرتے تھے، اسلام لانے پر ان کو معلوم ہوا کہ مردہ جانور حرام ہیں، انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اپنا حال عرض کیا

اس پر یہ آیت اتری،

یَسْئَلُوْنَکَ مَاذَآ اُحِلَّ لَھُمْ قُلْ اُحِلَّ لَکُمُ الطَّیِّبٰتُ ۔ (مائدہ) تجھ سے پوچھتے ہیں کہ ان کیلئے کیا حلال کیا گیا کہدے کہ تمام

اس کے بعد یہ تفصیل ہے کہ شکاری جانور اگر سدھے ہوئے ہوں اور خدا کا نام لیکر چھوڑے جائیں

تو ان کا شکار کیا ہوا کھانا حلال ہے[1]

شراب کی حرمت مخالفین کا خیال ہے کہ اسلام کی اشاعت کی بڑی وجہ یہ ہوئی کہ اس کے اکثر احکام (مثلاً تعدّد ازدواج وغیرہ) نفس پرستی کے مؤید تھے، اس لئے عرب کو اس کے قبول کرنے میں کوئی ایثار درکار نہ تھا، بلکہ اسلام وہی کہتا تھا، جو وہ خود چاہتے تھے، اس بحث کی تحقیق آگے آئے گی، یہاں صرف تاریخی حیثیت سے شراب کی حرمت کا واقعہ ذکر کرنا مقصود ہے،

عرب کو شراب سے بڑھ کر کوئی چیز محبوب نہ تھی، تمام ملک اس مرض میں مبتلا تھا، عرب کی شاعری کا موضوعِ اعظم شراب ہی مصلحت کے لحاظ سے اسلام کے تمام احکام تدریج آئے ہیں، اس لئے شراب بھی تدریج حرام کی گئی،

مدینہ میں شراب خواری کا رواج کسی قدر زیادہ تھا، بڑے بڑے شرفاء علانیہ شراب پیتے تھے، عرب میں ایسے بھی نیک لوگ تھے، جنھوں نے شراب پینی چھوڑ دی تھی، اور اس کو خلافِ تقا سمجھتے تھے، ابھی تک اسلام نے اس کے متعلق کوئی اپنا فیصلہ نہ سنایا تھا، لوگوں نے پوچھنا شروع کیا کہ شراب کے متعلق کیا حکم ہے، حضرت عمرؓ نے کہا،

اَللّٰھُمَّ بَیِّنْ لَنَا فِی الْخَمْرِ بَیَانًا شِفَاءً، اے خدا شراب کے بارہ میں ہمارے لئے شافی بیان کردے،

---

[1] حوالوں کے لئے ان آیتوں کے شانِ نزول تفسیروں میں دیکھو،

اس پر یہ آیت اتری،

يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ قُلْ فِيْهِمَا اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَاِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا (بقرہ - ۲۷)

لوگ تم سے شراب اور جوئے کی بابت دریافت کرتے ہیں کہدو کہ ان دونوں میں بڑا گناہ ہے اور فائدے بھی ہیں لیکن فائدہ سے گناہ بڑھکر ہے

اس آیت کے نازل ہونے کے بعد بھی لوگ شراب پیتے رہے ایک دفعہ ایک انصاری نے حضرت علیؓ اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کی دعوت کی جس میں شراب بھی تھی، کھانے کے بعد مغرب کا وقت آگیا، اور حضرت علیؓ نے نماز پڑھائی لیکن نشہ کے خمار میں کچھ کا کچھ پڑھ گئے حضرت عمرؓ نے پھر دعا کی کہ خدا شراب کے بارے میں صاف صاف بیان کردے) اس پر یہ آیت اتری

لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكَارٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ (نساء)

نشہ کی حالت میں تم نماز نہ پڑھو، یہانتک کہ جو تم کہو اس کو بھی سمجھ سکو،

اس آیت کے نازل ہونے کے بعد جب نماز کا وقت آتا تھا، تو آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے حکم سے ایک منادی اعلان کرتا تھا، کہ "کوئی مخمور نماز میں نہ شامل ہونے پائے"[1] لیکن چونکہ عام حکم نہ تھا، اسلئے نماز کے سوا باقی اوقات میں لوگ بے تکلف پیتے پلاتے تھے، حضرت عمرؓ نے پھر وہی دعا کی، اسی زمانہ میں کچھ لوگ شراب پی کر اس قدر بدمست ہوئے کہ آپس میں مارپیٹ تک نوبت[2] پہنچ گئی، اس پر یہ آیت[3] اتری

يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْآ اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ

مسلمانو بے شبہہ شراب اور جوا اور بت اور قمار کے تیر ناپاک ہیں اور شیطان کے کام ہیں، تو تم اس سے باز آؤ کہ تم کو

[1] یہ پورا واقعہ ابوداؤد کتاب الاشربہ میں مذکور ہے [2] صحیح مسلم جلد ۲ صفحہ ۳۲۰ ذکر سعد بن وقاصؓ [3] ابوداؤد میں پوری آیتیں نہیں مذکور ہیں، بلکہ چند لفظ نقل کرکے پوری آیت کی طرف اشارہ کردیا ہے،

لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ، اِنَّمَا يُرِيْدُ الشَّيْطَانُ اَنْ — فلاح حاصل ہو، شیطان تو صرف یہ چاہتا ہے کہ تم

يُّوْقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاءَ فِي الْخَمْرِ — لوگوں میں شراب اور جوے کے ذریعہ سے دشمنی

وَالْمَيْسِرِ وَيَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَعَنِ — بغض ڈالدے اور تم کو خدا کی یاد سے اور نماز سے

الصَّلٰوةِ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ (مائدہ) — روکدے تو بولو! تم باز آتے ہو؟

(ان آیتوں کے نزول کے بعد شراب قطعاً حرام ہوگئی، اسی وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم) نے مدینہ کی گلی کوچوں میں منادی کرادی کہ آج سے شراب حرام ہے لیکن باینہمہ شراب کی تجارت اور خرید و فروخت جاری تھی، ۸ھ میں یہ بھی حرام ہوگئی، آپنے مسجد نبوی میں لوگوں کو جمع کرکے اسی وقت اعلان کیا[1] اس کے بعد اسی سال فتح مکہ کے زمانہ میں آپنے علی الاعلان ان چیزوں کی تجارت کی ممانعت فرمائی جن کا کھانا یا کھانا ناجائز ہے، آپنے فرمایا،

اِنَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ حَرَّمَ بَيْعَ الْخَمْرِ وَ — خدا اور اس کے رسول نے شراب مردہ، سور

الْمَيْتَةِ وَالْخِنْزِيْرِ وَالْاَصْنَامِ[2] — اور بتوں کی خرید و فروخت حرام کردی،

غور کرو، شراب کی حرمت کس طرح اعلان عام کیساتھ عمل میں آئی، باینہمہ ابھی تک یہ نہیں متعین ہوا کہ یہ کس سال کا واقعہ ہے، محدثین اور ارباب روایت اس امر میں نہایت مختلف الآراء ہیں،[3]

---

[1] صحیح بخاری (تفسیر آیت الربوا) و صحیح مسلم باب تحریم بیع الخمر میں حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں، کہ اواخر سورۂ بقرہ کے نزول کے بعد جس میں حرمت ربوا کا حکم ہے یہ اعلان فرمایا، یہ آیتیں ۸ھ میں نازل ہوئی ہیں، فتح [2] صحیح بخاری و مسلم باب تحریم بیع الخمر والمیتۃ والاصنام [3] سیرۃ النبی جلد اول میں حرمت شراب کی دو تاریخیں مختلف مقامات پر لکھی گئی ہیں، ص ۲۰۰ میں ۳ھ اور ص ۲۹۰ میں ۸ھ لکھا گیا ہے، پہلا بیان عام ارباب سیر کا ہے، دوسرا علامہ ابن حجر کی تحقیق ہے لیکن مصنفین سیرۃ النبی کی اصلی تحقیق یہاں مذکور ہوئی ہے، اور وہ اس باب میں عام محدثین کے ساتھ ہیں، جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہوگا، "س"

حافظ ابن حجر فتح الباری کتاب التفسیر سورہ مائدہ باب لیس علی الذین آمنوا میں لکھتے ہیں،

والذی یظهر ان تحریمها کان عام الفتح سنة ثمان کما روی احمد من طریق عبد الرحمن بن وعلة قال سالت ابن عباس عن بیع الخمر فقال کان لرسول الله صلی الله علیه وسلم صدیق من ثقیف او دوس فلقیه یوم الفتح براویة خمر یهدیها الیه فقال یا فلان اما علمت ان الله حرمها، الخ

اور بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ شراب کی حرمت فتح مکہ کے زمانہ ۸ھ میں ہوئی اور اسکی دلیل یہ ہے کہ امام احمد نے عبدالرحمن بن وعلہ کی سند سے روایت کی ہے کہ میں نے حضرت عبداللہ بن عباس سے پوچھا کہ شراب کا بیچنا کیسا ہے تو انھوں نے کہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک دوست تھے، جو ثقیف یا دوس کے قبیلہ سے تھے وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے فتح مکہ میں ملے، اور ایک مشک شراب تحفہ میں پیش کی، آپ نے فرمایا کہ تم کو معلوم نہیں کہ خدا نے شراب کو حرام کر دیا ہے،

ہماری رائے میں حافظ ابن حجر کا خیال اور ان کا استدلال صحیح نہیں، اس روایت سے صرف اس قدر ثابت ہوتا ہے کہ ان صاحب کو شراب کی حرمت کا حال فتح مکہ تک نہیں معلوم ہوا تھا[1] یہ کہاں

---

(۱) مصنف کا یہ قیاس بالکل درست ہے جن صاحب کا یہ واقعہ ہے وہ قبیلہ ثقیف یا دوس کے تھے، ثقیف کا قبیلہ ۸ھ میں مسلمان ہوا، اور دوس گو بہت پہلے اسلام لا چکے تھے لیکن وہ مدینہ سے بہت دور آباد تھے، اسکے علاوہ ایک اور نکتہ بھی ہے جس کی طرف ہمارے محدثین نے توجہ نہیں کی ہے، وہ یہ ہے جیسا کہ ہم متن میں پہلے لکھ آئے ہیں کہ شراب کا پینا گو ۳ھ میں حرام ہو چکا تھا لیکن شراب کی تجارت بند نہیں ہوئی تھی، چنانچہ یہ صاحب بھی مے فروش تھے شراب کی خرید و فروخت ممانعت ربا کی حرمت کیساتھ عمل میں آئی، اور ربا کی حرمت سب سے آخر میں نازل ہوئی یعنی ۸ھ میں شراب فروشی کی ممانعت مدینہ میں اسی وقت کر دی گئی لیکن اس کا عام اعلان آپ نے فتح مکہ

ثابت ہوتا ہے کہ اس وقت حرمت نازل بھی نہیں ہوئی تھی، بہت سے احکام ہیں جن کی خبر دور کے رہنے والوں کو بہت دیر کے بعد ہوئی،

علاوہ اس کے خود بعض روایتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ فتح مکہ سے پہلے شراب کی حرمت نازل ہو چکی تھی، یہ کسی طرح ممکن نہیں کہ شراب جیسی ناپاک چیز ۸ھ تک حلال رہتی، اور آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی وفات سے صرف دو برس پہلے حرام ہوتی، حقیقت میں شراب ہجرت کے تیسرے یا چوتھے برس حرام ہو چکی تھی[۱]،

(بقیہ حاشیہ ص ۱۴۵) کے زمانہ میں فرمایا، جیسا کہ احادیث صحیحہ میں بتصریح مذکور ہے (دیکھو صحیح بخاری تفسیر آیت ربا و باب بیع المیتۃ والاصنام اور صحیح مسلم باب تحریم بیع الخمر) حافظ ابن حجر جو اس بات کے قائل ہیں کہ شراب کی حرمت ۸ھ میں نازل ہوئی، وہ خود جلد اول ص ۱۰۴ میں قاضی عیاض کے جواب میں لکھتے ہیں، قلت ویحتمل ان یکون تحریم التجارۃ فیھا تاخر عن وقت تحریمھا واللہ اعلم، یعنی ممکن ہو کہ شراب پینے کی حرمت کے بعد شراب کی تجارت کی حرمت نازل ہوئی ہو، صحیح مسلم میں ابو سعید خدری رض سے روایت ہو (باب تحریم بیع الخمر) جس سے معلوم ہوتا ہو کہ شراب پینے اور اس کی خرید فروخت کی ممانعت ایک ساتھ نازل ہوئی لیکن اس کے بعد حضرت عائشہ رض اور جابر بن عبد اللہ رض سے جو روایتیں ہیں اُن سے ثابت ہوتا ہو کہ پہلی روایت میں ابو سعید خدری رض یا اُن کے بعد کے راویوں سے کسی قدر تسامح ہوا ہو وھذا ھو الحق علاوہ ازیں حافظ ابن حجر نے امام احمد کی جس حدیث سے فتح مکہ میں شراب نوشی کی حرمت کے نزول پر استدلال کیا ہو، وہ خلاصۃً صحیح مسلم (باب تحریم بیع الخمر) میں بھی ہے، لیکن اس میں فتح مکہ کی تعیین نہیں،

[۱] سب سے بڑی دلیل اس کی یہ ہو کہ جب شراب کی حرمت نازل ہوئی، تو لوگوں نے کہا کہ ہمارے مسلمان بھائی جو شراب پی کر جنگ احد میں شریک ہوئے اور اسی حالت میں مارے گئے، اُن کا کیا حال ہوگا، اس پر آیت لَیْسَ عَلَی الَّذِیْنَ آمَنُوْا، نازل ہوئی،

(باقی ص ۱۴۷ پر)

سود خواری کی حرمت

سود خواری[1] بھی ان اخلاق ذمیمہ میں سے ہے جو اہلِ عرب کے رگ و ریشہ میں سرایت کر گئے تھے اسی لئے نہایت تدریج کیساتھ اسکی حرمت کے احکام بھی اترے قریش عموماً تجارت پیشہ تھے، ان میں جو امیر اور دولتمند سوداگر تھے، وہ غریبوں اور کاشتکاروں کو بھی شرح سود پر روپیہ قرض دیتے، اور جب تک قرض وصول نہ ہو جاتا، اصل سرمایہ کو ہر سال بڑھاتے جاتے،[2] خود آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے چچا عباس (اسلام سے پہلے) بہت بڑی سودی کاروبار کے مالک تھے،[3] آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) جب مدینہ تشریف لائے تو یہودی تاجروں کے سبب سے یہاں مختلف قسم کے سود کا رواج دیکھا، سب سے پہلے آپ نے چاندی اور سونے کے ادھار خرید و فروخت کو سود قرار دیا،[4]

(بقیہ حاشیہ ص ۱۴۶) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شراب کی حرمت کا واقعہ جنگِ اُحد سے بالکل متصل تھا، اور جنگ اُحد کا زمانہ یہی ہے بخاری تفسیر آیت مذکور میں حضرت جابرؓ کی روایت ہے،

صبح ناس غداۃ احد الخمر فقتلوا — غزوۂ اُحد کی صبح کو کچھ لوگوں نے شراب پی
من یومھم جمیعا شھداء وذلک — اور یہ سب اسی دن شہید ہوئے، یہ شراب
من قبل تحریمھا، — کی حرمت سے پہلے ہوا،

اس روایت کے ساتھ حضرت انسؓ کی اس روایت کو ملاؤ، جو اس کے بعد ہی واقع ہے،

فقال بعض القوم قتل قوم وھی — حرمت شراب کی آیت نازل ہوئی تو بعض لوگوں نے
فی بطنھم قال فانزل اللہ ولیس — کہا کہ کچھ لوگ اس حال میں مارے گئے ہیں کہ شراب
علی الذین اٰمنوا (الخ) — انکے پیٹ میں تھی، اس پر یہ آیت اتری کہ جو مومن

[illegible]

[1] اضافۂ ختم سود [2] موطا امام مالک باب الربوا [3] ابن جریر طبری آیت ربوا [4] صحیح مسلم باب الصرف

پھر دوگنے اور چوگنے سود لینے کی ممانعت آئی اور یہ آیت اُتری،

يَآاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوا الرِّبٰوٓا اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً وَّاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ (آل عمران)

مسلمانو! دگنا چوگنا سود نہ کھایا کرو، اور خدا سے ڈرا کرو تاکہ فلاح پاؤ،

اُس کے بعد آپ نے ہمجنس اشیار کا باہم گھٹ بڑھ کے مبادلہ منع فرمایا[1]، ۷ھ میں غزوۂ خیبر کے موقع پر مسلمانوں نے یہودی سوداگروں سے لین دین شروع کیا، اس وقت آپ نے اعلان فرمایا، کہ سونے کو اشرفی کے بھاؤ گھٹا بڑھا کر بیچنا بھی سود ہے[2]، سود کی حرمت کے متعلق تفصیلی احکام ۸ھ میں نازل ہوئے، آل عمران کے بعد سورۂ بقرہ میں سب سے پہلے یہ آیت اُتری،

اَلَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا يَقُوْمُوْنَ اِلَّا كَمَا يَقُوْمُ الَّذِيْ يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْٓا اِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا فَمَنْ جَآءَهٗ مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ فَانْتَهٰى فَلَهٗ مَا سَلَفَ، (بقرہ)

جو لوگ سود کھاتے ہیں وہ اس طرح کھڑے ہونگے جس طرح شیطان کسی کو چھو کر مخبوط بنا دیتا ہے، اسلئے کہ وہ یہ کہتے ہیں کہ بیع اور سود کا معاملہ یکساں ہی ہے، خدا نے بیع کو تو حلال کیا، اور سود کو حرام کر دیا، پس جس کے پاس خدا کی طرف سے نصیحت کی بات پہنچی اور وہ باز آگیا تو اس کو وہی لینا چاہیے،

لوگوں کو یہ اعتراض تھا کہ سود بھی ایک قسم کی تجارت ہے، جب تجارت جائز ہے تو سود کیوں حرام ہے، اس سوال کا جواب تو کتاب کی دوسری جلدوں میں آئیگا، یہاں صرف سود کی تاریخ حرمت سے بحث ہے، بہرحال اس آیت میں بھی سود کی قطعی حرمت کا فیصلہ نہ ہوا، آخر تھوڑے

---

[1] صحاح کتاب البیوع [2] صحیح مسلم باب بیع القلادہ فیہا خرز،

ہی وقفہ کے بعد غالباً ۸ھ میں یہ آیت نازل ہوئی،

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَذَرُوا	مسلمانو! خدا سے ڈرو اور سود جو باقی رہ گیا ہے،
مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبَا إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ فَإِنْ	اس کو چھوڑ دو، اگر تم سچے مومن ہو، اگر یہ نہ کرو تو
لَمْ تَفْعَلُوا فَأْذَنُوا بِحَرْبٍ مِنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ	خدا اور رسول سے لڑنے کے لئے تیار ہو جاؤ،
وَإِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوسُ أَمْوَالِكُمْ لَا تَظْلِمُونَ	اگر باز آجاؤ تو تم کو اپنے راس المال کا حق ہے،
وَلَا تُظْلَمُونَ. (بقرہ)	نہ تم کسی پر ظلم کرو، اور نہ تم پر کوئی ظلم کرے،

یہ آیت جب اتری تو آپ نے مسجد میں تمام مسلمانوں کو جمع کر کے یہ حکم سنایا[1]، ۹ھ میں اہلِ نجران سے جو معاہداتِ صلح ہوئے، ان میں ایک دفعہ یہ بھی تھی کہ "سود نہ لیں گے"[2]، ذیحجہ ۱۰ھ میں حجۃ الوداع کے موقع پر اس آیت کے نزول سے پہلے تمام ملک عرب میں جس قدر سودی معاملات تھے، آپ نے سب کو کالعدم قرار دیا،

حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ سود کی حرمت کا حکم اسلام کے سلسلۂ احکام کی سب سے آخری کڑی ہے[3]،

---

[1] صحیح بخاری و مسلم باب تحریم بیع الخمر۔ [2] ابوداؤد باب اخذ الجزیہ۔ [3] تفسیر آیت وَاتَّقُوا يَوْمًا، (بقرہ)

سال اخیر حجۃ الوداع اختتام فرض نبوت

ذی حجہ سنہ ۱۰ھ مطابق فروری سنہ ۶۳۲ء

اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ وَرَاَیْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا،

جب خدا کی مدد آگئی اور مکہ فتح ہو چکا اور تو نے دیکھ لیا کہ لوگ خدا کے دین میں فوج کی فوج داخل ہو رہے ہیں تو خدا کے حمد کی تسبیح پڑھ اور استغفار کر، خدا

بظاہر یہ خیال ہوتا ہے کہ نصرت اور فتح کے مقابلہ میں شکر کی ہدایت ہونی چاہیے تھی، تسبیح اور استغفار کو فتح سے کیا مناسبت ہے؟ اس بنا پر ایک صحبت میں حضرت عمرؓ نے صحابہ سے اس آیت کے معنی پوچھے، لوگوں نے مختلف معنی بتائے، حضرت عمرؓ نے عبداللہ بن عباسؓ کی طرف دیکھا، وہ کمسن تھے اور جواب دیتے جھجکتے تھے، حضرت عمرؓ نے ان کی ڈھارس بندھائی تو انہوں نے کہا کہ "یہ آیت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قرب وفات کا اعلان ہے، کہ استغفار موت کے لئے مخصوص ہے،" اس سورہ کے نازل ہونے کے بعد آپ کو معلوم ہو گیا تھا کہ رحلت کا زمانہ قریب آ گیا، اس لئے

[1] صحیح بخاری تفسیر سورۂ اذا جاء، [2] واحدی نے اسباب النزول میں لکھا ہے کہ یہ سورۂ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے دو برس پہلے اتری لیکن ابن قیم نے زاد المعاد میں لکھا ہے کہ سنہ ۱۰ھ میں اور عین ایام تشریق میں اتری (یہ دوسری روایت اصل میں بیہقی کی ہے) اور ابن حجر اور زرقانی نے تصریح کی ہے کہ اس کی سند ضعیف ہے، اس لئے واحدی کی روایت صحیح ہے، سیوطی نے بھی اسباب النزول میں مصنف عبدالرزاق کے حوالہ سے یہی روایت نقل کی ہے کہ یہ سورہ فتح مکہ کے بعد ہی فوراً نازل ہوئی، تصریحات ائمہ و اشارات حدیث کے علاوہ خود اس سورہ کا طرز بیان ظاہر کر دیتا ہے کہ وہ فتح مکہ کے متصل ہی اتری ہے یعنی حجۃ الوداع سے تقریباً دو پونے دو برس پہلے جن روایتوں میں وفات سے چند روز پہلے اس سورہ کا نازل ہونا بیان ہوا ہے وہ روایتاً و درایتاً دونوں حیثیتوں سے ضعیف ہیں، "س"

اب ضرورت تھی کہ تمام دنیا کے سامنے شریعت اور اخلاق کے تمام اصولِ اساسی کا مجمع عام میں اعلان کر دیا جائے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کے زمانہ سے اب تک فریضۂ حج ادا نہیں فرمایا تھا[1] ایک مدت تک تو قریش سدِ راہ رہے، صلح حدیبیہ کے بعد موقع ملا، لیکن مصالح اس کے مقتضی تھے کہ یہ فرض سب سے آخر میں ادا کیا جائے،

بہرحال ذوقعدہ میں اعلان ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حج کے ارادہ سے مکہ تشریف لیجاتے ہیں یہ خبر دفعۃً پھیل گئی، اور شرف ہمرکابی کے لئے تمام عرب اُمنڈ آیا، (سنیچر کے دن) ذوقعدہ کی ۲۶ تاریخ کو آپ نے غسل فرمایا[2]، اور چادر اور تہمد باندھی، نماز ظہر کے بعد مدینہ سے باہر نکلے، اور تمام ازواج مطہرات کو ساتھ چلنے کا حکم دیا، مدینہ سے چھ میل کے فاصلہ پر ذو الحلیفہ ایک مقام ہے جو مدینہ کی میقات ہے، یہاں پہنچکر شب بھر اقامت فرمائی، دوسرے دن دوبارہ غسل فرمایا، حضرت عائشہؓ نے اپنے ہاتھ سے آپ کے جسم مبارک میں عطر ملا[3]، اس کے بعد آپ نے دو رکعت نماز ادا کی، پھر قصوا پر سوار ہو کر احرام باندھا، اور بلند آواز سے یہ الفاظ کہے،

لَبَّیْکَ اللّٰھُمَّ لَبَّیْکَ اللّٰھُمَّ لَبَّیْکَ لَا شَرِیْکَ لَکَ لَبَّیْکَ — اے خدا ہم تیرے سامنے حاضر ہیں، اے خدا تیرا کوئی شریک نہیں،

(۱) سنن ابن ماجہ میں ہے (باب حجۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم) کہ ہجرت سے پہلے آپ نے دو حج فرمائے، بعض حدیثوں میں جو یہ ہے کہ آپ نے ایک ہی حج کیا تھا، ترمذی باب کم حج النبی اور ابوداؤد وقت الاحرام، اس سے مقصود بعد ہجرت ہے۔ (۲) ابوداؤد اور صحیح مسلم میں حجۃ الوداع کا واقعہ نہایت تفصیل سے مذکور ہے جس کا شان نزول یہ ہے کہ حضرت امام باقر نے حضرت جابرؓ سے جب وہ نابینا ہو گئے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حج کا حال پوچھا، حضرت جابرؓ نے آل رسول کی محبت سے امام باقر کے گریبان کے تکمے کھولے اور ان کے سینہ پر محبت سے ہاتھ رکھ کر کہا بھتیجے پوچھو کیا پوچھتے ہو؟ پھر نہایت تفصیل سے حج نبوی کے تمام حالات بیان کئے (اوقات کی تعیین بھی بخاری و مسلم میں حضرت ابن عباسؓ، انسؓ، اور حضرت عائشہؓ کی روایتوں میں ہے، اور امام نسائی نے کتاب المناسک میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت و تاریخ کے لئے خاص باب باندھا ہے، باب الوقت الذی خرج فیہ النبی صلی اللہ علیہ وسلم (۳) غسل کا ذکر طبقات ابن سعد ذکر حجۃ الوداع میں ہے، (ص ۱۲۴)

ان الحمد والنعمۃ لک والملک لک — ہم حاضر ہیں، تعریف اور نعمت سب تیری ہی ہے،

لاشریک لک، — اور سلطنت میں کوئی تیرا شریک نہیں،

حضرت جابرؓ جو اس حدیث کے راوی ہیں، ان کا بیان ہے کہ میں نے نظر اٹھا کر دیکھا تو آگے پیچھے، دائیں بائیں جہاں تک نظر کام کرتی تھی، آدمیوں کا جنگل نظر آتا تھا[1]، آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) جب لبیک فرماتے تھے، تو ہر طرف سے اسی صدائے غلغلہ انگیز کی آواز بازگشت آتی تھی، اور تمام دشت و جبل گونج اٹھتے تھے،

فتح مکہ میں آپ نے جن منازل میں نماز ادا کی تھی، وہاں برکت کے خیال سے لوگوں نے مسجدیں بنالی تھیں، آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) ان مساجد میں نماز ادا کرتے جاتے تھے، حرم پہنچکر غسل فرمایا دوسرے روز اتوار کے روز ذوالحجہ کی چار تاریخ صبح کے وقت) مکہ معظمہ میں داخل ہوئے، مدینہ سے مکہ تک کا یہ سفر نو دن میں طے ہوا، خاندان ہاشم کے لڑکوں نے آمد آمد کی خبر سنی تو خوشی سے باہر نکل آئے، آپ نے فرط محبت سے اونٹ پر کسی کو آگے اور کسی کو پیچھے بٹھا لیا[2]، کعبہ نظر پڑا تو فرمایا کہ "اے خدا!! اس گھر کو اور زیادہ عزت اور شرف دے"، پھر کعبہ کا طواف کیا، طواف سے فارغ ہو کر مقام ابراہیم میں دوگانہ ادا کیا، اور یہ آیت پڑھی،

وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرَاهِيْمَ مُصَلًّى — اور مقام ابراہیم کو سجدہ گاہ بناؤ،

صفا پر پہونچے تو یہ آیت پڑھی،

اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَائِرِ اللّٰهِ — صفا اور مروہ خدا کی نشانیاں ہیں،

(۱) کم و بیش ایک لاکھ مسلمان شریک حج تھے۔ (۲) نسائی باب استقبال الحج،

(یہاں سے) کعبہ نظر آیا، تو یہ الفاظ فرمائے،

لا الٰہ الا اللہ وحدہٗ لا شریک لہ لہ الملک — خدا کے سوا کوئی خدا نہیں، اس کا کوئی شریک نہیں اسکے

ولہ الحمد یحیی و یمیت و ھو علی کل شئ قدیر — لئے سلطنت اور ملک ور حمد ہے، وہ مارتا اور جلاتا ہے اور

لا الٰہ الا اللہ وحدہٗ انجز وعدہٗ نصر عبدہٗ — وہ تمام چیزوں پر قادر ہے، کوئی خدا نہیں، مگر وہ اکیلا

وھزم الاحزاب وحدہٗ، — خدا، اس نے اپنا وعدہ پورا کیا، اور اپنے بندہ کی مدد

صفا سے اتر کر مروہ پر تشریف لائے، یہاں بھی دعا و تہلیل کی، اہلِ عرب ایام حج میں عمرہ ناجائز سمجھتے تھے، صفا و مروہ کے طواف وسعی سے فارغ ہو کر آپ نے اُن لوگوں کو جن کے ساتھ قربانی کے جانور نہیں تھے، عمرہ تمام کر کے احرام اتارنے کا حکم دیا، بعض صحابہ نے گذشتہ رسوم مالوفہ کی بنا پر اس حکم کی بجا آوری میں معذرت کی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر میرے ساتھ قربانی کے اونٹ نہ ہوتے تو میں بھی ایسا ہی کرتا، حضرت علیؓ حجۃ الوداع سے کچھ پہلے یمن بھیجے گئے تھے، اسی وقت وہ یمنی حاجیوں کا قافلہ لیکر مکہ میں وارد ہوئے، چونکہ اُن کے ساتھ قربانی کے جانور تھے، اس لئے انہوں نے احرام نہیں اتارا جمعرات کے روز آٹھویں تاریخ کو آپ نے تمام مسلمانوں کے ساتھ منیٰ میں قیام فرمایا، دوسرے دن نویں ذیحجہ کو جمعہ کے روز صبح کی نماز پڑھ کر منیٰ سے روانہ ہوئے،

قریش کا معمول تھا کہ جب مکہ سے حج کے لئے نکلتے تھے، تو عرفات کے بجائے مزدلفہ میں مقام کرتے تھے، جو حرم کے حدود میں تھا، ان کا خیال تھا کہ قریش نے اگر حرم کے سوا کسی اور مقام میں مناسک حج ادا کئے، تو اُن کی شان یکتائی میں فرق آجائیگا، لیکن اسلام کو جو مساوات عام قائم کرنی تھی اس کے لحاظ سے یہ تخصیص روا نہیں رکھی جا سکتی تھی اس لئے خدا نے حکم دیا ثُمَّ اَفِیْضُوْا مِنْ حَیْثُ

۱؎ ابو داؤد

اَفَاضَ النَّاسُ) آپ بھی عام مسلمانوں کے ساتھ عرفات میں آئے[1] (اور یہ اعلان کرا دیا[2]،

قفوا علی مشاعرکم فانکم علی ارث من — اپنے مقدس مقامات میں ٹھہرے رہو کہ تم اپنے باپ

ارث ابیکم ابراھیم، — ابراہیم کی وراثت پر ہو،

یعنی عرفہ میں حاجیوں کا قیام حضرت ابراہیمؑ کی یادگار ہے۔ اور ان ہی نے اس مقام کو اس غرض خاص کے لئے متعین کیا ہے، عرفات میں ایک مقام نمرہ ہے، آپنے ایک کمل کے خیمہ میں قیام فرمایا، دوپہر ڈھل گئی، تو ناقہ پر (جس کا نام قصواء تھا) سوار ہو کر میدان میں آئے، اور ناقہ کے اوپر ہی سے خطبہ پڑھا،

(آج پہلا دن تھا کہ اسلام اپنے جاہ وجلال کے ساتھ نمودار ہوا، اور جاہلیت کے تمام بیہودہ مراسم کو مٹا دیا، اس لئے آپنے فرمایا،

الا کل شی من امر الجاھلیۃ تحت قدمی موضوع — ہاں جاہلیت کے تمام دستور میرے دونوں پاؤں کے نیچے ہیں) (صحیح مسلم وابوداؤد)

---

[1] صحیح بخاری باب الوقوف بعرفہ [2] ابوداؤد موضع الوقوف بعرفہ [3] یہ اور اس کے بعد کے تمام عربی جملے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خطبہ کے ٹکڑے ہیں، (یہ جملے کسی حدیث میں یکجا نہیں ہوئے ہیں، اس لئے اُن کو مختلف ماخذوں سے جمع کرنا پڑا ہے، صحیح بخاری و صحیح مسلم (باب حجۃ النبیؐ و باب الدیات) اور ابوداؤد (باب الاشہر الحرام و حجۃ النبیؐ) وغیرہ میں یہ خطبہ حضرت ابن عباسؓ، حضرت ابن عمرؓ، حضرت ابو امامہ باہلیؓ، حضرت جابرؓ، حضرت ابوبکرہؓ وغیرہ صحابہ کی روایتوں سے مذکور ہے، ان روایتوں میں بعض باتیں مشترک ہیں، مثلاً ان دمائکم و اموالکم حرام علیکم کحرمۃ الخ اور بعض باتیں الگ ہیں، مغازی و سیر کی کتابوں میں کچھ اور باتیں بھی مذکور ہیں، اصل یہ ہے کہ یہ ایک طویل خطبہ تھا، ہر ایک شخص کو جو فقرہ یاد رہ گیا، جس کی اس نے روایت کی اس بنا پر مختلف ماخذوں سے ان ٹکڑوں کو جمع کر لیا گیا ہے، اور اس کے جا بجا حوالے دیئے گئے ہیں، خطبہ کے بعض ضمنی الفاظ مصنف نے چھوڑ دیتے ہیں، روایتوں میں ایک اور اختلاف ہے، حضرت جابرؓ اپنی روایت میں، اور ایک روایت میں حضرت ابن عباسؓ خطبہ کا دن یوم عرفہ یعنی ۹ ذیحجہ اور حضرت ابوبکرؓ اور حضرت

تکمیلِ انسانی کی منزل میں سب سے بڑا سنگِ راہ امتیازِ مراتب تھا، جو دنیا کی قوموں کے نے تمام مذاہب نے، تمام ممالک نے، مختلف صورتوں میں قائم رکھا تھا، سلاطین سایۂ یزدانی تھے جن کے آگے کسی کو چون وچرا کی مجال نہ تھی، ائمہ مذہب کے ساتھ کوئی شخص مسائلِ مذہبی پر گفتگو کا مجاز نہ تھا، شرفا، رذیلوں سے ایک بالاتر مخلوق تھی، غلام آقا کے ہمسر نہیں ہو سکتے تھے، آج یہ تمام تفرقے، یہ تمام امتیازات، یہ تمام حدبندیاں دفعتہً ٹوٹ گئیں،

ایھا الناس! الا ان ربکم واحد	لوگو! بیشک تمہارا رب ایک ہے اور بیشک تمہارا
ان اباکم واحد الا لا فضل لعربی	باپ ایک ہے، ہاں عربی کو عجمی پر، عجمی کو عربی پر،
علی عجمی، ولا لعجمی علی عربی، ولا لاحمر	سُرخ کو سیاہ پر اور سیاہ کو سُرخ پر کوئی فضیلت
علی اسود ولا اسود علی احمر الا بالتقوی،[1] (مسند احمد)	نہیں، مگر تقویٰ کے سبب سے)

(بقیہ حاشیہ ص ۱۵۴) ابن عباسؓ اور دوسری روایتوں میں یوم النحر یعنی ۱۰ ذی الحجہ بتاتے ہیں، بعض روایتیں ایام تشریق کے خطبہ کی ہیں، ابن اسحاق نے اس کو مسلسل خطبہ کے طور پر نقل کیا ہے، ابن ماجہ، ترمذی اور مسند احمد میں خطبۂ حجۃ الوداع کے چند فقرے منقول ہیں، جن میں یہ تصریح نہیں کہ کس تاریخ کے خطبہ میں آپ نے یہ فرمایا، بہرحال صحاح ستہ اور مسانید کی تمام روایات کو یکجا کرنے سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ آپ نے اس حج میں تین دفعہ خطبہ دیا، ۹ ذی الحجہ یوم عرفہ کو، ۱۰ ذی الحجہ یوم النحر کو، اور تیسرا خطبہ ایام تشریق میں ۱۱ یا ۱۲ ذی الحجہ کو، ان خطبوں میں اصولی طور پر بعض باتیں مشترک ہیں، اور بعض مختلف المقام ہیں، یہ بہت ممکن ہے، جیسا کہ بعض محدثین نے تصریح کی ہے کہ چونکہ مجمع بہت بڑا تھا، اور آپ جو پیغام اپنی امت کو پہنچانا چاہتے تھے وہ نہایت اہم تھا، اس لئے آپ نے اپنی تقریر کے بعض بعض فقرے مکرر اعادہ فرمائے)

[1] امام احمد نے مسند میں ابو نضرہ تابعی کے واسطہ سے اور تابعی مذکور نے ایک صحابی سے جنہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حجۃ الوداع کا خطبہ دیتے سنا تھا، یہ فقرہ نقل کیا،

(بحوالہ منتقی الاخبار ابن تیمیہ مع نیل الاوطار)

من کل مسلم اخو المسلم وان المسلمین	(ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے، اور
اخوۃ (مستدرک حاکم جلد ۱ ص ۹۳ وطبری و ابن اسحاق)	مسلمان باہم بھائی بھائی ہیں،
ارقاءکم ارقاءکم اطعموھم مما تاکلون	تمہارے غلام! تمہارے غلام!! جو خود کھاؤ، وہی
واکسوھم مما تلبسون (ابن سعد بسند)	ان کو کھلاؤ، جو خود پہنو وہی ان کو پہناؤ،

عرب میں کسی خاندان کا کوئی شخص کسی کے ہاتھ سے قتل ہوتا، تو اس کا انتقام لینا خاندانی فرض ہوجاتا تھا، یہانتک کہ سیکڑوں برس گذر جانے پر بھی یہ فرض باقی رہتا تھا، اور اسی بنا پر لڑائیوں کا ایک غیر منقطع سلسلہ قائم ہوجاتا تھا، اور عرب کی زمین ہمیشہ خون سے رنگین رہتی تھی، آج یہ سب سے قدیم رسم، عرب کا سب سے مقدم فخر، خاندان کا پُرفخر مشغلہ برباد کردیا جاتا ہے (اور اس کے لئے نبوت کا منادی سب سے پہلے اپنا نمونہ آپ پیش کرتا ہے،)

ودماء الجاھلیۃ موضوعۃ وان اول	جاہلیت کے تمام خون (یعنی انتقام خون) باطل
دم اضع من دمائنا دم ابن ربیعۃ ابن	کردیئے گئے اور سب سے پہلے میں (اپنے خاندان کا خون)
الحارث (صحیح بخاری ومسلم وابوداؤد، بروایت جابرؓ)	ربیعہ بن الحارث کے بیٹے[1] کا خون باطل کرتا ہوں،

[1] ربیعہ قریش کے خاندان سے تھے، اور اُن کے خون کا انتقام لینا میراث کے طور پر ایک فرض خاندانی چلا آتا تھا، (ربیعہ بن حارث بن عبدالمطلب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چچازاد بھائی تھے، اور بعض روایتوں میں خود اُن کے قتل کا ذکر ہے لیکن یہ صحیح نہیں، ربیعہ خلافتِ فاروقی تک زندہ تھے، اور سنہ ۲۳ھ میں وفات پائی، صحیح یہ ہے کہ ربیعہ کا ایاس نام ایک بیٹا تھا، وہ قبیلہ بنو سعد میں پرورش پا رہا تھا، کہ ہذیل نے اس کو قتل کر ڈالا، دیکھو ابوداؤد وصحیح مسلم باب حجۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم اور زرقانی جلد ۵ صفحہ ۲۰۱)

(تمام عرب میں سودی کاروبار کا ایک جال پھیلا ہوا تھا جس سے غربا کا ریشہ ریشہ جکڑا ہوا تھا، اور ہمیشہ کے لئے وہ اپنے قرض خواہوں کے غلام بن گئے تھے، آج وہ دن ہے کہ اس جال کا تار تار الگ ہوتا ہے، اس فرض کی تکمیل کیلئے بھی معلم حق سب سے پہلے اپنے خاندان کو پیش کرتا ہے،

وربا الجاهلية موضوع واول ربا اضع ربانا ربا عباس بن عبد المطلب[۱] (صحیح مسلم و ابو داؤد)	جاہلیت کے تمام سود بھی باطل کر دئے گئے اور سب سے پہلے اپنے خاندان کا سود عباس بن عبد المطلب کا سود باطل کرتا ہوں)

آج تک عورتیں ایک جائداد منقولہ تھیں، جو قمار بازی میں داؤں پر چڑھا دی جا سکتی تھیں، آج پہلا دن ہے کہ یہ گروہ مظلوم، یہ صنف لطیف، یہ جوہر نازک قدردانی کا تاج پہنتا ہے،

فاتقوا الله في النساء[۲] (صحیح مسلم و ابو داؤد)	(عورتوں کے معاملہ میں خدا سے ڈرو)
ان لكم على نسائكم حقا ولهن عليكم حقا، (طبری ابن ہشام وغیرہ)	تمہارا عورتوں پر اور عورتوں کا تم پر حق ہے،

عرب میں جان و مال کی کچھ قیمت نہ تھی، جو شخص چاہتا تھا قتل کر دیتا تھا، اور جس کا مال چاہتا تھا چھین لیتا تھا، (آج امن و سلامتی کا بادشاہ تمام دنیا کو صلح کا پیغام سناتا ہے،)

ان دمائكم واموالكم عليكم حرام كحرمة يومكم هذا في شهركم هذا في بلدكم هذا الى يوم تلقون ربكم[۳]	تمہارا خون اور تمہارا مال تا قیامت اسی طرح حرام ہے، جس طرح یہ دن اس مہینہ میں اور اس شہر میں حرام ہے،

---

(۱) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا عباسؓ اسلام سے پہلے سود کا کاروبار کرتے تھے بہت سے لوگوں کے ذمہ ان کا سود باقی تھا (دیکھو تفسیر آیت ربوا) (۲) اس کے بعد آپؐ نے زن و شو کے فرائض کی تفصیل فرمائی، (۳) صحیح بخاری و مسلم و ابو داؤد وغیرہ)

(اسلام سے پہلے بڑے بڑے مذاہب دنیا میں پیدا ہوئے، لیکن ان کی بنیاد خود صاحب شریعت کے تحریری اصول پر نہ تھی، ان کو خدا کی طرف سے جو ہدایتیں ملی تھیں، بندوں کی ہوس پرستیوں نے اُن کی حقیقت گم کردی تھی، ابدی مذہب کا پیغمبر اپنی زندگی کے بعد ہدایاتِ ربانی کا مجموعہ تھی اپنے ہاتھ سے اپنی امت کو سپرد کرتا ہے اور تاکید کرتا ہے،

وانی قد ترکت فیکم ما لن تضلوا بعدہٗ ان اعتصمتم بہ کتاب اللہ (صحاح)	میں تم میں ایک چیز چھوڑتا ہوں اگر تم نے اس کو مضبوط پکڑ لیا، تو گمراہ نہ ہوگے، وہ چیز کیا ہے؟ -- کتاب اللہ

اس کے بعد آپ نے چند اصولی احکام کا اعلان فرمایا،[1]

ان اللہ عزوجل قد اعطی کل ذی حق حقہ فلا وصیۃ لوارثٍ،	خدا نے ہر حق دار کو (از روے وراثت) اس کا حق دیدیا، اب کسی کو وارث کے حق میں وصیت جائز نہیں،
الولد للفراش وللعاہر الحجر وحسابھم علی اللہ	لڑکا اس کا ہے جس کے بستر پر پیدا ہوا، زناکار کیلئے پتھر ہے، اور ان کا حساب خدا کے ذمہ ہے،
من ادعی الی غیر ابیہ وانتمی الی غیر موالیہ فعلیہ لعنۃ اللہ	جو لڑکا اپنے باپ کے علاوہ کسی اور کے نسب سے ہونے کا دعوی کرے اور جو غلام اپنے مولا کے سوا کسی اور طرف اپنی نسبت -- ان پر خدا کی لعنت ہے
الا لا یحل لامرأۃ ان تعطی من مال زوجہا شیئًا الا باذنہ الدین مقضیٌ	ہاں عورت کو اپنے شوہر کے مال میں سے اس کی اجازت کے بغیر کچھ دینا جائز نہیں، قرض ادا کیا جائے، عاریت ادا کی

[1] سنن ابن ماجہ باب الوصایا، ومسند ابو داؤد طیالسی، بروایت ابی امامۃ الباہلی، ابو داؤد کتاب الوصایا میں مختصراً ہی ابن سعد اور ابن اسحاق نے بھی اس کی بسند روایت کی ہو کہ یہ عرفہ کے خطبہ میں آپ نے فرمایا)

والعاریة مؤداة والمنحة مردودة و | کی جائے، عطیہ لوٹایا جائے، ضامن تاوان کا
الزعیم غارم) | ذمہ دار ہے،

یہ فرماکر آپنے مجمع عام کی طرف خطاب کیا،

انتم مسئولون عنی فما انتم قائلون (صحیح مسلم و ابوداود) | تم سے خدا کے ہاں میری نسبت پوچھا جائیگا تم کیا جواب دوگے

صحابہؓ نے عرض کی "ہم کہیں گے کہ آپنے خدا کا پیغام پہنچا دیا، اور اپنا فرض ادا کر دیا"

آپنے آسمان کی طرف انگلی اٹھائی اور تین بار فرمایا،

اللھم اشھد (صحیح مسلم و ابوداود) | اے خدا تو گواہ رہنا،

عین اس وقت جب آپ یہ فرض نبوت ادا کر رہے تھے، یہ آیت اتری[۱]،

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ | آج میں نے تمھارے لئے دین کو مکمل کر دیا اور اپنی نعمت
نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا، | تمام کر دی اور تمھارے لئے مذہب اسلام کو انتخاب کر لیا

نہایت حیرت انگیز اور عبرت خیز منظر یہ تھا، کہ شاہنشاہ عالمؐ جس وقت لاکھوں آدمیوں کے مجمع میں فرمان ربانی کا اعلان کر رہا تھا، اس کے تخت شاہنشاہی کا مسند بالیں (کجاوہ اور عرق گیر) ایک روپیہ سے زیادہ قیمت کا نہ تھا[۲]،

(خطبہ سے فارغ ہو کر آپنے حضرت بلالؓ کو اذان کا حکم دیا، اور ظہر اور عصر کی نماز ایک ساتھ ادا کی، پھر ناقہ پر سوار ہو کر موقف تشریف لائے، اور وہاں کھڑے ہو کر دیر تک قبلہ رو

---

[۱] صحیح بخاری و صحیح مسلم و ابوداود وغیرہ، ابن سعد میں تصریح خاص ہے، [۲] طبقات ابن سعد صفحہ ۱۲۷، (کتاب الشمائل للترمذی و ابن ماجہ)

دعا میں مصروف رہے، جب آفتاب ڈوبنے لگا تو آپ نے وہاں سے چلنے کی تیاری کی، حضرت اسامہؓ ابن زیدؓ کو اونٹ پر پیچھے بٹھالیا، آپ ناقہ کی زمام کھینچے ہوئے تھے یہاں تک کہ اس کی گردن کجاوے میں آکر لگتی تھی، لوگوں کے ہجوم سے ایک اضطراب سا پیدا ہو گیا تھا، لوگوں کو دستِ راست سے اور بخاری میں ہے کہ کوڑہ سے آپ اشارہ کرتے جاتے تھے کہ آہستہ آہستہ اور زبان مبارک سے ارشاد فرماتے تھے،

السکینة یا ایھا الناس السکینة یا ایھا الناس[1] لوگو! سکون کے ساتھ، لوگو! سکون کے ساتھ

اثنائے راہ میں ایک جگہ اتر کر طہارت کی، اسامہؓ نے کہا یا رسول اللہ! نماز کا وقت تنگ ہو رہا ہے، فرمایا نماز کا موقع آگے آتا ہے، تھوڑی دیر کے بعد آپ تمام قافلہ کے ساتھ مزدلفہ پہونچے، یہاں پہلے مغرب کی نماز پڑھی، اس کے بعد لوگوں نے اپنے اپنے پڑاؤ پر جاکر سواریوں کو بٹھایا، ابھی سامان کھولنے بھی نہ پائے تھے، کہ فوراً ہی نماز عشا کی تکبیر ہوئی، نماز سے فارغ ہو کر آپ لیٹ گئے، اور صبح تک آرام فرمایا، بیچ میں روزانہ دستور کے خلاف عبادتِ شبانہ کے لئے بیدار نہ ہوئے، محدثین نے لکھا ہے کہ یہی ایک شب ہے، جس میں آپ نے نماز تہجد ادا نہیں فرمائی، صبح سویرے اٹھکر باجماعت فجر کی نماز پڑھی، کفار قریش مزدلفہ سے اس وقت کوچ کرتے تھے، جب آفتاب پورا نکل آتا تھا، اور آس پاس کے پہاڑوں کی چوٹیوں پر دھوپ چمکنے لگتی تھی، اس وقت باواز بلند کہتے تھے، کوہ ثبیر! دھوپ سے چمک جا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس رسم کے ابطال کے لئے سورج نکلنے سے پہلے یہاں سے کوچ کیا،[2] یہ ذی الحجہ کی دسویں تاریخ اور سنیچر کا دن تھا،

(۱؎ بخاری و مسلم و ابو داؤد) ۲؎ صحیح بخاری و ابو داؤد،

فضل بن عباسؓ آپ کے برادرِ عم زاد ناقہ پر ساتھ تھے، اہلِ حاجت داہنے بائیں حج کے مسائل دریافت کرنے کے لئے آرہے تھے، آپ جواب دیتے تھے، اور زور زور سے مناسکِ حج کی تعلیم دیتے جاتے تھے، وادیِ محسّر کے راستہ سے آپ جمرۃ کے پاس آئے، ابن عباسؓ سے جو اس وقت کمسن تھے، فرمایا، مجھے کنکریاں چنکر دو، آپنے کنکریاں پھینکیں، اور لوگوں کو خطاب کر کے ارشاد فرمایا[۱]

ایاکم والغلو فی الدّین فانما اھلک قبلکم الغلو فی الدّین (ابن ماجۃ نسائی)	مذہب میں غلو اور مبالغہ سے بچو، کیونکہ تم سے پہلی قومیں اسی سے برباد ہوئیں،

اسی اثنا میں آپ یہ بھی فرماتے،

لتاخذ وامناسککم فانی لاادری لعلی لااحج بعد حجتی ھذہ (مسلم وابوداؤد)	حج کے مسائل سیکھ لو، میں نہیں جانتا شاید کہ اس کے بعد مجھے دوسرے حج کی نوبت نہ آئے،

[۱] ابوداؤد، [۲] نسائی،

یہاں سے فارغ ہوکر منیٰ کے میدان میں تشریف لائے، داہنے بائیں آگے پیچھے تقریباً ایک لاکھ مسلمانوں کا مجمع تھا، مہاجرین قبلہ کے داہنے انصار بائیں، اور بیچ میں عام مسلمانوں کی صفیں تھیں، آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) ناقہ پر سوار تھے، حضرت بلالؓ کے ہاتھ میں ناقہ کی مہار تھی، حضرت اسامہ بن زیدؓ پیچھے بیٹھے کپڑا تان کر سایہ کئے ہوئے تھے، آپنے نظر اٹھا کر اس عظیم الشان مجمع کی طرف دیکھا تو فرائضِ نبوت کے ۲۳ سالہ نتائج نگاہوں کے سامنے تھے، زمین سے آسمان تک قبول و اعترافِ حق کا نور ضو فشاں تھا، دیوانِ قضا میں انبیاءِ سابقین کے فرائضِ تبلیغ کے کارناموں پر ختمِ رسالت کی مہر ثبت ہورہی تھی، اور دنیا اپنی تخلیق کے لاکھوں برس کے بعد دینِ فطرت کی تکمیل کا مژدہ کائنات کے ذرہ ذرہ کی زبان سے سن رہی تھی، یعنی اسی

عالم میں زبانِ حق محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کام و دہن میں زمزمہ پرداز ہوئی)

اب ایک نئی شریعت ایک نئے نظام اور ایک نئے عالم کا آغاز تھا، اس بنا پر ارشاد فرمایا،

اِنَّ الزَّمَانَ قَدِ اسْتَدَارَ کَهَیْئَتِهٖ یَوْمَ خَلَقَ اللّٰہُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ (بروایت ابوبکرہ)	ابتدا میں جب خدا نے آسمان و زمین کو پیدا کیا تھا زمانہ پھر پھرا کے آج پھر اسی نقطہ پر آگیا

ابراہیم خلیل کے طریق عبادت (حج) کا موسم اپنی جگہ سے ہٹ گیا تھا، اس کا سبب یہ ہے کہ اس زمانہ میں کسی قسم کی خونریزی جائز نہیں تھی،[1] اس لئے عربوں کے خون آشام جذبات حیلۂ جنگ کے لئے اس کو کبھی گھٹا کبھی بڑھا دیتے تھے، آج وہ دن آیا کہ اس اجتماعِ عظیم کے شہر حرم کی تعیین کر دیجائے، آپ نے فرمایا،

السَّنَةُ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا مِنْهَا اَرْبَعَةٌ حُرُمٌ ثَلٰثَةٌ مُتَوَالِیَاتٌ ذُو الْقَعْدَةِ وَذُو الْحِجَّةِ وَمُحَرَّمٌ وَرَجَبُ شَهْرُ مُضَرَ الَّذِیْ بَیْنَ جُمَادٰی وَشَعْبَانَ (بروایت ابوبکرہ)	سال کے بارہ مہینے ہیں جن میں چار مہینے قابلِ احترام ہیں تین تو متواتر مہینے ہیں، ذو قعدہ، ذو الحجہ، اور محرم اور چوتھا رجب مضر کا مہینہ جو جمادی الثانی اور شعبان کے بیچ میں ہے،

[1] حج کے ان مہینوں کے احترام اور بزرگی کا تخیل عرب میں نہایت قدیم زمانہ سے چلا آتا تھا، اور عرب کے تمام فرقے خواہ یہودی یا عیسائی یا کسی اور مذہب کے پیرو ہوں سب برابر ان کی عزت کرتے تھے، ان مہینوں میں جنگ و جدال اور لڑائی بھڑائی حرام جانتے تھے، قدیم اشعارِ عرب میں اس کا بیان نہایت کثرت سے ہے، رومیوں کی تاریخ میں بھی عربوں کے اس عقیدہ کا ذکر ہے، سنہ ۵۴۱ء میں رومیوں کو شام اور فلسطین میں کوئی جنگی کارروائی کرنی تھی، اور ساتھ ہی عربوں کے حملہ کا خوف لگا تھا، سپہ سالار روم جو عربوں کے اندرونی حالات سے واقف تھا، اس نے جواب دیا کہ اس زمانہ میں عربوں سے کوئی خوف نہیں، کیونکہ عنقریب وہ دو مہینے آرہے ہیں جن میں اہلِ عرب عبادتوں میں مشغول رہتے ہیں، اور کسی قسم کا ہتھیار نہیں لگاتے، (نتائج الافہام محمود پاشا فلکی ص ۳۵ بحوالہ فرنچ ایشیاٹک سوسائٹی جرنل اپریل سنہ ۱۸۴۳ء) س،

(دنیا میں عدل وانصاف اور جور وستم کا محور صرف تین چیزیں ہیں، جان، مال اور آبرو، آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کل کے خطبہ میں گو ان کے متعلق ارشاد فرما چکے تھے لیکن عرب کے صدیوں کے زنگ دور کرنے کے لئے مکرر تاکید کی ضرورت تھی، آج آپنے اس کے لئے عجیب بلیغ انداز اختیار فرمایا:-

لوگوں سے مخاطب ہو کر پوچھا "کچھ معلوم ہے، آج کون سا دن ہے، لوگوں نے عرض کی کہ خدا اور اس کے رسول کو زیادہ علم ہے، آپ دیر تک چپ رہے، لوگ سمجھے کہ شاید آپ اس دن کا کوئی اور نام رکھیں گے، دیر تک سکوت کے بعد فرمایا "کیا آج قربانی کا دن نہیں ہے"؟ لوگوں نے کہا ہاں بیشک ہے، پھر ارشاد ہوا "یہ کون سا مہینہ ہے"؟ لوگوں نے پھر اسی طریقہ سے جواب دیا، آپنے پھر دیر تک سکوت کیا، اور فرمایا "کیا یہ ذوالحجہ نہیں ہے"؟ لوگوں نے کہا ہاں بیشک ہے" پھر پوچھا "یہ کون سا شہر ہے"؟ لوگوں نے بدستور جواب دیا، آپ نے اسی طرح دیر تک سکوت کے بعد فرمایا "کیا یہ بلدۃ الحرام نہیں ہے"؟ لوگوں نے کہا ہاں بیشک ہے" جب سامعین کے دل میں یہ خیال پوری طرح جاگزیں ہو چکا کہ آج کا دن بھی، مہینہ بھی اور خود شہر بھی محترم ہے، یعنی اس دن، اس مقام میں جنگ اور خونریزی، جائز نہیں، تب فرمایا،

فان دماءکم واموالکم واعراضکم علیکم	تو تمہارا خون، تمہارا مال اور تمہاری آبرو
حرام کحرمتہ یومکم ھذا فی شھرکم ھذا	تا قیامت اسی طرح محترم ہے جس طرح یہ
فی بلدکم ھذا (بروایت ابو بکرہ)	دن، اس مہینہ میں اور اس شہر میں محترم ہے

(قوموں کی بربادی ہمیشہ آپس کے جنگ وجدال اور باہمی خونریزیوں کا نتیجہ رہی ہے، وہ پیغمبر جو ایک لازوال قومیت کا بانی بن کر آیا تھا، اس نے اپنے پیروؤں سے بآواز بلند کہا،

الا لا ترجعوا بعدی ضلالاً یضرب بعضکم رقاب بعض وستلقون ربکم فیسئلکم عن اعمالکم (بروایت ابوبکرہ)

ہاں، میرے بعد گمراہ نہ ہوجانا کہ خود ایک دوسرے کی گردن مارنے لگو، تم کو خدا کے سامنے حاضر ہونا پڑیگا اور وہ تم سے تمہارے اعمال کی بازپرس کریگا،

ظلم وستم کا ایک عالمگیر پہلو یہ تھا، کہ اگر خاندان مین کسی ایک شخص سے کوئی گناہ سرزد ہوتا تو اس خاندان کا ہر شخص اس جرم کا قانونی مجرم سمجھا جاتا تھا، اور اکثر اصلی مجرم کے روپوش یا فرار ہوجانے کی صورت مین بادشاہ کا اس خاندان میں سے جس پر قابو چلتا تھا، اس کو سزا دیتا تھا، باپ کے جرم میں بیٹے کو سولی دیجاتی تھی، اور بیٹے کے جرم کا خمیازہ باپ کو اٹھانا پڑتا تھا، یہ سخت ظالمانہ قانون تھا، جو مدت سے دنیا میں حکمران تھا، اگرچہ قرآن مجید نے لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی کے وسیع قانون کے رو سے اس ظلم کی ہمیشہ کے لئے بیخ کنی کردی تھی، لیکن اس وقت جب دنیا کا آخری پیغمبر ایک نیا نظام سیاست ترتیب دے رہا تھا، اس اصول کو فراموش نہیں کرسکتا تھا، آپنے فرمایا،

الا لا یجنی جان الا علی نفسہ الا لا یجنی جان علی ولدہ ولا مولود علی والدہ (ابن ماجہ وترمذی)

ہاں، مجرم اپنے جرم کا آپ ذمہ دار ہے، ہاں، باپ کے جرم کا ذمہ دار بیٹا نہیں، اور بیٹے کے جرم کا جواب دہ باپ نہیں،

عرب کی بدامنی اور نظام ملک کی بے ترتیبی کا ایک بڑا سبب یہ تھا کہ ہر شخص اپنی خداوندی کا آپ مدعی تھا، اور دوسرے کی ماتحتی اور فرمانبرداری کو اپنے لئے ننگ اور عار جانتا تھا، ارشاد ہوا،

ان امر علیکم عبد مجدع اسود یقودکم بکتاب اللہ فاسمعوا لہ واطیعوا (صحیح مسلم)

(بروایت ام الحصین)

اگر کوئی حبشی بینی بریدہ غلام بھی تمہارا امیر ہو اور وہ تم کو خدا کی کتاب کے مطابق لے چلے تو اسکی اطاعت

ریگستانِ عرب کا ذرہ ذرہ اس وقت اسلام کے نور سے منور ہو چکا تھا، اور خانہ کعبہ ہمیشہ کیلئے ملتِ ابراہیم کا مرکز بن چکا تھا، اور فتنہ پردازانہ قوتیں پامال ہو چکی تھیں، اس بنا پر آپنے ارشاد فرمایا،

الا ان الشیطان قد ایس ان یعبد فی بلدکم ھذا ابداً ولکن ستکون له طاعة فیما تحقرون من اعمالکم فسیرضی به (ابن ماجہ و ترمذی)	ہاں، شیطان اس بات سے مایوس ہو چکا کہ اب تمھارے اس شہر میں اس کی پرستش قیامت تک نہ کیجائے گی، لیکن البتہ چھوٹی چھوٹی باتوں میں اسکی پیروی کروگے، اور وہ اس پر خوش ہوگا،

سبسے آخر میں آپنے اسلام کے فرضِ اولین یاد دلائے،

اعبدوا ربکم وصلوا خمسکم وصوموا شھرکم واطیعوا اذا امرکم تدخلوا جنة ربکم (مسند احمد جلد ۵ ص ۲۵۱ و مستدرک حاکم جلد ۱ ص ۳۹۰)	اپنے پروردگار کو پوجو، پانچوں وقت کی نماز پڑھو مہینہ کا روزہ رکھا کرو، اور میری احکام کی اطاعت کرو، خدا کی جنت میں داخل ہو جاؤگے، (۴۲)

یہ فرماکر آپ نے مجمع کی طرف اشارہ کیا، اور فرمایا،

الا ھل بلغت،	کیوں، میں نے پیغامِ خداوندی سنا دیا،

سب بول اٹھے، ہاں، فرمایا،

اللّٰھم اشھد	اے خدا تو گواہ رہنا،

پھر لوگوں کی طرف مخاطب ہوکر فرمایا،

فلیبلغ الشاھد الغائب،	جو لوگ اس وقت موجود ہیں، وہ ان کو سنادیں جو موجود نہیں،

(خطبہ[1] کے اختتام پر آپ نے تمام مسلمانوں کو الوداع[2] کہا،

اس کے بعد آپ قربان گاہ کی طرف تشریف لے گئے، اور فرمایا کہ "قربانی کیلئے منیٰ کی کچھ تخصیص نہیں ہے، بلکہ منیٰ اور مکہ کی ایک ایک گلی میں قربانی ہوسکتی ہے،" آپکے ساتھ قربانی کے سو اونٹ تھے، کچھ تو آپنے خود اپنے ہاتھ سے ذبح کئے، اور باقی حضرت علیؓ کے سپرد کردیئے کہ وہ ذبح کریں، اور حکم دیا کہ گوشت پوست جو کچھ ہو سب خیرات کردیا جائے، یہاں تک کہ قصاب کی مزدوری بھی اس سے ادا نہ کی جائے، الگ سے دیجائے،

قربانی سے فارغ ہوکر آپنے معمر بن عبداللہ کو بلوایا، اور سر کے بال منڈوائے، اور فرطِ محبت سے کچھ بال خود اپنے دستِ مبارک سے ابو طلحہؓ انصاری اور اُن کی بیوی ام سلیم اور بعض اُن لوگوں کو جو پاس[3] بیٹھے تھے، عنایت فرمائے، اور باقی ابو طلحہؓ نے اپنے ہاتھ سے تمام مسلمانوں میں ایک ایک دو دو کرکے تقسیم کردیئے، اس کے بعد آپ مکہ معظمہ تشریف لائے، خانہ کعبہ کا طواف کیا، اس سے فارغ ہوکر چاہ زمزم کے پاس آئے،

چاہ زمزم سے حاجیوں کو پانی پلانے کی خدمت خاندانِ عبدالمطلب سے متعلق تھی، چنانچہ اس وقت اسی خاندان کے لوگ پانی نکال نکال کر لوگوں کو پلا رہے تھے، آپ نے فرمایا "یا بنی عبدالمطلب اگر مجھے یہ خوف نہ ہوتا کہ مجھکو ایسا کرتے دیکھ کر اور لوگ بھی تمھارے ہاتھ سے ڈول چھین کر خود اپنے ہاتھ سے پانی نکال کر پئیں گے، تو میں خود اپنے ہاتھ سے پانی نکال کر پیتا"

---

[1] معلوم ہوتا ہے کہ یہ خطبہ بہت بڑا تھا، صحیح مسلم (حج) میں روایت ہے کہ قال قولاً کثیراً، آپنے بہت سی باتیں فرمائیں، صحیح بخاری (حجۃ الوداع) میں ہے کہ آپنے اس میں دجال کا بھی ذکر فرمایا تھا، لیکن تعیین نہیں کہ کس دن کے خطبہ میں یہ فرمایا، [2] صحیح بخاری باب الخطبۃ ایام منیٰ [3] صحیح مسلم و ابو داؤد،

حضرت عباسؓ نے ڈول میں پانی نکال کر پیش کیا، آپنے قبلہ رُخ ہو کر کھڑے کھڑے پانی پیا، پھر یہاں سے منیٰ واپس تشریف لے گئے، اور وہیں نمازِ ظہر ادا فرمائی، [1]

بقیہ ایام التشریق یعنی ۱۲ ذیحجہ تک آپنے مستقل اقامت منیٰ ہی میں فرمائی، ہر روز زوال کے بعد رمی جمار کی غرض سے تشریف لیجاتے، اور پھر واپس آجاتے، ابوداؤد (باب الخطبہ بمنیٰ) میں ایک حدیث ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپنے ۱۲ ذیحجہ کو بھی منیٰ میں ایک خطبہ دیا تھا، جس کے الفاظ مختصراً وہی ہیں، جو پہلے خطبہ میں میں گذر چکے، ۱۳ ذیحجہ کو سہ شنبہ کے دن زوال کے بعد آپ نے یہاں سے نکل کر وادی محصب میں [2] قیام کیا، اور شب کو اسی مقام پر آرام فرمایا، پچھلے پہر اٹھ کر مکہ معظمہ تشریف لے گئے، اور خانہ کعبہ کا آخری طواف کر کے وہیں صبح کی نماز ادا کی، اس کے بعد قافلہ اسی وقت اپنے اپنے مقام کو روانہ ہوگیا، اور آپ نے مہاجرین وانصار کیساتھ مدینہ کی طرف مراجعت فرمائی، راہ میں ایک مقام خُم پڑا، جو جحفہ سے تین میل پر ہے، یہاں ایک تالاب ہے، عربی میں تالاب کو غدیر کہتے ہیں، اور اس لئے اس مقام کا نام عام روایتوں

---

[1] حضرت ابنِ عمرؓ کی حدیث بخاری ومسلم دونوں میں ہے کہ آپنے ظہر کی نماز حسبِ دستور اس دن منیٰ میں پڑھی، لیکن حضرت جابرؓ کی جو طویل حدیث قصۂ حجۃ الوداع میں ہے اس میں تعیین ہے کہ آپنے مکہ میں نماز ظہر پڑھی، حضرت عائشہؓ کی ایک روایت سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے، اس بنا پر محدثین میں ان دونوں قولوں کی باہمی ترجیح اور وجوہ ترجیح میں اختلاف ہے، علامہ ابن حزم نے دوسری روایت کو ترجیح دی ہے، اور علامہ ابن قیم نے زاد المعاد میں پہلے قول کو مرجح ثابت کیا ہے، فریقین کے موازنۂ دلائل کے بعد ہم نے ابن قیم کا فیصلہ قبول کیا ہے، [2] اس درے اسی کا دوسرا نام ابطح اور خیف بن کنانہ ہے)

میں غدیر خم آتا ہے، آپنے یہاں تمام صحابہ کو جمع کرکے ایک مختصر سا خطبہ دیا،

اما بعد الا ایھا الناس فانما انا بشر یوشک ان یاتی رسول اللّٰہ فاجیب انا تارک فیکم الثقلین اولھما کتاب اللّٰہ فیہ الھدی والنور فخذوا کتاب اللّٰہ و استمسکوا بہ واھل بیتی اذکرکم اللّٰہ فی اھل بیتی،	حمد و ثنا کے بعد اے لوگو! میں بھی بشر ہوں ممکن ہے کہ خدا کا فرشتہ جلد آجائے اور مجھے قبول کرنا پڑے (یعنی موت) میں تمہارے درمیان دو بھاری چیزیں چھوڑتا ہوں، ایک خدا کی کتاب جس کے اندر ہدایت اور روشنی ہے خدا کی کتاب کو مضبوطی سے پکڑو، اور دوسری چیز میرے اہل بیت ہیں، میں اپنے اہل بیت کے بارے میں تمہیں خدا کو یاد دلاتا ہوں

آخری جملہ کو آپ نے تین دفعہ مکرر فرمایا، یہ صحیح مسلم (مناقب حضرت علیؓ کی روایت ہے، نسائی، مسند امام احمد، ترمذی، طبرانی، طبری، حاکم وغیرہ میں کچھ اور فقرے بھی ہیں، جن میں حضرت علیؓ کی منقبت ظاہر کی گئی ہے ان روایتوں میں ایک فقرہ اکثر مشترک ہے،

من کنت مولاہ فعلی مولاہ، اللّٰھم وال من والاہ وعاد من عاداہ،	جس کو میں محبوب ہوں علی بھی اس کو محبوب ہونا چاہئے الٰہی جو علی سے محبت رکھے اس سے تو بھی محبت رکھ اور جو علی سے عداوت رکھے اس سے تو بھی عداوت رکھ

احادیث میں خاص یہ تصریح نہیں کہ ان الفاظ کے کہنے کی ضرورت کیا پیش آئی، بخاری میں ہے کہ اسی زمانہ میں حضرت علیؓ یمن بھیجے گئے، جہاں سے واپس آکر وہ حج میں شامل ہوئے تھے، یمن میں انھوں نے اپنے اختیار سے ایک ایسا واقعہ کیا تھا جس کو ان کے بعض ہمراہیوں نے پسند نہیں کیا، ان میں سے ایک صاحب نے آکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایت کی آپ نے فرمایا "علی کو اس سے زیادہ کا حق تھا"[1] عجب نہیں کہ اسی قسم کے شکوک رفع کرنے کے لئے

[1] صحیح بخاری بعث علیؓ الی الیمن و الترمذی مناقب حضرت علیؓ

اس موقع پر آپنے یہ الفاظ فرمائے،

مدینہ کے قریب پہنچکر ذوالحلیفہ میں شب بسر کی، صبح کے وقت ایک طرف سے آفتاب نکلا،
اور دوسری طرف کوکبۂ نبوی مدینہ منورہ میں داخل ہوا، سواد مدینہ پر نظر پڑی، تو یہ
الفاظ فرمائے،[۱]

اللہ اکبر لا الٰہ الا اللہ وحدہٗ
لا شریک لہٗ لہٗ الملک ولہٗ
الحمد وھو علیٰ کل شئی قدیر،
آئبون تائبون عابدون ساجدون
لربنا حامدون صدق اللہ وعدہٗ
ونصر عبدہٗ وھزم الاحزاب وحدہٗ

خدا بزرگ و برتر ہے اس کے سوا کوئی خدا
نہیں کوئی اس کا شریک نہیں بس اسی کی سلطنت
ہے اسی کے لئے مدح وستایش ہے، وہ ہر
بات پر قادر ہے، لوٹے آرہے ہیں توبہ کرتے
ہوئے فرماں بردارانہ، زمین پر پیشانی رکھکر
اپنے پروردگار کی مدح وستایش میں مصروف
ہوکر، خدانے اپنا وعدہ سچا کیا، اپنے بندے
کی نصرت کی، اور تمام قبائل کو تنہا شکست دی)

[۱] صحیح بخاری بعث علی الی الیمن وترمذی، مناقب حضرت علیؓ۔ [۲] حجۃ الوداع کے تمام تر واقعات صحیح بخاری،
صحیح مسلم، سنن ابوداؤد ونسائی سے لئے گئے ہیں، ہر واقعہ کے لئے ان کتابوں میں کتاب الحج کے مختلف
ابواب دیکھو،

وفات

اِنَّكَ مَيِّتٌ وَاِنَّهُمْ مَيِّتُوْنَ (زمر)

ربیع الاول سنہ ۱۱ھ مطابق مئی سنہ ۶۳۲ء

روحِ قدسی کو عالمِ جسمانی میں اسی وقت تک رہنے کی ضرورت تھی، کہ تکمیلِ شریعت اور تزکیۂ نفوس کا عظیم الشان کام درجۂ کمال تک پہونچ جائے حجۃ الوداع میں یہ فرضِ اہم ادا ہو چکا ہو جبکہ کامل، اور مکارمِ اخلاق کے اصول عملاً قائم کرکے عرفات کے مجمع عام میں اعلان کر دیا گیا کہ

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ، — آج کے دن میں نے تمہارے دین کو کامل کردیا، اور اپنی نعمتیں پوری کردیں،

(سورہ فتح کا نزول خاص خاص صحابہ کو آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے قربِ وفات کی اطلاع دے چکا تھا[۱]، اور آپ حکمِ ربانی فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ (فتح) کے مطابق زیادہ تر اوقات تسبیح و تہلیل میں بسر فرماتے تھے[۲]، آپ عموماً ہر سال رمضان مبارک میں دس دن اعتکاف میں بیٹھتے تھے لیکن رمضان سنہ ۱۰ھ میں بیس دن اعتکاف میں بیٹھے، سال میں ایک دفعہ ماہ رمضان میں آپ پورا قرآن ناموسِ اکبر کی زبانی سنتے تھے، لیکن وفات کے سال دو دفعہ یہ شرف حاصل ہوا[۳]،

(۱) صحیح بخاری تفسیر اذا جاء، (۲) اس قسم کی روایتیں گو طبری، ابن خزیمہ اور ابن مردویہ میں ہیں، لیکن مختصراً صحیح بخاری تفسیر اذا جاء، میں بھی مذکور ہیں، (۳) صحیح بخاری باب الاعتکاف و باب تالیف القرآن)

حجۃ الوداع کے موقع پر مناسکِ حج کی تعلیم کے ساتھ ساتھ آپنے یہ اعلان بھی فرمایا کہ "مجھے امید نہیں کہ آیندہ سال تم سے مل سکوں" بعض روایتوں میں یہ الفاظ اس طرح وارد ہوئے ہیں "شاید میں اس کے بعد حج نہ کر سکوں[۱]" غدیر خم کے خطبوں میں بھی اسی قسم کے الفاظ ادا ہوئے،

غزوہ اُحد کے بیان میں گذر چکا ہے کہ شہدائے اُحد کے جنازہ کی نماز نہیں پڑھی گئی تھی، تمام غزوات میں صرف غزوۂ اُحد ہی ایک ایسا غزوہ ہے جس میں مسلمانوں نے سب سے زیادہ بیکسی کے ساتھ جان دی، اس لئے ان کی یاد آپکے دل میں اس وقت بھی موجود تھی،

حجۃ الوداع کے موقع پر تمام مسلمانوں کو اپنے فیض دیدار سے مشرف فرمایا، اور اُن کو حسرت کے ساتھ وداع کیا، شہدائے احد جو بَلْ هُمْ اَحْيَاءٌ کے مژدہ جانفزا سے فیضیاب تھے آٹھ برس کے بعد آخری دفعہ آپنے اُن کو بھی اپنی زیارت سے مشرف کرنا ضروری سمجھا، چنانچہ اسی زمانہ میں اُن کی قبر پر تشریف لے گئے، اور اُن کیلئے دعائے خیر فرمائی، اور اس رقت انگیز طریقہ سے اُن کو وداع کیا کہ "جس طرح ایک مرنے والا اپنے زندہ اعزہ کو وداع کرتا ہے[۲]"، اس کے بعد ایک خطبہ دیا، جس میں فرمایا، "میں تم سے پہلے حوض پر جا رہا ہوں اس کی وسعت اتنی ہے جتنی ایلہ سے حجفہ تک، مجھ کو تمام دنیا کے خزانوں کی کنجی دی گئی ہے، مجھے خوف نہیں ہے کہ میرے بعد تم شرک کرد گے لیکن اس سے ڈرتا ہوں کہ دنیا میں مبتلا ہو جاؤ، اور اس کیلئے آپس میں کشت و خون نہ کرو تو پھر اسی طرح ہلاک ہو جاؤ جس طرح تم سے پہلی قومیں ہلاک ہوئیں" راوی کا بیان ہے کہ یہ آخری دفعہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خطبہ دیتے ہوئے سنا[۳]،

غزوات میں گذر چکا ہے کہ حضرت زیدؓ بن حارثہ کو حدود شام کے عربوں نے شہید کر ڈالا تھا،

[۱] مسلم و ابو داود و نسائی، کتاب الحج [۲] صحیح بخاری کتاب الجنائز [۳] صحیح مسلم باب اثبات الحوض،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان سے اس کا قصاص لینا چاہتے تھے، آغاز علالت سے ایک روز پہلے آپ نے اسامہ رضؓ ابن زید کو مامور کیا کہ وہ فوج لیکر جائیں اور ان شریروں سے اپنے باپ کا انتقام لیں[1])

(۱۸ یا ۱۹) صفر سنہ ۱۱ھ میں آدھی رات کو آپ جنۃ البقیع میں جو عام مسلمانوں کا قبرستان تھا[2]

(۱) واقدی اور ابن اسحاق کا بیان ہو کہ اس غزوہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ کو بھی جانے کا حکم دیا تھا لیکن یہ روایتیں بے سند ہیں، اس لئے علامہ ابن تیمیہ نے اس سے شدت کیسا تھ انکار کیا ہو حضرت عمرؓ کے متعلق تو نہیں کہا جا سکتا لیکن حضرت ابوبکرؓ کو آپنے ایام علالت میں امام نماز مقرر فرمایا اور یہ صحیح روایت سے ثابت ہو اس بنا پر اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ پہلے حضرت ابوبکرؓ کو جانے کا حکم ہوا تھا تو معلوم ہوتا ہو کہ بعد کو آپ نے مستثنیٰ کر لیا (۲) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ابتدائے مرض کے دن، مدت علالت اور تاریخ وفات کی تعیین میں روایات مختلف ہیں، امر مختلف فیہ سے پہلے ان امور کو بتا دینا چاہیے جن پر تمام روایات کا اتفاق ہے اور جن پر گویا محدثین اور ارباب سیر کا اجماع عام ہے، اور وہ یہ ہیں، (۱) سال وفات سنہ ۱۱ھ ہو (۲) مہینہ ربیع الاول کا تھا، (۳) یکم سے ۱۲ تک کوئی تاریخ تھی (۴) دوشنبہ کا دن تھا، (صحیح بخاری ذکر وفات کتاب الجنائز) زیادہ تر روایات سے یہ ثابت ہوتا ہو، کہ آپ کل ۱۳ دن بیمار رہے، اس بنا پر اگر تحقیقی طور سے متعین ہو جائے کہ آپنے کس تاریخ کو وفات پائی تو تاریخ آغاز مرض بھی متعین کیجا سکتی ہو حضرت عائشہؓ کے گھر بروایت صحیح ۸ روز (ایک دوشنبہ سے دوسرے دوشنبہ تک) بیمار رہے اور وہیں وفات فرمائی، اسلئے ایام علالت کی مدت ۸ روز تو یقینی ہے، عام روایات کے رو سے پانچ دن اور چاہئیں، اور یہ قرائن سے بھی معلوم ہوتا ہے، اس لئے ۱۳ دن مدت علالت صحیح ہو، علالت کے ۵ دن آپنے دوسری ازواج کے حجروں میں بسر فرمائے، اس حساب سے علالت کا آغاز چہارشنبہ سے ہوتا ہے،

"تاریخ وفات کی تعیین میں راویوں کا اختلاف ہو کتب حدیث کا تمام تر دفتر چھان ڈالنے کے بعد بھی تاریخ وفات کی مجھکو کوئی روایت احادیث میں نہیں مل سکی، ارباب سیر کے ہاں تین روایتیں ہیں، یکم ربیع الاول، دوم ربیع الاول، اور ۱۲ ربیع الاول ان تینوں روایتوں میں باہم ترجیح دینے کے لئے اصول روایت و درایت دونوں سے کام لینا ہو، روایۃً دوم ربیع الاول کی روایت ہشام بن محمد بن سائب کلبی، اور ابو مخنف کے واسطہ سے مروی ہے، (طبری ص ۱۵-۱۸) اس روایت کو گو اکثر قدیم مورخوں (مثلاً یعقوبی و مسعودی) وغیرہ) نے قبول کیا ہو لیکن محدثین کے نزدیک یہ دونوں مشہور دروغ گو اور غیر معتبر ہیں، یہ روایت واقدی سے بھی ابن سعد و طبری نے نقل کی ہے، (جزء وفات) لیکن واقدی کی مشہور ترین روایت جس کو اس نے متعدد اشخاص سے نقل کیا ہو وہ ۱۲ ربیع الاول کی ہے، البتہ بیہقی نے دلائل میں بسند صحیح سلیمان التیمی سے دوم ربیع الاول کی روایت نقل کی ہے، (زرقانی براس ابن سید الناس، وفات) لیکن یکم ربیع الاول کی روایت ثقہ ترین ارباب سیر موسیٰ بن عقبہ سے اور مشہور محدث امام لیث مصری سے مروی ہے (فتح الباری وفات)

تشریف لے گئے، وہاں سے واپس تشریف لائے تو مزاج ناساز ہوا (یہ حضرت میمونہؓ کی باری کا دن تھا) اور روز چہارشنبہ تھا، پانچ دن تک آپ اس حالت میں بھی ازراہ عدل و کرم باری باری ایک ایک بیوی

(بقیہ حاشیہ ص ۱۷۲) امام سہیلی نے روض الانف میں اسی روایت کو اقرب الی الحق لکھا ہے (جلد دوم وفات) اور سب سے پہلے امام مذکور ہی نے درایۃً اس نکتہ کو دریافت کیا، کہ ۱۲ ربیع الاول کی روایت قطعاً ناقابل تسلیم ہے، کیونکہ دو باتیں یقینی طور پر ثابت ہیں، روز وفات دوشنبہ کا دن تھا (صحیح بخاری ذکر وفات و صحیح مسلم کتاب الصلوٰۃ) اس سے تقریباً تین مہینے پہلے ذیحجہ ۱۰ھ کی نویں تاریخ کو جمعہ کا دن تھا (صحاح قصہ حجۃ الوداع، صحیح بخاری تفسیر الیوم اکملت لکم دینکم) ۹ ذیحجہ ۱۰ھ روز جمعہ سے ۱۲ ربیع الاول ۱۱ھ تک حساب لگاؤ، ذیحجہ، محرم، صفر، ان تینوں مہینوں کو خواہ ۲۹، ۲۹، لو خواہ ۳۰، ۳۰، ۳۰، خواہ بعض ۳۰ کسی حالت اور کسی شکل سے ۱۲ ربیع الاول کو دوشنبہ کا دن نہیں پڑ سکتا، اسلئے درایۃً بھی یہ تاریخ قطعاً غلط ہے، دوم ربیع الاول کو حساب سے اس وقت دوشنبہ پڑ سکتا ہے جب تینوں مہینے ۲۹ کے ہوں جب وہ پہلی صورتیں صحیح نہیں ہیں تو اب صرف تیسری صورت رہ گئی ہے، جو کثیر الوقوع ہے، یعنی یہ کہ دو مہینے ۲۹ کے اور ایک مہینہ تیس کا لیا جائے، اس حالت میں ۲۹ ربیع الاول کو دوشنبہ کا روز واقع ہوگا، اور یہی ثقہ اشخاص کی روایت ہے ذیل کے نقشہ سے معلوم ہوگا کہ ۹ ذیحجہ کو جمعہ ہو تو اوایل ربیع الاول میں اس حساب سے دوشنبہ کس کس دن واقع ہو سکتا ہے

نمبر شمار	صورت مفروضہ	دوشنبہ	دوشنبہ	دوشنبہ
۱	ذیحجہ، محرم اور صفر سب ۳۰ دن کے ہوں	۶	۱۳	
۲	ذیحجہ، محرم اور صفر سب ۲۹ دن کے ہوں	۲	۹	۱۶
۳	ذیحجہ، ۲۹، محرم ۲۹، اور صفر ۳۰ کا ہو،	۱	۸	۱۵
۴	ذیحجہ، ۳۰، محرم ۲۹ اور صفر ۲۹ کا ہو،	۱	۸	۱۵
۵	ذیحجہ، ۲۹، محرم ۳۰، اور صفر ۲۹ کا ہو،	۱	۸	۱۵
۶	ذیحجہ، ۳۰ محرم ۲۹ اور صفر ۳۰ کا ہو،	۷	۱۴	
۷	ذیحجہ، ۳۰ محرم ۳۰ اور صفر ۲۹ کا ہو،	۷	۱۴	
۸	ذیحجہ، ۲۹ کا اور محرم و صفر ۳۰ کے ہوں	۷	۱۴	

ان مفروضہ تاریخوں میں سے ۶، ۷، ۸، ۱۳، ۱۹، ۱۴، ۱۵، خارج از بحث ہیں کہ علاوہ اور وجوہ کے ان کی تائید میں کوئی روایت نہیں رہ گئیں یکم اور دوم تاریخیں، دوم تاریخ صرف ایک صورت میں پڑ سکتی ہے (باقی ص ۱۷۴ پر)

(۵ ابن سعد و عبدالرزاق بسند صحیح و صحیح مسلم باب الامامۃ)

کے حجرہ میں تشریف لیجاتے رہے، دوشنبہ کے دن) مرض میں شدت ہوئی، تو ازواجِ مطہرات سے اجازت لی کہ حضرت عائشہؓ کے گھر قیام فرمائیں، خلق عمیم کی بنا پر اجازت بھی صاف اور علانیہ نہیں طلب کی، بلکہ پوچھا کہ کل میں کس کے گھر رہوں گا، دوسرا دن (دوشنبہ) حضرت عائشہؓ کے یہاں قیام فرمانے کا تھا، ازواجِ مطہرات نے مرضیِ اقدس سمجھ کر عرض کی کہ آپ جہاں چاہیں قیام فرمائیں[1]، ضعف اس قدر ہوگیا تھا کہ چلا نہیں جاتا تھا، حضرت علیؓ اور حضرت عباسؓ دونوں بازو تھام کر بمشکل حضرت عائشہؓ کے حجرے میں لائے،

(آمد ورفت کی قوت جب تک رہی، آپ مسجد میں نماز پڑھانے کی غرض سے تشریف لاتے رہے، سب سے آخری نماز جو آپ نے پڑھائی، وہ مغرب کی نماز تھی، سر میں درد تھا، اس لئے سر میں رومال باندھ کر آپ تشریف لائے اور نماز ادا کی جس میں سورۂ والمرسلات عرفاً قرات فرمائی[2] عشاء کا وقت آیا تو دریافت فرمایا کہ نماز ہو چکی؟ لوگوں نے عرض کی کہ سب کو حضورؐ کا انتظار ہے،

(بقیہ حاشیہ ص ۱۷۳) جو خلافِ اصول ہے کیم تاریخ تین صورتوں میں واقع ہو سکتی ہے، اور تینوں کثیر الوقوع ہیں اور روایات ثقات اُن کی تائید میں ہیں اسلئے وفاتِ نبوی کی صحیح تاریخ ہمارے نزدیک کیم ربیع الاول ۱۱ھ ہے، اس حساب میں فقط رویتِ ہلال کا اعتبار کیا گیا ہے جس پر اسلامی قمری مہینوں کی بنیاد ہے، اصول فلکی سے ممکن ہے کہ اس پر خدشات وارد ہو سکتے ہوں،

کتبِ تفسیر میں تحت آیت الیوم اکملت لکم دینکم حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ اس آیت کے یوم نزول (۹ ذیحجہ سنہ ۱۰ھ) سے روز وفات تک کے ۸۱ دن ہیں، (دیکھو ابن جریر، ابن کثیر و بغوی وغیرہ) ہمارے حساب سے ۹ ذیحجہ سنہ ۱۰ھ سے لیکر کیم ربیع الاول تک دو ۲۹، اور ایک مہینہ ۳۰ لیکر جو ہماری مفروضہ صورت ہے، پورے ۸۱ دن ہوتے ہیں، ابو نعیم نے بھی دلائل میں بسند کیم ربیع الاول تک تاریخ وفات نقل کی ہے، (ص ۱۴۶ – س)

[1] صحیح بخاری ذکر وفات، ابن سعد نے بروایات صحیح نقل کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے حضرت فاطمہ زہراؓ نے اجازت طلب کی تھی، [2] یہ حدیث بخاری و مسلم و ابوداؤد و ترمذی اور نسائی باب القراۃ میں مذکور ہے، آئندہ حضرت عائشہؓ کی روایت آئیگی جس میں مذکور ہوگا کہ آخری نماز مسجد میں ظہر کی آپ نے پڑھائی، حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں ان دونوں میں اس طرح تطبیق دی ہے کہ مغرب کا واقعہ اندرون حجرۂ نبوی کا واقعہ ہے جیسا کہ نسائی میں ہے (جلد ۲ صفحہ ۱۳۵) (باقی ص ۱۷۵)

لگن میں پانی بھرواکر غسل فرمایا، پھر اٹھنا چاہا کہ غش آگیا، افاقہ کے بعد پھر فرمایا کہ نماز ہو چکی؟ لوگوں نے پھر وہی پہلا جواب دیا، آپنے پھر غسل فرمایا، اور پھر جب اٹھنا چاہا تو غش آگیا، افاقہ ہوا تو پھر دریافت فرمایا، لوگوں نے وہی جواب دیا، تیسری مرتبہ جسم مبارک پر پانی ڈالا پھر جب اٹھنے کا ارادہ کیا تو پھر غشی طاری ہوگئی، جب افاقہ ہوا تو ارشاد فرمایا کہ ابوبکر نماز پڑھائیں (حضرت عائشہؓ نے معذرت کی کہ یا رسول اللہ ابوبکر نہایت رقیق القلب ہیں، آپ کی جگہ اُن سے کھڑا نہو جائے گا، آپنے پھر یہی حکم دیا کہ ابوبکرؓ نماز پڑھائیں، چنانچہ) کئی دن تک حضرت ابوبکرؓ نے نماز پڑھائی،

(بقیہ حاشیہ ص ۱۷۴) لیکن آگے چل کر حافظ موصوف کی نظر ترمذی کی روایت پر پڑی جس میں مذکور ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے باہر نکل کر نماز پڑھائی" اس کی تاویل اُن کو یہ کرنی پڑی کہ "اس سے مقصود ہے کہ خوابگاہ سے باہر آکر" (جلد ۸ ص ۱۰۲) لیکن ہمارے نزدیک تاویل صحیح نہیں کہ اول تو حجرہ نبوی میں اتنی جگہ نہ تھی کہ کوئی بڑی جماعت ہو سکے، دوسری یہ کہ خوابگاہ کے علاوہ حجرہ نبوی میں اور جگہ کہاں تھی، علاوہ ازیں احادیث میں صلی بنا کے یہی معنی ہر جگہ آئے ہیں، کہ تمام مسلمانوں کے امام بنکر نماز پڑھائی گھر کی نماز پر یہ لفظ صادق نہیں آتا، اس لئے صحیح یہ ہے کہ نماز مسجد نبوی میں پڑھی گئی، جیسا کہ عام روایت کا اشارہ ہے یہ آخری نماز مغرب تھی، یا ظہر اسکی تطبیق یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مسلسل امامت کا انقطاع مغرب کی نماز مذکور پر ہوا جیسا کہ آگے عشا کی نماز کے ذکر میں آئے گا، ظہر کی نماز جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد میں ادا فرمائی وہ اتفاقی تھی اصل میں امام پہلے سے حضرت ابوبکرؓ تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اگر بعد کو شریک ہوگئے تھے یہ نماز مسجد میں آپ کی آخری نماز تھی بعض صحابہ سے یہ مذکور ہے کہ آخری نماز صبح کی تھی، یہ درحقیقت اُن کا اپنا واقعہ ہے یعنی آخری بار یہی موقع ملا، (ص ۱۷۵ صحیح بخاری و مسلم میں بروایت حضرت عائشہؓ یہ تخصیص ہے، دیکھو کتاب الصلوٰۃ اور وفات)

(۵ بخاری باب الامامۃ ج ۱ ص ۹۲) میں حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ تین دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز نہیں پڑھائی، اور حضرت ابوبکرؓ نے آپ کی قائم مقامی کی، اس قائم مقامی کا آغاز شب جمعہ کی نماز عشا سے ہے (بخاری و مسلم کتاب الصلوٰۃ) اور اختتام دوشنبہ کی صبح کی نماز پر ہوا، (بخاری باب من رجع القہقری فی الصلوٰۃ ص ۱۶۰) کل یہ تین دن میں ۱۷ اوقات کی نمازیں ہوئیں، ابن سعد نے واقدی سے بعینہ یہی روایتیں کی ہیں، ایک میں ہے کہ ۳ دن امامت کی دوسری میں ہے کہ ۱۷ وقت کی

وفات سے چار دن پہلے (جمعرات کو) آپ نے فرمایا کہ دوات کاغذ لاؤ، میں تمہارے لئے ایک تحریر لکھ دوں جس کے بعد تم گمراہ نہ ہو گے، بعض صحابہ نے لوگوں کو مخاطب کر کے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مرض کی شدت ہے (غلبہ الوجع) اور تمہارے پاس قرآن موجود ہے، جو ہمارے لئے کافی ہے، اس پر حاضرین میں اختلاف پیدا ہوا، بعض کہتے تھے کہ تعمیل ارشاد کیجائے، بعض کچھ اور کہتے تھے، اختلاف اور شور و غل زیادہ ہوا، تو بعض نے کہا اھجر استفھموہ خود آپ سے دریافت کر لو، لوگ جب پوچھنے لگے تو آپ نے فرمایا "مجھے چھوڑ دو، میں جس مقام میں ہوں، وہ اس سے بہتر ہے جس کی طرف تم مجھے بلاتے ہو"

سلہ یہ روایت صحیح بخاری موقع وفات کی ہے، صحیح بخاری میں یہ حدیث مختلف ابواب میں مذکور ہے، اور ہر جگہ الفاظ میں کچھ نہ کچھ اختلاف ہے، صحیح مسلم کتاب الوصیۃ میں یہ روایتیں یکجا ہیں، جن صحابی نے قلم دوات لانے میں گفتگو کی، بخاری میں ان کا نام نہیں لیکن حدیث کی اور کتابوں میں (مثلاً صحیح مسلم) بہ تصریح حضرت عمرؓ کا نام ہے، صحیح مسلم میں (ان کے) یہ الفاظ ہیں:

قد غلب علیہ الوجع وعندکم القرآن حسبنا کتاب اللہ آپ کو مرض کی شدت ہے، ہمارے پاس قرآن موجود ہے، خدا کی کتاب ہمارے لئے کافی ہے

(صحیح مسلم کی دوسری روایتوں کے یہ الفاظ ہیں)

(۱) فقالوا ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یھجر تو لوگوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بیہودی (ھجر) کی باتیں کرتے ہیں

(۲) فقالوا اھجر استفھموہ (تو لوگوں نے کہا کیا آپ بیہودی کی باتیں کرتے ہیں آپ سے خود پوچھ لو)

اس بنا پر یہ روایت شیعہ و سنی کا بڑا معرکہ آرا میدان بن گئی ہے، شیعہ کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت علیؓ کی خلافت کا فرمان لکھوانا چاہتے تھے، سنی کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو واقعی تکلیف تھی، اور یہ معلوم تھا کہ شریعت کے متعلق کوئی نکتہ باقی نہیں رہا، خود قرآن مجید میں الیوم اکملت لکم نازل ہو چکی تھی، اسلئے حضرت عمرؓ نے آپ کو تکلیف دینا مناسب نہیں سمجھا، اگر کوئی ضروری حکم ہوتا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کسی کے روکنے سے کیونکر رک سکتے تھے، اس واقعہ کے بعد چار دن آپ زندہ رہے، اس وقت نہ سہی بعد کو لکھوا دیا ہوتا، (اور یہ کیونکر معلوم ہوا کہ آپ کیا لکھوانا چاہتے تھے، بخاری میں ہے کہ آپ عبداللہ بن ابی بکر کو بلا کر حضرت ابوبکرؓ کی خلافت کا فرمان لکھوانا چاہتے تھے، پھر آپ نے ضروری نہیں سمجھا اور فرمایا کہ خود خدا اور اہل اسلام ابوبکر کے سوا کسی اور کو پسند نہ کریں گے، اس اختلاف کے بعد آپ نے لوگوں کو زبانی تین وصیتیں فرمائیں، جو ضروری بات آپ کاغذ پر لکھوانا چاہتے تھے، ممکن ہے، وہ یہی ہوں، یا اگر وہ ان کے علاوہ تھی، تو آپ اس کو ان عام وصیتوں کے ساتھ زبانی بھی فرما سکتے تھے، اس کے بعد مجمع عام میں جو خطبہ دیا، اس میں اس کا اظہار فرما سکتے تھے" (باقی صفحہ پر)

(اس کے بعد آپ نے تین) وصیتیں فرمائیں، ان میں سے ایک یہ تھی، کہ کوئی مشرک عرب میں رہنے نہ پائے، دوسری یہ کہ سفراء کا اسی طرح احترام کیا جائے، جس طرح آپ کے زمانہ میں دستور تھا، تیسری وصیت راوی کو یاد نہیں رہی[1]،

(اسی دن[2] ظہر کی نماز کے وقت آپ کی طبیعت کچھ سکون پذیر ہوئی، آپنے حکم دیا کہ پانی کی سات مشکیں آپ پر ڈالی جائیں، غسل فرما چکے تو حضرت علیؓ اور حضرت عباسؓ تھام کر مسجد میں لائے، جماعت کھڑی ہو چکی تھی، اور حضرت ابو بکرؓ نماز پڑھا رہے تھے، آہٹ پا کر حضرت ابو بکرؓ پیچھے ہٹے، آپنے اشارہ سے روکا، اور اُن کے پہلو میں بیٹھ کر نماز پڑھائی، یعنی آپ کو دیکھ حضرت ابو بکرؓ اور حضرت ابو بکرؓ کو دیکھ کر اور لوگ ارکان ادا کرتے جاتے تھے،

(نماز کے بعد آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ایک خطبہ دیا، جو آپ کی زندگی کا سب سے آخری خطبہ تھا، آپنے فرمایا:-

خدا نے اپنے ایک بندہ کو اختیار عطا فرمایا ہو کہ خواہ دنیا کی نعمتوں کو قبول کرے یا خدا کے پاس (آخرت) میں جو کچھ ہے اس کو قبول کرے لیکن اُس نے خدا ہی کے پاس کی چیزیں قبول کیں[3]

یہ سُن کر حضرت ابو بکرؓ رو پڑے، لوگوں نے اُن کی طرف تعجب سے دیکھا کہ آپ تو ایک شخص کا واقعہ بیان فرماتے

(بقیہ حاشیہ ص ۱۷۶) مجھ کو احتیاط کرنی چاہیئے کہ کتاب تاریخ کی حیثیت سے نکل کر علم کلام کے دائرہ میں نہ جانے تاہم جو میری ذاتی تحقیق ہے میں الفاروق میں لکھ چکا ہوں،

[1] صحیح بخاری ذکر وفات و صحیح مسلم کتاب الوصیۃ، [2] روایتوں میں بالتصریح یہ مذکور نہیں ہو کہ یہ کس دن کے ظہر کا واقعہ ہو لیکن صحیح مسلم باب النہی عن بناء المساجد علی القبور میں حضرت جندبؓ کی روایت ہو کہ حضرت ابو بکرؓ کی شان میں جو الفاظ آپنے فرمائے تھے، جن کا بیان آگے آتا ہے وہ وفات سے پانچ روز پیشتر فرمائے تھے، اور چونکہ مرض الموت کا خطبہ اسی نماز ظہر کے بعد آپنے فرمایا تھا، جیسا کہ صحیح بخاری و صحیح مسلم میں حضرت عائشہؓ کی روایت ہو اس لئے یہ وفات سے پانچ روز پہلے جمعرات کا واقعہ تھا، حافظ ابن حجر نے بھی فتح الباری میں یہی فیصلہ کیا ہے، [3] س

کرتے ہیں کہ یہ رونے کی کونسی بات ہے لیکن رازدار نبوت سمجھ چکا تھا کہ وہ بندہ خود محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، آپ نے اپنی تقریر کا سلسلہ آگے بڑھایا، اور فرمایا "سب سے زیادہ میں جس کی دولت اور صحبت کا ممنون ہوں ابوبکر ہیں، اگر میں دنیا میں کسی کو اپنی امت میں سے اپنا دوست بنا سکتا تو ابوبکر کو بناتا، لیکن اسلام کا رشتہ دوستی کے لئے کافی ہے، مسجد کے رُخ کوئی دریچہ ابوبکر کے دریچہ کے سوا باقی نہ رکھا جائے، ہاں تم سے پہلی قوموں نے اپنے پیغمبروں اور بزرگوں کی قبروں کو عبادتگاہ بنالیا ہے، دیکھو تم ایسا نہ کرنا، میں منع کر جاتا ہوں،

زمانۂ علالت میں انصار آپ کی عنایات اور مہربانیوں کو یاد کر کے روتے تھے، ایک دفعہ اسی حالت میں حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عباسؓ کا گذر ہوا، انھوں نے انصار کو روتے دیکھا تو وجہ دریافت کی انھوں نے بیان کیا کہ "حضور کی صحبتیں یاد آتی ہیں"، اُن میں سے ایک صاحب نے جاکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ واقعہ بیان کیا، آج اسکی تلافی کا موقع تھا، اس لئے اس کے بعد آپ نے انصار کی نسبت لوگوں کو طرف خطاب کر کے فرمایا یا ایہا الناس! میں انصار کے معاملہ میں تم کو وصیت کرتا ہوں عام مسلمان بڑھتے جائیں گے لیکن، انصار اس طرح کم ہو کر رہ جائیں گے جیسے کھانے میں نمک وہ اپنی طرف سے اپنا فرض ادا کر چکے، اب تمھیں ان کا فرض ادا کرنا ہے، وہ میرے (جسم میں بمنزلہ) معدہ کے ہیں جو تمھارے نفع و نقصان کا متولی ہو (یعنی جو خلیفہ ہو) اسکو چاہیے کہ ان میں جو نیکوکار ہوں اُن کو قبول کرے، اور جن سے خطا ہوئی ہے۔ اُن کو معاف کرے

اوپر گذر چکا ہے کہ رومیوں کی طرف جس فوج کا بھیجنا آنحضرتؐ نے تجویز کیا تھا، اسکی سرداری

۱؎ صحیح بخاری و مسلم مناقب ابی بکر، اخیر تکملہ ۲؎ صحیح مسلم باب النہی عن بناء المساجد علی القبور میں ہے ۳؎ صحیح بخاری مناقب انصار

اسامہ بن زیدؓ کو تفویض فرمائی تھی، اس پر لوگوں نے (ابن سعد نے تصریح کی ہے کہ وہ منافقین تھے) شکایت کی کہ بڑے بوڑھوں کے ہوتے ہوئے نوجوانوں کو یہ منصب کیوں عطا ہوا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس مسئلہ کی نسبت ارشاد فرمایا،

"اگر اسامہ کی سرداری پر تم کو اعتراض ہے تو اس کے باپ زید کی سرداری پر بھی تم معترض تھے خدا کی قسم وہ اس منصب کا مستحق تھا، اور وہ مجھے سب سے زیادہ محبوب تھا اور اب اس کے بعد یہ سب سے زیادہ محبوب[1] ہے"،

اسلام اور دیگر مذاہب میں ایک نہایت دقیق فرق یہ ہے کہ اسلام شریعت کے تمام احکام کا واضع اور حاکم براہِ راست خدائے پاک کو قرار دیتا ہے پیغمبر کا صرف اسی قدر فرض ہے کہ احکام الٰہی کو اپنے قول و عمل کے ذریعہ سے بندوں تک پہنچا دے، چونکہ دوسرے مذاہب میں یہ غلط فہمی شرک و کفر تک منجر ہو چکی تھی، اور اس کے نتائج پیش نظر تھے، اس لئے ارشاد فرمایا:

"حلال و حرام کی نسبت میری طرف نہ کیجائے، میں نے وہی چیز حلال کی ہے جو خدا نے اپنی کتاب میں حلال کی ہے، اور وہی چیز حرام کی ہے، جو خدا نے حرام کی ہے"؛

انسان کی جزا و سزا کی بنیاد خود اس کے ذاتی عمل پر ہے، آپ نے فرمایا:

"اے پیغمبر خدا کی بیٹی فاطمہ! اور اے پیغمبر خدا کی پھوپھی صفیہ! خدا کے ہاں کے لئے کچھ کر لو، میں تمھیں خدا سے نہیں بچا سکتا"؛[2]

---

(1) صحیح بخاری بعث اسامہ و مناقب زید بن حارثہؓ (2) یہ اور اس کے اوپر کی حدیث مسند امام شافعی باب استقبال القبلہ کتاب الام امام شافعی اور ابن سعد جزء الوفات میں بسند حسن مروی ہے لیکن ان روایتوں میں مذکور ہے کہ صبح کی نماز کے بعد آپ نے فرمایا لیکن بخاری کے حوالہ سے گذر چکا ہے کہ آپ نے ظہر کی نماز میں شرکت فرمائی تھی اور اس کے بعد خطبہ دیا تھا

دوسری غلطی مسند اور ابن سعد کی روایتوں میں یہ ہے کہ وہ دو شنبہ کی صبح یعنی روز وفات کا واقعہ اس کو بیان کرتے ہیں حالانکہ روایات صحیح ثابت ہے کہ دو شنبہ کی صبح کو آپ نے صرف پردہ اٹھا کر جھانکا تھا نہ باہر تشریف لائے اور نہ نماز میں شرکت فرمائی تھی "س"

خطبہ سے فارغ ہو کر آپ حجرۂ عائشہؓ میں واپس تشریف لائے)

آپ کو حضرت فاطمہ زہراؓ سے بیحد محبت تھی، (اثنائے علالت میں) ان کو بلا بھیجا، تشریف لائیں تو ان سے کچھ کان میں باتیں کیں، وہ رونے لگیں، پھر بلا کر کچھ کان میں کہا تو ہنس پڑیں، حضرت عائشہؓ نے دریافت کیا، تو کہا پہلی دفعہ آپ نے فرمایا کہ میں اسی مرض میں انتقال کروں گا، جب میں رونے لگی تو فرمایا کہ میرے خاندان میں سب سے پہلے تمہیں مجھ سے آکر ملوگی"[1] تو ہنسنے لگی،

یہود و نصاریٰ نے انبیاء کے مزارات اور یادگاروں کی تعظیم میں جو افراط کی تھی، وہ بُت پرستی کی حد تک پہنچ گئی تھی، اسلام کا فرض اولین بُت پرستی کی رگ و ریشہ کا استیصال کرنا تھا، اس لئے حالتِ مرض میں جو چیز سب سے زیادہ آپ کے پیشِ نظر تھی یہی تھی، (اتفاق سے بعض ازواجِ مطہرات نے جو حبشہ ہو آئی تھیں، اسی حالت میں وہاں کے عیسائی معبدوں[2] کا اور اُن کے مجسموں اور تصویروں کا تذکرہ کیا، آپ نے فرمایا ان لوگوں میں جب کوئی نیک آدمی[3] مرجاتا ہے، تو اس کے مقبرہ کو عبادتگاہ بنا لیتے ہیں، اور اُس کا بت بنا کر اُس میں کھڑا کرتے ہیں، قیامت کے روز اللہ عزوجل کی نگاہ میں یہ لوگ بدترین مخلوق ہوں[4] گے)، عین کرب کی شدت میں جب کہ چادر کبھی منہ پر ڈال لیتے تھے اور کبھی گرمی سے گھبرا کر اُلٹ دیتے تھے، حضرت عائشہؓ نے زبانِ مبارک سے یہ الفاظ سُنے،

لعنۃ اللّٰہ علی الیھود والنصاریٰ اتخذوا	یہود و نصاریٰ پر خدا کی لعنت ہو، انھوں نے
قبور انبیائھم مساجد[5]،	اپنے پیغمبروں کی قبروں کو عبادتگاہ بنا لیا،

---

(1) صحیح بخاری ذکر وفات (2) کوئی رومن کیتھولک گرجا ہوگا، جس میں حضرت عیسیٰؑ، حضرت مریمؑ اور اولیاء اور شہیدوں کے مجسّمے اور تصویریں ہوتی ہیں، (3) جسکو عیسائی سینٹ کہتے ہیں) (4) صحیح بخاری و صحیح مسلم باب النہی عن بناء المساجد علی القبور) (5) صحیح بخاری ذکر وفات و صحیح مسلم باب مذکور سابق)

(اسی کرب اور بے چینی میں یاد آیا کہ حضرت عائشہ رض کے پاس کچھ اشرفیاں رکھوائی تھیں، دریافت فرمایا کہ عائشہ! وہ اشرفیاں کہاں ہیں؟ محمد خدا سے بدگمان ہو کر ملے گا؟ جاؤ ان کو خدا کی راہ[۱] میں خیرات کر دو[۲])

(وفات سے ایک دن[۳] پہلے اتوار کو) لوگوں نے دوا پلانی چاہی، چونکہ گوارا نہ تھی آپ نے انکار فرمایا، اسی حالت میں غشی طاری ہوگئی، لوگوں نے منہ کھول کر دوا پلا دی، افاقہ کے بعد آپ کو احساس ہوا، تو فرمایا کہ سب کو دوا پلائی جائے، معلوم ہوا جن لوگوں نے زبردستی دوا پلائی تھی ان میں حضرت عباس رض شامل نہ تھے، اس لئے وہ اس حکم[۴] سے مستثنیٰ رہے، محدثین اس واقعہ کو لکھ کر لکھتے ہیں کہ یہ بشریت کا اقتضا تھا، یعنی جس طرح بیماروں میں نازک مزاجی آجاتی ہے آپ نے بھی اسی طرح یہ حکم دیا تھا، لیکن ہمارے نزدیک تو یہ تنگ مزاجی نہیں، بلکہ لطفِ طبع تھا،

مرض میں اشتداد و تخفیف ہوتی رہتی تھی، جس دن وفات ہوئی (یعنی دوشنبہ کے دن) بظاہر طبیعت کو سکون تھا، حجرۂ مبارک مسجد سے ملا ہوا تھا، آپ نے (صبح کے وقت) پردہ اٹھا کر دیکھا تو لوگ (فجر کی) نماز میں مشغول تھے، دیکھ کر مسرت سے ہنس پڑے، لوگوں نے آہٹ پا کر خیال کیا کہ آپ باہر آنا چاہتے ہیں، فرطِ مسرت سے تمام لوگ بے قابو ہوگئے، اور قریب تھا کہ نمازیں ٹوٹ جائیں حضرت ابو بکر رض نے جو امام تھے، چاہا کہ پیچھے ہٹ جائیں، آپ نے اشارہ سے روکا اور حجرۂ شریف میں داخل ہو کر پردے ڈال دیئے،[۵] صحیح مسلم میں ہے کہ اس قدر ضعف تھا کہ آپ پردے بھی اچھی طرح نہ ڈال سکے[۶]، یہ سب سے آخری موقع تھا کہ صحابہ نے جمالِ اقدس کی زیارت کی حضرت انس رض بن مالک

---

۱ مسند ابن حنبل جلد ۶ ص ۴۹ و ابن سعد جزء الوفات بروایت متعددہ ۲ ابن سعد وفات ۳ صحیح بخاری ذکر وفات و صحیح مسلم (استعداد بالدود) ۴ صحیح بخاری ذکر وفات و کتب صحاح کتاب الصلوٰۃ ۵ صحیح مسلم کتاب الصلوٰۃ ص ۱۶۶

کہتے ہیں کہ آپ کا چہرہ یہ معلوم ہوتا تھا کہ مصحف کا کوئی ورق ہے[1] یعنی سپید ہو گیا تھا ،)

دن جیسے جیسے چڑھتا جاتا تھا، آپ پر بار بار غشی طاری ہوتی تھی، اور پھر افاقہ ہو جاتا تھا، حضرت فاطمہ زہرا رضؓ یہ دیکھ کر بولیں "واکرب اباہ" ہائے میرے باپ کی بے چینی! آپ نے فرمایا تمھا باپ آج کے بعد بے چین نہ ہوگا" حضرت عائشہ رضؓ فرماتی ہیں، کہ آپ جب تندرست تھے، تو فرمایا کرتے تھے، کہ پیغمبروں کو اختیار دیا جاتا ہے، کہ وہ خواہ موت کو قبول کریں، یا حیاتِ دنیا کو ترجیح دیں اس حالت میں اکثر آپ کی زبانِ مبارک سے یہ الفاظ ادا ہوتے رہے،

مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ، ان لوگوں کے ساتھ جن پر خدا نے انعام کیا

اور کبھی یہ فرماتے،

اَللّٰهُمَّ فِي الرَّفِيْقِ الْاَعْلٰى، خداوندا! بڑے رفیق میں،

وہ سمجھ گئیں کہ اب صرف رفاقتِ الٰہی مطلوب ہے)

وفات سے ذرا پہلے حضرت ابوبکر رضؓ کے صاحبزادے عبدالرحمٰن خدمت اقدس میں آئے، آپ حضرت عائشہ رضؓ کے سینہ پر سر ٹیک کر لیٹے تھے، عبدالرحمٰن کے ہاتھ میں مسواک تھی، مسواک

---

(1) صحیح مسلم باب الصلوٰۃ، حضرت انس رضؓ بن مالک کی روایت میں جو صحیح مسلم (کتاب الصلوٰۃ ص ۱۶۰) میں ہے، بیان ہے کہ تین دن کے بعد آپ اس وقت صبح کی نماز کے وقت برآمد ہوئے تھے، لیکن جماعت میں شریک نہ ہو سکے، اور واپس گئے، امام شافعی نے کتاب الام میں اور ابن سعد نے جزء الوفات میں ابن ابی سبرہ سے روایت کی ہے کہ آپ اس نماز میں شریک جماعت ہوئے لیکن یہ درحقیقت راوی کا سہو ہے، صحیح بخاری و مسلم وغیرہ میں یہ تصریح مذکور ہے کہ آپ شریک جماعت نہ ہو سکے، اور واپس گئے، راوی کو گذشتہ نماز ظہر کا التباس ہوا، تین دن کے بعد سے مراد جمعرات کے روز جس دن آپ نے خطبہ دیا تھا، اس کے بعد سے جمعہ، سنیچر اور اتوار کے دن ہیں،

کی طرف نظر جما کر دیکھا، حضرت عائشہؓ سمجھیں کہ آپ مسواک کرنا چاہتے ہیں، عبدالرحمن سے مسواک لیکر دانتوں سے نرم کی، اور خدمت اقدس میں پیش کی، آپنے بالکل تندرستوں کی طرح مسواک کی، آپکی وفات کا وقت قریب آرہا تھا، سہ پہر تھی[1] سینہ میں سانس کی گھرگھراہٹ محسوس ہوتی تھی، اتنے میں لبِ مبارک ہلے تو لوگوں نے یہ الفاظ سُنے[2]،

(الصّلوٰۃ و ما ملکت ایمانکم) نماز اور غلام،

پاس پانی کی لگن تھی، اس میں بار بار ہاتھ ڈالتے اور چہرہ پر ملتے، (چادر کبھی منہ پر ڈال لیتے، اور کبھی ہٹا دیتے تھے، اتنے میں) ہاتھ اٹھا کر انگلی سے اشارہ کیا، اور تین دفعہ) فرمایا'

بَل الرفیق الاعلیٰ، اوراب کوئی نہیں بلکہ وہ بڑا رفیق درکار ہے،

یہی کہتے کہتے ہاتھ لٹک آئے آنکھیں پھٹ کر چھت سے لگ گئیں، اور روح پاک عالم قدس میں پہنچ گئی[3]

اَللّٰھُمَّ صَلِّ علیہ و علیٰ آلہٖ واصحابہ صلوٰۃً کثیراً کثیراً

تجہیز و تکفین (تجہیز و تکفین کا کام دوسرے دن سہ شنبہ ۲ ربیع الاول کو شروع ہوا، اس تاخیر کے متعدد اسباب تھے،

(۱) عقیدتمندوں کو یقین نہیں آتا تھا، کہ حضور نے اس دنیا کو الوداع کہا، چنانچہ حضرت عمرؓ نے تلوار کھینچ لی، کہ جو یہ کہے گا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے وفات پائی اُس کا سر اڑا دونگا

(۱) ابن اسحاق نے سیرت میں لکھا ہو کہ وفات دوپہر کو ہوئی لیکن حضرت انس بن مالکؓ سے بخاری اور مسلم میں روایت ہے کہ آخر یوم یعنی دوشنبہ کے آخر وقت وفات فرمائی، حافظ ابن حجر نے دو روایتوں میں اسی طرح تطبیق دی ہو کہ دوپہر ڈھل چکی تھی، اور سہ پہر کا وقت تھا، (۲) ادب المفرد امام بخاری ص ۴۳ مصر، سنن ابی ماجہ کتاب الوصایا اور ابن سعد جزء الوفات بسند صحیح، (۳) یہ تمام واقعات صحیح بخاری ذکر وفات کے مختلف ابواب میں مذکور ہیں،

لیکن حضرت ابو بکرؓ آئے اور انھون نے تمام صحابہ کے سامنے خطبہ دیا کہ حضورؐ کا اس جہان سے تشریف لیجانا یقینی تھا، اور قرآن مجید کی آیتیں پڑھ کر سنائین، تو لوگوں کی آنکھین کھلیں اور اس ناگزیر واقعہ کا یقین آیا،

(۲) اسکے بعد اتنا وقت نہیں رہا تھا کہ غروب آفتاب سے پہلے تجہیز وتکفین سے پہلے فراغت ہو سکے

(۳) قبر کنی کا کام غسل وکفن کے بعد شروع ہوا، اس لئے دیر تک انتظار کرنا پڑا،

(۴) جس حجرہ میں آپنے وفات پائی تھی، وہیں لوگ علی الترتیب تھوڑے تھوڑے کر کے جاتے، اور نماز جنازہ ادا کرتے تھے، اسلئے بھی بڑی دیر لگی اور سہ شنبہ کا دن گذر کر رات کو فراغت ملی[1])

تجہیز وتکفین کی خدمت خاص اعزہ واقارب نے انجام دی فضل بن عباس اور اسامہ بن زیدؓ نے پردہ کیا، اور حضرت علیؓ نے غسل دیا، حضرت عباسؓ بھی موقع پر موجود تھے، اور بعض روایتوں میں ہر کہ انہی نے پردہ بھی کیا تھا، چونکہ اس شرف میں ہر شخص شریک ہونا چاہتا تھا اس لئے حضرت علیؓ نے اندر سے کواڑ بند کر لئے تھے، انصار نے دروازہ پر آواز دی کہ خدا کے لئے ہمارے حقوق کا بھی خیال رکھئے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت گذاری میں ہمارا بھی حصہ ہے، حضرت ابو بکرؓ نے جیسا کہ واقدی کا بیان ہے، فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں کسی کا حق نہیں ہے، اس لئے اگر سب کو اجازت دی گئی تو کام رہ جائے گا، لیکن (انصار کے اصرار پر) حضرت علیؓ نے اوس بن خولی انصاری کو جو اصحاب بدر میں تھے اندر بلا لیا، وہ پانی کا گھڑا بھر بھر کر لاتے تھے حضرت علیؓ

[1] ابن سعد وغیرہ کی بعض روایتوں میں ہے کہ چہار شنبہ کو تدفین ہوئی، لیکن یہ تمام تر کذب اور جھوٹ ہے، خود ابن سعد میں صحیح روایتیں یہ ہیں کہ سہ شنبہ کو تدفین ہوئی، البتہ چہار شنبہ کی شام شروع ہوگئی تھی، ابن ماجہ کی روایت ہے (کتاب الجنائز) فلما فرغوا من جھازہ یوم الثلثاء جب سہ شنبہ کے دن تجہیز وتکفین سے فرصت ہوئی

نے جسم مبارک کو سینہ سے لگا رکھا تھا، حضرت عباسؓ اور اُن کے دونوں صاحبزادے قثمؓ اور فضل جسم مبارک کی کروٹیں بدلتے تھے، اور اسامہ بن زیدؓ اوپر سے پانی ڈالتے تھے[1]

(کفن کے لئے پہلے جو کپڑا انتخاب کیا گیا تھا، وہ حضرت ابو بکرؓ کے صاحبزادے عبداللہ کے کی یمن کی بنی ہوئی ایک چادر تھی، لیکن بعد کو اتار لی گئی[2]) اور تین سوتی سفید کپڑے جو سحول کے بنے ہوئے تھے، کفن میں دیئے گئے، ان میں قمیص اور عمامہ نہ تھا[3]

(غسل وکفن کے بعد یہ سوال پیدا ہوا کہ آپ کو دفن کہاں کیا جائے، حضرت ابو بکرؓ نے کہا، نبی جس مقام پر وفات پاتا ہے، وہیں دفن بھی ہوتا ہے، چنانچہ نعش مبارک اٹھا کر اور بستر الٹ کر حجرۂ عائشہؓ میں اسی مقام پر قبر کھودنا تجویز ہوا[4] حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ آپ کو کسی میدان میں اسلئے دفن نہیں کیا گیا کہ آخری لمحوں میں آپ کو یہ خیال تھا کہ لوگ فرط عقیدت سے میری قبر کو بھی عبادتگاہ نہ بنالیں، میدان میں اس کی دار وگیر مشکل تھی[5] اس لیے حجرہ کے اندر دفن کیا گیا)

مدینہ میں دو صاحب قبر کھودنے میں ماہر تھے، حضرت ابو عبیدہ جراحؓ اور ابو طلحہ حضرت ابو عبیدہؓ اہل مکہ کے دستور کے مطابق صندوقی قبر کھودتے تھے، اور ابو طلحہؓ مدینہ کے رواج کے مطابق لحدی، لوگوں میں اختلاف پیش آیا کہ کس قسم کی قبر کھودی جائے، حضرت عمرؓ نے

---

[1] طبقات ابن سعد صفحہ ۶۲ و ۶۳، جزء الوفات طبری (مختصراً) ابوداؤد کتاب الجنائز میں بھی ان صاحبوں کے نام ہیں، نیز ابن ماجہ کتاب الجنائز) [2] صحیح مسلم صفحہ ۲۰ کتاب الجنائز) [3] صحیح بخاری ومسلم و ابوداؤد کتاب الجنائز [4] ابن سعد جزء الوفات بروایات صحیحہ و ابن ماجہ کتاب الجنائز ذکر وفات نبوی [5] صحیح بخاری کتاب الجنائز باب الوفات

کہا اختلاف مناسب نہیں دونوں صاحبوںؓ کے پاس آدمی بھیجا جائے، جو پہلے آجائے، لوگوں نے اس رائے کو پسند کیا، چنانچہ حضرت عباسؓ نے دونوں صاحبوں کے پاس آدمی بھیجے، اتفاق یہ کہ حضرت ابو عبیدہؓ گھر پر موجود نہ تھے، ابو طلحہؓ آئے اور ان ہی نے مدینہ کے رواج کے مطابق قبر کھودی، جو لحدی یعنی بغلی تھی، چونکہ زمین نم تھی اس لئے جس بستر پر آپنے وفات پائی تھی، وہ قبر میں بچھا دیا گیا،

جنازہ تیار ہو گیا تو لوگ نماز کے لئے ٹوٹے (جنازہ حجرہ کے اندر تھا، باری باری سے لوگ تھوڑے تھوڑے کر کے جاتے تھے،) پہلے مردوں نے پھر عورتوں نے، پھر بچوں نے نماز پڑھی لیکن کوئی امام نہ تھا، [۲]

جسم مبارک کو حضرت علیؓ، فضل بن عباسؓ، اسامہؓ بن زید اور حضرت عبدالرحمانؓ بن عوف نے قبر میں اتارا، [۳]

(۱) ابن ماجہ کتاب الجنائز) [۲] ابن سعد بروایت صحیحہ جزالوفات ([۳] ابوداؤد کتاب الجنائز، ابن ماجہ اور ابن سعد میں اسامہؓ بن زید اور حضرت عبدالرحمنؓ بن عوف کے بجائے قثم بن عباسؓ اور شقران (غلام خاص) کے نام ہیں، ارباب نظر جانتے ہیں کہ ان دو روایتوں میں ترجیح کس کو ہو سکتی ہے)

متروکات

آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے جب انتقال فرمایا تو آپ نے مقبوضات و جائداد میں سے کیا کیا چیزیں ترکہ میں چھوڑیں؟ اس سوال کا جواب تو یہ ہے کہ آپ خود اپنی زندگی میں اپنے پاس کیا رکھتے تھے، جو مرنے کے بعد چھوڑ جاتے، اور اگر کچھ تھا بھی تو اس کے متعلق عام اعلان فرما چکے تھے،

لانورث ماترکنا صدقة[1]،	ہم انبیا کا کوئی وارث نہیں ہوتا جو چھوڑا وہ عام مسلمانوں کا ہے

حضرت ابوہریرہ رض کی روایت ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میرے وارث اشرفی بانٹ کر نہیں پائیں گے یعنی نہ ہوگی نہ پائیں گے، چنانچہ یاد ہوگا کہ وفات کے وقت چند دینار حضرت عائشہ رض کے پاس امانت تھے، آپ نے اسی وقت نکلوا کر خیرات کرا دیئے،

عمرو بن حویرث سے جو ام المومنین جویریہ رض کے بھائی تھے، بخاری میں روایت ہے،

ماترک رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مرتے وقت کچھ نہ چھوڑا،
عند موته درهما ولا دينارا ولا	نہ درہم، نہ دینار، نہ غلام، نہ لونڈی، اور نہ کچھ اور
عبدا ولا امة ولا شيئا الا بغلته	صرف اپنا سفید خچر اور ہتھیار، اور کچھ زمین جو
البيضاء وسلاحه وارضا جعلها صدقة[2]	عام مسلمانوں پر صدقہ کر گئے،

ابوداؤد میں حضرت عائشہ رض کی روایت ہے،

---

[1] یہ فقرہ تمام حدیث کی کتابوں میں ہے، بخاری میں متعدد مقامات میں ہے، کتاب الوصایا، کتاب الفرائض، باب فرض الخمس [2] صحیح بخاری کتاب الوصایا،

ماترک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دینارًا ولا درھمًا ولا بعیرًا ولا شاۃً، | آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ دینار چھوڑا، نہ درہم، نہ اونٹ، نہ بکری،

بہرحال متروکات میں اگر تھیں تو یہی تین چیزیں تھیں، کچھ زمین، سواری کے جانور اور ہتھیار۔

زمین حضرت عمرو بن حویرثؓ نے جس زمین کا ذکر کیا ہے، وہ مدینہ، خیبر اور فدک کے چند باغ تھے، مدینہ کی جائداد سے بنونضیر کی جائداد مراد ہے یا مخیریق نام ایک یہودی نے ۳ھ میں (غزوۂ اُحد کے موقع پر) آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو چند باغ وصیۃً ہبہ کئے تھے، وہ مراد ہیں، لیکن صحیح روایتوں سے ثابت ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے یہ باغ اسی وقت مستحقین کو تقسیم کر دیئے تھے[۱]،

فدک اور خیبر کی نسبت ابتدا ہی سے شیعہ اور اہل سنّت میں اختلاف ہے، شیعہ کہتے ہیں کہ یہ آپ کی ذاتی جائداد تھی، اور وراثت کے طور پر اہل بیت میں تقسیم ہونی چاہیے تھی، اہلسنت کہتے ہیں کہ یہ بطور ولایت اسلامی آپ کے قبضہ میں تھی، اور ذاتی ہو بھی تو آپ نے خود فرما دیا تھا کہ "ہمارا جو ترکہ ہو، وہ صدقہ ہے"،

اصل یہ ہے کہ یہ اختلاف خود صحابہ کے وقت میں پیدا ہو چکا تھا، حضرت عباسؓ (آپ کے چچا) حضرت فاطمہؓ (صاحبزادی) اور اکثر ازواج مطہرات[۲] مدعی تھیں کہ اس جائداد کو بطور وراثت تقسیم ہونا چاہیے، حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ اور دیگر اکابر صحابہ نے کہا کہ یہ وقف عام ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خود اپنی زندگی میں جس طرح اور جن مصارف میں انکی آمدنی صرف کرتے تھے اسمیں تغیر نہ ہوگا، آنحضرت

(۱) بخاری باب فرض الخمس میں ہے وصدقتہ بالمدینۃ یہ ان ہی باغوں کے متعلق ہے، تفصیل کیلئے فتح الباری ج ۶ صفحہ ۱۴۰ دیکھو، نیز صحیح بخاری میں کتاب المغازی ذکر بنونضیر (۲) صحیح بخاری کتاب الفرائض (۳) یہ صحیح بخاری کے متعدد ابواب میں مذکور ہے، دیکھو کتاب الفرائض)

صلی اللہ علیہ وسلم، نے اپنے زمانۂ حیات میں ان تینوں جائدادوں کی آمدنی مختلف مدوں میں متعین کردی تھی، بنو نضیر کی جائداد کی آمدنی ناگہانی ضروریات کے لئے مخصوص تھی، فدک کی آمدنی مسافروں کے لئے وقف تھی، خیبر کی آمدنی کو آپ تین حصوں میں تقسیم فرماتے تھے، دو حصے عام مسلمانوں کے لئے تھے، ایک حصہ ازواج مطہرات کو سالانہ مصارف کے لئے ملتا تھا، اس میں سے بھی جو بچ جاتا وہ غریب مہاجرین کی اعانت میں کام آتا،[۱] آخر میں حضرت عمرؓ نے اپنے زمانۂ خلافت میں حضرت علیؓ اور حضرت عباسؓ کے اصرار پر مدینہ کی جائداد ان دونوں کی تولیت میں دیدی تھی لیکن حضرت علیؓ نے اس پر قبضہ کر لیا تھا، خیبر اور فدک حضرت عمرؓ بن عبدالعزیز کے زمانہ تک خلفاء کے ہاتھ میں رہے[۱]،

جانور ارباب سیر نے آپکے اسپ خاصہ اور مویشی اور دواب کی تفصیل اس طرح لکھی ہے، جس سے ایک والیِ ملک کے اصطبل اور دواب خانہ کا دھوکا ہوتا ہے،

طبری نے ان تمام جانوروں کے نام اور حالات تفصیل سے لکھے ہیں، اور اگر وہ قابلِ اعتبار ہوتے تو حقیقت میں نہایت دلچسپ تھے، لیکن اس کے متعلق طبری کی جس قدر روایتیں ہیں، سب بلا استثناء واقدی سے ماخوذ ہیں، پچھلے مصنفین جن میں بڑے بڑے محدثین ہیں، مثلاً یعمری، مغلطائی، حافظ عراقی وغیرہ نے بھی یہ تفصیل لکھی ہے، اور چونکہ یہ مصنفین اکثر سلسلۂ سند نہیں لکھتے، اس لئے اکثر لوگ اُن کے مستند ہونے کی بنا پر اس واقعہ کو صحیح خیال کرتے ہیں لیکن جب تفتیش کیجاتی ہو تو معلوم ہوتا ہو کہ اس قسم کی تمام روایتوں کا سلسلۂ سند واقدی سے آگے نہیں بڑھتا،

[۱] سنن ابی داؤد، باب صفایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم [۲] حوالۂ مذکورہ حضرت عمرؓ بن عبدالعزیز نے باغ فدک سادات کو دے دیا تھا)

حضرت عائشہؓ کی روایت اوپر گذر چکی ہے،

ماترک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دینارًا — آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ دینار چھوڑا،

ولا درھما ولا بعیرا ولا شاۃ — نہ درہم، نہ اونٹ نہ بکری)

صحیح بخاری (کتاب الجہاد) میں عمرو بن حویرث (ام المومنین جویریہ کے بھائی تھے) سے روایت ہے،

ماترک النبی صلی اللہ علیہ وسلم الا بغلتہ — آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ نہیں چھوڑا، بجز

البیضا وسلاحہ وارضا ترکھا صدقۃ — اپنے سفید خچر اور ہتھیار، اور ایک زمین کے جو

ان روایتوں سے معلوم ہوگا، کہ متروکاتِ خاصہ میں صرف ایک جانور تھا، ان صحیح اور مسلّم روایات کے ہوتے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اسباب اور دواب کی اتنی بڑی فہرست جو طبری وغیرہ نے درج کی ہے، اور جو ایک تاجدار سلطنت کے شایانِ حال ہے، کیونکر تسلیم کی جا سکتی ہے،

احادیث صحیحہ کے استقراء سے اس قدر ضرور ثابت ہوتا ہے کہ عمرو بن حویرثؓ کی مختصر فہرست سے زائد چیزیں بھی آپ کے قبضہ میں آئیں لیکن اس سے عمرو کی روایت پر اثر نہیں پڑ سکتا، کیونکہ عمرو صرف اس بات کے مدعی ہیں، کہ وفات کے وقت یہی سرمایہ تھا، ممکن ہے کہ یہ چیزیں وفات سے پہلے آپ نے حسب عادت ہبہ یا خیرات کر دی ہوں بہر حال (از روے روایاتِ صحیحہ مختلف اوقات میں) حسب ذیل جانور آپ کے دائرہ ملک میں آئے،

لخیف: ایک گھوڑا جو ابی بن عباس کے باغ میں بندھا تھا، بخاری نے کتاب الجہاد میں اس کا ذکر کیا ہے،

عفیرہ ایک گدھا تھا حضرت معاذؓ کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ کو اپنے ساتھ اس پر بٹھایا تھا

(بخاری کتاب الجہاد)

عضباء، وقصواء، نہایت تیز رو اونٹنی تھی، قصواء بھی اسی کا نام ہے (طبری ص ۴۰۰،) آپ نے اسی کو آپ نے ہجرت کے وقت حضرت ابوبکرؓ سے خریدا تھا، اور اسی پر سوار ہو کر آپ نے ہجرت فرمائی تھی، اور مدینہ پہنچکر حضرت ابو ایوبؓ کے مکان کے پاس جا کر بیٹھ گئی تھی،[۱] حجۃ الوداع کا خطبہ بھی آپ نے اسی کی پشت پر دیا تھا،[۲] یہ ہر معرکہ میں بازی لیجاتی تھی، ایک دفعہ ایک بدو باہر سے آیا، اسکی سواری میں ایک اونٹ تھا، جو ابھی جوان بھی نہیں ہوا تھا، عضباء کا اس سے مقابلہ ہوا، اور وہ آگے نکل گیا، صحابہ کو ملال ہوا، آپ نے فرمایا کہ "یہ خدا کا فرض ہو کہ دنیا کی کوئی چیز جب سر اٹھائے تو اس کو پست کر دے"[۳] (بخاری باب الجہاد)

تیہ: دُلدل جس کا ذکر اکثر روایتوں میں ہے اسی خچر کا نام ہے، جس کا ذکر عمرو بن حریثؓ کی روایت میں ہے چنانچہ بخاری کے شارحین نے تصریح کی ہے، یہ خچر مقوقس مصری نے آپ کو تحفہ میں بھیجا تھا، صحیح بخاری میں ہے کہ ابن العلماء (رئیس ایلہ) نے بھی آپ کو ایک سفید خچر غزوۂ تبوک کے موقع پر تحفۃً بھیجا تھا،[۴]

غزوۂ حنین میں جس سفید خچر پر آپ سوار تھے، وہ فردہ بن نفاثہ جذامی نے ہدیۃً بھیجا تھا، ارباب سیر نے اس خچر کو دُلدل سمجھا ہے لیکن یہ غلط ہے[۵] صحیح مسلم میں اسکی تصریح موجود ہے،

اسلحہ — اس زہد و قناعت کے ساتھ جہاد کی ضرورت سے توشہ خانۂ مبارک میں حسب ذیل سامان تھا، نو عدد تلواریں تھیں جن کے نام یہ ہیں، ماثور، عضب، ذوالفقار، قلعی، بتار، حتف، مخذم، قضیب،

[۱] صحیح بخاری ذکر ہجرت [۲] صحیح مسلم و ابوداؤد ذکر حجۃ الوداع [۳] کتاب الجہاد بغلۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم [۴] فتح الباری ذکر غزوۂ حنین، جلد ۸ ص ۲۲، [۵] باب غزوۂ حنین،

ماثور، والد ماجد سے میراث میں ملی تھی، ذوالفقار بدر میں ہاتھ آئی تھی تلوار کا قبضہ چاندی کا تھا، فتح مکہ میں جو تلوار آپ کے ہاتھ میں تھی، اس کا قبضہ زرین تھا، سات زرہیں تھیں، ذات الفضول ذات الوشاح، ذات الحواشی، سعدیہ، فضہ، تبراء، خرنق، ذات الفضول وہی زرہ تھی جو تیس صاع پر ایک یہودی کے ہاں سال بھر کے لئے آپ نے رہن رکھی تھی، زرہیں سب لوہے کی تھیں، اگرچہ عرب میں چمڑے کی زرہیں بھی ہوتی تھیں،

چھ کمانیں تھیں، زوراء، روحاء، صفراء، بیضا، کتوم، شداد، کتوم وہ کمان تھی، جو غزوۂ احد میں ٹوٹ گئی تھی، اور آپ نے قتادہ کو دیدی تھی، ایک ترکش تھا جس کو کافور کہتے تھے، چمڑے کی ایک پیٹی تھی، جس میں چاندی کے تین حلقے تھے، لیکن ابن تیمیہ نے لکھا ہو کہ کسی حدیث سے مجھکو یہ نہیں پتہ لگا کہ آپ نے کبھی پیٹی لگائی بھی تھی، ایک ڈھال تھی جس کا نام زلوق تھا، پانچ برچھیاں تھیں، لوہے کا ایک مغفر تھا، جس کا نام موشح تھا، ایک اور مغفر تھا، جس کو سبوغ کہتے تھے تین جبے تھے، جن کو آپ لڑائی میں پہنتے تھے، کہتے ہیں کہ ان میں سے ایک دیبائے سبز کا تھا، ایک سیاہ علم تھا، جس کا نام عقاب تھا، اور بھی زرد و سفید علم تھے،

آثار متبرکہ (ان متروکات کے علاوہ بعض یادگاریں بھی تھیں، جو لوگوں نے تبرکاً اپنے پاس رکھ چھوڑی تھیں، حجۃ الوداع کے موقع پر آپ نے عقیدتمندوں کو موئے مبارک عطا فرمائے تھے، جو زیادہ تر حضرت ابو طلحہ انصاریؓ کے ہاتھ آئے تھے[۲] حضرت انسؓ بن مالک کے پاس بھی موئے مبارک تھے[۳] ان کے پاس دو چیزیں اور تھیں نعلین مبارک اور ایک لکڑی کا ٹوٹا ہوا پیالہ جو چاندی کے تاروں سے

---

[۱] صحیح بخاری کتاب البیوع و کتاب الرہن (۲) صحیح مسلم حجۃ الوداع (۳) صحیح بخاری کتاب الطہارت،

جوڑ دیا گیا تھا، ذوالفقار جو حضرت علیؓ کے پاس تھی، اُن کے بعد اُن کے خاندان میں یادگار رہی امام حسینؓ کی شہادت کے بعد وہ حضرت علی بن حسینؓ کے ہاتھ آئی بعض صحابہ نے آکر اُن کی خدمت میں عرض کی کہ مجھے ڈر ہے کہ کہیں یہ یادگار آپ سے نہ چھن جائے، اگر مجھے عنایت ہو تو یہ میری جان کے ساتھ رہے لیکن انھوں نے یہ ایثار گوارا نہ کیا،

حضرت عائشہؓ کے پاس آپکے وہ کپڑے تھے جن میں آپنے انتقال فرمایا تھا[۱]، استحقاقِ خلافت کی بنا پر خاتم (مہر) اور عصائے مبارک جن کا احادیث میں ذکر ہے، پہلے حضرت ابو بکرؓ پھر حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کے قبضہ میں آئے لیکن ان ہی کے عہد میں یہ دونوں چیزیں ضائع ہو گئیں، انگوٹھی تو حضرت عثمانؓ کے ہاتھ سے ایک کنوئیں میں گر گئی، اور عصائے مبارک کو جہجاہ غفاریؓ نے توڑ ڈالا،

(امام بخاری نے ان آثار مبارکہ کے ذکر کے لئے ایک خاص باب باندھا ہے،)

مسکن مبارک (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم) کمسن تھے کہ والدین کا سایہ سر سے اٹھ گیا، اپنے دادا اور چچا کے گھروں میں پرورش پائی اور یہیں سن رشد کو پہنچے پچیس سال کی عمر میں حضرت خدیجہؓ سے شادی کی، یہ یقینی طور پر نہیں معلوم کہ اس کے بعد آپ نے اپنے موروثی مکان میں اقامت فرمائی یا حضرت خدیجہؓ ہی کے گھر رہے، لیکن آپکے حصہ کا ایک پدری مکان مکہ میں موجود تھا، جس پر عقیل نے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چچازاد بھائی اور حضرت علیؓ کے حقیقی بھائی تھے اور اس وقت تک مسلمان نہیں ہوئے تھے قبضہ کر لیا تھا، چنانچہ فتح مکہ کے موقع پر جب آپ مکہ تشریف لائے تو لوگوں نے پوچھا کہ یا رسول اللہ!

[۱] (ان تمام آثار مذکورۂ بالا کا ذکر صحیح بخاری کتاب الخمس میں ہے [۲] خاتم کا ذکر کتاب الخمس کے علاوہ بخاری کتاب اللباس میں ہے، عصائے مبارک کا حال فتح الباری جلد ۶ صفحہ [illegible] سے ماخوذ ہے) س

آپ کہاں قیام فرمائیں گے؟ کیا اپنے دولتخانہ پر ٹھہریں گے؟ آپنے فرمایا، عقیل نے ہمارے لئے گھر کہاں چھوڑا ہے؟[1]

مدینہ منورہ میں تشریف آوری کے بعد چھ مہینے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابوایوب رضی اللہ عنہ انصاری کے گھر قیام فرما رہے، اس اثنا میں آپ تنہا تھے، اہل و عیال مکہ ہی میں تھے، جب آپنے مسجد نبوی کی بنیاد ڈالی تو اسی کے اطراف میں چھوٹے چھوٹے حجرے تیار فرمائے، اور اس وقت آپنے آدمی بھیجکر مکہ سے اہل و عیال کو بلوایا، اور ان ہی حجروں میں اتارا۔[2]

آخر ایام میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نو بیویاں تھیں، اور الگ الگ حجروں میں رہتی تھیں، جن میں نہ صحن تھا نہ دالان تھے، نہ ضرورت کے الگ الگ کمرے تھے، ہر حجرہ کی وسعت عموماً چھ سات ہاتھ سے زیادہ نہ تھی، دیواریں مٹی کی تھیں، جو اس قدر کمزور تھیں کہ ان میں شگاف پڑ گیا تھا، ان سے اندر دھوپ آتی تھی، چھت کھجور کی شاخوں اور پتیوں سے چھائی تھی، بارش سے بچنے کے لئے بال کے کمبل لپیٹ دیئے جاتے تھے، بلندی اتنی تھی کہ آدمی کھڑا ہو کر چھت کو ہاتھ سے چھو سکتا تھا، گھر کے دروازوں پر پردہ یا ایک پٹ کا کواڑ ہوتا تھا،[3]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ باری باری سوا ایک شب ایک حجرہ میں بسر فرماتے تھے، دن کو عموماً اصحاب کی مجلس میں تشریف رکھتے جو گویا ان حجروں کا صحن یا گھر کی مردانہ نشستگاہ تھی"

ان حجروں کے علاوہ ایک بالاخانہ بھی تھا، جس کو احادیث میں "مشربہ" کہا گیا ہے، ۹ھ میں جب آپنے ایلاء کیا تھا، اور نیز گھوڑے پر سے گر کر چوٹ کھائی تھی، تو ایک مہینہ اسی پر اقامت فرمائی تھی[4]

---

(۱) بخاری فتح مکہ (۲) ابن سعد (۳) یہ پوری تفصیل ادب المفرد بخاری، باب التطاول فی البنیان فی البناء میں ہے) (۴) ابوداؤد، باب امامۃ القاعد،

اس بالاخانہ پر سامانِ آرائش کیا تھا، ایک چٹائی کا بستر، چمڑے کا ایک تکیہ جس میں کھجور کی چھال بھری ہوئی تھی، اور ادھر اُدھر چند کھالیں لٹکی ہوئی تھیں[۱]

کاشانۂ نبوت گو انوارِ الٰہی کا مظہر تھا، تاہم اس میں رات کو چراغ تک نہیں ہوتا تھا[۲] گھر کی دنیاوی اور ظاہری آرائش بھی پسندِ خاطر نہ تھی، ایک بار حضرت عائشہؓ نے دیوار دن دار پر دھاری دار رنگین کپڑے منڈھے تو آپ سخت ناراض ہوئے، اور فرمایا ہم کو اینٹ اور پتھر کو لباس پہنانے کے لئے مال نہیں دیا گیا ہے[۳]

یہ حجرہ ہائے مبارک آپ کی وفات کے بعد ازواجِ مطہراتؓ کے قبضہ میں رہے، ان میں جب کسی کا انتقال ہو جاتا، تو وہ حجرہ ان کے اعزہ کی ملکیت میں چلا جاتا، جن سے حضرت معاویہؓ نے اپنے زمانۂ خلافت میں اکثر حجروں کو خرید لیا تھا[۴]

حضرت عمرؓ کے عہد تک یہ تمام حجرے اپنے حال پر قائم رہے، حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں بعض حجرے توڑ کر مسجد نبویؐ میں داخل کر لئے گئے، تاہم ولید بن عبدالملک کے زمانہ تک بہت سے حجرے باقی تھے ۸۸ھ میں جب حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ مدینہ کے والی تھے، تمام حجرے بجز حجرۂ عائشہؓ کے کہ وہ مدفنِ نبوی ہے، توڑ کر مسجد نبوی میں ملا دیے گئے، جس دن یہ حجرے ٹوٹے ہیں، تمام مدینہ میں کہرام مچا ہوا تھا کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک اور یادگار مٹ گئی[۵]

دایہ | آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جو ترکہ والد سے ملا تھا، اس میں ایک حبشیہ کنیز بھی تھیں جن کا نام امِ ایمنؓ تھا،

---

[۱] صحیح بخاری ص ۸۷۶، باب ماکان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یتجوز من اللباس والبسط [۲] صحیح بخاری جلد ۱ ص ۳، باب التطوع خلف المرأۃ [۳] ابو داود جلد ۲ ص ۱۱۹، کتاب اللباس باب فی الصور [۴] ابن سعد جزء نساء [۵] ابن سعد جزء ازواج النبی صلی اللہ علیہ وسلم،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی انا یا دایہ وہی تھیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات تک زندہ رہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ اُن کو ماں کہکر پکارتے تھے، اور جب اُن کو دیکھتے تو فرمایا کرتے کہ اب یہی میرے خاندان کی یادگار رہ گئی ہیں[۱]، جب آپنے حضرت خدیجہؓ سے عقد کیا تو اُن کو آزاد کرکے حضرت زیدؓ سے جو آپکے متبنی اور محبوب خاص اور حضرت خدیجہؓ کے غلام تھے، شادی کردی اسامہؓ اُنہی کے بطن سے تھے،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مزاح کا واقعہ جو کتابوں میں منقول ہے، کہ ایک عورت نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک اونٹ مانگا، آپنے فرمایا، میں اونٹ کا بچہ دونگا، بولی کہ بچہ لیکر کیا کرونگی، آپنے فرمایا کہ "جتنے اونٹ ہیں، اونٹ کے بچے ہی ہوتے ہیں"، ان ہی کا واقعہ ہے،

یہ اکثر غزوات میں شریک رہیں، جنگ احد میں سپاہیوں کو پانی پلاتیں اور زخمیوں کی مرہم پٹی کرتیں، جنگ خیبر میں بھی شریک تھیں[۲]،

خدام خاص، صحابہ میں سے بعض عقیدتمند ایسے تھے، جو دنیا کے سب کام کاج چھوڑکر ہمہ وقت خدمتِ اقدس میں حاضر رہتے، اور خاص خاص کام انجام دیتے، اُن کے نام حسب ذیل ہیں:

۱۔ حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ مشہور صحابی ہیں، فقہ حنفی کے بانی اول گویا وہی ہیں، امام ابو حنیفہ کی فقہ کا سلسلہ ان ہی کی روایات و استنباطات پر منتہی ہوتا ہے، مکہ معظمہ میں قرآن مجید کی اشاعت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ابتدائی زمانہ میں ان ہی نے کی، ستر سورتیں خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک سے سُن کر یاد کی تھیں،

یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے رازدار بھی تھے، اور جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سفر میں جاتے تو خوابگاہ

[۱] صحیح مسلم باب رد المہاجرین الی الانصار منائحھم [۲] یہ تمام حالات طبقات ابن سعد جزء ثامن تذکرہ ام ایمن سے ماخوذ ہیں،

وضو اور مسواک کا اہتمام ان ہی کے متعلق ہوتا، جب آپ مجلس سے اٹھتے تو جوتیاں پہناتے، راہ میں آگے آگے عصا لیکر چلتے، جب آپ کہیں کسی مجلس میں جاکر بیٹھتے تو نعلین مبارک اُتار کر بغل میں رکھ لیتے، پھر اُٹھنے کے وقت سامنے لاکر رکھ دیتے، جلوت وخلوت میں ساتھ رہتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق وعادات کا نمونہ بن گئے تھے[1]

۲۔ حضرت بلال رضی۔ دنیا اُن کو موذن کے لقب سے جانتی ہے (یہ حبشی نژاد غلام تھے، مکہ میں ایمان لائے تھے، اور جس جوش وخروش سے ایمان لائے تھے، اس کا مختصر ذکر آغاز کتاب میں گذر چکا ہے، حضرت ابوبکر رضی نے اُن کو خرید کر آزاد کرا دیا تھا، اس وقت سے برابر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں رہے) آپ کا خانگی انتظام ان ہی کے سپرد تھا، بازار سے سودا سلف لانا، قرض دام لینا پھر ادا کرنا، مہمانوں کے کھانے پینے کا انتظام کرنا، یہ تمام باتیں ان ہی سے متعلق تھیں[2]

۳۔ حضرت انس رضی بن مالک بھی آپ کے خادم خاص تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ تشریف لائے تو وہ نہایت کمسن تھے، اُن کی ماں خدمتِ اقدس میں اُن کو لائیں، اور عرض کی کہ "یارسول اللہ! یہ میرا بیٹا ہے لائی ہوں کہ خدمت گذاری کرے"[3]

حضرت انس رضی نے دس برس تک آپ کی خدمت کی، لوگوں کے پاس آنا جانا، چھوٹے چھوٹے کام کرنا، وضو کا پانی لانا، اُن کے فرائض تھے، چونکہ ابھی کمسن تھے، اُن سے کام بن نہیں آتے تھے لیکن آپ نے اُن سے کبھی بازپرس نہ فرمائی،[4]

---

[1] پوری تفصیل طبقات ابن سعد میں ہے (مجملاً بخاری باب مناقب عبداللہ بن مسعود میں بھی یہ مذکور ہے [2] ابوداؤد جلد ۲ ص ۲، باب قبول ہدایا المشرکین [3] صحیح مسلم فضائل انس رضی [4] ابوداؤد کتاب الادب)

شمائل

شکل ولباس وطعام و مذاقِ طبیعت

حلیۂ اقدس

حلیۂ اقدس آپ میانہ قد اور موزون اندام تھے، رنگ سفید سُرخ تھا، پیشانی چوڑی، اور ابرو پیوستہ تھے، بینی مبارک درازی مائل تھی، چہرہ ہلکا یعنی بہت پُرگوشت نہ تھا، دہانہ کشادہ تھا، دندانِ مُبارک بہت پیوستہ نہ تھے، گردن اونچی، سر بڑا، اور سینہ کشادہ اور فراخ سر کے بال نہ بہت پیچیدہ تھے، نہ بالکل سیدھے تھے، ریشِ مبارک گھنی تھی، چہرا کھڑا کھڑا تھا، آنکھیں سیاہ و سُرمگیں، اور پلکیں بڑی بڑی تھیں، شانے پُرگوشت اور مونڈھوں کی ہڈیاں بڑی تھیں، سینۂ مُبارک میں ناف تک بالوں کی ہلکی تحریر تھی، شانوں اور کلائیوں پر بال تھے ہتھیلیاں پُرگوشت اور چوڑی، کلائیاں لمبی اور پاؤں کی ایڑیاں نازک اور ہلکی تھیں، پاؤں کے تلوے بیچ سے ذرا خالی تھے، نیچے سے پانی نکل جاتا تھا،[1]

(صحابہ پر آپ کے حسن وخوبروئی کا بہت اثر پڑتا تھا، حضرت عبد اللہ بن سلام جو پہلے یہودی تھے، پہلے پہل جب چہرۂ اقدس پر اُن کی نظر پڑی ہے تو بولے خدا کی قسم یہ جھوٹے کا چہرہ نہیں"،[2] جابر بن سمرہ ایک صحابی ہیں، اُن سے کسی نے پوچھا آپ کا چہرہ تلوار سا چمکتا تھا بولے "نہیں ماہ وخورشید کی طرح"،[3] یہی صحابی روایت کرتے ہیں، کہ ایک شب کو جب

[1] یہ حلیہ بہ تفصیل شمائل ترمذی ومسند ابن حنبل جلد ا ص ۱۱۶ و ۱۱۷ میں اور مختصراً بخاری ومسلم باب صفۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم میں بھی ہے [2] ترمذی ابواب الزہد صفحہ ۴۰۹ [3] مشکوٰۃ باب صفۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم بحوالہ مسلم،

مطلق ابر نہ تھا، اور چاند نکلا تھا، میں کبھی آپ کو دیکھتا کبھی چاند کو دیکھتا تھا، تو آپ مجھے چاند سے زیادہ خوبرو معلوم ہوتے تھے،[1] حضرت براءؓ صحابی کہتے ہیں، کہ میں نے کسی جوڑے والے کو سرخ (خط) کے لباس میں آپ سے زیادہ خوبصورت نہیں دیکھا،[2]

آپ کے پسینہ میں ایک طرح کی خوشبو تھی،[3] چہرہ مبارک پر پسینہ کے قطرے موتی کی طرح ڈھلکتے تھے[4] جسم مبارک کی جلد نہایت نرم تھی، حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ آپ کا رنگ نہایت کھلتا تھا، آپ کا پسینہ موتی معلوم ہوتا تھا، میں نے دیبا اور حریر بھی آپ کی جلد سے زیادہ نرم نہیں دیکھے، اور مشک و عنبر میں بھی آپ کے بدن سے زیادہ خوشبو نہ تھی،[5]

عام طور پر مشہور ہے کہ آپ کے سایہ نہ تھا، لیکن اس کی کوئی سند نہیں ہے،

مہر نبوت

شانوں کے بیچ میں کبوتر کے انڈے کے برابر خاتم نبوت تھی، یہ بظاہر سرخ ابھرا ہوا گوشت سا تھا، (صحیح مسلم اور) شمائل ترمذی میں حضرت جابر بن سمرہؓ سے روایت ہے،

رأیت الخاتم بین کتفی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غدۃ حمراء مثل بیضۃ الحمامۃ،[6]	میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دونوں شانوں کے بیچ میں خاتم کو دیکھا جو کبوتر کے انڈے کے برابر سرخ غدود تھا

(لیکن ایک اور روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ بائیں شانہ کے پاس چند مسوں کی مجموعی ترکیب سے ایک مستدیر شکل پیدا ہوگئی تھی، اسی کو مہر نبوت کہتے تھے،[7] تمام صحیح روایات کی تطبیق ہے

(۱) مشکوٰۃ باب مذکور بحوالہ ترمذی و دارمی (۲) صحیح مسلم باب مذکور (۳) ایضاً (۴) بخاری جلد اول (۵) مشکوٰۃ باب مذکور بحوالہ بخاری ومسلم (۶) صحیح مسلم (باب اثبات النبوۃ) (۷) مشہور ہو گیا ہے کہ پشت پر جو خاتم نبوت تھی اس میں یا مدتی طور پر کلمہ طیبہ تحریر تھا یہ بالکل بے سند بات ہے، احادیث سے اس کا کوئی ثبوت نہیں، محدثین نے تصریح کردی ہے کہ ان میں جو بعض روایتیں باطل اور بہت ہی ضعیف ہیں، حافظ ابن حجر فرماتے ہیں "لم یثبت منہا شیئ"، زرقانی بر مواہب جلد اول ص ۱۵۴) البتہ کلمہ اس نقرئی خاتم میں منقوش تھا، جو انگشت مبارک میں خطوط پر مہر کرنے کی غرض سے آپ پہنا کرتے تھے، لوگوں نے غلطی سے اس کو خاتم نبوت کی طرف منسوب کردیا ہے

یہ ثابت ہوتا ہے کہ دونوں شانوں کے درمیان ایک ذرا ابھرا ہوا گوشت کا حصہ تھا جس پر تل تھے اور بال اُگے ہوئے تھے،

موئے مُبارک

سر کے بال اکثر شانے تک لٹکے رہتے تھے، فتح مکہ میں لوگوں نے دیکھا تو شانوں پر چار گیسو پڑے تھے،

مشرکین عرب بالوں میں مانگ نکالتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ کفار کے مقابلہ میں اہل کتاب کی موافقت پسند کرتے تھے، ابتدا میں آپ بھی اہل کتاب کی طرح بال چھوٹے ہوئے رکھتے تھے پھر مانگ نکالنے لگے، یہ شمائل ترمذی کی روایت ہے، معلوم ہوتا ہے کہ جب مشرکین کا وجود نہ رہا تو اُن کی مشابہت کا احتمال بھی جاتا رہا۔ اخیر اخیر زمانہ میں مانگ نکالنے لگے،

(بالوں میں اکثر تیل ڈالتے تھے، اور ایک دن بیچ کنگھی کرتے تھے، ریش مبارک میں گنتی کے چند بال سفید ہونے پائے تھے،)

رفتار

رفتار بہت تیز تھی، چلتے تھے تو معلوم ہوتا تھا کہ ڈھلوان زمین پر اتر رہے ہیں، ضعیف روایتوں میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سایہ نہ تھا یعنی زمین پر جسم اقدس کا سایہ نہیں پڑتا تھا لیکن محدثین کے نزدیک یہ روایتیں صحت سے خالی اور ناقابلِ اعتبار ہیں،

گفتگو

گفتگو اور خندہ و تبسم

گفتگو نہایت شیریں اور دلآویز تھی، بہت ٹھہر ٹھہر کر گفتگو فرماتے تھے ایک ایک فقرہ الگ ہوتا کہ سننے والوں کو یاد رہ جاتا، معمول تھا کہ ایک ایک بات کو تین تین دفعہ فرماتے، جس بات پر زور دینا ہوتا بار بار اس کا اعادہ فرماتے، حالت گفتگو میں اکثر نگاہ آسمان کی طرف ہوتی تھی، آواز بلند تھی، حضرت اُمِّ ہانی سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

کعبہ میں قرآن پڑھتے تھے، اور ہم لوگ گھروں میں پلنگوں پر لیٹے لیٹے سنتے تھے[1]،

حضرت خدیجہؓ کے پہلے شوہر سے ایک صاحبزادے تھے جن کا نام ہند تھا، اور وہ نہایت خوش تقریر تھے، جس چیز کا بیان کرتے اس کی تصویر کھینچ دیتے، حضرت امام حسن علیہ السلام نے اُن سے پوچھا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کیونکر تقریر فرماتے تھے، انھوں نے کہا آپ ہمیشہ متفکر رہتے تھے، اکثر چپ رہتے، اور بے ضرورت کبھی گفتگو نہ فرماتے، ایک ایک فقرہ الگ اور صاف اور واضح ہوتا تھا، ہات سے اشارہ کرتے، تو پورا ہاتھ اٹھاتے، کسی بات پر تعجب کرتے تو ہتھیلی کا رُخ پلٹ دیتے، تقریر میں کبھی ہات پر ہات مارتے، بات کرتے کرتے جب کبھی مسرت کی کیفیت طاری ہوتی، تو آنکھیں نیچی ہوجاتیں، ہنستے بہت کم تھے، ہنسی آتی تو مسکرا دیتے، اور یہی آپ کی ہنسی تھی[2]، جریر بن عبداللہ کا بیان ہے کہ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھکو دیکھا ہو اور مسکرا نہ دیا ہو، روایتوں میں آیا ہے کہ کبھی کبھی جب آپ کو زیادہ ہنسی آتی، تو ڈاڑھ کے دانت (نواجذ) نظر آنے لگتے، لیکن ابن القیم وغیرہ نے لکھا ہے کہ یہ طرز ادا کا مبالغہ ہے، ورنہ کبھی آپ اس زور سے نہیں ہنسے کہ نواجذ نظر آئیں،

خندہ و تبسم

لباس لباس کے متعلق کسی قسم کا التزام نہ تھا، عام لباس چادر قمیص، اور تہمد تھی، پاجامہ کبھی استعمال نہیں فرمایا، لیکن امام احمد اور اصحاب سنن اربعہ نے روایت کی ہے، کہ آپ نے منیٰ کے بازار میں پاجامہ خرید تھا حافظ ابن قیم نے لکھا ہے کہ اس سے قیاس ہوتا ہے، کہ استعمال بھی فرمایا ہوگا، موزوں کی عادت نہ تھی، لیکن نجاشی نے جو سیاہ موزے بھیجے تھے،

عام لباس

پاجامہ

موزہ

---

[1] ابن ماجہ باب ماجاء فی القراءۃ فی صلوۃ اللیل، [2] شمائل ترمذی،

عمامہ — آپنے استعمال فرمائے، بظاہر روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ چرمی تھے، عمامہ کا شملہ کبھی دوش مبارک پر کبھی دونوں شانوں کے بیچ میں پڑا رہتا تھا، کبھی تحت الحنک کے طور پر پیٹ لیتے تھے، عمامہ اکثر سیاہ رنگ کا ہوتا تھا، عمامہ کے نیچے سر سے لپٹی ہوئی ٹوپی ہوتی تھی اور بنچی ٹوپی کبھی استعمال نہیں فرمائی (عمامہ کے نیچے ٹوپی کا التزام تھا، فرماتے تھے کہ ہم میں اور

ٹوپی — مشرکین میں یہی امتیاز ہے کہ ہم ٹوپیوں پر عمامہ باندھتے ہیں[1])

چادر — لباس میں سب سے زیادہ یمن کی دھاری دار چادریں پسند تھیں، جن کو عربی میں حبرہ کہتے ہیں[2]

عبا — بعض اوقات شامی عبا استعمال کی ہو جس کی آستین اس قدر تنگ تھی کہ وضو کرنا چاہا تو چڑھ نہ سکی، اور ہاتھ کو آستین سے نکالنا پڑا، نوشیروانی قبا بھی جس کی جیب اور آستینوں پر دیبا کی سنجاف تھی استعمال کی ہے،

کمبل — جب انتقال ہوا تو حضرت عائشہؓ نے کمبل جس میں پیوند لگے ہوئے تھے، اور گاڑھے کی ایک تہمد نکال کر دکھائی کہ ان ہی کپڑوں میں آپنے وفات پائی،

حُلّہ حمراء — روایتوں میں آیا ہے کہ آپنے حلہ حمراء بھی استعمال کیا ہے، حمراء کے معنی سُرخ کے ہیں، اسلئے اکثر محدثین نے وہی عام معنی لئے ہیں لیکن ابن القیم نے اصرار کیساتھ دعویٰ کیا ہو کہ سُرخ لباس آپنے کبھی نہیں پہنا اور نہ مردوں کیلئے اس کو جائز رکھتے تھے حُلّہ حمراء ایک قسم کی یمنی چادر تھی جسمیں سُرخ دھاریاں بھی ہوتی تھیں، اس بنا پر اس کو حمراء کہتے تھے اور یہی کبھی کبھی استعمال کرتے تھے عام محدثین کہتے ہیں کہ اس تخصیص کا کوئی ثبوت نہیں، زرقانی میں یہ بحث نہایت تفصیل سے مذکور ہو، مختلف روایتوں سے ثابت ہوتا ہو کہ آپنے سیاہ

---

[1] ابوداؤد کتاب اللباس [2] صحیح بخاری باب اللباس،

سرخ، سبز، زعفرانی، ہر رنگ کے کپڑے پہنے ہیں لیکن سفید رنگ بہت مرغوب[1] تھا، (بعض اوقات اس قسم کی چادر بھی استعمال فرمائی ہے جس پر کجاوے کی شکل بنی ہوئی تھی،)[2] نعلین مبارک اس طرز کے تھے جس کو اس ملک میں چپل کہتے ہیں، یہ صرف ایک تلا ہوتا تھا جس میں تسمے لگے ہوتے تھے، بچھونا چمڑے کا گدا ہوتا تھا جس میں روئی کے بجائے کھجور کے پتے ہوتے تھے، چارپائی بان کی بنی ہوتی تھی، جس سے اکثر جسم پر بدھیاں پڑجاتی تھیں،

نعلین

انگوٹھی

جب آپ نے نجاشی اور قیصر روم کو خط لکھنا چاہا تو لوگوں نے عرض کی کہ سلاطین مہر کے بغیر کوئی تحریر قبول نہیں کرتے، اس بنا پر چاندی کی انگوٹھی بنوائی جس میں اوپر تلے تین سطروں میں محمد رسول اللہ لکھا ہوا تھا، بعض صحابہ سے روایت ہے کہ آپ صرف مہر لگانے کے وقت اس کا استعمال فرماتے تھے، اور دہنے ہاتھ کی انگلی میں پہنتے تھے،

خود و زرہ

لڑائیوں میں زرہ اور مغفر بھی پہنتے تھے، اُحد کے معرکہ میں جسم مبارک پر دو زرہیں تھیں تلوار کا قبضہ کبھی چاندی کا بھی ہوتا تھا،

عام غذا

غذا اور طریقۂ طعام اگرچہ ایثار اور قناعت کی وجہ سے لذیذ اور پر تکلف کھانے کبھی نصیب ہوتے، یہاں تک کہ (جیسا کہ صحیح بخاری کتاب الاطعمہ میں ہے) تمام عمر آپ نے چپاتی کی صورت تک نہیں دیکھی، تاہم بعض کھانے آپ کو نہایت مرغوب تھے، سرکہ، شہد، حلوا، روغن زیتون، کدو خصوصیت کے ساتھ پسند تھے، سالن میں کدو ہوتا تو پیالہ میں اس کی قاشیں انگلیوں سے ڈھونڈھتے، ایک دفعہ حضرت ام ہانیؓ کے گھر تشریف لے گئے اور پوچھا کہ کچھ کھانے کو ہے؟ بولیں کہ سرکہ ہے، فرمایا کہ جس گھر میں سرکہ ہو، اس کو نادار نہیں کہہ سکتے، عرب میں ایک کھانا ہوتا ہے جس کو حیس کہتے ہیں، یہ گھی میں پنیر اور کھجور ڈال کر پکایا جاتا ہے، آپ کو یہ بہت مرغوب تھا،

مرغوب کھانے

[1] ابوداؤد جلد ۲ کتاب اللباس، مسند ابن حنبل جلد ۱ صفحہ ۲۴۴، [2] ابوداؤد جلد ۲ کتاب اللباس لبس الصوف والشعر

ایک دفعہ حضرت امام حسن علیہ السلام اور عبداللہ بن عباسؓ سلمیٰ کے پاس گئے، اور کہا آج ہم کو وہ کھانا پکا کر کھلاؤ جو آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کو بہت مرغوب تھا، بولیں تم کو وہ کیا پسند آئے گا؟ لوگوں نے اصرار کیا تو انھوں نے جو کا آٹا پیسکر ہانڈی میں چڑھا دیا، اوپر سے روغن زیتون اور زیرہ اور کالی مرچیں ڈالدیں، پک گیا تو لوگوں کے سامنے رکھا کہ یہ آپ کی محبوب ترین غذا تھی،

گوشت کے اقسام میں سے آپنے دُنبہ، مُرغ، بٹیر (حباری) اونٹ، بکری، بھیڑ، گورخر، خرگوش مچھلی کا گوشت کھایا ہے، دست کا گوشت بہت پسند تھا، شمائل ترمذی میں حضرت عائشہؓ کا قول نقل کیا ہے کہ دست کا گوشت فی نفسہ آپ کو چنداں مرغوب نہ تھا، بات یہ تھی کہ کئی کئی دن تک گوشت نصیب نہیں ہوتا تھا، اس لئے جب کبھی ملجاتا تو آپ چاہتے تھے کہ جلد پک کر تیار ہو جائے، دست کا گوشت جلدی گل جاتا ہے اسلئے آپ اسی کی فرمایش کرتے لیکن متعدد روایتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ یوں بھی آپکو یہ گوشت پسند تھا

حضرت صفیہؓ کے نکاح میں جب آپنے ولیمہ کا کھانا کھلایا تھا، تو صرف کھجور اور ستو تھا، تربوز کو کھجور کے ساتھ ملاکر کھاتے تھے، پتلی ککڑیاں پسند تھیں، ایک دفعہ معوذ بن عفراء کی صاحبزادی نے کھجور اور پتلی ککڑیاں خدمت میں پیش کیں، (بعض اوقات روٹی کے ساتھ بھی کھجور تناول فرمائی ہے)

پانی دودھ شربت

ٹھنڈا پانی نہایت مرغوب تھا، دودھ کبھی خالص نوش فرماتے کبھی اس میں پانی ملا دیتے، کشمش کھجور، انگور، پانی میں بھگو دیا جاتا، کچھ دیر کے بعد وہ پانی نوش جان فرماتے، کھانے کے ظروف میں ایک لکڑی کا پیالہ تھا، جو لوہے کے تاروں سے بندھا ہوا تھا، روایت میں اسی قدر ہے، قرینہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ٹوٹ گیا ہوگا، اس لئے تاروں سے جوڑ دیا ہوگا،

معمولاتِ طعام

دسترخوان پر جو کھانا آتا، اگر ناپسند ہوتا تو اس میں ہاتھ نہ ڈالتے لیکن اسکو برا نہ کہتے جو سالن سامنے

ہوتا، اسی میں ہاتھ ڈالتے، ادھر ادھر ہاتھ نہ بڑھاتے اور اُس سے اوروں کو بھی منع فرماتے کھانا کبھی مسند یا تکیہ پر ٹیک کر نہ کھاتے اور اسکو ناپسند فرماتے میز یا خوان پر کبھی نہیں کھایا خوان زمین سے کسی قدر اونچی میز ہوتی تھی، عجم اسی پر کھانا رکھ کر کھاتے تھے چونکہ یہ بھی فخر اور امتیاز کی علامت تھی یعنی امرا اور اہلِ جاہ کیساتھ مخصوص تھی، اسلئے آپنے اس پر کھانا پسند نہیں فرمایا، کھانا صرف انگلیوں سے کھاتے[1] گوشت کو کبھی کبھی چھری سے کاٹ کر بھی کھاتے، صحیح بخاری میں یہ روایت موجود ہے[2] ابوداؤد میں ایک حدیث ہے کہ گوشت چھری سے نہ کاٹو، کیونکہ یہ اہل عجم کا شعار ہے لیکن ابوداؤد نے خود اس حدیث کو ضعیف کہا ہے، اس حدیث کے راوی ابو معشر نجیح ہیں، جن کی نسبت بخاری نے لکھا ہے کہ وہ منکر الحدیث ہیں، اور ان ہی منکرات میں حدیث مذکور بھی ہے[3]،

خوش لباسی گو تکلف اور جاہ پسندی سے آپ کو نفرت تھی لیکن کبھی کبھی آپ نہایت قیمتی اور خوشنما لباس بھی زیب تن فرماتے تھے، حضرت عبداللہ بن عباسؓ جب حروریہ کے پاس سفیر بنا کر گئے تو وہ یمن کے نہایت قیمتی کپڑے پہن کر گئے، حروریہ نے کہا، کیوں ابن عباس یہ کیا لباس ہے؟ بولے کہ تم اس پر معترض ہو میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بہتر سے بہتر کپڑوں میں دیکھا ہے[4]

حضرت عبداللہ بن عمرؓ نہایت متقشف تھے ایک دفعہ بازار سے ایک شامی حلہ مول لیا، گھر لا کر دیکھا تو اس میں سُرخ دھاریاں تھیں جا کر واپس کر آئے کسی نے یہ واقعہ حضرت اسماءؓ (حضرت عائشہؓ کی بہن ہیں) سے کہا انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا جبہ منگوا کر لوگوں کو دکھایا جس کی جیبوں اور آستینوں اور دامن پر دیبا کی سنجاف تھی[5]

---

[1] غذا کے متعلق زیادہ تر واقعات شمائل ترمذی اور زاد المعاد ابن قیم سے ماخوذ ہیں۔ [2] کتاب الاطعمہ باب القطع بالسکین
[3] قسطلانی شرح صحیح بخاری جلد ۸ ص ۲۵۲، مصر [4] ابوداؤد کتاب اللباس باب لبس الصوف والشعر
[5] ابوداؤد باب الرخصۃ فی العلم وخیط الحریر

(بعض امراء وسلاطین نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بیش قیمت کپڑے ہدیۃً بھیجے، آپ نے قبول فرمایا، اور کبھی زیب تن کئے)

مرغوب رنگ رنگوں میں زرد رنگ بہت پسند تھا، حدیثوں میں آیا ہے کہ کبھی کبھی آپ تمام کپڑے یہاں تک کہ عمامہ بھی اسی رنگ کا رنگوا کر پہنتے تھے[1] (سفید رنگ بھی بہت پسند تھا، فرماتے تھے کہ یہ رنگ سب رنگوں میں اچھا ہے)

نامرغوب رنگ سرخ لباس ناپسند فرماتے تھے، ایک دفعہ عبداللہ بن عمروؓ سرخ کپڑے پہنکر آئے تو فرمایا یہ کیا لباس ہے، عبداللہ نے جاکر آگ میں ڈال دیا، آپ نے سنا تو فرمایا کہ جلانے کی ضرورت تھی، کسی عورت کو دیدیا ہوتا[2]

عرب میں سرخ رنگ کی مٹی ہوتی ہے جس کو مغرہ کہتے ہیں، اس سے کپڑے رنگا کرتے تھے، یہ رنگ آپ کو نہایت ناپسند تھا، ایک دفعہ حضرت زینبؓ اس سے کپڑے رنگ رہی تھیں، آپ گھر میں آئے اور دیکھا تو واپس چلے گئے، حضرت زینبؓ سمجھ گئیں، کپڑے دھو ڈالے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دوبارہ تشریف لائے اور جب دیکھ لیا کہ اس رنگ کی کوئی چیز نہیں تب گھر میں قدم رکھا[3]، ایک دن ایک شخص سرخ پوشاک پہن کر آیا، تو آپ نے اس کے سلام کا جواب نہیں دیا، ایک دفعہ صحابہؓ نے سواری کے اونٹوں پر سرخ رنگ کی چادریں ڈالدی تھیں آپ نے فرمایا میں یہ دیکھنا نہیں چاہتا، کہ یہ رنگ تم پر چھا جائے، فوراً صحابہ نہایت تیزی سے دوڑے اور چادریں اتار کر پھینک دیں[4]،

خوشبو

خوشبو کا استعمال خوشبو آپ کو بہت پسند تھی، کوئی خوشبو کی چیز ہدیۃً بھیجتا تو کبھی رد نہ فرماتے، ایک خاص

۱؎ ابوداؤد باب فی المصبوغ ۲؎ ابوداؤد باب فی الحمرہ ۳؎ ابوداؤد ۴؎ یہ تمام روایتیں ابوداؤد کتاب اللباس میں ہیں۔

قسم کی خوشبو یا عطر ہوتا ہے جس کو سکہ کہتے ہیں، یہ ہمیشہ آپکے استعمال میں رہتا تھا صحابہ کہتے ہیں کہ جس گلی کوچہ سے آپ نکل جاتے وہ معطر ہو جاتا، اکثر فرمایا کرتے مردوں کی خوشبو ایسی ہونی چاہئے کہ خوشبو پھیلے اور رنگ نظر نہ آئے، اور عورتوں کی ایسی کہ خوشبو نہ پھیلے اور رنگ نظر آئے[1]

نفاست پسندی — مزاج میں لطافت تھی، ایک شخص کو میلے کپڑے پہنے دیکھا تو فرمایا کہ اس سے اتنا نہیں ہوتا کہ کپڑے دھولیا کرے[2]،

ایکدفعہ ایک شخص خراب کپڑے پہنے ہوئے خدمت میں حاضر ہوا، آپنے پوچھا تم کو کچھ مقدور ہے،؟ بولا ہاں! ارشاد ہوا کہ خدانے نعمت دی ہے تو صورت سے بھی اس کا اظہار ہونا چاہئے[3]

عرب تہذیب وتمدن سے کم آشنا تھے، مسجد میں آتے تو عین نماز میں دیواروں پر یا سامنے زمین پر تھوک دیتے، آپ اس کو نہایت ناپسند فرماتے، دیواروں پر تھوک کر دھبوں کو خود چھڑی کی نوک سے کھرچ کر مٹاتے، ایکدفعہ تھوک کا دھبہ دیوار پر دیکھا تو اس قدر غصہ آیا کہ چہرۂ مبارک سرخ ہوگیا، ایک انصاری عورت نے دھبہ کو مٹایا، اور اس جگہ خوشبو لاکر ملی آپ نہایت خوش ہوئے اور اس کی تحسین کی[4]،

کبھی کبھی مجلس عالی میں خوشبو کی انگیٹھیاں جلائی جاتیں جن میں اگر اور کبھی کبھی کافور ہوتا[5]

ایکدفعہ ایک عورت نے حضرت عائشہؓ سے پوچھا کہ خضاب لگانا کیسا ہے، بولیں کچھ مضائقہ

---

[1] شمائل ترمذی [2] ابوداؤد کتاب اللباس باب ماجاء فی غسل الثوب [3] ابوداؤد کتاب اللباس
[4] نسائی کتاب المساجد [5] نسائی صفحہ ۲۴۰، مطبوعہ نظامی باب البخور،

نہیں لیکن میں اسلئے ناپسند کرتی ہوں کہ میرے حبیب (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) کو حنا کی بو ناگوار تھی، [1]

اکثر مشک اور عنبر کا استعمال فرماتے،

ایک شخص کے بال پریشان دیکھے تو فرمایا کہ اس سے اتنا نہیں ہو سکتا کہ بالوں کو درست کرلے، [2] ایک دفعہ اون کی چادر اوڑھی، پسینہ آیا تو اتار کر رکھدی، [3]

ایک دن لوگ مسجد نبوی میں آئے، چونکہ مسجد تنگ تھی اور کاروباری لوگ میلے کپڑوں میں چلے آئے تھے، پسینہ آیا تو تمام مسجد میں بو پھیل گئی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ نہا کر آتے تو اچھا ہوتا [4] اسی دن سے غسل جمعہ ایک حکم شرعی بن گیا،

مسجد نبوی میں جھاڑو دینے کا التزام تھا، ام محجن نام ایک عورت جھاڑو دیا کرتی تھی،

ابن ماجہ میں روایت ہے کہ آپ نے حکم دیا کہ مساجد میں بچے اور مجنوں نہ جانے پائیں، اور خرید و فروخت نہ ہونے پائے، اور یہ بھی حکم دیا کہ مساجد میں جمعہ کے دن خوشبو کی انگیٹھیاں جلائی جائیں،

اہل عرب بدویت کے اثر سے نظافت اور صفائی کا نام نہیں جانتے تھے، اس بنا پر اس خاص باب میں آپ کو نہایت اہتمام کرنا پڑتا تھا،

عرب کی عادت تھی، اور آج بھی بدویوں میں عموماً پائی جاتی ہے کہ راستہ میں بول و براز کرتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس کو نہایت ناپسند فرماتے، اور اس سے منع کرتے تھے احادیث میں کثرت سے روایتیں موجود ہیں کہ آپ نے ان لوگوں پر لعنت کی ہے جو راستہ میں یا درختوں کے سایہ میں بول و براز کرتے ہیں، امرا کا دستور ہے کہ کاہلی کی وجہ سے کسی برتن میں پیشاب کر لیا کرتے ہیں، اس سے بھی منع فرماتے تھے، [5]

---

[1] نسائی ص ۹۵، باب کراہیۃ ریح الحنا۔ [2] ابو داؤد کتاب اللباس [3] ایضاً [4] اس مضمون میں متعدد حدیثیں بخاری شریف (غسل جمعہ) میں باختلاف الفاظ و واقعات مذکور ہیں [5] ترغیب و ترہیب کتاب الطہارۃ،

عرب میں پیشاب کے بعد استنجا کرنے یا پیشاب سے کپڑوں کے بچانے کا مطلق دستور نہ تھا، آپ ایک دفعہ راہ میں جا رہے تھے، دو قبریں نظر آئیں، فرمایا کہ ان میں سے ایک پر اس لئے عذاب ہو رہا ہے کہ وہ اپنے کپڑوں کو پیشاب سے محفوظ نہیں رکھتا تھا،[1]

ایک دفعہ آپ مسجد میں تشریف لائے، دیواروں پر جا بجا دھبے تھے، آپ کے ہاتھ میں کھجور کی ٹہنی تھی، اس سے کھرچ کھرچ کر تمام دھبے مٹائے، پھر لوگوں کی طرف خطاب کر کے غصہ کے لہجہ میں فرمایا کہ کیا تم پسند کرتے ہو کہ کوئی شخص تمہارے سامنے آکر تمہارے منہ پر تھوک دے، جب کوئی شخص نماز پڑھتا ہے تو خدا اس کے سامنے اور فرشتے اس کے داہنے جانب ہوتے ہیں، اس لئے انسان کو سامنے یا داہنی جانب تھوکنا نہیں چاہیے،[2]

ایک صحابی نے عین نماز میں (جب کہ وہ امام نماز تھے) تھوک دیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دیکھ رہے تھے، فرمایا کہ یہ شخص اب نماز نہ پڑھائے، نماز کے بعد یہ صاحب خدمت اقدس میں آئے اور پوچھا کہ کیا آپ نے یہ حکم دیا ہے؟ فرمایا کہ ہاں تم نے خدا اور پیغمبر کو اذیت دی،[3]

بودار چیزوں مثلاً پیاز لہسن اور مولی سے نفرت تھی، حکم تھا کہ یہ چیزیں کھا کر لوگ مسجد میں نہ آئیں، بخاری میں حدیث ہے کہ جو شخص پیاز لہسن کھائے وہ ہمارے پاس نہ آئے، اور ہمارے ساتھ نماز نہ پڑھے، اپنے زمانہ خلافت میں ایک مرتبہ حضرت عمرؓ نے خطبہ میں کہا کہ تم لوگ پیاز لہسن کھا کر مسجد میں آتے ہو، حالانکہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا تھا کہ کوئی شخص یہ چیزیں کھا کر مسجد میں آتا تو آپ حکم دیدیتے کہ مسجد سے نکال کر بقیع میں پہنچا دیا جائے،[4]

[1] صحیح بخاری عذاب القبر [2] ترغیب و ترہیب [3] ایضاً باب البصاق فی المسجد [4] مسلم و نسائی و ابن ماجہ،

سواری

سواری کا شوق گھوڑے کی سواری آپ کو نہایت مرغوب تھی (آپؐ فرمایا کرتے الخیل معقود فی نواصیھا الخیر، گھوڑوں کے علاوہ گدھے، خچر، اونٹ پر آپؐ نے سواری فرمائی ہے، آپ کے خاص سواری کے گھوڑے کا نام لُحیف تھا، گدھے کا نام عفیر اور خچر کا نام دلدل اور تیہ اور اونٹنیوں کا نام قصواء اور عضباء تھا)

اسپ دوانی

اسپ دوانی مدینہ سے باہر ایک میدان تھا جس کی سرحد حصباء سے ثنیۃ الوداع تک ۶ میل تھی، یہاں گھوڑ دوڑ کی مشق کرائی جاتی تھی،

گھوڑے جو مشق کے لئے طیار کرائے جاتے تھے، ان کی تیاری کا یہ طریقہ تھا کہ پہلے اُن کو خوب دانا گھاس کھلاتے تھے، جب وہ موٹے تازے ہوجاتے تو اُن کی غذا کم کرنی شروع کرتے اور گھر میں باندھ کر جامہ کستے، پسینہ آتا، اور خشک ہوتا، روزانہ یہ عمل جاری رہتا، رفتہ رفتہ جس قدر گوشت چڑھ گیا تھا خشک ہوکر ہلکا پھلکا چھریرا بدن نکل آتا، یہ مشق چالیس دن میں ختم ہوتی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سواری کا ایک گھوڑا تھا جس کا نام سبحہ تھا، ایک دفعہ اُس کو آپؐ نے بازی میں دوڑایا، اُس نے بازی جیتی، تو آپ کو خاص مسرت ہوئی،[1]

گھوڑ دوڑ کا اہتمام حضرت علیؓ کے سپرد تھا، انھوں نے اپنی طرف سے سراقہ بن مالک کو یہ خدمت سپرد کی، اور اُس کے چند قاعدے مقرر کئے، جن کی تفصیل حسب ذیل ہے،[2]

۱۔ گھوڑوں کی صفیں قائم کی جائیں، اور تین دفعہ پکار دیا جائے کہ جس کو لگام درست کرنی

---

[1] نسائی ص ۷۰۰ باب حب الخیل ۲ دار قطنی جلد ۲ ص ۵۵۲ (کتاب السبق بین الخیل) مسند احمد اور بیہقی میں بھی یہ واقعہ مذکور ہے) [2] یہ پوری تفصیل دار قطنی ص ۵۵۳-۵۵۴ (کتاب السبق بین الخیل میں ہے لیکن محدثانہ حیثیت سے یہ روایت ضعیف ہے)

یا بچہ کو ساتھ رکھنا، یا زین الگ کردینی ہو الگ کرلے،

۲۔ جب کوئی آواز نہ آئے تو تین دفعہ تکبیریں کہی جائیں، تیسری تکبیر پر گھوڑے میدان میں ڈال دیئے جائیں،

۳۔ گھوڑے کے کان آگے نکل جائیں تو سمجھ لیا جائے گا کہ وہ آگے نکل گیا،

حضرت علیؓ خود میدان کے انتہائی سرے پر بیٹھ جاتے، اور ایک خط کھینچ کر دو آدمیوں کو دونوں کناروں پر کھڑا کردیتے، گھوڑے ان ہی دونوں کے درمیان ہو کر نکلتے،[1]

اونٹوں کی دوڑ بھی ہوتی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خاص سواری کا ناقہ عضبار ہمیشہ بازی لیجاتا، ایک دفعہ ایک بدو اونٹ پر سوار آیا، اور مسابقت میں عضباء سے آگے نکل گیا، تمام مسلمانوں کو سخت صدمہ ہوا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "خدا پر حق ہے کہ دنیا کی جو چیز گردن اٹھائے، اس کو نیچا دکھائے"[1]

رنگوں میں صندلی، مشکی، اور کمیت بہت پسند تھا،[2] گھوڑوں کی دم کاٹنے سے منع فرمایا کہ کھی ہانکنے کا مور چھل ہے،[3]

---

[1] (صحیح بخاری ونسائی ودارقطنی ومسند احمد عن انس باب الرہان والسبق) [2] نسائی مطبوعہ نظامی ص ۹۶ (باب ما یستحب من شتبہ الخیل، [3] کتب ستن، کتاب الادب،

معمولات

(ترمذی نے شمائل میں حضرت علیؓ سے روایت کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اوقات کے تین حصے کر دیئے تھے، ایک عبادت الٰہی کے لئے، دوسرا عام خلق کے لئے اور تیسرا اپنی ذات کیلئے)

صبح سے شام تک کے معمولات

معمول تھا کہ نماز فجر پڑھ کر (جانماز پر) آلتی پالتی مار کر بیٹھ جاتے، یہانتک کہ آفتاب اچھی طرح نکل آتا،[۱] (اور یہی وقت دربار نبوت کا ہوتا، لوگ پاس آ آ کر بیٹھتے، اور آپ اُن کو مواعظ و نصائح تلقین فرماتے[۲])

(اکثر صحابہ سے پوچھتے کہ کسی نے کوئی خواب دیکھا ہے، کسی نے دیکھا ہوتا تو عرض کرتے آپ اسکی تعبیر بیان فرماتے،[۳] کبھی خود اپنا خواب بیان فرماتے[۴]، اس کے بعد ہر قسم کی گفتگو ہوتی، لوگ جاہلیت کے قصے بیان کرتے، شعر پڑھتے، ہنسی خوشی کی باتیں کرتے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صرف مُسکرا دیتے[۵]، اکثر اسی وقت مال غنیمت اور وظائف و خراج وغیرہ کی تقسیم فرماتے[۶]

بعض روایتوں میں ہے کہ جب دن کچھ چڑھ جاتا تو چاشت کی کبھی چار، کبھی آٹھ رکعت نماز ادا فرماتے، گھر جاکر گھر کے دھندے میں مشغول رہتے، پھٹے کپڑوں کو سیتے، جوتا ٹوٹ جاتا تو اپنے ہاتھ سے گانٹھ لیتے، دودھ دوہتے[۷]،

[۱] صحیح مسلم باب تبسمه صلعم، و ابو داؤد صفحہ ۱۳۱، [۲] جامع ترمذی [۳] صحیح مسلم کتاب التعبیر [۴] صحیح بخاری کتاب التعبیر [۵] نسائی باب قعود الامام فی مصلاہ [۶] بخاری اور حدیث کی کتابوں میں متعدد جزئی واقعات مذکور ہیں۔
[۷] صحیح بخاری باب ما یکون الرجل فی مهنة اهله و مسند حنبل و مسند عائشہؓ،

نمازِ عصر پڑھکر ازواجِ مطہرات میں سے ایک ایک کے پاس جاتے، اور ذرا ذرا دیر ٹھہرتے، پھر جس کی باری ہوتی، وہیں رات بسر فرماتے، تمام ازواجِ مطہرات وہیں جمع ہو جاتیں، عشا تک صحبت رہتی[1]، پھر نمازِ عشا کے لئے مسجد میں تشریف لیجاتے، اور واپس آکر سو رہتے، ازواج رخصت ہو جاتیں، نمازِ عشا کے بعد بات چیت کرنی ناپسند فرماتے تھے[2]

خواب عام معمول یہ تھا کہ آپ اوّل وقت نمازِ عشا پڑھ کر آرام فرماتے تھے، سوتے وقت التزاماً قرآن مجید کی کوئی سورہ (بنی اسرائیل، زمر، حدید، حشر، صف، تغابن، جمعہ) پڑھ کر سوتے شمائل ترمذی میں ہو کہ آرام فرماتے وقت یہ الفاظ فرماتے،

اللّٰھم باسمک اموت واحییٰ	خدایا تیرا نام لیکر مرتا ہوں اور زندہ رہتا ہوں،

جاگتے تو فرماتے،

الحمد للّٰہ الذی احیانا بعد	اُس خدا کا شکر جس نے موت کے بعد زندہ
ما اماتنا والیہ النشور،	کیا، اور اسی کی طرف حشر ہوگا،

آدھی رات یا پہر رات رہے جاگ اٹھتے، مسواک ہمیشہ سرہانے رہتی تھی، اٹھکر پہلے مسواک فرماتے، پھر وضو کرتے، اور عبادت میں مشغول ہوتے، آپ کی سجدہ گاہ[3] آپکے سرہانے ہوتی تھی، ہمیشہ داہنی کروٹ اور دایاں ہاتھ رخسارہ کے نیچے رکھ کر سوتے، لیکن جب کبھی سفر میں پچھلے پہر منزل پر اتر کر آرام فرماتے تو معمول تھا کہ دایاں ہاتھ اونچا کرکے چہرہ اس پر ٹیک کر سوتے کہ گہری نیند آجائے، نیند میں کسی قدر خراٹے کی آواز آتی تھی،

---

[1] صحیح مسلم باب القسم بین الزوجات [2] بخاری صلوٰۃ العشاء [3] (یعنی سجدہ کا مقام جہاں بحالت نماز آپ سجدہ کرتے تھے)" اس

بچھونے میں کوئی التزام نہ تھا کبھی معمولی بستر پر کبھی کھال پر، کبھی چٹائی، اور کبھی خالی زمین پر آرام فرماتے، [۱]

عبادت شبانہ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خانگی معمولات اور اوراد سے حضرت عائشہؓ کے برابر کوئی واقف نہ تھا، اُن سے مروی ہے کہ جب سورۂ مزمل کی ابتدائی آیتیں نازل ہوئیں تو آپ نے اس قدر نمازیں پڑھیں کہ پاؤں پر ورم آگیا، بارہ مہینے تک باقی آیتیں رُکی رہیں، سال بھر کے بعد جب بقیہ آیتیں اُتریں تو قیام لیل جو اب تک فرض تھا نفل رہ گیا،

شب کو آٹھ رکعت متصل پڑھتے، جن میں صرف آٹھویں رکعت میں قعدہ کرتے، پھر ایک اور رکعت پڑھتے، اور اس میں بھی جلسہ کرتے، پھر دو رکعت اور ادا کرتے، اس طرح ۱۱ رکعتیں ہو جاتیں، لیکن جب عمر زیادہ ہو گئی، اور جسم ذرا بھاری ہو گیا تو سات رکعتیں پڑھتے جن کے بعد دو رکعتیں اور ادا کرتے، کبھی کبھی رات کو اتفاقاً نیند کا غلبہ ہوتا اور اس معمول میں فرق آتا تو دن میں ۱۲ رکعتیں پڑھ لیتے تھے،

ابوداؤد میں حضرت عائشہؓ سے ایک اور روایت ہے اس کے الفاظ یہ ہیں :۔

"عشا کی نماز جماعت سے پڑھکر گھر میں چلے آتے، اور یہاں چار رکعتیں پڑھ کر خواب راحت فرماتے، وضو کا پانی اور مسواک سرہانے رکھ دی جاتی، سو کر اٹھتے، پہلے مسواک فرماتے پھر وضو کرتے اور جائے نماز پر آکر آٹھ رکعتیں ادا کرتے" [۲]

حضرت عبداللہ بن عباسؓ کہتے ہیں کہ ایک دن میں اپنی خالہ میمونہ (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات میں تھیں) کے یہاں خاص اس غرض سے رہا کہ دیکھوں آپ رات کو کس طرح نماز پڑھتے ہیں، زمین پر فرش بچھا ہوا تھا آپ نے اس پر آرام فرمایا، میں سامنے آڑا سویا، قریباً رات ڈھلے آپ نکھیں

---

[۱] یہ پوری تفصیل زرقانی میں حدیث کی متعدد کتابوں کے حوالے سے مذکور ہے [۲] سنن ابوداؤد باب صلوٰۃ اللیل،

ملتے ہوئے اٹھے، آل عمران کی اخیر دس آیتیں پڑھیں، پانی کی مشک لٹکی ہوئی تھی، اس سے وضو کیا، پھر نماز شروع کی، میں بھی وضو کرکے بائیں پہلو میں کھڑا ہو گیا، آپ نے ہاتھ پکڑ کر داہنی جانب پھیر دیا، ۱۳ رکعتیں پڑھ کر آپ سو رہے، یہاں تک کہ سانس کی آواز آنے لگی، صبح ہوتے حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے اذان دی، آپ اٹھے، فجر کی سنتیں ادا کیں، پھر مسجد میں تشریف لے گئے،

معمولات نماز

ابتدا میں آپ ہر نماز کے لئے نیا وضو کرتے تھے، لیکن جب یہ گراں گذرنے لگا تو صرف پنج وقتہ مسواک کرلی، فتح مکہ میں آپ نے سب سے پہلے ایک وضو سے کئی نمازیں پڑھیں[۱]، تاہم عادۃً آپ اکثر نئے وضو کے ساتھ نماز ادا فرماتے تھے، وضو میں عام معمول یہ تھا کہ پہلے تین بار ہاتھ دھوتے، پھر کلی کرتے، اور ناک میں پانی ڈالتے، اس کے بعد تین تین بار منہ ہاتھ دھوتے، سر کا مسح کرتے، اور تین بار پاؤں کو دھوتے[۲]، بعض اوقات کسی عضو کو تین بار اور کسی عضو کو دو بار اور کسی عضو کو ایک بار دھوتے[۳]، سنن و نوافل زیادہ تر گھر ہی میں ادا فرماتے، اذان صبح ہی کیساتھ اٹھتے اور فجر کی دو رکعت سنت نہایت اختصار کے ساتھ ادا کرتے، یہاں تک کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا بیان ہے کہ مجھے بعض اوقات یہ خیال ہوتا تھا کہ آپ نے سورۂ فاتحہ پڑھی یا نہیں[۴]، لیکن فرض کی دو رکعتوں میں عموماً طویل سورتیں پڑھتے، حضرت عبداللہ بن سائب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک بار آپ نے مکہ میں نماز فجر میں سورۂ مومنین پڑھی، اسی طرح کبھی واللیل اذا عسعس اور کبھی سورۂ ق پڑھتے، صحابہ کا اندازہ ہے کہ آپ صبح کی نماز میں ساٹھ سے لیکر سو آیتوں تک پڑھتے تھے،

ظہر و عصر میں اگرچہ بہ نسبت فجر کے تخفیف فرماتے تھے، تاہم ابتدا کی دو رکعتوں میں سورۂ فاتحہ

۱؎ صحیح مسلم و مسند جلد ۵ ص ۲۲۵، ۲؎ مسلم جلد ۱ ص ۱۰۸ باب صفۃ الوضوء وکمالہ ۳؎ مسلم جلد ۱ ص ۱۰۱ باب آخر فی صفۃ الوضوء
۴؎ مسلم جلد ۱ ص ۲۷۰ باب رکعتی سنۃ الفجر والحث علیہا،

کے ساتھ اتنی بڑی سورہ پڑھتے کہ آدمی بقیع تک جاتا تھا، اور وہاں اپنا کام کرتا تھا، پھر پلٹ کر گھر آتا تھا اور وضو کرتا تھا، اور پہلی رکعت میں جاکر شامل ہوجاتا تھا، صحابہ نے اندازہ کیا تو معلوم ہوا کہ ظہر کی اوّل دو رکعتوں میں آپ اس قدر قیام فرماتے ہیں جس میں الٓمٓ تنزیل السجدۃ کے برابر سورہ پڑھی جاسکتی ہے، اخیر کی دو رکعتوں میں یہ مقدار نصف رہ جاتی تھی، عصر کی دونوں پہلی رکعتوں میں ظہر کی آخری رکعتوں کے برابر قیام فرماتے تھے، اور اخیر کی دو رکعتوں میں پہلی رکعتوں کی نصف مقدار رہ جاتی تھی حضرت ابوسعید خدری رضؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ظہر کی پہلی رکعت میں تیس آیتوں کے برابر، اور دوسری رکعت میں پندرہ آیتوں کے یا اس کے نصف کے برابر اور عصر میں پندرہ آیتوں کے برابر پڑھا کرتے تھے، جابر بن سمرہ کہتے ہیں کہ ظہر میں آپ سَبِّحِ اسْمَ رَبِّکَ الْاَعْلٰی پڑھتے تھے،

مغرب کی نماز میں وَالْمُرْسَلَات اور سورہ طور پڑھتے تھے،

عشاء کی نماز میں وَالتِّیْنِ وَالزَّیْتُوْنِ اور اسی کے برابر کی سورتیں پڑھتے تھے،

تہجد کی نماز میں بڑی بڑی سورتیں پڑھتے تھے، مثلاً سورہ بقرہ، سورۂ آل عمران، سورۂ نساء، سورہ جمعہ کی پہلی رکعت میں سورہ جمعہ یُسَبِّحُ لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ، اور دوسری رکعت میں اِذَا جَآءَکَ الْمُنٰفِقُوْنَ اور کبھی سَبِّحِ اسْمَ رَبِّکَ الْاَعْلٰی اور ھَلْ اَتٰکَ حَدِیْثُ الْغَاشِیَۃِ،

عیدین میں بھی دو پچھلی سورتیں یعنی سَبِّحِ اسْمَ رَبِّکَ الْاَعْلٰی اور ھَلْ اَتٰکَ پڑھتے تھے، اتفاق سے اگر عید اور جمعہ ایک ساتھ پڑجاتا تو دونوں نمازوں میں یہی دونوں سورتیں پڑھا کرتے تھے، جمعہ کے دن کی نماز صبح میں الٓمٓ تنزیل السجدہ اور ھَلْ اَتٰی عَلَی الْاِنْسَانِ حِیْنٌ،

---

۵ مسلم جلد اصفحہ ،، باب القراۃ فی الظہر والعصر وغیرہما ۱۲

(ءَنّ اللّٰہُ ھُم پڑھنے کا معمول تھا)[۱]

معمولاتِ خطبہ (وعظ و پند اور ارشاد و ہدایت کے لئے آپ اکثر خطبہ دیا کرتے تھے، بالخصوص جمعہ کیلئے تو خطبہ لازمی تھا، جمعہ کے خطبات میں معمول یہ تھا کہ جب لوگ جمع ہو جاتے تو آپ نہایت سادگی کے ساتھ گھر سے نکلتے، مسجد میں داخل ہوتے اور لوگوں کو سلام کرتے، پھر منبر پر تشریف لے جاتے تو لوگوں کی طرف رُخ کرکے سلام کرتے، اور اذان کے بعد فوراً خطبہ شروع کر دیتے، پہلے ہاتھ میں ایک عصا ہوتا تھا، لیکن جب منبر بن گیا تو ہاتھ میں عصا لینا چھوڑ دیا، خطبہ ہمیشہ نہایت مختصر اور جامع ہوتا تھا، فرمایا کرتے تھے کہ نماز کا طول اور خطبہ کا اختصار آدمی کے تفقہ کی دلیل ہے، جمعہ کے خطبہ میں عموماً سورۂ "ق" پڑھتے تھے[۲]، اس میں قیامت اور حشر و نشر کا بہ تفصیل ذکر ہے،

خطبہ ہمیشہ حمد خداوندی کے ساتھ شروع کرتے تھے، اگر اثنائے خطبہ میں کوئی کام پیش آجاتا، تو منبر سے اُتر کر اس کو کر لیتے، پھر منبر پر جا کر خطبہ کو پورا فرماتے، ایک بار آپ خطبہ دے رہے تھے، اسی حالت میں ایک آدمی نے آکر کہا، یا رسول اللہ! میں مسافر آدمی ہوں، اپنے دین کی حقیقت سے ناواقف ہوں، اسکے متعلق پوچھنے آیا ہوں، آپ منبر سے اتر آئے، ایک کرسی رکھ دی گئی، اس پر بیٹھ گئے اور اس کو تعلیم و تلقین کی، پھر جا کر خطبہ کو پورا کیا[۳] ایک بار آپ .... خطبہ دے رہے تھے امام حسین علیہ السلام سُرخ کپڑے پہنے ہوئے مسجد میں آگئے، چونکہ بچپن کی وجہ سے لڑکھڑاتے آتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا تو ضبط نہ ہو سکا، منبر سے اُتر آئے اور گود میں اٹھا لیا، اور یہ آیت پڑھی اِنَّمَا اَمْوَالُکُمْ وَاَوْلَادُکُمْ فِتْنَۃٌ[۴] خطبہ کی حالت میں لوگوں کو بیٹھنے اور نماز پڑھنے کا بھی حکم دیتے تھے، چنانچہ عین خطبہ کی حالت

---

[۱] یہ تمام روایتیں صحیح مسلم کتاب الصلوٰۃ، کتاب الجمعہ والعیدین میں مذکور ہیں [۲] صحیح مسلم [۳] ادب المفرد مطبوعہ مصر ص ۲۱۰ باب الجلوس علی السریر [۴] جامع ترمذی مناقب حسنینؓ

میں ایک شخص مسجد میں آیا، آپنے پوچھا کہ کیا تم نے نماز پڑھی؟ اُس نے کہا نہیں، آپنے فرمایا اٹھو، اور پڑھو۔[1]

میدانِ جہاد میں جب خطبہ دیتے تھے، تو کمان پر ٹیک لگا کر کھڑے ہوتے تھے، بعض لوگوں کا خیال ہے کہ آپ ہاتھ میں تلوار لیکر کھڑے ہوتے تھے، لیکن ابن قیم نے لکھا ہے کہ آپنے خطبہ کی حالت میں کبھی تلوار ہاتھ میں نہیں[2] لی،

وعظ و ارشاد کے لئے عموماً ناغہ دیکر خطبہ دیا کرتے تھے، تاکہ لوگ گھبرا نہ جائیں[3]۔

معمولات سفر | حج، عمرہ اور زیادہ تر جہاد کی وجہ سے آپ کو اکثر سفر کی ضرورت پیش آیا کرتی تھی سفر میں معمول یہ تھا کہ پہلے ازواجِ مطہرات پر قرعہ ڈالتے، جس کے نام قرعہ پڑتا وہ ہمسفر ہوتیں[4]، جمعرات کے دن سفر کرنا پسند فرماتے تھے، اور صبح کے تڑکے روانہ ہوجاتے تھے، افواج کو بھی جب کسی مہم پر روانہ فرماتے تو اسی وقت روانہ فرماتے[5] جب سواری سامنے آتی اور رکاب میں قدم مبارک رکھتے تو بسم اللہ کہتے، اور جب زین پر سوار ہوجاتے تو تین بار تکبیر کہتے، اس کے بعد یہ آیت پڑھتے،

سُبْحَانَ الَّذِیْ سَخَّرَ لَنَا ھٰذَا وَمَا کُنَّا لَهٗ مُقْرِنِیْنَ وَاِنَّآ اِلٰی رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُوْنَ[6]، | پاک ہے وہ ذات جس نے اس جانور کو ہمارا فرمانبردار بنا دیا حالانکہ ہم خود اس کو مطیع نہیں کر سکتے تھے اور ہم ...

---

[1] بخاری جلد ا ص ۱۲۷ باب اذا رای الامام رجلاً جاء و ھو یخطب امرہ ان یصلی رکعتین۔ [2] زاد المعاد جلد اول ص ۱۲۱، فصل فی ھدیہ فی خطبہ [3] بخاری جلد ا ص ۱۶ باب ما کان النبی صلعم یتخولھم بالموعظۃ [4] بخاری جلد ۲ باب حدیث الافک کتاب المغازی [5] ابوداؤد کتاب الجہاد باب فی ای یوم یستحب السفر و باب فی الابتکار فی السفر [6] ابوداؤد کی ایک روایت میں ہے کہ سوار ہوجانے کے بعد تین تین بار تکبیر و تحمید کرتے، پھر یہ دعا پڑھتے، سُبْحَانَكَ انی ظلمت نفسی فاغفر لی انه لا یغفر الذنوب اِلّا انت، (ابوداؤد کتاب الجہاد ۳ باب ما یقول الرجل اذا رکب

پھر یہ دعا کرتے،

اللّٰھم انا نسئالک فی سفرنا ھذا البر	خداوندا! اس سفر میں ہم تجھ سے نیکی، پرہیزگاری
والتقوی ومن العمل ما ترضی اللّٰھم	اور عمل پسندیدہ کی درخواست کرتے ہیں، خداوندا!
ھون علینا سفرنا واطوعنا بعدہ اللّٰھم	ہمارے اس سفر کو آسان اور اس کی مسافت کو
انت الصاحب فی السفر والخلیفۃ فی الاھل	طے کر دے، خداوندا سفر میں تو رفیق ہو، بال بچوں
اللّٰھم انی اعوذبک من وعثاء السفر	کے لئے تو ہمارا قائم مقام ہے، خداوندا میں سفر
کآبۃ المنقلب وسوء المنظر فی الاھل	اور واپسی کے آلام، مصائب اور گھر بار کے مناظر
والمال،	قبیحہ سے تیری پناہ مانگتا ہوں،

جب واپس ہوتے تو اس میں اس قدر اضافہ کر دیتے، "آئبون، تائبون، عابدون لربنا، حامدون" راستے میں جب کسی چوٹی پر چڑھتے تو تکبیر کہتے، اور جب اس سے نیچے اترتے تو ترنم ریز تسبیح ہوتے، صحابہ بھی آپ کے ہم آواز ہو کر تکبیر و تسبیح کا غلغلہ بلند کرتے، جب کسی منزل پر اترتے تو یہ دعا فرماتے [1]

یا ارض ربی وربک اللّٰہ اعوذ باللّٰہ	اے زمین میرا اور تیرا پروردگار خدا ہے میں تیری برائی سے
من شرک وشر ما فیک وشر ما خلق	اور اس چیز کی برائی سے جو تیرے اندر ہے، اور اس چیز کی
فیک وشر ما یدب علیک واعوذبک	برائی سے جو تیرے اندر پیدا کی گئی ہے، اور اس چیز کی برائی
من اسد واسود ومن الحیۃ والعقرب	سے جو تجھ پر چلتی ہے، پناہ مانگتا ہوں خداوندا تجھ سے شیر

[1] ابوداؤد کتاب الجہاد باب ما یقول الرجل اذا سافر،

ومن ساکنی البلد ومن والد وما ولد[1]

سانپ بچھو، اور اس گاؤں کے رہنے والوں اور آدمیوں سے پناہ مانگتا ہوں

جب کسی آبادی میں داخل ہونا چاہتے تو یہ دعا پڑھتے،

اللّٰھم رب السمٰوٰت السبع وما اظللن و رب الارضین السبع وما اقللن و رب الشیاطین وما اضللن و رب الریاح وما ذرین اسألک خیر ھذہ القریۃ وخیر اھلھا واعوذ بک من شرھا و شر اھلھا وشر ما فیھا[2]،

خداوندا! اے ساتوں آسمان اور ان تمام چیزوں کے پروردگار جن پر وہ سایہ فگن ہیں، اے ساتوں زمینوں اور ان تمام مخلوقات کے پروردگار جو ان پر موجود ہیں، اے شیاطین اور ان تمام نفوس کے پروردگار جن کو وہ گمراہ کرتے ہیں، اے ہوا اور ان تمام اشیاء کے پروردگار جن کو وہ اڑاتی ہیں، میں تجھ سے اس گاؤں اور اس گاؤں کے رہنے والوں کی بھلائی کی درخواست کرتا ہوں اور اس گاؤں اور اس گاؤں کے اور اس میں رہنے والوں کے شر سے پناہ مانگتا ہوں

مدینہ پہونچتے تو پہلے مسجد میں جاکر دو رکعت نماز ادا فرماتے،[3] پھر مکان کے اندر تشریف لیجاتے، تمام لوگوں کو حکم تھا کہ سفر سے آنے کے ساتھ ہی گھر کے اندر نہ چلے جائیں تاکہ عورتیں اطمینان کے ساتھ سامان درست کرلیں،[4]

معمولاتِ جہاد جہاد میں معمول یہ تھا کہ جب فوج کو کسی مہم پر روانہ فرماتے تو امیر العسکر کو خاص طور پر پرہیزگاری اختیار کرنے اور اپنے رفقا کیساتھ نیکی کرنے کی ہدایت فرماتے پھر تمام فوج کی طرف مخاطب ہو کر فرماتے،

اغزوا باسم اللّٰہ فی سبیل اللّٰہ قاتلوا من کفر باللّٰہ اغزوا ولا تغلوا ولا تغدروا ولا تمثلوا ولا تقتلوا ولیدا[5]،

خدا کے نام پر خدا کی راہ میں کفار سے لڑو، خیانت اور بدعہدی نہ کرنا، مردوں کے ناک کان نہ کاٹنا، بچوں کو قتل نہ کرنا،

---

[1] زاد المعاد فصل فی ھدیہ فی السفر [2] ابو داؤد کتاب الجہاد باب ما یقول الرجل اذا نزل المنزل [3] ابو داؤد کتاب الجہاد باب فی اعطاء البشیر [4] ابو داؤد کتاب الجہاد باب فی الطروق،

اس کے بعد شرائط جہاد کی تلقین کرتے،[1]

جب فوج کو رخصت کرتے، تو یہ الفاظ فرماتے،

استودع اللہ دینکم و امانتکم و خواتیم اعمالکم،[2] — میں تمہارے قرض کو، امانت کو، اور تمہارے اعمال کے نتائج کو خدا کے حوالے کرتا ہوں،

جب خود شریک جہاد ہوتے، اور حملہ کے مقام پر شب کو پہونچتے تو صبح کا انتظار کرتے صبح ہو جاتی تو حملہ کرتے،[3] اگر صبح کے وقت حملہ کرنے کا اتفاق نہ ہوتا، تو دوپہر ڈھلے حملہ کرتے،[4] جب کوئی مقام فتح ہو جاتا، تو اقامت عدل و انصاف کے لئے وہاں تین دن تک قیام فرماتے،[5] جب فتح و ظفر کی خبر آتی، تو سجدۂ شکرانہ بجالاتے،[6] جب میدان جہاد میں شریک کارزار ہوتے تو یہ دعا فرماتے،

ترجمہ

اللّٰھم انت عضدی ونصیری بک احول وبک اصول وبک اقاتل،[7] — خداوندا تو میرا دست و بازو ہے تو میرا مددگار ہے، تیری مدد سے میں مدافعت کرتا ہوں حملہ کرتا ہوں، اور

معمولات عیادت وغیرہ

بیماروں کی عیادت و غمخواری آپ ضرور فرماتے تھے، اور صحابہ کو ارشاد ہوتا تھا کہ عیادت بھی ایک مسلمان کا فرض ہے،[8] ہجرت کے ابتدائی زمانہ میں معمول شریف یہ تھا کہ جب کسی شخص کی موت کا وقت قریب آجاتا تو صحابہ آپ کو اس کی اطلاع دیتے، آپ اس کے مرنے سے پہلے تشریف لاتے، اسکے لئے دعائے مغفرت فرماتے، اور اخیر دم تک اسکے پاس بیٹھے رہتے، یہاں تک کہ دم واپسیں

---

[1] صحیح مسلم کتاب الجہاد باب تامیر الامام الامراء علی البعوث ووصیتہ ایاہم بآداب الغزو وغیرہا [2] ابوداؤد کتاب الجہاد باب فی الدعاء عند الوداع [3] بخاری کتاب المغازی ذکر غزوہ خیبر [4] ابوداؤد کتاب الجہاد باب فی ای وقت یستحب اللقاء [5] ابوداؤد کتاب الجہاد باب فی الامام یقیم عند الظہور علی العدو بارضہم [6] ابوداؤد کتاب الجہاد باب فی سجود الشکر [7] ابوداؤد کتاب الجہاد باب مایدعی عند اللقاء [8] صحیح بخاری باب وجوب عیادۃ المریض،

کے انتظار میں آپ کو اس قدر دیر ہو جاتی کہ آپ کو تکلیف ہونے لگتی، صحابہ نے تکلیف کا احساس کیا، اور اب ان کا یہ معمول ہو گیا کہ جب کوئی شخص مر جاتا تو آپ کو اس کی موت کی خبر دیتے، آپ اس کے مکان پر تشریف لیجاتے، اس کیلئے استغفار فرماتے، جنازہ کی نماز پڑھتے، اس کے بعد اگر مٹی دینا چاہتے تو ٹھہر جاتے، ورنہ واپس چلے آتے لیکن صحابہ کو آخر آپ کی یہ تکلیف بھی گوارا نہ ہوئی، اس لئے خود جنازہ آپکے مکان تک لانے لگے، اور یہی عام معمول ہو گیا[۱]۔

عیادت کے لئے جب کسی بیمار کے پاس تشریف لیجاتے، تو اس کو تسکین دیتے، پیشانی اور نبض[۲] پر ہاتھ رکھتے، اس کی صحت کے لئے دعا فرماتے[۳] اور کہتے انشاء اللہ طہور، خدانے چاہا تو خیریت ہے[۴] کوئی بد فالی کے فقرے کہتا تو ناپسند فرماتے، ایک بار ایک اعرابی مدینہ میں آکر بیمار پڑ گیا، آپ اسکی عیادت کو تشریف لے گئے، اور کلمات تسکین ادا فرمائے، اس نے کہا "تم نے خیریت کہا، شدت کا تپ ہے جو قبر ہی میں ملا کر چھوڑے گی" آپنے فرمایا "ہاں اب یہی ہو"[۴]

معمولات ملاقات معمول یہ تھا کہ کسی سے ملنے کے وقت ہمیشہ پہلے خود سلام اور مصافحہ کرتے، کوئی شخص اگر جھک کر آپکے کان میں کچھ بات کہتا تو اس وقت تک اس کی طرف سے رخ نہ پھیرتے جب تک وہ خود منہ نہ ہٹا لے، مصافحہ میں بھی یہی معمول تھا یعنی کسی سے ہاتھ ملاتے، تو جب تک کہ وہ خود نہ چھوڑ دے، اس کا ہاتھ نہ چھوڑتے، مجلس میں بیٹھتے تو آپکے زانو کبھی ہمنشینوں سے آگے نکلے ہوئے نہ ہوتے[۵]۔

---

[۱] (مسند ابن حنبل جلد ۲ صفحہ ۲۰۰ [۲] صحیح بخاری باب وضع الید علی المریض [۳] باب دعاء العائد للمریض [۴] باب عیادت الاعراب) [۵] ابو داؤد و ترمذی۔

جو شخص حاضر ہونا چاہتا، دروازے پر کھڑے ہو کر پہلے "السلام علیکم" کہتا، پھر پوچھتا کہ کیا میں اندر آسکتا ہوں؟ (خود بھی آپ کسی سے ملنے جاتے تو اسی طرح اجازت مانگتے) کوئی شخص اس طریقہ کے خلاف کرتا، تو آپ اُس کو واپس کر دیتے، ایک دفعہ بنو عامر کا ایک شخص آیا، اور دروازہ پر کھڑا ہو کر پکارا کہ اندر آسکتا ہوں؟ آپنے فرمایا کہ "جا کر اُن کو اجازت طلبی کا طریقہ سکھا دو" یعنی پہلے سلام کرے، تب اجازت مانگے،

ایک دفعہ صفوان بن اُمیہ نے جو قریش کے رئیس اعظم تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اپنے بھائی کلدہ کے ہات دودھ، ہرن کا بچہ اور لکڑیاں بھیجیں، کلدہ یونہی بے اجازت چلے آئے، آپنے فرمایا، کہ "واپس جاؤ، اور سلام کر کے اندر آؤ"[1]

ایک دفعہ حضرت جابرؓ زیارت کو آئے، اور دروازہ پر دستک دی، آپنے پوچھا کون ہے؟ بولے "میں" آپنے فرمایا "میں میں" یعنی یہ کیا طریقہ ہے، نام بتانا چاہئے"

جب آپ خود کسی کے گھر پر جاتے تو دروازہ کے دائیں یا بائیں جانب کھڑے ہوتے اور السلام علیکم کہکر اذن طلب فرماتے، (راوی کا بیان ہے کہ آپ عین دروازہ کے سامنے اس وجہ سے نہ کھڑے ہوتے کہ اس وقت تک دروازوں پر پردہ ڈالنے کا رواج نہ تھا) اگر صاحب خانہ اذن نہ دیتا تو پلٹ آتے، چنانچہ ایک دفعہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) سعد بن عبادہؓ کے گھر تشریف لائے، اور باہر کھڑے ہو کر اذن طلبی کے لئے "السلام علیکم ورحمۃ اللہ" کہا، سعدؓ نے اس طرح آہستہ سلام کا جواب دیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں سنا حضرت سعدؓ کے فرزند قیس بن سعدؓ نے کہا کہ آپ رسول اللہ کو اندر آنے

[1] یہ دونوں روایتیں ابوداؤد جلد ۲ صفحہ ۱۵۶ میں ہیں،

کی اجازت کیوں نہیں دیتے، حضرت سعدؓ نے کہا چپ رہو رسول اللہ بار بار سلام کریں گے جو ہمارے لئے برکت کا سبب ہوگا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دوبارہ السلام علیکم کہا اور سعدؓ نے پھر اسی طرح جواب دیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تیسری دفعہ پھر اسی طریقہ سے اذن طلب کیا، اور جب کوئی جواب نہ ملا، تو آپ واپس چلے، حضرت سعدؓ نے آپ کو جاتے دیکھا تو دوڑ کر گئے، اور عرض کی کہ میں آپ کا سلام سن رہا تھا لیکن آہستہ جواب دیتا تھا، (کہ آپ بار بار سلام فرمادیں)[1]

(کسی کے گھر تشریف لیجاتے تو ممتاز مقام پر بیٹھنے سے پرہیز فرماتے، ایک بار آپ حضرت عبد اللہ بن عمرؓ کے مکان پر تشریف لے گئے، انھوں نے آپکے بیٹھنے کے لئے چمڑے کا ایک گدا ڈال دیا، لیکن آپ زمین پر بیٹھ گئے، اور گدا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت عبد اللہ ابن عمر کے درمیان آگیا)[2]

معمولات عامہ (تیمن یعنی داہنی طرف سے یا داہنے ہاتھ سے کام کرنا آپ کو محبوب تھا، جوتا پہلے داہنے پانوں میں پہنتے، مسجد میں پہلے داہنا پانوں رکھتے، مجلس میں کوئی چیز تقسیم فرماتے تو داہنی طرف سے، اسی طرح کسی کام کو شروع کرنا چاہتے تو پہلے بسم اللہ کہہ لیتے)

---

[1] (ابوداؤد کتاب الادب ۲ ادب المفروص ۲۱۹)

مجالسِ نبویؐ

دربارِ نبوت شہنشاہ کونینؐ کا دربار نقیب و چاؤش اور خیل و حشم کا دربار نہ تھا، دروازہ پر دربان بھی نہیں ہوتے تھے، تاہم نبوت کے جلال سے ہر شخص پیکرِ تصویر نظر آتا تھا، حدیثوں میں آیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں لوگ بیٹھتے تو یہ معلوم ہوتا کہ اُن کے سروں پر چڑیاں بیٹھی ہوئی ہیں، یعنی کوئی شخص ذرا بھی جنبش نہیں کرتا تھا، گفتگو کی اجازت میں ترتیب کا لحاظ رہتا تھا، لیکن یہ امتیاز مراتب نسب و نام یا دولت و مال کی بنا پر نہیں بلکہ فضل و استحقاق کی بنا پر ہوتا تھا، سب سے پہلے آپ اہلِ حاجت کی طرف متوجہ ہوتے اور اُنکی معروضات سنکر اُنکی حاجت براری فرماتے تمام حاضرین ادب سے سر جھکائے رہتے، خود بھی آپ مؤدب ہو کر بیٹھتے، جب کچھ فرماتے تو تمام مجلس پر سناٹا چھا جاتا، کوئی شخص بولتا تو جب تک وہ چپ نہ ہو جائے دوسرا شخص بول نہیں سکتا تھا، اہلِ حاجت عرضِ مدعا میں ادب کی حد سے بڑھ جاتے تو آپ کمالِ حلم کے ساتھ برداشت فرماتے، آپ کسی کی بات کاٹ کر گفتگو نہ فرماتے، جو بات ناپسند ہوتی، اس سے تغافل فرماتے، اور ٹال جاتے۔ کوئی شخص شکریہ ادا کرتا تو اگر آپنے واقعی اس کا کوئی کام انجام دیا ہے تو شکریہ قبول فرماتے، مجلس میں جس قسم کا ذکر چھڑ جاتا، آپ بھی اس میں شامل ہو جاتے، ہنسی اور مہذب ظرافت میں بھی شریک ہوتے، خود بھی مذاقیہ باتیں فرماتے، کبھی کسی قبیلہ کا کوئی معزز شخص آجاتا، تو حسبِ مرتبت اس کی تعظیم فرماتے، اور فرماتے اکرموا کریمہ کل قوم، مزاج پرسی کے ساتھ ہر شخص سے دریافت فرماتے کہ کوئی ضرورت اور حاجت تو نہیں ہے، یہ بھی فرماتے کہ جو لوگ اپنے مطالب مجھ تک

نہیں پہنچا سکتے، مجکو اُن کے حالات اور ضروریات کی خبر دو،

ایران میں معمول تھا کہ جب مجلس میں کوئی معزز شخص آجاتا تھا تو سب تعظیم کو کھڑے ہوجاتے یہ بھی قاعدہ تھا کہ رؤسا اور امرا جب دربار جاتے تو لوگ سینوں پر ہاتھ رکھکر کھڑے رہتے، آپنے ان باتوں سے منع فرمایا اور ارشاد کیا کہ "جس کو یہ پسند آتا ہے کہ لوگ اس کے سامنے تعظیم سے کھڑے رہیں، اس کو اپنی جگہ دوزخ میں ڈھونڈھنی چاہیے،"[۱] البتہ جوشِ محبت میں آپ کسی کسی کے لئے کھڑے ہوجاتے، چنانچہ حضرت فاطمہ زہراؓ جب کبھی آجاتیں، تو اکثر کھڑے ہوجاتے، اور فرطِ محبت سے اُن کی پیشانی چومتے، (حضرت حلیمہ سعدیہ کے لئے بھی آپنے اُٹھ کر چادر بچھادی تھی، اسی طرح ایک دفعہ آپکے رضاعی بھائی آئے، تو اُن کے لئے بھی محبت سے کھڑے ہوگئے، اور اُن کو اپنے سامنے بٹھایا،[۲])

ہر شخص کو اس کے رتبہ کے مناسب جگہ ملتی، کسی شخص کے دل میں یہ خیال نہیں آنے پاتا کہ دوسرا شخص اس سے زیادہ عزت یاب ہے، جب کوئی شخص اچھی بات کہتا تو آپ تحسین فرماتے، اور نامناسب گفتگو کرتا، تو اس کو مطلع فرما دیتے،[۳]

ایک دفعہ دو شخص مجلس اقدس میں حاضر تھے، اُن میں ایک معزز اور دوسرا کم رتبہ تھا، معزز صاحب کو چھینک آئی لیکن انھوں نے اسلامی شعار کے موافق الحمدُللہ نہیں کہا، دوسرے صاحب کو بھی چھینک آئی، انھوں نے الحمدللہ کہا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حسب معمول یرحمک اللہ کہا، معزز صاحب نے شکایت کی آپنے فرمایا کہ انھوں نے خدا کو یاد کیا، تو میں نے بھی کیا تم نے خدا

---

[۱] ابوداؤد کتاب الادب باب قیام الرجل للرجل [۲] ابوداؤد، کتاب الادب برالوالدین [۳] یہ تمام تفصیل شمائل ترمذی کی دو مفصل روایتوں سے ماخوذ ہے جنمیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عام اخلاق کا ذکر ہے،

کو بھلا دیا تو میں نے بھی تم کو بھلا دیا،[1]

صحابہ کو اس بات کی سخت تاکید تھی کہ کسی کی شکایت یا عیب آپ تک نہ پہونچائیں آپ فرماتے تھے کہ "میں چاہتا ہوں کہ دنیا سے جاؤں تو سب کی طرف سے صاف جاؤں"[2]

مجالس ارشاد

(آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم) کی تعلیم و تلقین کا فیض اگرچہ سفر، حضر، جلوت، خلوت، نشست، برخاست غرض ہر وقت جاری رہتا تھا تاہم اس سے وہی لوگ مستفیض ہو سکتے تھے، جو اتفاق سے موقع پر ہوتے تھے، اس بنا پر آپ نے تعلیم و ارشاد کے لئے بعض اوقات خاص کر دیئے تھے کہ لوگ پہلے سے مطلع رہیں، اور جن کو استفادہ منظور ہو وہ آسکیں،

صحبتیں عموماً مسجد نبوی میں منعقد ہوتی تھیں، مسجد نبوی میں ایک چھوٹا سا صحن تھا، کبھی آپ وہاں نشست فرماتے، ابتداءً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نشست کے لئے کوئی ممتاز جگہ نہ تھی، باہر سے اجنبی لوگ آتے، تو آپ کے پہچاننے میں دقت ہوتی، صحابہ نے ایک چھوٹا سا مٹی کا چبوترہ بنا دیا، آپ اس پر تشریف رکھتے، باقی دونوں طرف صحابہ حلقہ باندھ کر بیٹھ جاتے[3]

آداب مجلس

(ان مجالس میں آنے والوں کے لئے کوئی روک ٹوک نہ تھی، عموماً بدو اپنے اپنی وحشت نما طریقہ سے آتے اور بے باکانہ سوال و جواب کرتے،

خلق نبوی کا منظر ان مجالس میں زیادہ حیرت انگیز بنجاتا ہے، آپ پیغمبر خاتم کی حیثیت سے رونق افروز ہیں، صحابہ عقیدت کیش غلاموں کی طرح خدمت اقدس میں حاضر ہیں، ایک شخص آتا ہے، اور اس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم) میں، اور حاشیہ نشینوں میں، کوئی ظاہری امتیاز نظر نہیں آتا، لوگوں سے

---

[1] ادب المفرد امام بخاری، [2] ابوداؤد کتاب الادب، [3] ابن سعد قسم [۲] صفحہ ۱۳۲، [4] ابوداؤد باب القدر،

پوچھتا ہے "محمد کون ہے"؟ صحابہ بتاتے ہیں کہ "یہی گورے سے آدمی جو ٹیک لگائے ہوئے بیٹھے ہیں"، وہ کہتا ہے، "اے ابن عبدالمطلب! میں تم سے نہایت سختی سے سوال کروں گا، خفا نہ ہونا۔" آپ بخوشی سوال کی اجازت دیتے ہیں۔[۱]

باایں ہمہ سادگی و تواضع، یہ مجالس رعب و وقار اور آدابِ نبوت کے اثر سے لبریز ہوتی تھیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات و تلقینات کا دائرہ، اخلاق، مذہب، اور تزکیۂ نفوس تک محدود تھا، اس کے علاوہ اور باتیں منصبِ نبوت سے خارج تھیں لیکن بعض لوگ نہایت معمولی اور خفیف باتیں پوچھتے تھے، مثلاً یارسول اللہ میرے باپ کا نام کیا ہے؟ میرا اونٹ کھو گیا ہے وہ کہاں ہے؟ آپ اس قسم کے سوالات کو ناپسند فرماتے تھے،

ایک بار اسی قسم کے لغو سوالات کئے گئے تو آپ نے برہم ہو کر فرمایا کہ "جو پوچھنا ہو پوچھو، میں سب کا جواب دونگا" حضرت عمرؓ نے آپ کے چہرہ کا رنگ دیکھا تو نہایت الحاح کے ساتھ کہا رضیت[۲] الخ

کوئی شخص کھڑے کھڑے سوال نہیں کرتا تھا، ایک شخص نے اس طرح سوال کیا تو آپ نے اس کی طرف تعجب سے دیکھا، اسی طرح یہ بھی معمول تھا کہ جب ایک مسئلہ طے ہو جاتا تو دوسرا مسئلہ پیش کیا جاتا، بعض اوقات آپ گفتگو کرتے ہوتے، کوئی صحرا نشین بدو جو آدابِ مجلس سے ناواقف ہوتا، دفعۃً آجاتا، اور عین سلسلۂ تقریر میں کوئی بات پوچھ بیٹھتا، آپ سلسلۂ تقریر قائم رکھتے اور فارغ ہو کر اس کی طرف متوجہ ہوتے، اور جواب دیتے، ایک دفعہ آپ تقریر فرما رہے تھے، ایک بدو آیا اور آنے کیساتھ اس نے پوچھا کہ قیامت کب آئے گی؟ آپ تقریر کرتے رہے، حاضرین سمجھے کہ آپ نے نہیں سنا، کسی کسی نے کہا

---

[۱] بخاری جلد ۱ ص ۱۵ کتاب الایمان [۲] بخاری کتاب العلم

سنا" لیکن آپ کو ناگوار ہوا، آپ گفتگو سے فارغ ہو چکے تو دریافت فرمایا کہ پوچھنے والا کہاں ہے"؟ بدو نے کہا میں یہ حاضر ہوں" آپ نے فرمایا جب لوگ امانت کو ضائع کرنے لگیں گے"۔ بولا کہ امانت کیونکر ضائع ہوگی ، ؟ فرمایا جب نا اہلوں کے ہاتھ میں کام آئے گا[۱]

اوقاتِ مجلس | اس قسم کی مجالس کے لئے جو خاص وقت مقرر تھا، وہ صبح کا تھا ۔ نمازِ فجر کے بعد آپ بیٹھ جاتے ، اور فیوض روحانی کا سرچشمہ جاری ہو جاتا ۔ بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر نماز کے بعد آپ ٹھہر جاتے اور مجلس قائم ہو جاتی ، چنانچہ کعب بن مالکؓ پر جب غزوۂ تبوک کی غیر حاضری کی وجہ سے عتاب نازل ہوا ، تو وہ ان ہی مجالس میں آکر آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی خوشنودیِ مزاج کا پتہ لگاتے ، خود اُن کے الفاظ یہ ہیں ،

واتی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فاسلم علیہ وھو فی مجلسہ بعد الصلوٰۃ فاقول فی نفسی ھل حرک شفتیہ برد السلام ام لا[۲]،	میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آتا تھا ، اور سلام کرتا تھا ، اور آپ بعد نماز کے اپنی مجلس میں ہوتے تھے تو میں اپنے جی میں کہتا تھا کہ آپنے جواب سلام میں اپنے لب ہلائے یا نہیں ،

صبح کی مجلسوں میں کبھی کبھی آپ وعظ فرماتے ترمذی اور ابوداؤد میں عرباض بن ساریہؓ سے روایت ہے ،

وعظنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یوما بعد صلوٰۃ الغداۃ موعظۃ بلیغۃ ذرفت منھا العیون ووجلت منھا القلوب[۳]،	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دن صبح کی نماز کے بعد ایک بلیغ وعظ کہا جس سے آنکھیں اشک ریز ہو گئیں اور دل کانپ اٹھے ،

نماز کے بعد جو مجلس منعقد ہوتی اس میں وعظ و نصیحت اور اس قسم کی جزئی باتوں پر گفتگو ہوتی تھی ،

---

[۱] صحیح بخاری کتاب العلم ص ۱۴ [۲] بخاری جلد ۲ ص ۶۳۵ ، حدیث کعب بن مالکؓ [۳] ترمذی ص ۴۴۴ ،

لیکن ان اوقات کے علاوہ آپ خاص طور پر حقائق و معارف کے اظہار کے لیے مجالس منعقد فرماتے تھے، یہی مجالس ہیں جن کی نسبت احادیث میں یہ الفاظ آئے ہیں،

کان یوماً بارزاً للناس[1]،	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک دن عام طور پر لوگوں کیلئے باہر نکلے تھے

چونکہ افادہ عام ہوتا تھا، اس لئے آپ چاہتے تھے کہ کوئی شخص فیض سے محروم نہ رہنے پائے اس بنا پر جو لوگ ان مجالس میں آکر واپس چلے جاتے، ان پر آپ نہایت ناراض ہوتے تھے، آپ ایک مرتبہ صحابہ کے ساتھ مسجد میں بیٹھے ہوئے تھے کہ تین شخص آئے ایک صاحب نے حلقہ میں تھوڑی سی جگہ خالی پائی وہیں بیٹھ گئے، دوسرے صاحب کو درمیان میں موقع نہیں ملا، اسلئے سب کے پیچھے بیٹھے لیکن تیسرے صاحب واپس چلے گئے، آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) جب فارغ ہوئے تو فرمایا کہ ان میں سے ایک نے خدا کی طرف پناہ لی خدا نے اس کو بھی پناہ دی ایک نے حیا کی خدا بھی اس سے شرمایا، ایک نے خدا سے منہ پھیرا، خدا نے اس سے بھی منہ پھیر لیا[2]،

پند و نصائح کتنے ہی مؤثر طریقہ سے بیان کئے جائیں لیکن ہمیشہ سنتے سنتے آدمی اکتا جاتا ہے اور نصائح بے اثر ہو جاتے ہیں، اس بنا پر آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) وعظ و نصائح کی مجالس ناغہ دیکر منعقد فرماتے تھے، بخاری میں ابن مسعودؓ سے روایت ہے،

کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم یتخولنا	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہم لوگوں کو ناغہ دیکر نصیحت
بالموعظة فی الایام کراهة السآمة علینا	فرماتے تھے کہ ہم لوگ اکتا نہ جائیں،

عورتوں کے لئے مخصوص مجالس (ان مجالس کا فیض زیادہ تر مردوں تک محدود تھا، اور عورتوں کو موقع

[1] سنن ابن ماجہ صفحہ ۲۲ [2] بخاری جلد ۱ صفحہ ۲ کتاب العلم،

کم ملتا تھا، اس بنا پر عورتوں نے درخواست کی کہ ہمارے لئے خاص دن مقرر فرمایا جائے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ درخواست منظور کی، اور اُن کے وعظ و ارشاد کے لئے ایک خاص دن مقرر ہو گیا[۱]

اگر مسائلِ شرعیہ کے متعلق ہر قسم کے سوالات کی اجازت تھی، اور خاتونانِ حرم وہ مسائل دریافت کرتی تھیں، جو خاص پردہ نشینوں سے تعلق رکھتے تھے تاہم جب کوئی پردہ کا واقعہ مجلسِ عام میں سوال کی غرض سے پیش کیا جاتا، تو فرطِ حیا سے آپ کو ناگوار ہوتا،

اس قسم کے پردے کی بات مرد بھی مجمعِ عام میں پوچھتے تو آپ کو تکدر ہوتا، ایک دفعہ ایک انصاری نے (جن کا نام عاصم تھا) مجلسِ عام میں پوچھا کہ اگر کوئی شخص اپنی بیوی کو غیر کے ساتھ دیکھے تو کیا حکم ہے؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ناگوار ہوا، اور آپ نے اُن کو ملامت کی[۲]

طریقۂ ارشاد | کبھی کبھی آپ خود امتحان کے طور پر حاضرین سے کوئی سوال کرتے، اس سے لوگوں کی جودتِ فکر اور اصابتِ رائے کا اندازہ ہوتا، حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ ایک دفعہ آپ نے پوچھا وہ کون سا درخت ہے جس کے پتے جھڑتے نہیں، اور جو مسلمانوں سے مشابہت رکھتا ہے؟ لوگوں کا خیال جنگلی درختوں کی طرف گیا، میرے ذہن میں آیا کہ کھجور کا درخت ہوگا لیکن میں کمسن تھا، اس لئے جرأت نہ کر سکا، بالآخر لوگوں نے عرض کی کہ حضور بتائیں، ارشاد فرمایا "کھجور" عبد اللہ ابن عمر رضی اللہ عنہ کو تمام عمر حسرت رہی کہ کاش میں نے جرأت کرکے اپنا خیال ظاہر کر دیا ہوتا[۳]

ایک روز آپ مسجد میں تشریف لائے، صحابہ رضی اللہ عنہم کے دو حلقے قائم تھے، ایک قرآن خوانی اور ذکر و دعا میں مشغول تھا، اور دوسرے حلقہ میں علمی باتیں ہو رہی تھیں، آپ نے فرمایا دونوں عملِ خیر کر رہے ہیں،

---

[۱] بخاری کتاب العلم [۲] ایضاً [۳] سنن ابن ماجہ صفحہ ۲۱، باب فضل العلماء،

لیکن خدا نے مجکو صرف معلم بنا کر مبعوث کیا ہے، یہ کہکر علمی حلقہ میں بیٹھ گئے[1]،

ان مجالس میں دقیق مباحث کو جن کی تہ تک عوام نہیں پہنچ سکتے، ناپسند فرماتے تھے، چنانچہ ایک روز صحابہ کی مجلس میں مسئلۂ تقدیر پر گفتگو ہو رہی تھی آپنے سنا تو حجرہ سے نکل آئے آپ کا چہرہ اس قدر سُرخ ہوگیا تھا، گویا عارضِ مبارک پر کسی نے انار کے دانے نچوڑ دیے ہیں، آپنے صحابہ کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا کیا تم اسی لئے پیدا کئے گئے ہو، قرآن کو باہم ٹکرا رہے ہو، گذشتہ امتیں ان ہی باتوں سے برباد ہوئیں[2]،

ان مجالس کا مقصد یہ بھی تھا کہ صحابہ جن مسائل میں باہم اختلاف کرتے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اُن کا صحیح فیصلہ کر دیتے، مثلاً شہرت طلبی اور جاہ پرستی خلوصِ عمل کے منافی سمجھی جاتی ہے اور خود صحابہ کے زمانہ میں بھی سمجھی جاتی تھی، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں دو شخصوں نے اس مسئلہ میں گفتگو کی، ایک نے کہا اگر ہم نے دشمن سے مقابلہ کیا، اور ایک شخص نے فخریہ یہ کہکر نیزہ مارا کہ میرا وار لینا میں غفاری جوان ہوں تو اس میں تمھاری کیا رائے ہے؟ مخاطب نے جواب دیا، میری رائے میں کچھ ثواب ملے گا تیسرے آدمی نے یہ گفتگو سُن کر کہا میرے نزدیک اس میں کوئی ہرج نہیں، اس پر دونوں میں اختلاف ہوا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کی گفتگو سُنی تو فرمایا، ثواب اور شہرت دونوں میں کوئی مخالفت نہیں[3]،

عام خیال یہ تھا کہ قوائے عملیہ کے بیکار کر دینے کا نام تقدیر ہے، تقدیر میں جو کچھ لکھا ہوگا اسکو کوئی عملی طاقت مٹا نہیں سکتی لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مجلس میں جو اتفاقاً منعقد ہو گئی تھی اس خیال کی تردید کی، اور فرمایا کہ اعمال تو خود تقدیر ہیں انسان کو خدا جن اعمال کی توفیق دیتا ہے، وہی اس کا نوشتۂ تقدیر ہیں اسلئے توکل قوتِ عمل کے بیکار کر دینے کا نام نہیں، چنانچہ صحابہ ایک جنازہ میں شریک تھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

---

[1] سنن ابن ماجہ ص ۹ باب نقدر [2] ایضاً [3] ابو داؤد جلد ۲ ص ۱۱۳

تشریف لائے اور صحابہ جمع ہو گئے، آپ کے ہاتھ میں ایک چھڑی تھی، اس سے زمین کریدنے لگے، پھر فرمایا تم میں کوئی ایسا نہیں ہے، جس کی جگہ جنت یا دوزخ میں نہ لکھی جاچکی ہو، ایک شخص نے کہا تو ہم اپنی تقدیر پر توکل کرکے عمل کیوں نہ چھوڑ دیں، جو شخص سعادتمند ہوگا، وہ خود بخود سعادتمندوں میں داخل ہوجائے گا اور جو شخص بدبخت ہوگا، وہ بدبختوں سے جاملے گا، آپ نے فرمایا سعادتمند وہ لوگ ہیں جن کو سعادتمندوں کے عمل کی توفیق دیجاتی ہے، اور بدبخت وہ ہیں، جن کے لئے شقاوت کے کام کے اسباب جمع ہوجاتے ہیں[1]،

مجالس میں شگفتہ مزاجی

باوجود اس کے کہ ان مجالس میں صرف ہدایت، ارشاد، اخلاق، اور تزکیۂ نفوس کی باتیں ہوتی تھیں، اور صحابہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی خدمت میں اس طرح بیٹھتے تھے کان الطیر فوق رؤسھم تاہم یہ مجلسیں شگفتہ مزاجی کے اثر سے خالی نہ تھیں، ایک دن آپ نے ایک مجلس میں بیان فرمایا کہ جنت میں خدا سے ایک شخص نے کھیتی کرنے کی خواہش کی، خدا نے کہا کیا تمہاری خواہش پوری نہیں ہوئی ہے؟ اس نے کہا ہاں، لیکن میں چاہتا ہوں کہ فوراً بوؤں اور ساتھ ہی تیار ہوجائے، چنانچہ اس نے بیج ڈالے، فوراً دانہ اگا، بڑھا، اور کاٹنے کے قابل ہوگیا، ایک بدو بیٹھا ہوا تھا، اس نے کہا یہ سعادت صرف قریشی یا انصاری کو نصیب ہوگی، جو زراعت پیشہ ہیں، لیکن ہم لوگ تو کاشتکار نہیں، آپ ہنس پڑے[2]،

ایک دفعہ ایک صاحب خدمت میں حاضر ہوئے، اور عرض کی کہ میں تباہ ہوگیا، ارشاد ہوا کیوں؟ بولے میں نے رمضان میں بیوی سے ہمبستری کی، آپ نے فرمایا، ایک غلام آزاد کرو،

[1] بخاری جلد ۲ صفحہ ۷۰۳، تفسیر وکذب بالحسنیٰ [2] بخاری جلد ۲ ص ۱۱۲۱ باب کلام الرب مع اہل الجنۃ،

بولے غریب ہوں، غلام کہاں سے لاؤں، ارشاد ہوا، دو مہینے کے روزے رکھو، بولے یہ مجھ سے ہو نہیں سکتا، فرمایا ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلاؤ، بولے اتنا مقدور نہیں، اتفاق سے کہیں سے زنبیل بھر کر کھجوریں آگئیں، آپ نے فرمایا لو غریبوں کو خیرات کر آؤ، عرض کی، اُس خدا کی قسم جس نے آپ کو پیغمبر بنایا، سارے مدینہ میں مجھ سے بڑھ کر کوئی غریب نہیں، آپ بے ساختہ ہنس پڑے، اور فرمایا اچھا تم خود ہی کھالو[1]

فیضِ صحبت

ایک دفعہ حضرت ابوہریرہؓ نے عرض کی کہ ہم جب خدمتِ اقدس میں حاضر ہوتے ہیں، تو دنیا ہیچ معلوم ہوتی ہے لیکن جب گھر میں بال بچوں میں بیٹھتے ہیں، تو حالت بدل جاتی ہے، آپ نے فرمایا کہ اگر ایک سا حال رہتا تو فرشتے تمھاری زیارت کو آتے[2]

ایک دفعہ حضرت حنظلہؓ خدمتِ اقدس میں آئے، اور کہا یا رسول اللہ! میں منافق ہو گیا، میں جب خدمتِ اقدس میں حاضر ہوتا ہوں اور آپ دوزخ و جنت کا ذکر فرماتے ہیں تو یہ چیزیں آنکھوں کے سامنے آجاتی ہیں، لیکن بال بچوں میں آکر سب بھول جاتا ہوں، ارشاد ہوا کہ اگر باہر نکل کر بھی وہی حالت رہتی تو فرشتے تم سے مصافحہ کرتے[3]

---

[1] بخاری ص ۸۰۰ باب نفقۃ المعسر علی اہلہ [2] ترمذی شریف باب ماجاء فی صفۃ الجنۃ ونعیمہا، امام ترمذی کے نزدیک یہ حدیث قوی نہیں [3] ترمذی ابواب الزہد وصحیح مسلم کتاب التوبہ،

خطابتِ نبویؐ

خطابت[1] اور تقریر نبوت کا نہایت ضروری عنصر ہے، اسی بنا پر جب خدا نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو فرعون کے پاس پیغمبر بنا کر بھیجا، تو ان کو یہ دعا مانگنا پڑی،

وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّن لِّسَانِي يَفْقَهُوا قَوْلِي | خداوند! میری زبان کی گرہ کھول کہ لوگ میری بات سمجھیں

لیکن سید الانبیاءؐ کو خود بارگاہِ الٰہی سے یہ وصفِ کامل عطا کیا گیا تھا، چنانچہ آپؐ نے تحدیثِ نعمت کے طور پر فرمایا،

انا افصح العرب، | میں فصیح ترین عرب ہوں،

بعثت بجوامع الکلم، | میں کلماتِ جامعہ لیکر مبعوث ہوا ہوں

عرب میں اگرچہ ہر قبیلہ فصاحت و بلاغت کا مدعی تھا، تاہم تمام عرب میں دو قبیلے اس وصف میں نمایاں امتیاز رکھتے تھے، قریش اور بنو ہوازن، قریش خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا قبیلہ تھا، اور بنو ہوازن کے قبیلہ میں آپ نے پرورش پائی تھی، اس لئے آپ نے ارشاد فرمایا ہے،

انا اعربکم انا من قریش لسانی | میں تم میں فصیح تر ہوں، قریشی ہوں اور

لسان بنی سعد بن بکر، [2] | میری زبان بنو سعد کی زبان ہے[3]،

طرز بیان | آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نہایت سادہ طریقہ پر خطبہ دیتے تھے، آپ جب اپنے حجرے

---

[1] اضافہ تا ختم باب [2] طبقات ابن سعد ج ۱ [3] بنو سعد قبیلۂ ہوازن کی ایک شاخ ہے،

کے لئے نکلتے تھے۔ تو سلاطین کی طرح نہ آپ کے ساتھ چاؤش ہوتے تھے، نہ آپ خطبا، کا لباس پہنتے تھے، ہاتھ میں صرف ایک عصا ہوتا تھا، اور کبھی کبھی کمان پر ٹیک لگا کر خطبہ دیتے تھے[1]، ابن ماجہ میں ہے کہ مسجد میں جب آپ خطبہ دیتے تو دستِ مبارک میں عصا ہوتا تھا، اور میدانِ جنگ میں خطبہ دینے کے لئے کھڑے ہوتے تھے، تو کمان پر ٹیک لگاتے تھے،

جمعہ اور عید کا خطبہ تو متعین تھا، لیکن اس کے علاوہ خطبہ کا کوئی وقت مقرر نہ تھا، جب ضرورت پیش آتی، آپ فی البدیہ خطبہ کے لئے تیار ہو جاتے تھے، یہی وجہ ہے کہ آپ نے زمین پر، منبر پر، اونٹ پر، جس جگہ جیسا موقع پیش آیا ہے، خطبہ دیا ہے، ضرورت کے لحاظ سے اگرچہ آپ کو کبھی کبھی طویل خطبہ بھی دینا پڑتا تھا، تاہم آپ کے خطبے عموماً مختصر ہوتے تھے،

عام نصائح اور پند کی باتیں گو آپ اخباری فقروں میں بیان فرماتے، لیکن جب کلام کو خاص طور پر موثر بنانا ہوتا تھا، تو خطبہ کو عموماً سوال کی صورت میں شروع فرماتے تھے، غزوہ حنین میں آپ نے انصار کے سامنے جو خطبہ دیا وہ اول سے آخر تک سوال و جواب ہے، خطبۂ حجۃ الوداع وغیرہ اور تمام خطبات میں جیسا کہ آگے آتا ہے یہ خصوصیت نمایاں ہے، جوش بیان کا یہ حال تھا کہ آنکھیں سرخ اور آواز نہایت بلند ہو جاتی تھی، غصہ بڑھ جاتا تھا، انگلیاں اٹھتی جاتی تھیں گویا یہ معلوم ہوتا تھا کہ آپ کسی فوج کو جنگ کے لئے ابھار رہے ہیں[2]، جوش بیان میں جسد مبارک جھوم جھوم جاتا تھا[3]، ہاتھوں کو حرکت دینے سے پٹھوں کے چٹخنے کی آواز آتی تھی[4]، کبھی مٹھی بند کر لیتے تھے، کبھی کھول دیتے تھے[5]، حضرت عبد اللہؓ بن عمرؓ نے اس قسم کی پرجوش حالت کی نہایت صحیح تصویر ان الفاظ میں کھینچی ہے،

[1] ابوداؤد جلد ا کتاب الصلوٰۃ ابواب الجمعۃ والخطبۃ علی قوس [2] صحیح مسلم باب تخفیف الصلوٰۃ والخطبہ ص ۳۱۹ جلد ۱
[3] ابن ماجہ ذکر البعث [4] مسند ابن حنبل جلد ۲ صفحہ ۴۰۲،

سمعت رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم علی المنبر	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو منبر پر خطبہ دیتے سنا فرما رہے تھے کہ
یقول یاخذ الجبار سمٰواتہ وارضہ بیدہٖ	خداوند صاحب جبروت آسمان و زمین کو اپنے ہاتھ میں لیگا
قبض یدہ فجعل یقبضھا ویبسطھا.....	یہ بیان کرتے ہوئے آپ مٹھی بند کر لیتے تھے اور پھر کھول دیتے تھے...
قال ویتمائل رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم	......آپ کا جسم مبارک کبھی دائیں کبھی بائیں جھکتا جاتا تھا،
عن یمینہٖ وعن شمالہٖ حتی نظرت الی المنبر	یہاں تک کہ میں نے منبر کو دیکھا تو اس کا سب سے نچلا حصہ
یتحرک من اسفل شیٔ منہ حتی انی لاقول اساقط	بھی اس قدر ہل رہا تھا کہ میں نے خیال کیا کہ آپ کو
ھو برسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم (ابن ماجہ ذکر البعث)	نے کر گر تو نہیں پڑے گا،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خطبات کی نوعیت

احادیث کی کتابوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خطبات اور اُن کے جستہ جستہ فقرے بغیر کسی خاص ترکیب کے جمع کر دیئے گئے ہیں لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مختلف حیثیتیں تھیں، اور اس کا اثر آپکے طرز بیان پر پڑتا تھا آپ داعی مذہب تھے، فاتح تھے، واعظ تھے، امیر الجیش تھے، قاضی تھے، پیغمبر تھے، اس اختلاف حیثیت نے آپکے خطابت اور زور بیان میں نہایت اختلاف پیدا کر دیا ہے، اور بلاغت کا اقتضا بھی یہی ہے، آپ بحیثیت داعی مذہب ہونے کے جو خطبہ دیتے تھے، اس میں نہایت زور اور جوش پیدا ہو جاتا تھا، اور اُس وقت آپ کی حیثیت بالکل ایک میر لجیش کی ہوتی تھی، چنانچہ جس وقت یہ آیت نازل ہوئی،

وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ، اپنے اقرباء کو ڈراؤ،

تو آپ نے تمام قریش کو جمع کر کے ایک خطبہ دینا چاہا، ابولہب کی شقاوت نے اگرچہ اس خطبہ کو پورا نہیں ہونے دیا، تاہم آپ کی زبان سے اس واقعہ پر جو چند جملے نکل گئے اس سے

آپکے زور بیان کا اندازہ ہو سکتا ہی، آپنے صفا پر چڑھ کر پہلے پکارا "یا صباحاہ" یہ وہ لفظ ہے، جو عرب میں اس وقت بولا جاتا ہے، جب صبح کے وقت کوئی قبیلہ کسی پر دفعۃً غارت گری کے لئے ٹوٹ پڑتا ہی، تمام لوگ یہ لفظ سُن کر چونک اٹھے اور آپکے گرد جمع ہو گئے آپنے فرمایا،

ارأیتم ان اخبرتکم ان خیلا تخرج من سفح ہذا الجبل اکنتم مصدقی،

بتاؤ اگر میں تمہیں یہ خبر دوں کہ اس پہاڑ کے دامن سے ایک فوج نکلا چاہتی ہی تو کیا تم میری تصدیق کروگے

سب نے جواب دیا، ابتک آپ کی نسبت ہم کو کسی قسم کی دروغ گوئی کا تجربہ نہیں ہوا ہے، جب آپنے یہ اقرار لے لیا، تو فرمایا،

انی نذیر لکم بین یدی عذاب شدید،

میں تمہیں ایک ایسے سخت عذاب سے ڈراتا ہوں جو تمہارے سامنے ہے،

ابولہب نے نہایت استخفاف کے ساتھ کہا، کیا ہم سبھوں کو اسی لئے جمع کیا تھا، یہ کہکر چل کھڑا ہوا[1]،

غزوۂ حنین میں آپنے تمام مال غنیمت مؤلفۃ القلوب کو دیدیا، اور انصار بالکل محروم رہ گئے تو چند نوجوانوں کو یہ نہایت ناگوار ہوا، اور انھوں نے کہا خدا پیغمبر کی مغفرت کرے، قریش کو دیتا ہے اور ہم کو چھوڑ دیتا ہی، حالانکہ ہماری تلواروں سے خون ٹپک رہا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر ہوئی تو تمام انصار کو ایک خیمہ میں جمع کرکے اصل حقیقت دریافت فرمائی، لوگوں نے کہا چند نوجوانوں نے یہ کہا ہی لیکن ہم میں جو لوگ صاحب الرائے اور سردار ہیں، انھوں نے ایک لفظ بھی نہیں کہا، اب آپنے اس

---

[1] بخاری جلد ۲ ص ۷۴۳ تفسیر سورۂ تبت۔

موقع پر کھڑے ہو کر ایک خطبہ دیا،

یا معشر الانصار الم اجدکم ضلالا فهداکم الله بی وکنتم متفرقین فالّفکم الله بی وعالة فاغناکم الله بی،	اے گروہ انصار! کیا میں نے تم کو گمراہ نہیں پایا، پھر خدا نے میری وجہ سے تمہیں ہدایت دی، تم متفرق تھے خدا نے میری وجہ سے تم کو مجتمع کر دیا، تم محتاج تھے خدا نے میری وجہ سے تم کو غنی کر دیا،

انصار ہر بات پر کہتے جاتے تھے "خدا اور اس کا رسول بہت امین ہے،" آپ نے فرمایا "یہ کیوں نہیں کہتے کہ اے محمدؐ! تم اس حالت میں آئے تھے کہ لوگ تمہاری تکذیب کرتے تھے، ہم نے تمہاری تصدیق کی، تمہارا کوئی مددگار نہ تھا ہم نے تمہاری مدد کی، تم گھر سے نکالے ہوئے تھے، ہم نے تم کو گھر دیا، تم محتاج تھے ہم نے تمہاری غمخواری کی" اس کے بعد آپ نے اصل اعتراض کا جواب دیا،

اترضون ان یذهب الناس بالشاة والبعیر وتذهبون بالنبی الی رحالکم فوالله لما تنقلبون به خیر مما ینقلبون،	کیا تم یہ نہیں پسند کرتے کہ لوگ اونٹ اور بکریاں لیکے جائیں، اور تم اپنے گھروں میں خود پیغمبر کو لیکر جاؤ" خدا کی قسم تم لوگ جو لیکر واپس جاتے ہو وہ اس سے بہتر ہے جسکو وہ لیکر جا رہے ہیں،

اس پر تمام انصار پکار اٹھے "رضینا" یعنی ہم سب راضی ہیں،[1]

اس خطبہ کے وجوہ بلاغت پر اگر غور کیا جائے تو ایک مختصر سا رسالہ تیار ہو سکتا ہے، فاتحانہ حیثیت سے آپ نے صرف فتح مکہ کے موقع پر ایک تقریر کی تھی جس کے جستہ جستہ فقرے احادیث کی کتابوں میں مذکور ہیں، مکہ عرب کے نزدیک نہایت مقدس شہر تھا، حرم ایک دارالامان تھا جس میں کبھی خونریزی نہیں ہو سکتی تھی، فتح مکہ میں سب سے پہلے اس کے دامن عظمت پر خون کا دھبہ لگایا گیا،

---

[1] صحیح بخاری غزوۂ حنین،

اور چونکہ مذہب کے ہاتھ سے لگایا گیا تھا، اس لئے خیال پیدا ہو سکتا تھا کہ ہمیشہ کیلئے اس کا احترام نہ مٹ جائے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ان ہی دونوں پہلوؤں پر اپنی تقریر میں زور دینا تھا، چنانچہ آپنے بہ ترتیب ان ہی کی طرف توجہ کی، سب سے پہلے آپنے صحابہ کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا،

ان اللہ حرم مکۃ یوم خلق السمٰوٰت والارض فھی حرام بحرام اللہ الی یوم القیمۃ لم تحل لاحد قبلی ولا تحل لاحد بعدی ولم تحلل لی قط الا ساعۃ من الدھر لا ینفر صیدھا ولا یعضد شوکھا ولا یختلی خلاھا ولا تحل لقطتھا الا لمنشد،

خدانے جس دن آسمان اور زمین کو پیدا کیا، اسی دن مکہ کو حرام کر دیا، پس وہ بحرمت خدا حرام ہے، وہ میری پہلے نہ کسی پر حلال ہوا، اور نہ میرے بعد حلال ہوگا، اور میرے لئے بھی بجز چند گھنٹوں کے ہرگز حلال نہیں ہوا، نہ اسکے شکار کو بدکایا جا سکتا، نہ اس کا کانٹا کاٹا جا سکتا، نہ اس کی گھاس کاٹی جا سکتی، نہ اسکی گمشدہ چیز حلال ہو سکتی ہے،

[illegible]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا سب سے مہتم بالشان خطبہ وہ ہے جو آپنے حجۃ الوداع میں دیا تھا، یہ خطبہ صرف احکام کا ایک سادہ مجموعہ ہے جس کو قدرۃً خشک اور روکھا پھیکا ہونا چاہئے، تاہم سلاست، روانی اور شستگی الفاظ کے لحاظ سے یہ خطبہ بھی اور خطبوں سے کم نہیں، آپنے حمد و نعت کے بعد اس خطبہ کی اہمیت اسطرح ظاہر کی،

ایھا الناس اسمعوا فانی لا ادری لعلی لا القاکم بعد عامی ھذا فی موقفی ھذا فی شہرکم ھذا فی بلدکم ھذا

لوگو! سنو! کیونکہ شاید میں اس سال کے بعد اس جگہ اس مہینہ میں، اس شہر میں تم سے نہ مل سکوں،

سادہ سا جملہ یہ تھا کہ غالبا یہ میری عمر کا آخری سال ہے، لیکن اس تفصیل اور اس پیرایہ بیان نے اس مفہوم کو اور بھی زوردار بنا دیا ہے، آپنے فرمایا کہ مسلمانوں کی عزت و آبرو، جان، مال، سب مسلمانوں پر حرام ہے، اس مطلب کو اس بلیغ طریقہ سے ادا کیا ہے،

اتدرون ای یوم هذا قالوا الله ورسوله اعلم قال فان هذا یوم حرام افتدرون ای بلد هذا، قالوا الله ورسوله اعلم قال بلد حرام قال اتدرون ای شهر هذا قالوا الله ورسوله اعلم قال شهر حرام۔

کیا جانتے ہو کہ یہ کونسا دن ہے؟ لوگوں نے کہا خدا اور رسول کو اس کا علم ہے آپنے فرمایا، یہ یوم الحرام ہے، کیا جانتے ہو کہ یہ کونسا شہر ہے؟ لوگوں نے کہا خدا اور رسول کو اس کا علم ہے آپنے کہا بلد الحرام ہے، کیا جانتے ہو یہ کونسا مہینہ ہے، لوگوں نے کہا خدا اور رسول کو اس کا علم ہے، آپنے فرمایا شہر حرام

(بخاری باب الخطبۃ ایام منیٰ)

اس طرح جب لوگوں کے دل میں اس دن اس مہینہ اور اس شہر کی حرمت کا خیال تازہ ہو گیا، تو آپنے اصل مقصود کو بیان کیا،

ان الله حرم علیکم دماءکم واموالکم واعراضکم کحرمة یومکم هذا فی شهرکم هذا فی بلدکم هذا، لا ترجعوا بعدی کفارا یضرب بعضکم رقاب بعض،

خدا نے تمہارا خون، تمہارا مال، تمہاری آبرو، تم پر اس مہینہ میں، اس شہر میں، اس دن کی حرمت کی طرح حرام کیا، میرے بعد کافر نہ ہو جانا کہ تم میں ہر ایک دوسرے کی گردن مارے،

آپنے ان الفاظ میں مساوات کی تعلیم دی ہے،

ان ربکم واحد وان اباءکم واحد کلکم من آدم وآدم من تراب ان اکرمکم عند الله اتقاکم،

تمہارا خدا ایک تمہارا باپ ایک، تم سب آدم کی اولاد ہو، اور آدم مٹی کے تھے، خدا کے نزدیک تم میں شریف تر وہ ہے، جو زیادہ پرہیزگار ہے،

عرب کا عام ذریعۂ معاش غارتگری تھی، لیکن شہر حرام کے چار مہینے تک وہ لوگ بیکار نہیں رہ سکتے تھے اسلئے ان مہینوں کو ادل بدل کیا کرتے تھے، جس کو نسئی کہتے ہیں، قرآن مجید نے اسکی ممانعت کی

إنما النسئ زيادة في الكفر — نسی کفر میں اضافہ کرتی ہے،

آپ نے اپنے خطبہ میں اس کا اعلان ان الفاظ میں فرمایا،

إن الزمان قد استدار كهيئته يوم خلق الله السموات والأرض، — زمانہ ہر پھر کے پھر اسی مرکز پر آگیا، جیسا کہ اس دن تھا جب خدا نے آسمان و زمین کو پیدا کیا تھا،

ان حیثیتوں کے علاوہ آپ کی حیثیت ایک معلّم اور واعظ کی تھی، آپ نے اس حیثیت سے جو خطبے دیئے ہیں، وہ اگرچہ نہایت سادہ ہیں تاہم ان میں بھی مجموعی بلاغت کا اسلوب موجود ہے، ایک اخلاقی وعظ کے لئے پیچدار ترکیب، شاندار الفاظ اور تشبیہ و استعارہ کی ضرورت نہیں ہوتی، اس کو صرف سادہ الفاظ، واضح جملے، اور مختصر ترکیبوں سے مطالب کو ذہن نشین کرنا پڑتا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حیثیت سے جو خطبے دئے ہیں، وہ تمامتر اسی قسم کے ہیں، مدینہ آکر سب سے پہلا فقرہ جو زبان مبارک سے نکلا یہ تھا،

يا أيها الناس، أفشوا السلام، وأطعموا الطعام، وصلوا والناس نيام، تدخلوا الجنة بسلام — لوگو! اسلام پھیلاؤ، کھانا کھلایا کرو، نماز پڑھا کرو جب لوگ سوتے ہوں، جنت میں سلامتی کیساتھ داخل ہو جاؤ گے،

مدینہ میں جو سب سے پہلا جمعہ آپ نے پڑھا ہے، ابن اسحاق کی روایت کے مطابق حمد و ثنا کے بعد اس میں آپ نے یہ خطبہ دیا تھا،

أما بعد أيها الناس فقدموا لأنفسكم تعلمن والله ليصعقن أحدكم ثم ليدعن غنمه ليس لها راع ثم ليقولن له ربه ليس له ترجمان ولا — حمد و ثنا کے بعد اے لوگو! اپنے لئے پہلے سے سامان کرو، تم کو معلوم ہو جائیگا کہ خدا کی قسم تم میں سے ایک جب بیہوش و حواس کھو چکے گا اور اپنی بکریوں (مال و دولت) کو چھوڑ جائیگا،

حاجب یحجبه دونه الم یأتك رسولی فبلغك
واتیتك مالا فافضلت علیك فما قدمت
لنفسك فلینظرن یمیناً وشمالاً فلا یری
شیئاً ثم لینظرن قدامه فلا یری غیر جهنم
فمن استطاع ان یتقی بوجهه من النار و
لو بشق من تمرة فلیفعل ومن لم یجد فبکلمة
طیبة فانها تجزی الحسنة بعشر امثالها
الی سبع مائة ضعف والسلام علیکم
ورحمة الله وبرکاته،

جنکا کوئی نگہبان نہ ہوگا پھر خدا اس کیلئے بیچ میں کوئی ترجمان ہوگا
نہ دربان جو روکیگا، اس سے کہیگا کہ کیا تیرے پاس میرا فرستادہ
نہیں آیا، اور میرا پیغام نہیں پہنچایا، اور میں نے تم کو دولت نہیں دی
اور حاجت سے زیادہ نہیں عطا کیا تو تو نے اپنے لئے کیا سامان
کیا اس وقت وہ بندہ دائیں بائیں دیکھے گا تو اسکو کچھ نظر نہیں آئیگا
اپنے سامنے دیکھے گا تو جہنم کے سوا اس کو کوئی چیز نظر نہیں آئیگی
بس جس کو قدرت ہو وہ اپنے کو آگ سے بچائے، گو چھوہارے کے ایک
ٹکڑے ہی سے کیوں نہ ہو کسی کے پاس یہ بھی نہ ہو تو ایک اچھی اور
خوش خلاقی کی بات ہی سے کیونکہ ایک نیکی کا بدلہ دہ گونہ

[illegible]

اس کے بعد دوسری دفعہ آپنے فرمایا:

الحمد لله احمده واستعینه نعوذ بالله من
شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یهدی الله
فلا مضل له ومن یضلل فلا هادی له و
اشهد ان لا اله الا الله وحده لا شریك له
ان احسن الحدیث کتاب الله قد افلح من
زینه الله فی قلبه وادخله فی الاسلام
بعد الکفر فاختاره علی ما سواه من احادیث

خدا کی حمد ہو میں خدا کی حمد کرتا ہوں اور اسکے دامن میں ہم اپنے نفس کی
برائیوں اور اپنے اعمال کی خرابیوں سے پناہ چاہتے ہیں جس کو خدا ہدایت دیدے
اسکو کوئی گمراہ نہیں کر سکتا اور جسکو وہ ہدایت نہ کرے اسکی کوئی رہنمائی
کرنیوالا نہیں میں گواہی دیتا ہوں کہ خدا کے سوا کوئی اور معبود نہیں وہی
تنہا ہے کوئی اسکا شریک نہیں، بہترین کلام خدا کی کتاب ہے کامیاب
ہوا وہ جس کے دل کو خدا نے اس سے آراستہ کیا، اور اسکو کفر کے
بعد اسلام میں داخل کیا انسانوں کی باتوں کو چھوڑ کر خدا کے کلام کو

الناس انه احسن الحديث وابلغه احبوا
ما احب الله احبوا الله من كل قلوبكم
ولا تملوا كلام الله وذكره ولا تقس
عنه قلوبكم فاعبدوا الله ولا تشركوا
به شيئا واتقوه حق تقاته وصدقوا
الله صالح ما تقولون بافواهكم وتحابوا
بروح الله بينكم ان الله يغضب ان
ينكث عهده والسلام عليكم و
رحمة الله وبركاته،

پسند کیا، کیونکہ خدا کا کلام سب سے زیادہ بہتر اور سب سے زیادہ
پُراثر ہے جس کو خدا دوست رکھتا ہے تم بھی دوست رکھو اور
خدا کو دل سے پیار کرو اور اس کے کلام اور ذکر سے کبھی نہ تھکو
اور تمہارے دل اسکی طرف سے سخت نہ ہوں پس خدا ہی کو
پوجو اور کسی کو اس کا ساجھی نہ بناؤ، اور اس سے ڈرو جیسا کہ
اس سے ڈرنے کا حق ہے اور خدا سے سچی بات کہو اور آپس میں
ایک دوسرے کو ذات الٰہی کے واسطہ سے پیار کرو خدا
اس سے ناراض ہوتا ہے کہ کوئی اپنے عہد کو پورا نہ کرے
تم پر خدا کی سلامتی اور رحمت اور برکت نازل ہو،

ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ دیا جس میں صرف پانچ باتیں بیان کیں،

ان الله لا ينام ولا ينبغي له ان ينام يخفض
القسط ويرفعه يرفع اليه عمل الليل قبل
عمل النهار، وعمل النهار قبل عمل الليل
حجابه النور (صحیح مسلم روایة الله تعالیٰ)

ہاں خدا سوتا نہیں اور نہ سونا اس کی ذات کے شایان
شان ہے، وہی قسمت کو پست و بلند کرتا ہے اور رات
کے اعمال، اس کو دن سے پہلے پہنچ جاتے ہیں، اور
دن کے اعمال رات سے پہلے، خدا کا پردہ نور ہے،

جمعہ کے خطبہ میں عموماً زہد و رقاق حسن اخلاق، خوفِ قیامت، عذابِ قبر، توحید صفاتِ الٰہی بیان کرتے تھے، ہفتہ میں کوئی عظیم الشان واقعہ پیش آتا تھا، تو اس کے متعلق ہدایت فرماتے تھے اکثر ایسا بھی کرتے کہ نئے خطبہ کے بجائے قرآن مجید کے انہی مضامین کی کوئی مؤثر صورت ق وغیرہ

پڑھ دیا کرتے، یہ سورہ آپ جمعہ کے خطبہ میں اکثر و بیشتر پڑھا کرتے تھے، عید کے خطبہ میں ان مضامین کے علاوہ صدقہ پر خاص طور پر زور دیتے تھے، اتفاقی خطبے ضرورت کے موقع پر دیا کرتے تھے، اور ان میں مقتضائے وقت کے مناسب مطالب بیان فرماتے تھے، ایک دفعہ آفتاب میں گہن لگا، اتفاق سے اسی دن آپکے کمسن فرزند حضرت ابراہیمؑ نے وفات پائی تھی، مزعوماتِ عرب کے مطابق لوگون نے کہا کہ یہ گہن اسی لئے لگا ہے، آپنے اس موقع پر حسب ذیل خطبہ دیا،

اما بعد یا ایھا الناس انما الشمس والقمر آیتان من آیات اللہ وانھما لاینکسفان لموت احد من الناس،

حمد و ثنا کے بعد، لوگو! آفتاب و ماہتاب خدا کی دو نشانیاں ہیں، وہ کسی کے مرنے سے تاریک نہیں ہوتے،

ما من شی لم اکن رأیتہ الا قد رأیتہ من مقامی ھذا حتی الجنۃ والنار وانہ قد اوحی الی انکم تفتنون فی القبور مثل فتنۃ الدجال فیؤتی احدکم فیقال ما علمک بھذا الرجال فاما المؤمن فیقول ھو محمد ھو رسول اللہ جاء بالبینات والھدی فاجبنا واطعنا، اما المرتاب فیقول لا ادری سمعت الناس یقولون شیئا فقلتہ،

جس چیز کو میں نے پہلے نہیں دیکھا تھا، اس کو یہیں دیکھ لیا، یہاں تک کہ جنت، دوزخ کو بھی، اور ہاں مجھے وحی کی گئی ہے، کہ تم قبروں میں آزمائے جاؤگے جس طرح دجال سے آزمائے جاؤگے، تم میں سے ہر ایک شخص کے پاس ایک آنے والا آئیگا اور پوچھے گا کہ اس شخص (یعنی خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم) کی نسبت کیا جانتے ہو؟ یقین والے کہیں گے، کہ یہ محمد ہیں، یہ خدا کے رسول ہیں، جو نشانیاں اور ہدایتیں لیکر آئے تو ہم نے اُن کو قبول کیا، اور اُن کی پیروی کی، اور شک کرنے والے کہیں گے، میں نہیں جانتا، لوگوں کو جو کہتے سنا، کہدیا،

اِنَّہٗ عرض علی کل شئی تولجونہ فعرضت	میرے سامنے وہ تمام مقامات پیش ہوئے جن میں تم
علی الجنۃ حتی لو تناولت منہا قطفًا اخذتہ	داخل ہوگے تا آنکہ اگر میں چاہتا تو اس کا پھل توڑ لیتا
فقصر یدی عنہ وعرضت علی النار فرأیت	لیکن میرا ہاتھ رک گیا، دوزخ میرے سامنے رونما کی گئی
فیہا امرأۃ تعذب فی ھرۃ لہا وبطتہا فلم	اس میں ایک عورت کو دیکھا جس کو صرف اسلئے سزا دیجا رہی
تطعمہا ولم تدعہا تاکل من خشاش	تھی کہ اس نے ایک بلی کو باندھ رکھا تھا نہ اسکو خود کچھ کھانے
الارض ورأیت ابا ثمامۃ عمرو بن مالک یجر قصبہ	کو دیتی تھی اور نہ چھوڑتی تھی کہ وہ زمین کی گری پڑی
فی النار وانہم کانوا یقولون ان الشمس والقمر	کوئی چیز کھائے، نیز میں نے دوزخ میں ابو ثمامہ عمرو بن مالک کو
لا یخسفان الا لموت عظیم وانہ ایتان	دیکھا تو یہ وہ لوگ تھے جو کہتے تھے کہ آفتاب و ماہتاب میں
من ایات اللہ یریکموہما فاذا خسفا	کسی بڑے آدمی کی موت سے گہن لگتا ہے حالانکہ وہ تو خدا
فصلوا حتی تنجلی[1]	کی دو نشانیاں ہیں، جب تم گہن دیکھو تو نماز

[illegible]

[1] صحیح مسلم باب [illegible]

رد بدعت اور اعتصام بالسنۃ میں آپ کا یہ مختصر خطبہ، بتغیر الفاظ حدیث کی اکثر کتابوں میں منقول ہے

انما ھما اثنتان الکلام والھدی فاحسن	صرف دو باتیں ہیں، قول اور عملی طریقہ، تو عمدہ کلام خدا کا
الکلام کلام اللہ فاحسن الھدی ھدی	کلام ہے اور عمدہ طریقہ محمد کا طریقہ ہے، خبردار (مذہب میں)
محمد الا وایاکم ومحدثات الامور فان شر	نئی باتوں سے بچو، نئی باتیں بدترین چیزیں ہیں، ہر نئی بات
الامور محدثاتہا وکل محدثۃ بدعۃ	بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے، تم کو درازی عمر کا خیال
وکل بدعۃ ضلالۃ الا لا یطولن علیکم	نہ پیدا ہو کہ تمہارے دل سخت ہو جائیں، اور جو چیز
الامد فیقسوا قلوبکم الا ان ما ھو آت	آنے والی ہے وہ قریب ہے، دور وہ چیز ہے جو آنے والی نہیں ہے

قریب وان البعید ما لیس بآتٍ الا انما الشقی	بدبخت اپنی ماں کے پیٹ میں بدبخت ہوا، خوش نصیب
من شقی فی بطن امه والسعید من وعظ	وہ ہے جو غیر سے موعظت حاصل کرے، خبردار! مسلمان
بغیرہ الا ان قتال المومن کفر وسبابه	سے لڑنا کفر، اور اس کو گالی گلوچ کرنا فسق ہے، مسلمان
فسوق ولا یحل لمسلم ان یهجر اخاه	کے لئے جائز نہیں کہ تین دن سے زیادہ اپنے
فوق ثلاث الا وایاکم والکذب،	بھائی سے رنجیدہ رہے، ہاں خبردار جھوٹ
(ابن ماجہ (باب اجتناب البدع)	سے پرہیز کرنا،

اثر انگیزی (خطبات نبوی تاثیر اور رقت انگیزی میں درحقیقت معجزۂ الٰہی تھے، پتھر سے پتھر دل بھی ان کو سُن کر چند لمحوں میں موم ہو جاتے تھے مکہ میں ایک دفعہ آپ نے سورۂ والنجم کی آیتیں تلاوت کر کے سنائیں تو یہ اثر ہوا کہ آپ کے ساتھ مسلمان تو مسلمان بڑے بڑے کفار بھی سجدہ میں گر پڑے۔[1]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانۂ جاہلیت کے ایک دوست جو جھاڑ پھونک کرنا جانتے تھے، یہ سن کر کہ نعوذ باللہ آپ کو جنون ہے، بغرض علاج آئے، آپ نے ان کے سامنے مختصر سی تقریر کی، انھوں نے کہا محمد ذرا اس کو پھر تو دہرانا، غرض آپ نے کئی دفعہ تقریر دہرائی، تو انھوں نے کہا میں نے شاعروں کے قصیدے اور کاہنوں کے کلام سُنے ہیں لیکن یہ تو چیز ہی اور ہے۔[2]

ایک دفعہ ایک نومسلم قبیلہ ہجرت کر کے مدینہ آیا، آپ نے ان کی امداد کی ضرورت سمجھی، مسجد نبوی میں تمام مسلمان جمع ہوئے تو آپ نے ایک خطبہ دیا جس میں قرآن مجید کی یہ آیت پڑھی کہ تمام انسان ایک ہی نسل سے ہیں یعنی

---

[1] صحیح بخاری سورۂ والنجم [2] صحیح مسلم باب تخفیف الصلوٰۃ وقصر الخطبہ،

یَا اَیُّھَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّکُمُ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَۃٍ، — اے لوگو! اس خدا سے ڈرو جس نے ایک ذات سے تم سب کو پیدا کیا،

پھر سورۂ حشر کی یہ آیت تلاوت کی، وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ،

اس کے بعد فرمایا "درہم، کپڑا، غلہ، بلکہ چھوہارے کا ایک ٹکڑا، جو ہو، راہ خدا میں دو" مدینہ کے مسلمانوں کی مالی حالت جیسی تھی وہ سیرت کے ہر صفحہ سے ظاہر ہے لیکن باایں ہمہ آپ کی رقت انگیز اور موثر تقریر سے یہ عالم پیدا ہو گیا کہ ہر صحابی کے پاس جو کچھ تھا، اس نے سامنے رکھ دیا، بعضوں نے اپنے کپڑے اتار دیے، کسی نے گھر کا غلہ لاکر دیدیا، ایک انصاری گئے، اور گھر سے اشرفیوں کا ایک توڑا اٹھا لائے جو اس قدر بھاری تھا کہ بمشکل ان سے اٹھ سکتا تھا، راوی کا بیان ہے کہ تھوڑی ہی دیر کے بعد آپ کے سامنے غلہ اور کپڑے کے دو بڑے بڑے ڈھیر لگ گئے، اور خوشی سے آپ کا چہرہ کندن کی طرح دمکنے لگا،[۱]

سخت سے سخت اشتعال انگیز اوقات میں آپ کے چند فقرے معاملہ کو رفع دفع کرکے جوشِ محبت کا دریا بہا دیتے تھے، اوس و خزرج کی سالہا سال کی عداوتیں اسی اعجاز کی بدولت مبدل بہ محبت ہو گئیں، غزوۂ بدر سے پہلے آپ ایک دفعہ ایک سمت سے ہو کر نکلے، مسلمان اور منافقین یکجا بیٹھے ہوئے تھے، مسلمانوں نے تو ادب سے سلام کیا، لیکن منافقین نے ایک گستاخانہ فقرہ .... استعمال کیا، یہ چنگاری تھی جس نے خرمن میں آگ لگا دی، قریب تھا کہ جنگ و جدل برپا ہو جائے لیکن آپ کے چند فقروں نے آگ پر پانی ڈال دیا،[۲]

[۱] صحیح مسلم باب الصدقات [۲] صحیح بخاری السلام علی جماعۃ فیہا المسلم والکافر،

غزوۂ مصطلق سے واپسی میں ایک واقعہ پر منافقین نے اشتعال پیدا کیا اور بہت ممکن تھا کہ مہاجرین وانصار باہم دست و گریبان ہوجائیں کہ عین وقت پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر ہوئی آپ تشریف لائے تو اس طرح تقریر فرمائی کہ چند لمحوں میں مہاجرین و انصار پھر شیر و شکر تھے[1] واقعۂ افک میں اوس وخزرج میں اس قدر اختلاف پیدا ہوا کہ خاص مسجد نبوی میں شاید تلواریں نیام سے نکل پڑتیں آپ منبر پر تشریف فرما تھے آپ نے سلسلۂ تقریر جاری رکھا اور اثر یہ تھا کہ برادرانہ محبت کی لہریں پھر جاری ہوگئیں[2]

غزوۂ حنین میں مال غنیمت کی تقسیم پر جب انصار میں آزردگی پیدا ہوگئی تھی، اس وقت آپ نے جس بلیغانہ انداز میں تقریر فرمائی ہو اس کا مختصر سا ذکر اوپر گذرچکا ہے اس تقریر کا کیا اثر ہوا؟ یہ ہوا کہ وہی انصار جو چند لمحے پہلے کبیدہ خاطر ہو رہے تھے، اس قدر روئے کہ اُن کی ڈاڑھیاں تر ہوگئیں اور دل کا سارا غبار آب کوثر کے ان قطروں سے دفعۃً دھل گیا[3]

فتح مکہ کے موقع پر انصار کی توقع کے خلاف جب آپ نے روسائے قریش کی جان بخشی فرمائی تو ان میں سے وہ لوگ جن کی آنکھوں میں خلق نبوی کا جلوہ نہ تھا معترض ہوئے کہ "آخر آپ کو اپنے وطن و خاندان کی محبت آہی گئی" آپ کو یہ معلوم ہوا تو تمام انصار کو جمع کرکے دریافت کیا کہ کیا یہ سچ ہے کہ تم نے ایسا کہا ہے، عرض کی ہاں یا رسول اللہ! فرمایا "وطن و خاندان کی پاسداری میرے پیش نظر نہ تھی میں خدا کا بندہ اور اس کا فرستادہ ہوں، میں نے اللہ کی طرف ہجرت کی اور تمہاری طرف، اب میرا جینا تمہارا جینا ہے، اور میرا مرنا تمہارا مرنا ہے" یہ سُن کر انصار پر رقت طاری ہوگئی، اور رونے لگے،

وعظ و نصیحت میں جو خطبات آپ ارشاد فرماتے تھے، وہ بھی اسی قدر موثر ہوتے تھے،

---

[1] صحیح بخاری تفسیر منافقین و ابن سعد غزوۂ مذکور [2] صحیح بخاری قصۂ افک [3] صحیح مسلم فتح مکہ،

ایک صحابی موقع کی تصویر ان الفاظ میں کھینچتے ہیں،

وعظنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یوماً بعد الصلوٰۃ الغداۃ موعظۃ بلیغۃ ذرفت منہا العیون ووجلت منہا القلوب (ترمذی وابوداؤد)

صبح کی نماز کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دن ایسا مؤثر وعظ کہا کہ آنکھیں اشک ریز ہوگئیں، اور دل کانپ اٹھا،

ایک اور مجلس وعظ کے تاثیر کی کیفیت حضرت اسماء بنت ابی بکرؓ بیان کرتی ہیں،

قام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خطیباً فذکر فتنۃ القبر التی یفتتن بہا المرء فلما ذکر ذالک ضج المسلمون ضجۃ،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ دینے کو کھڑے ہوئے، اور اس میں فتنۂ قبر کو بیان کیا، جس میں انسان کی آزمائش کی جائے گی، جب یہ بیان کیا تو مسلمان چیخ اٹھے[1]

حضرت ابوہریرہؓ اور ابوسعیدؓ سے مروی ہے کہ ایک دفعہ آپ خطبہ دے رہے تھے کہ آپ کی زبان مبارک سے یہ الفاظ نکلے وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِہٖ "قسم ہے اُس ذات کی جس کے دستِ قدرت میں میری جان ہے" یہ الفاظ آپ نے تین دفعہ فرمائے، اور پھر جھک گئے، لوگوں پر یہ اثر ہوا کہ جو جہاں تھا وہیں سر جھکا کر رونے لگا، راوی کہتے ہیں کہ ہم کو بھی ہوش نہ رہا، کہ آپ قسم کس بات پر کھا رہے ہیں،[2]

حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ ایک دن آپ نے خطبہ دیا، یہ خطبہ اس قدر مؤثر تھا کہ میں نے ایسا خطبہ نہیں سنا، اثنائے تقریر میں آپ نے فرمایا اے لوگو! جو میں جانتا ہوں اگر تم وہ جانتے تو ہنستے کم اور روتے زیادہ" اس فقرہ کا ادا ہونا تھا کہ لوگوں کی یہ حالت ہوگئی کہ منہ پر کپڑا ڈال کر بے اختیار رونے لگے،[3]

[1] صحیح بخاری ما جاء فی عذاب القبر [2] سنن نسائی کتاب الزکوٰۃ [3] صحیح بخاری تفسیر سورۂ مائدہ،

عباداتِ نبویؐ

فَاِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ وَاِلٰی رَبِّکَ فَارْغَبْ ؏

اے محمد جب تجھے فرصت ملے عبادت کے لئے کھڑے ہو جاؤ اور اپنے رب سے دل لگاؤ،

(دنیا[1] میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا اور کوئی ایسا پیغمبر نہیں گذرا جس کے متعلق صحیح طور پر یہ معلوم ہو سکے کہ اس کا طریقۂ عبادت کیا تھا؟ اس کے کون کون سے اوقات اس کیلئے مخصوص تھے؛ اور اُن کی عبادتوں کی نوعیت کیا تھی، گذشتہ انبیاء میں حضرت نوحؑ، بلکہ آدم سے لیکر حضرت موسیٰ تک جن کے حالات توراۃ میں مذکور ہیں، اُن کی زندگی کا یہ باب صحائفِ بنی اسرائیل سے قطعاً مفقود ہے انجیل میں حضرت عیسیٰؑ کے متعلق کہیں کہیں صرف اسقدر ملتا ہے کہ وہ کبھی کبھی دعائیں مانگا کرتے تھے لیکن جبکہ اُن مذاہب کے پیرؤوں نے اپنے پیغمبروں کے ساتھ اس قدر بے اعتنائی برتی ہے کہ یہ ضروری امور بھی جن پر دین و شریعت کا دار و مدار ہے، وہ محفوظا نہیں رکھ سکے پیروانِ اسلام کو یہ فخر ہے کہ انھوں نے اول سے آخر تک اپنے پیغمبر کے اوقاتِ عبادت، اسکے طریقے، اسکے انواع، اسکی کیفیات غرض اس کے ایک ایک جزئیات کو محفوظ رکھا ہے)

دعا و نماز (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نبوت سے پہلے بھی عبادتِ الٰہی میں مصروف رہتے تھے، اور غارِ حرا میں جاکر مہینوں قیام اور مراقبہ کرتے تھے،[2] نبوت کیساتھ ساتھ آپ کو نماز کا طریقہ بھی بتایا گیا، لیکن چونکہ کفار قریش کا ڈر تھا اسلئے چھپ کر نماز ادا کرتے تھے، نماز کا وقت جب آتا کسی پہاڑ کی گھاٹی میں چلے جاتے اور وہاں نماز پڑھ لیتے، ایک دفعہ آپ حضرت علیؓ کے ساتھ کسی درہ میں نماز پڑھ رہے تھے، اتفاق سے ابو طالب نکلے انھوں نے

---

[1] اضافہ تا ختم باب [2] صحیح بخاری باب بدء الوحی،

دیکھا تو پوچھا بھتیجے! یہ تم کیا کر رہے ہو؟ آپ نے ان کو اسلام کی دعوت دی،[۱]

چاشت کی نماز آپ سب کے سامنے حرم ہی میں ادا کرتے تھے، کیونکہ یہ نماز قریش کے مذہب[۲] میں بھی جائز تھی، صحیح بخاری میں ہے کہ ایک دن آپ حرم میں نماز پڑھ رہے تھے، اور روسائے قریش بیٹھے تمسخر کر رہے تھے، ابوجہل نے کہا "کاش اس وقت کوئی جاتا، اور اونٹ کی اوجھ نجاست سمیت اٹھالاتا، اور محمد جب سجدہ میں جاتے تو وہ ان کی گردن پر ڈال دیتا" چنانچہ اس تجویز کے مطابق یہ فرض عقبہ نے انجام دیا[۳]، نماز میں جب آپ جہر سے قرأت فرماتے تو کفار بُرا بھلا کہتے[۴]،

ایک دفعہ آپ حرم میں نماز ادا کر رہے تھے، بعض اشقیا نے چاہا کہ آپ کے ساتھ گستاخی سے پیش آئیں[۵]، ایک دفعہ ایک شقی نے گلے میں پھانسی ڈالدی[۶]، لیکن باایںہمہ مزاحمت لذت شناس یادِ الٰہی اپنے فرض سے باز نہیں آتا تھا،

راتوں کو اٹھ اٹھ کر آپ نمازیں پڑھا کرتے تھے، اس عبادتِ شبانہ کے متعلق مختلف صحابہ سے مختلف روایتیں ہیں، ایک راوی کا بیان ہے کہ آپ رات بھر نماز میں کھڑے رہے، ام سلمہ رض کہتی ہیں کہ آپ کچھ دیر سوتے، پھر کچھ دیر اٹھ کر نماز میں مصروف ہوتے پھر سوجاتے پھر اٹھ بیٹھتے اور نماز ادا کرتے، غرض صبح تک یہی حالت قائم رہتی، ابن عباس رض کی روایت ہے کہ آدھی رات کے بعد آپ اٹھتے تھے، اور تیرہ رکعتیں ادا کرتے تھے حضرت عائشہ رض کی روایت ۹ رکعت کی ہے محدثین نے ان سب میں تطبیق دی ہے کہ آپ ان طریقوں میں سے ہر ایک طریقہ سے نماز ادا کرتے تھے، ہر راوی نے اپنا مشاہدہ بیان کیا ہے[۷]

۱؎ مسند ابن حنبل ج ۱ ص ۵ ۹ ۲؎ ابن اثیر ۳؎ صحیح بخاری باب طہارۃ والصلوٰۃ ۴؎ صحیح بخاری تفسیر سورۂ بنی اسرائیل ۵؎ ابن ہشام، ذکر قبل ہجرت ۶؎ صحیح بخاری باب مالقی النبی بمکۃ ۷؎ اس بحث کو زرقانی نے شرح مواہب میں بہ تفصیل لکھا ہے، ج ۱، ص ۴۵۵،

عام طور پر آخر میں آپ کا طرزِ عمل وہی تھا جو حضرت عائشہؓ اور ابن عباسؓ کی زبانی عباداتِ شبانہ کے عنوان میں گذر چکا ہے،

فرائض پنجگانہ کے علاوہ آپ کم از کم سنن و نوافل کی ۳۹ رکعتیں روزانہ معمولاً ادا کرتے تھے، دو صبح، چار چاشت، چھ ظہر، چھ عصر، چار پہلے اور دو بعد نماز (حسب روایت حضرت عائشہؓ) دو مغرب، چھ عشاء، تیرہ عشاء و وتر، ان کے علاوہ صلوٰۃ الاوابین، سنت تحیتِ مسجد وغیرہ الگ تھیں، تمام سنن میں سب سے زیادہ صبح کی دو رکعتوں کے آپ سختی سے پابند تھے[۱]، کسی وقت کی سنت خلافِ معمول اگر چھوٹ جاتی، تو اس کی قضا پڑھتے، حالانکہ اصل شریعت کی رو سے اس کی ضرورت عام اُمت کے لئے نہیں، ایسا واقعہ حضر میں صرف ایک ہی دفعہ پیش آیا، یعنی ظہر و عصر کے درمیان ایک وفد خدمتِ قدس میں باریاب ہوا جس کی وجہ سے آپ ظہر کے بعد کی دو رکعت نہ پڑھ سکے، نماز عصر کے بعد آپنے بعض ازواجِ مطہرات کے حجروں میں جا کر دو رکعت نماز ادا کی، چونکہ یہ نماز بالکل خلاف معمول تھی، اسلئے ازواجِ مطہرات نے استفسار کیا، آپنے واقعہ بیان فرمایا، عام اُمت کے لئے ایک نماز کی قضا ایک دفعہ کافی ہو، لیکن آپ جس چیز کو شروع کرتے تھے، پھر اس کو ترک کرنا پسند نہیں فرماتے تھے اس لئے ام المومنین حضرت عائشہؓ اور ام سلمہؓ کا بیان ہے کہ آپنے اس قضا کو تمام عمر ادا کیا،[۲]

رمضان کا مہینہ آپ کی عبادتوں کے لئے سب سے زیادہ ذوق افزا تھا، حضرت ابن عباسؓ بیان کرتے ہیں کہ آپ فیاض تو تھے ہی لیکن جب رمضان کا مہینہ آتا، اور جبریل قرآن سنانے آتے تو آپ کی فیاضی کی کوئی حد نہ رہتی، آپ کی فیاضی ہوا سے بھی آگے نکل جاتی[۳]، رمضان کے آخری عشرہ میں

---

[۱] صحیح بخاری، ابواب نوافل و سنن [۲] مسند احمد و ابوداؤد و صحیح مسلم الرکعتان بعد العصر [۳] صحیح بخاری کتاب الصوم،

آپ اور زیادہ عبادت گزار ہو جاتے، حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ جب رمضان کا آخری عشرہ آتا تو آپ رات رات بھر بیدار رہتے تھے، ازواج سے بے تعلق ہو جاتے تھے، اہلبیت کو نماز کیلئے جگاتے[1] تھے، اس اخیر عشرہ میں آپ عموماً اعتکاف میں بیٹھا کرتے تھے یعنی ہمہ وقت مسجد میں بیٹھکر یاد الٰہی و عبادت گذاری میں مصروف رہتے تھے[2]،

قرآن مجید کی تلاوت روزانہ فرماتے تھے۔ ابوداؤد کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ تلاوت کا وقت نماز عشاء کے بعد تھا[3]، روزانہ سورتوں کی تعداد مقرر تھی، اسی تعداد کے موافق آپ تلاوت کر لیا کرتے تھے، رمضان میں پورے قرآن کا دورہ کرتے تھے[4]، پچھلی رات کو اٹھ کر کوئی موثر سورہ یا چند آیات تلاوت کرتے تھے، حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ رات کو میں نے دیکھا کہ آپ پچھلے پہر بیدار ہوئے، آنکھیں ملتے ہوئے اٹھے، رات کے سناٹے میں تارے جھلملا رہے تھے، آپ نے نظر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا اور یہ آیتیں پڑھیں[5]،

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ	آسمان اور زمین کی پیدایش اور شب و روز کے انقلاب میں ان
اللَّیْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ	دانشمندوں کیلئے نشانیاں ہیں جو اٹھتے بیٹھتے اور پہلو پر لیٹے
الَّذِیْنَ یَذْکُرُوْنَ اللّٰهَ قِیَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰی	ہوئے اللہ کو یاد کرتے ہیں اور آسمان و زمین پر غور کرتے ہیں کہ
جُنُوْبِهِمْ وَیَتَفَکَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ	خدایا تو نے یہ (نظام عالم) بے نتیجہ نہیں پیدا کیا تو پاک ہے
رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا سُبْحٰنَکَ فَقِنَا	پس ہم کو دوزخ کے عذاب سے بچا، خدایا جس کو تو دوزخ میں داخل کرے
عَذَابَ النَّارِ رَبَّنَآ اِنَّکَ مَنْ تُدْخِلِ النَّارَ	اس کو تو نے رسوا کر دیا، گنہگاروں کا کوئی مددگار نہیں، خدایا!

[1] ابوداؤد باب الصوم [2] صحیح بخاری باب الاعتکاف [3] ابوداؤد ابواب شہر رمضان [4] صحیح بخاری بدء الوحی [5] صحیح بخاری و صحیح مسلم صلوٰۃ اللیل

فَقَدْ اَخْزَيْتَهٗ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ۝ رَبَّنَآ اِنَّنَا
سَمِعْنَا مُنَادِيًا يُّنَادِيْ لِلْاِيْمَانِ اَنْ اٰمِنُوْا بِرَبِّكُمْ
فَاٰمَنَّا رَبَّنَا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَكَفِّرْ عَنَّا سَيِّاٰتِنَا
وَتَوَفَّنَا مَعَ الْاَبْرَارِ ۝ رَبَّنَا وَاٰتِنَا مَا وَعَدْتَّنَا
عَلٰي رُسُلِكَ وَلَا تُخْزِنَا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اِنَّكَ لَا
تُخْلِفُ الْمِيْعَادَ ۝ فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ اَنِّىْ
لَآ اُضِيْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ
اُنْثٰى بَعْضُكُمْ مِّنْ بَعْضٍ فَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا
وَاُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَاُوْذُوْا فِيْ سَبِيْلِيْ وَقٰتَلُوْا
وَقُتِلُوْا لَاُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَلَاُدْخِلَنَّهُمْ
جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ثَوَابًا مِّنْ عِنْدِ
اللّٰهِ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الثَّوَابِ (آل عمران - ۲۰)

ہم نے ایک پکارنے والے کی آواز سنی جو پکار کر یہ کہہ رہا تھا کہ اپنے
پروردگار پر ایمان لاؤ تو ہم ایمان لائے، خداوندا تو ہمارے گناہ بخش دے
ہماری برائیوں پر پردہ ڈال اور نیکوں کے ساتھ دنیا سے اٹھا خداوندا
تو نے اپنے رسولوں کے ذریعہ جس چیز کا وعدہ کیا ہے وہ ہم کو عنایت کر
اور قیامت کے دن ہمیں رسوا نہ کرنا تو اپنے وعدہ کے خلاف نہیں
کرتا، پروردگار نے پکار سن لی اور دعا قبول کر لی کہ میں کسی
کام کرنیوالے کے کام کو ضائع نہیں کرتا، مرد ہو یا عورت تم
ایک دوسرے سے ہو جنھوں نے ہجرت کی یا اپنے گھروں سے نکالے گئے اور
میری راہ میں ستائے گئے ہیں، اور وہ لڑے ہیں اور مارے
گئے ہیں، ان سب کے گناہوں کو مٹا دونگا، اور ان کو جنت
میں جگہ دونگا، جن کے نیچے نہریں بہتی ہونگی اللہ کی طرف
سے ان کو یہ جزا ملے گی، اور اللہ ہی کے پاس اچھی جزا ہے

اسی موقع پر آپ یہ الفاظ بھی کہا کرتے تھے، جو سرتاپا اثر اور روحانیت میں ڈوبے ہوئے ہیں

اللّٰھم لک الحمد انت نور السمٰوٰت والارض
ولک الحمد انت قیام السمٰوٰت والارض
ولک الحمد انت رب السمٰوٰت والارض
ومن فیھن انت الحق ووعدک الحق وقولک الحق

خداوندا تیری حمد ہو، تو آسمان و زمین کا نور ہے تیری حمد ہو
تو آسمان و زمین اور جو کچھ ان میں ہے سب کا پروردگار ہے
تو حق ہے، تیرا وعدہ حق ہے، تیری بات حق ہے، تجھ سے ملنا حق ہے
جنت حق ہے اور دوزخ حق ہے قیامت حق ہے خداوندا میں نے

ولقاءک الحق والجنۃ حق والنار حق، والساعۃ حق، اللھم لک اسلمت وبک اٰمنت وعلیک توکلت والیک انبت وبک خاصمت والیک حاکمت فاغفرلی ما قدمت وما اخرت و اسررت وما اعلنت انت الٰھی لا الٰہ الا انت (صحیح مسلم باب الدعا فی صلوٰۃ اللیل)	تیرے ہی آستانہ پر سر جھکایا ہے، تجھی پر ایمان لایا ہوں، تجھی پر میں نے بھروسہ کیا ہے، تیرے ہی زور پر جھگڑتا ہوں، تجھی سے فیصلہ چاہتا ہوں، تو میرا اگلا اور پچھلا، کھلا اور چھپا ہر ایک گناہ معاف کر، تو ہی میرا مسجود ہے، تیرے سوا کوئی اور معبود نہیں،

کبھی گھر کے لوگ جب سو جاتے، آپ چپ چاپ بستر سے اٹھتے اور دعا و مناجات الٰہی میں مصروف ہو جاتے، حضرت عائشہ رض کہتی ہیں کہ ایک رات میری آنکھ کھلی تو آپ کو بستر پر نہ پایا، سمجھی کہ آپ کسی اور بیوی کے حجرے میں تشریف لے گئے، اندھیرے میں ادھر اُدھر ٹٹولا تو دیکھا کہ پیشانی اقدس خاک پر ہے، اور آپ سر بسجود دعا میں مصروف ہیں، یہ دیکھ کر حضرت عائشہ رض کہتی ہیں کہ مجھ کو اپنے شبہہ پر ندامت ہوئی، اور دل میں کہا سبحان اللہ! ہم کس خیال میں ہیں، اور آپ کس عالم میں ہیں[1]، کبھی کبھی راتوں کو اٹھ کر آپ تنِ تنہا قبرستان میں تشریف لیجاتے تھے اور دعا و زاری کرتے تھے، ایک دفعہ آپ کے پیچھے پیچھے حضرت عائشہ رض گئیں تو دیکھا کہ آپ جنت البقیع میں داخل ہوئے، اور یہ دعا مانگی[2]،

دعا اور نماز کے بعد آپ سو جاتے، یہاں تک کہ خراٹے کی آواز سنائی دیتی کہ دفعۃً سپیدۂ صبح نمودار ہوتا، آپ بیدار ہوتے. صبح کی سنت ادا کرکے مسجد کو تشریف لیجاتے، اور اس وقت یہ الفاظ زبانِ مبارک پر ہوتے،

---

[1] سنن نسائی باب الغیرۃ [2] سنن نسائی باب الاستغفار للمومنین،

اللھم اجعل فی قلبی نوراً و فی لسانی نوراً	خدایا میرے دل میں نور پیدا کر اور میری زبان میں
واجعل فی سمعی نوراً واجعل فی بصری نوراً	اور میری قوت سامعہ میں نور پیدا کر، آنکھوں میں
واجعل فی خلفی نوراً و من امامی نوراً واجعل	نور پیدا کر اور میرے پیچھے اور میرے آگے نور پیدا
من فوقی نوراً و تحتی نوراً واعطنی نوراً	کر، میرے اوپر اور میرے نیچے نور پیدا کر،
(صحیح مسلم باب الدعاء فی صلوٰۃ اللیل)	اور مجھے نور عطا کر،

ارکان نماز میں سب سے کم وقفہ رکوع کے بعد قیام میں ہوتا ہے لیکن حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم رکوع کے بعد اتنی دیر کھڑے رہتے تھے کہ ہم لوگ سمجھتے تھے کہ آپ سجدہ میں جانا بھول

جو چیز نماز کی حضوری میں خلل ڈالتی تھی اس سے احتراز فرماتے تھے، ایک دفعہ چادر اوڑھ کر نماز ادا فرمائی جس میں دونوں طرف حاشیے تھے، نماز میں اتفاق سے حاشیوں پر نظر پڑ گئی، نماز سے فارغ ہو کر فرمایا کہ یہ لیجا کر فلاں شخص (ابوجہیم) کو دے آؤ، اور ان سے انبجانی مانگ لاؤ، حاشیوں نے نماز کی حضوری میں خلل ڈالا[۲]

ایک دفعہ دروازے پر منقش پردہ پڑا ہوا تھا، نماز میں اس پر نگاہ پڑی تو حضرت عائشہؓ سے فرمایا کہ اس کو ہٹا دو، اس کے نقش و نگار حضور قلب میں خلل انداز ہوئے[۳])

روزہ | انبیاء اور داعیانِ مذہب نے تکمیل روحانیت کے لیے تقلیل غذا، بلکہ ترک غذا (روزہ) کو اسباب ضروری میں شمار کیا ہے، ہندوستان کے ریاضت کش، اور مرتاض داعیانِ مذہب تو اس راہ میں حد افراط سے بھی آگے نکل گئے ہیں، لیکن داعی اسلام کا طرز عمل اس باب میں افراط اور تفریط کے بیچ میں تھا، اسلام سے پہلے اہل عرب عاشوراء کے دن روزہ رکھا کرتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی معمولاً اس دن

---

۱ مسند ابن حنبل ج ۳ ص ۱۷، ۲ صحیح بخاری ج ۱ ص ۴۸ کتاب الصلوٰۃ، انبجانی ایک کپڑے کا نام ہے ۳ صحیح بخاری کتاب اللباس والصلوٰۃ

روزہ رکھتے تھے بعض حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ مکہ کے قیام کے زمانہ میں آپ متواتر کئی کئی مہینوں تک روزہ رکھتے تھے، لیکن مدینہ آکر اس معمول میں فرق آگیا، مدینہ میں یہود بھی عاشورا کا روزہ رکھتے تھے، آپنے بھی رکھا، بلکہ تمام مسلمانوں کو اس دن روزہ رکھنے کی تاکید فرمائی، لیکن جب رمضان کے روزے فرض ہوئے تو عاشورا کا روزہ نفل رہ گیا۔

رمضان کے علاوہ پورے مہینہ کا روزہ مدینہ میں آپنے کبھی نہیں رکھا، صرف ایک شعبان مستثنیٰ ہے، اس میں قریب قریب پورے مہینہ بھر آپ روزہ سے رہتے، اس طرح سال میں دو مہینے شعبان اور رمضان تو پورے روزوں میں گذرتے تھے سال کے بقیہ مہینوں میں یہ کیفیت رہتی تھی کہ روزہ رکھنے پر آتے تھے تو معلوم ہوتا تھا کہ اب آپ کبھی روزہ نہ توڑیں گے، پھر روزہ توڑ دیتے تھے تو معلوم ہوتا تھا کہ اب کبھی روزہ نہ رکھیں گے، مہینہ کے نصف اول میں جنکو ایام بیض کہتے ہیں، آپ اکثر روزہ سے رہتے تھے، مہینہ میں تین دن دو دو شنبہ اور ایک جمعرات کو معمولاً روزے رکھا کرتے تھے، بعض روایتوں میں ہے کہ جمعہ کا روزہ بھی معمولات میں سے تھا، ان کے علاوہ محرم کے دس دن یکم سے عاشورا تک اور شوال کے آغاز میں چھ دن دوسری سے ساتویں تک آپ روزوں میں گذارتے تھے،[1]

اتفاقی روزے ان کے علاوہ تھے، آپ کبھی گھر میں تشریف لاکر پوچھتے تھے کہ کچھ کھانے کو ہے، جواب ملتا کچھ نہیں، آپ فرماتے تو میں آج روزہ سے ہوں[2] کبھی کبھی آپ صوم وصال بھی رکھتے تھے یعنی متواتر کئی کئی دن تک ایک روزہ رکھتے تھے بیچ میں مطلق افطار نہیں کرتے تھے، یا برائے نام کچھ کھالیتے تھے لیکن جب صحابہ نے اس میں آپ کی تقلید کرنی چاہی تو آپنے منع فرمایا، بعض لوگوں نے

[1] روزہ کے متعلق یہ حدیثیں تمام کتب حدیث میں ہیں، اسوقت ابوداؤد اور صحیح مسلم کتاب الصوم پیش نظر ہیں [2] ابوداؤد باب النیۃ فی الصیام

اس ممانعت کو صرف اس مبنی پر محمول کیا کہ آپ حکماً نہیں بلکہ شفقت سے منع فرماتے ہیں، اس لیے اس ممانعت کے باوجود آپ کے ساتھ انھوں نے بھی اس قسم کے روزے رکھنے شروع کیے آپ کو یہ خبر معلوم ہوئی تو دو دن متصل روزہ رکھا تیسرے دن اتفاق سے چاند ہو گیا، آپ نے فرمایا اگر مہینہ بڑھ سکتا تو میں اتنے دن تک افطار نہ کرتا تاکہ ان مذہب میں غلو کرنے والوں کا سارا غلو جاتا رہتا، صحابہ نے عرض کی یا رسول اللہ پھر حضور کیوں کئی کئی دن تک افطار نہیں کرتے؟ ارشاد ہوا تم میں مجھ سا کون ہے؟ مجھ کو تو ایک کھلانے والا ہے جو کھلاتا ہے، اور ایک پلانے والا ہے جو پلاتا ہے۔ بعض روایتوں میں یہ الفاظ اس طرح وارد ہوئے ہیں "تم میں مجھ جیسا کون ہے میں شب بسر کرتا ہوں تو میرا خدا مجکو کھلاتا اور پلا دیتا ہے[1]"

عام مسلمانوں کے لیے آپ اس قسم کی مذہبی سختیوں کو ناپسند فرماتے تھے، اور عام طور پر خود بھی ان چیزوں سے احتراز کرتے تھے، تفصیلی واقعات آگے آتے ہیں)

زکوٰۃ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اسلام سے پہلے بھی بہت کچھ خیرات اور مبرات کیا کرتے تھے، جیسا کہ آغاز اسلام میں حضرت خدیجہ رض نے شہادت دی ہے[2]، اسلام کے بعد آپ کی یہ کیفیت تھی کہ کوئی چیز نقد اپنے پاس رہنے نہیں دیتے تھے، جو کچھ آتا مستحقین میں تقسیم فرما دیتے لیکن باایں ہمہ زکوٰۃ کا ادا کرنا آپ سے ثابت نہیں، اس سے بعض فقہا نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ انبیاء علیہم السلام پر زکوٰۃ فرض نہیں ہوتی لیکن اصل یہ ہے کہ زکوٰۃ کے دو مفہوم ہیں، ایک مطلق صدقہ و خیرات اور اس باب میں جو آپ کی کیفیت تھی وہ کس سے مخفی ہے؟ دوسرا یہ کہ چاندی سونے یا جانور وغیرہ کی مخصوص مقدار و تعداد پر جو حاجت اصلیہ سے

---

[1] صوم وصال کی یہ حدیثیں صحیح مسلم سے لی گئی ہیں [2] صحیح بخاری بدء الوحی،

زیادہ ہو اور سال بھر تک مالک کے قبضہ میں رہی ہو، ایک خاص شرح رقم ادا کیجائے، یہ مصطلحہ زکوٰۃ کبھی آپ پر فرض ہی نہیں ہوئی، کاشانۂ نبوت میں کوئی قابل زکوٰۃ چیز سال بھر تک تو کیا رہتی یہ بھی پسند خاطر نہ تھا کہ شب گذر جائے اور مال و دولت کا کوئی نشان گھر کے اندر رہ جائے، ایک دفعہ ایسا اتفاق ہوا کہ خراج کی رقم اُس قدر زیادہ آگئی کہ وہ شام تک ختم نہ ہوسکی، آپ نے رات بھر مسجد میں آرام فرمایا، اور کاشانۂ اقدس میں اس وقت تک قدم نہیں رکھا جبتک حضرت بلال رضؓ نے آکر یہ اطلاع نہ دی کہ "یا رسول اللہ! خدا نے آپ کو سبکدوش کیا"[1]

حج اسلام سے پہلے آپ نے جس قدر حج کیے انکی تعداد صحیح متعین نہیں کیجا سکتی، ابن الاثیر نے لکھا ہی چونکہ قریش معمولاً ہر سال حج کیا کرتے تھے، اس لیے قرینہ غالب یہی ہی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی ہر سال حج ادا کرتے ہوں گے، ترمذی[2] میں ہی کہ قیام مکہ کے زمانہ میں آپ نے دو حج کیے تھے، اور ابن ماجہ اور حاکم میں ہے کہ تین حج کیے تھے لیکن یہ سب روایتیں مرسل ہیں، مدینہ کے زمانہ قیام میں متفقاً ثابت ہے کہ صرف ایک حج ۱۰ھ میں کیا[3]، یہ وہی حجۃ الوداع ہے جس کا ذکر بہ تفصیل پہلے گذر چکا ہے، صـ ۱۵۱

حج کے علاوہ آپ نے عمرے بھی ادا کیے ہیں، ہجرت کے بعد چار عمرے ثابت ہیں، ایک عمرہ ذیقعدہ کے مہینہ میں، ایک حدیبیہ کے سال، ایک غزوۂ حنین کے بعد، اور چوتھا حجۃ الوداع کیساتھ[4]، حضرت انس رضؓ کہتے ہیں کہ حجۃ الوداع والے عمرہ کے سوا تمام عمرے آپ نے ذیقعدہ کے مہینہ میں ادا کیے، ایک دفعہ حضرت ابن عمر رضؓ سے کسی نے پوچھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کے عمرے کیے تھے؟ انھوں نے جواب دیا "چار عمرے، ان میں سے ایک ماہ رجب میں" حضرت عائشہ رضؓ نے یہ سنا تو کہا "خدا ابو عبدالرحمٰن (ابن عمر رضؓ کی کنیت) پر رحم فرمائے، آپ نے کوئی عمرہ ایسا نہیں کیا جس میں وہ شریک نہ ہوں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے رجب میں کوئی

---

[1] ابو داؤد باب قبول ہدایا المشرکین [2] باب کم حج النبی صلی اللہ علیہ وسلم [3] زرقانی ج ۸ ص ۱۶۴ [4] صحیح مسلم و ابو داؤد حجۃ الوداع و ترمذی باب کم حج النبی صلی اللہ علیہ وسلم [5] جامع ترمذی باب مذکور،

عمرہ نہیں کیا"[1]

سال حدیبیہ میں سب سے پہلے دفعہ جب آپ عمرہ ادا کرنے کے لیے روانہ ہوئے تھے تو کفار قریش نے قدم قدم پر روکنے کی کوشش کی صحابہ انکی مدافعت میں آپ سے پچھڑ گئے، لیکن آپ کو خانہ کعبہ کی زیارت کا یہ ذوق وشوق تھا کہ اپنے ہمراہیوں کا انتظار کیے بغیر بخطر آپ سب سے آگے بڑھے چلے جارہے تھے، آخر جان نثاروں نے ابوقتادہ انصاری کو بھیجا کہ وہ جاکر ہماری جانب سے سلام عرض کریں اور یہ درخواست کریں کہ آپ ذرا توقف فرمائیں، ہمیں یہ ڈر ہے کہ دشمن کہیں ہمارے اور آپ کے درمیان حائل نہ ہو جائیں" بارے آپ نے ان کی یہ درخواست قبول فرمائی،[2]

دوام ذکر الٰہی | (قرآن مجید نے اہل ایمان کا یہ وصف خاص بیان کیا ہے

اَلَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ (آل عمران) جو خدا کو اٹھتے بیٹھتے یاد کرتے ہیں،

لَا تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ (نور) جنکو اشغال دنیوی خدا کی یاد سے غافل نہیں کرتے،

اور قرآن کا مطلع ان اوصاف کا خود بہترین مظہر تھا، حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہر لحظہ اور لمحہ خدا کی یاد میں مصروف رہتے تھے،[3] ربیعہ بن کعب اسلمی رات کو آپ کے آستانہ پر پہرہ دیتے تھے وہ بیان کرتے ہیں کہ آپ کی تسبیح وتہلیل کی آواز سنتے سنتے میں تھک جاتا تھا اور مجھے نیند آجاتی تھی،[4] اٹھتے بیٹھتے چلتے پھرتے، کھاتے پیتے سوتے جاگتے، وضو کرتے، نئے کپڑے پہنتے، سوار ہوتے، سفر میں جاتے، واپس آتے، گھر میں داخل ہوتے، مسجد میں قدم رکھتے، غرض ہر حالت میں دل وزبان ذکر الٰہی میں مصروف رہتے، چنانچہ اسی بنا پر احادیث میں مختلف اوقات وحالات کیلئے کثرت سے ادعیہ ماثورہ

[1] بخاری ومسلم کتاب الحج [2] صحیح بخاری ص ۲۴۵ باب جزاء الصید [3] ابوداؤد کتاب الطہارۃ [4] مسند ابن حنبل ج ۴ ص ۵۹

منقول ہیں، اخیر زندگی میں جب سورۂ اذا جاء نازل ہوئی جس میں تحمید و تسبیح کا حکم ہے تو امہات المومنین کا بیان ہے کہ ہر وقت اور ہر حالت میں زبان مبارک پر تسبیح و تہلیل جاری رہتی تھی[۱]۔

حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ آپ اکثر یہ دعا رَبِّ اغْفِرْ لِیْ وَتُبْ عَلَیَّ اِنَّکَ اَنْتَ التَّوَّابُ الْغَفُوْرُ تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد پڑھا کرتے تھے، ہم نے گنا تو ایک ایک نشست میں سو سو دفعہ یہ الفاظ آپ کی زبان سے ادا ہوئے[۲]، سفر اور کوچ کی بے اطمینانی میں بھی آپ یاد الٰہی سے غافل نہیں ہوتے تھے، سواری پر بیٹھے بیٹھے نفل ادا کرتے تھے، اور اس کی پروا نہیں کرتے تھے کہ قبلہ کی طرف رخ ہے یا نہیں، سواری کا جانور جدھر چل رہا ہوتا آپ اُدھر ہی منہ کیے نماز کی نیت کر لیتے[۳] کہ اَیْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ، جدھر رخ کرو ادھر ہی خدا کا منہ ہے)

ذوق و شوق (آپ اصحابؓ کی محفل میں یا امہات المومنینؓ کے حجروں میں بات چیت میں مشغول ہوتے کہ دفعۃً اذان کی آواز آتی، آپ اٹھ کھڑے ہوتے[۴]، رات کا ایک معتد بہ حصہ گو شب بیداری میں گذرتا تھا، تاہم صبح کے وقت اُدھر موذن نے اللہ اکبر کہا، ادھر آپ بستر سے اٹھ بیٹھے[۵]، شب کے وقت جس ذوق، شوق اور وجد کی حالت میں نماز پڑھتے اس کا نقشہ حضرت عائشہؓ نے ان الفاظ میں کھینچا ہے، کبھی پوری پوری رات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے رہتے، سورۂ بقرہ، سورۂ آل عمران سورۂ نساء (قرآن کی سب سے بڑی سورتیں ہیں) پڑھتے، جب کوئی خوف اور خشیت کی آیت آتی، خدا سے دعا مانگتے اور پناہ طلب کرتے، کوئی رحمت اور بشارت کی آیت آتی تو اس کے حصول کی دعا مانگتے[۶]" قرأت اتنی زور سے

۱ ابن سعد جزء الوفاۃ ۲ ترمذی و ابن ماجہ و دارمی باب دعوات ۳ صحیح بخاری و مسلم و ابو داؤد وغیرہ ۴ صحیح بخاری باب یکون الرجل فی خدمۃ اہلہ ص ۸۰۰ ۵ صحیح بخاری من انتظر الاقامۃ ۶ مسند ابن حنبل ج ۶، ص ۹۲

فرماتے کہ دور دور تک آواز جاتی، اور لوگ اپنے بستروں پر پڑے پڑے آپ کی آواز سنتےؑ کبھی کبھی کوئی آیت آجاتی کہ آپ اس کے ذوق و شوق میں محو ہوجاتے، حضرت ابوذرؓ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ آپ نے نماز میں یہ آیت پڑھی،

اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ ۚ وَاِنْ تَغْفِرْ	اگر تو سزا دے تو تیرے بندے ہیں، اور اگر معاف
لَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ	کردے تو تو غالب اور حکمت والا ہے،

تو یہ اثر ہوا کہ صبح تک آپ یہی آیت پڑھتے رہ گئے،[۱]

زید بنؓ خالد جہنی ایک صحابی ہیں، وہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے ایک دفعہ ارادہ کیا کہ آج شب میں آپ کو نماز پڑھتے دیکھوں گا۔ (غالباً یہ کسی سفر کا واقعہ ہے،) نماز کا وقت آیا تو آپ نماز کیلئے کھڑے ہوئے، پہلے دو رکعتیں معمولی ادا کیں، پھر دو رکعتیں بہت ہی لمبی اور بڑی دیر تک پڑھیں پھر دو دو رکعتیں کر کے آٹھ رکعتیں بتدریج چھوٹی پڑھیں، اور سب کے آخر میں وتر ادا کی،[۲] خبابؓ کی روایت ہے کہ ایک شب آپؐ نماز کے لیے کھڑے ہوئے تو صبح تک مصروف رہے،[۳]

حضرت حذیفہؓ کہتے ہیں کہ ایک شب مجکو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز پڑھنے کا اتفاق ہوا، آپنے سورۂ بقرہ شروع کی (قرآن کی یہ سب سے بڑی سورہ ہے) میں سمجھا کہ آپ سو آیتوں تک پڑھیں گے لیکن آپ انکو پڑھ کر اور آگے بڑھے میں نے دل میں کہا شاید پوری سورہ آپ ایک ہی رکعت میں ختم کرنا چاہتے ہیں، چنانچہ آپنے جب اس سورہ کو ختم کیا تو میں نے خیال کیا کہ آپ رکوع کرینگے لیکن آپنے فوراً ہی سورۂ نسا شروع کر دی، یہ بھی ختم ہو چکی تو سورۂ آل عمران شروع کی (یہ تینوں سورتیں ملکر

[۱] ابن ماجہ باب ماجاء فی صلوٰۃ اللیل [۲] ایضاً [۳] صحیح مسلم موطا، ابوداؤد [۴] نسائی احیاء اللیل،

سوا پانچ پاروں کے قریب ہیں) بہت ٹھہر ٹھہر کر نہایت سکون اور اطمینان سے آپ قرأت کر رہے تھے، اور ہر آیت کے مضمون کے مطابق بیچ بیچ میں تسبیح اور دعا کرتے جاتے تھے، اس کے بعد آپ نے رکوع کیا، رکوع میں قیام ہی کے برابر توقف فرمایا، پھر کھڑے ہوئے اور اتنی ہی دیر تک کھڑے رہے، پھر سجدہ کیا، اور سجدہ میں بھی اسی قدر تاخیر فرمائی۔[۱]

میدان جنگ میں یاد الٰہی | عین اس وقت جب دونوں طرف سے فوجیں برسرپیکار ہوتیں، تیر و سنان اور تیغ و خنجر کی چمک سے آنکھیں خیرہ ہو رہی ہوتیں اور ہر طرف سے شور و دار و گیر برپا ہوتا، آپ نہایت خضوع و خشوع اور اطمینان قلب کے ساتھ دعا و زاری اور ذکر الٰہی میں مصروف ہوتے، سپاہی شجاعت کے فخر و غرور سے پیشانیوں پر بل ڈالے ہوئے دشمنوں کے مقابلہ میں ہوتے، لیکن خود سپہ سالار کی پیشانی زمین نیاز پر ہوتی، بدر، احد، خندق، خیبر، تبوک تمام بڑے بڑے معرکوں میں آپ کی یہی کیفیت تھی،

معرکہ ہائے جنگ میں سپہ سالاروں کو اپنے بہادر سپاہیوں کی قوت پر ناز ہوتا ہے، لیکن اسلام کے قائد اعظم کو صرف خدائے ذوالجلال کی قوت پر ناز تھا، عالم اسباب کے لحاظ سے گو آپ نے اصول جنگ کے مطابق ہر میدان میں اپنی فوجیں مرتب کیں، لیکن اصلی اعتماد اور بھروسا اسباب کائنات سے ماوراء قادر مطلق کی ذات پر تھا، بدر میں دو صحابی حاضر ہوتے ہیں اور عرض کرتے ہیں کہ یا رسول اللہ ہم کو کافروں نے اس شرط پر رہا کیا ہے کہ ہم جنگ میں شرکت نہ کریں، ارشاد ہوتا ہے کہ ”ہم کو صرف خدا کی مدد درکار ہے“[۲] بدر کا میدان خون سے لالہ زار ہو رہا ہے، اور خشوع و خضوع سے دونوں ہاتھ پھیلا کر بارگاہ ایزدی میں عرض کر رہے ہیں ”خدایا اپنا وعدۂ نصرت پورا کر“، محویت اور بیخودی میں

---

[۱] صحیح مسلم و نسائی صلوٰۃ اللیل [۲] صحیح مسلم باب الوفاء بالعہد،

ردائے مبارک کندھے سے گر گر پڑتی ہے، اور آپ کو خبر تک نہیں ہوتی، کبھی سجدے میں گر پڑتے ہیں اور عرض کرتے ہیں کہ "خدایا! اگر آج یہ چند نفوس مٹ گئے تو پھر قیامت تک تو نہ پوجا جائیگا"[1]

اسی اثنا میں حضرت علیؓ تین دفعہ میدانِ جنگ سے حاضرِ خدمت ہوتے ہیں، اور ہر دفعہ یہ دیکھتے ہیں کہ وہ مقدس پیشانی خاک پر ہے،[2]

غزوۂ اُحد کے خاتمہ پر ابوسفیان مسرت سے ہبل کی جے پکارتا ہے، لیکن آپ اس دل شکستگی کے عالم میں بھی حضرت عمرؓ کو حکم دیتے ہیں کہ تم بھی کہو

اللہ مولانا ولا مولی لکم اللہ اعلی واجل[3] خدا ہمارا آقا ہے، تمھارا کوئی آقا نہیں، خدا بڑا اور بلند ہے

غزوۂ احزاب میں آپ خود اپنے دستِ مبارک سے خندق کھودنے میں مصروف تھے، اور لبِ مبارک پر یہ الفاظ جاری تھے،

اللھم لا خیر الا خیر الآخرۃ فبارک فی الانصار والمھاجرۃ خدایا، بھلائی صرف آخرت کی بھلائی ہے، انصار اور مہاجرین کو برکت عطا کر،

دشمن اس شدت سے حملہ پر حملہ کر رہے تھے کہ کسی مسلمان کا اپنی جگہ سے ہٹنا ممکن نہ تھا، اور یہ محاصرہ ۲۰-۲۲ دن تک قائم رہا، لیکن اس مدت میں صرف ایک یا زیادہ سے زیادہ چار وقت کی نمازیں قضا ہوئیں، ایک دن عصر کے وقت دشمنوں نے اس زور کا حملہ کیا کہ ایک لمحہ کے لیے بھی مہلت نہ مل سکی، آخر عصر کا وقت ختم ہوگیا، آپ کو سخت رنج ہوا، حملہ رکنے پر سب سے پہلے باجماعت نماز ادا کی،[3]

---

[1] صحیح بخاری مسلم، بدر [2] سیرۃ ج اول ص ۰ ۵ ۴ [3] صحیح بخاری اُحد

غزوۂ خیبر میں جب آپ شہر کے قریب پہنچے تو زبان مبارک سے یہ الفاظ نکلے اللہ اکبر خربت خیبر، اللہ اکبر خیبر ویران ہو چکا، عمارتیں نظر آئیں تو صحابہ سے ارشاد کیا کہ ٹھہر جاؤ، پھر یہ دعا مانگی،

اللّٰھم انا نسألک خیر ھذہ القریۃ وخیر اھلھا وخیر ما فیھا ونعوذ بک من شرھا وشر اھلھا وشر ما فیھا (ابن ہشام)

اے خدا ہم تجھ سے اس آبادی کی، اس آبادی والوں کی اس آبادی کی چیزوں کی بھلائی چاہتے ہیں، اور ان سب کی برائیوں سے تیری پناہ کے طلبگار ہیں۔

حنین کے معرکہ میں بارہ ہزار فوج آپکے ساتھ تھی، لیکن اول ہی حملہ میں اس کے پاؤں اکھڑ گئے، اس فوج کا سپہ سالار اگر ان ہی آدمیوں کے بھروسہ پر میدان جنگ میں اترتا تو شاید وہ سب سے پہلے بھاگ کر اپنی جان بچاتا، لیکن آپ کو جس قوت پر اعتماد تھا، آپ اسکو اس تنہائی میں بھی اسی طرح ناصر و مددگار سمجھتے تھے، جس طرح فوج و لشکر کیساتھ، عین اس وقت جب دس ہزار قدر انداز تیروں کا مینھ برساتے ہوئے سیلاب کی طرح بڑھتے چلے آتے تھے، اور آپکے پہلو میں چند جان نثاروں کے سوا کوئی اور باقی نہیں رہا تھا، آپ سواری سے اتر آئے اور فرمایا "میں خدا کا بندہ اور پیغمبر ہوں" پھر بارگاہ الٰہی میں دست بدعا ہو کر نصرتِ موعودہ کی درخواست کی، دفعۃً ہوا کا رخ پلٹ گیا اور نسیم فتح علم اسلام کو لہرانے لگی،[۱] دس ہزار دشمن کے بے پناہ تیروں کو یکہ و تنہا مناجات و زاری کی سپر پر روکنے کی جرأت پیغمبروں کے سوا اور کس سے ظاہر ہو سکتی ہے۔

اس مرقع کا سب سے مؤثر منظر غزوۂ بنی مصطلق میں نظر آتا ہے، سامنے دشمن پڑاؤ ڈالے پڑے ہیں، اور غفلت کے منتظر ہیں کہ دفعۃً نماز کا وقت آجاتا ہے، اور آپ امام بنکر آگے کھڑے ہو جاتے ہیں

---

[۱] صحیح بخاری و مسلم حنین،

صحابہ کی ایک جماعت مقتدی ہو کر نماز میں مصروف ہو جاتی ہے، اور دوسرے دشمنوں کا سامنا روک لیتی ہی، صلح حدیبیہ کے زمانہ میں اس سے بھی زیادہ خطرناک موقع پیش آیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مکہ کے پاس عسفان میں خیمہ زن تھے، قریش کے مشہور جنرل خالد بن ولید آس پاس کی پہاڑیوں میں دشمنوں کی فوج کا ایک دستہ لیے ہوئے موقع کی تاک میں تھے، آخر قریش کی یہ رائے قرار پائی کہ مسلمان جب نماز کے لیے کھڑے ہوں تو عین اُس وقت ان پر بےخبری میں حملہ کیا جائے، خداوند کارساز کی بارگاہ میں قصر صلوٰۃ کی ایک عمدہ تقریب پیدا ہوگئی، چنانچہ قصر کی آیتیں نازل ہوئیں عصر کا وقت آیا تو آپ نماز کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے، دشمن اپنی فوج کا پرا لیے آپکے سامنے تھے، صحابہ دو حصوں میں منقسم ہو گئے ایک حصہ نے آپکے پیچھے آکر نماز کی صفیں قائم کریں اور دوسرا حصہ دشمنوں کے مقابل کھڑا ہو گیا، پہلی جماعت فارغ ہو کر بتدریج دشمنوں کے مقابل آگئی، اور دوسری ترتیب کے ساتھ پیچھے ہٹ کر آپکے ساتھ نماز میں جاملی، یہ تمام تبدیلیاں مقتدیوں کی صفوں میں ہو رہی ہیں لیکن خود سپہ سالار خون آشام تلواروں کے سایہ میں تمام خطرات سے بے پروا عبادتِ الٰہی میں مصروف ہے، اور اسکو ذرہ برابر جنبش نہیں ہوتی،

ان واقعات کو پڑھ کر اندازہ ہوگا کہ اس حکم الٰہی کی کہانتک تعمیل ہوئی،

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا لَقِيْتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوْا	مسلمانو! جب کسی گروہ سے مٹ بھیڑ ہو جائے تو ثابت قدم
وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ (انفال)	رہو اور بار بار خدا کا نام لیتے جاؤ، تم کامیاب ہوگے،

صحیح بخاری میں روایت ہو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جہاد میں جب کسی ٹیکرے پر چڑھتے تو تین بار اللہ اکبر کہتے

خشیۃ الٰہی | آپ خاتم الانبیاء تھے، افضل رسل تھے، محبوب خاص تھے، تاہم خشیۃ الٰہی کا یہ اثر تھا کہ فرمایا کرتے

ـه ابوداؤد ج اول باب صلوۃ المسافرین ـه باب التکبیر عند الحرب،

کہ مجھکو کچھ نہیں معلوم کہ میرے اوپر کیا گذریگی" حضرت عثمانؓ بن مظعون نے جب وفات پائی تو آپ تعزیت کو گئے، لاش دھری تھی، ایک عورت نے لاش کی طرف مخاطب ہو کر کہا "خدا گواہ ہے کہ خدا نے تجھکو نوازا" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "تم کو کیونکر معلوم ہوا" بولیں خدا نے اُن کو نہیں نوازا تو اور کس کو نوازے گا" ارشاد ہوا کہ "ہاں مجھ کو بھی ان کی نسبت بھلائی کی توقع ہے، لیکن میں پیغمبر ہو کر بھی یہ نہیں جانتا کہ میرے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے گا"[۱]

(جب کبھی زور سے ہوا چلتی آپ سہم جاتے کسی ضروری کام میں ہوتے، اسکو چھوڑ کر قبلہ رخ ہو جاتے[۲] اور فرماتے "خدایا تیری بھیجی ہوئی مصیبت سے پناہ مانگتا ہوں" جب مطلع صاف ہو جاتا یا پانی برس جاتا تو مسرور ہوتے اور خدا کا شکر ادا فرماتے، ایک دن اس قسم کا واقعہ پیش آیا، تو حضرت عائشہؓ نے پوچھا یا رسول اللہ! آپ کیوں مضطرب ہو جاتے ہیں" ارشاد ہوا عائشہ! تجھے کیا معلوم کہ قوم ہود کا واقعہ نہ پیش آئے جس نے بادل دیکھکر کہا یہ ہمارے کھیتوں کو سیراب کرنیوالا ہے، حالانکہ وہ عذاب الٰہی تھا[۳]

حضرت ابوبکرؓ نے عرض کی کہ یا رسول اللہ آپکے بال پکنے لگے، فرمایا مجھے سورۂ ہود و واقعہ والمرسلات اور عم یتساءلون نے بوڑھا کر دیا[۴] (ان سورتوں میں قیامت وغیرہ کے واقعات مذکور ہیں)

ابی بن کعبؓ سے روایت ہے کہ جب دو ثلث شب گذر چکتی، باآواز یہ الفاظ ادا فرماتے "لوگو! خدا کو یاد کرو، زلزلہ آرہا ہے، اس کے پیچھے آنیوالا آرہا ہے، موت اپنے سامان کے ساتھ آپہنچی، موت اپنے سامان کے ساتھ آپہنچی"[۵]

---

[۱] صحیح بخاری باب الجنائز [۲] سنن ابن ماجہ باب یدعو بہ الرجل اذا رای السحاب [۳] یہ واقعہ بخاری و مسلم اور دیگر حدیث کی کتابوں میں بھی مذکور ہے، اخیر فقرہ قرآن کی آیت کا ترجمہ ہے [۴] شمائل ترمذی ماجاء فی شیبہ صلعم [۵] مشکوٰۃ بحوالہ ترمذی باب البکاء والخوف

فرمایا کرتے تھے "لوگو! جو کچھ میں جانتا ہوں اگر تم جانتے ہوتے تو تم کو ہنسی کم اور رونا زیادہ آتا"[1]

ایک دفعہ آپ نے نہایت مؤثر طرز سے خطبہ میں فرمایا "اے معشر قریش! اپنی آپ خبر لو، میں تم کو خدا سے نہیں بچاسکتا، اے بنی عبد المناف! میں تم کو بھی خدا سے نہیں بچاسکتا، اے عباس بن عبد المطلب! میں تم کو بھی خدا سے نہیں بچاسکتا، اے صفیہ! رسول خدا کی پھوپھی! میں تجھ کو بھی خدا سے نہیں بچاسکتا اے محمد کی بیٹی فاطمہ رض! میں تجھکو بھی خدا سے نہیں بچاسکتا" (صحیحین)

ایک دفعہ اعراب بادیہ کا مسجد نبوی میں اتنا ہجوم ہوا کہ آپ پسینے کے قریب ہوگئے مہاجرین نے اٹھ کر لوگوں کو ہٹایا، آپ نکل کر حضرت عائشہ رض کے حجرہ میں داخل ہوگئے، اور تقاضائے بشری سے بددعا زبان سے نکل گئی، فوراً قبلہ رخ ہوکر دونوں ہاتھ خدا کی بارگاہ میں اٹھائے اور دعا کی، خدایا! میں ایک انسان ہوں، اگر تیرے کسی بندہ کو مجھ سے تکلیف پہنچے تو مجھے سزا نہ دینا"[2]

گریہ و بکا خشیت الٰہی کی وجہ سے اکثر آپ پر رقت طاری ہوتی اور آنکھوں سے آنسو جاری ہوجاتے تھے، حضرت عبداللہ بن مسعود نے جب آپ کے سامنے یہ آیت پڑھی فَكَيْفَ إِذَا جِئْنَا مِن كُلِّ أُمَّةٍ بِشَهِيدٍ وَجِئْنَا بِكَ عَلَىٰ هَٰؤُلَاءِ شَهِيدًا، تو بے اختیار چشم مبارک سے آنسو جاری ہوگئے[3]، اکثر نماز میں رقت طاری ہوتی، اور آنسو جاری ہوجاتے، ایک دفعہ جب سورج گرہن پڑا تو نماز کسوف میں آپ ٹھنڈی سانسیں بھرتے اور فرماتے تھے، خدایا تو نے وعدہ کیا ہے کہ تو لوگوں پر میرے ہوتے عذاب نہیں نازل کریگا،[4]

عبداللہ بن شخیر ایک صحابی بیان کرتے ہیں کہ میں ایک بار خدمت نبوی میں حاضر ہوا، دیکھا کہ آپ نماز میں مشغول ہیں، آنکھوں سے آنسو جاری ہیں، روتے روتے اس قدر ہچکیاں بندھ گئی تھیں کہ معلوم

[1] صحیحین [2] مسند ابن حنبل ج ۶ ص ۱۰۱ و ۱۲۳، دونوں صفحوں میں دو روایتیں ہیں، مگر غالباً ایک ہی واقعہ ہے۔ [3] صحیح بخاری تفسیر آیت مذکورہ [4] ابوداؤد صلوٰۃ الکسوف۔

ہوتا تھا کہ چکی چل رہی ہے یا ہانڈی ابل رہی ہے،[1]

ایک بار آپ ایک جنازہ میں شریک تھے، قبر کھودی جارہی تھی، آپ قبر کے کنارے بیٹھ گئے، یہ منظر دیکھ کر آپ پر اس قدر رقت طاری ہوئی کہ آنسوؤں سے زمین نم ہوگئی، پھر فرمایا بھائیو! اس دن کے لیے سامان کر رکھو،[2]

ایک دفعہ کسی غزوہ سے واپس تشریف لا رہے تھے، راہ میں ایک پڑاؤ ملا، کچھ لوگ بیٹھے تھے، آپ نے دریافت فرمایا کہ تم کون ہو؟ بولے ہم مسلمان ہیں، ایک عورت بیٹھی ہی چولھا سلگا رہی تھی، پاس ہی اس کا لڑکا تھا، آگ خوب روشن ہوگئی اور بھڑک گئی تو وہ بچہ کو لیکر آپ کی خدمت میں آئی اور بولی آپ رسول اللہ ہیں؟ ارشاد ہوا ہاں بیشک، پھر اس نے پوچھا کیا ایک ماں اپنے بچہ پر جسقدر رحم ہاں ہے، خدا اپنے بندوں پر اس سے زیادہ مہربان نہیں ہے، آپنے فرمایا ہاں بیشک، اس نے کہا تو ماں اپنے بچہ کو آگ میں نہیں ڈالتی، آپ پر گریہ طاری ہوگیا، پھر سر اٹھا کر فرمایا، خدا اس بندہ کو عذاب دیگا جو سرکش اور متمرد ہے، خدا سے سرکشی کرتا ہے اور اس کو ایک نہیں کہتا[3]

ایک دفعہ آپ نے حضرت ابراہیمؑ کی دعا،

رَبِّ إِنَّهُنَّ أَضْلَلْنَ كَثِيرًا مِّنَ النَّاسِ — پروردگار ان بتوں نے بہت سے لوگوں کو گمراہ کیا ہی ان میں

فَمَن تَبِعَنِي فَإِنَّهُ مِنِّي — سے جس نے میری پیروی کی وہی میری جماعت میں ہے،

اس کے بعد حضرت عیسیٰؑ والی دعا پڑھی،

---

[1] ترمذی وابو داؤد باب البکاء فی صلوٰۃ اللیل [2] سنن ابن ماجہ باب الحزن والبکاء [3] سنن ابن ماجہ باب یرجی من رحمۃ اللہ۔

اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ وَاِنْ تَغْفِرْ — اگر تو ان کو عذاب دے تو وہ تیرے بندے ہیں،

لَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ — اور اگر معاف کردے تو تو غالب و دانا ہے،

دونوں ہاتھ اٹھا کر اَللّٰهُمَّ اُمَّتِيْ اُمَّتِيْ فرماتے جاتے تھے، اور آنکھوں سے آنسو جاری تھے[1]

محبت الٰہی | دنیا میں دو قسم کے پیغمبر آئے ہیں، ایک وہ جن کی آنکھوں کے سامنے صرف خدا کے جلال و کبریائی کا جلوہ تھا، اور اس لئے وہ صرف خدا کے خوف و خشیّت کی تعلیم دیتے تھے مثلاً حضرت نوحؑ و حضرت موسیٰ علیہما السلام، دوسرے وہ جو محبتِ الٰہی میں سرشار تھے، اور وہ لوگوں کو اسی خمخانۂ عشق کی طرف بلاتے تھے مثلاً حضرت یحییٰ و عیسیٰ علیہما السلام، لیکن لیکن یہ دونوں افراط و تفریط کے راستے تھے، پہلی راہ اخلاص و محبت کی منزل تک پہنچاتی، اور دوسری عبودیت اور آداب و احترام کی منزل سے دور پھینک دیتی ہے جیسا کہ عیسائی تعلیم اور موجودہ انجیل کی سیرۃ مسیح میں ہر شخص کو نظر آسکتا ہے لیکن اسلام دونوں جلووں کو یکساں نمایاں کرنا چاہتا ہے یہی سبب ہے کہ حاملِ شریعتِ اسلامیہ کی ذاتِ مبارک میں یہ دونوں پہلو بیک وقت نظر آتے ہیں، قرآن مجید نے کمالِ ایمان کا وصف یہ بیان کیا ہے،

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ، — جو ایمان لائے ہیں اُن کو سب سے زیادہ خدا پیارا ہے،

صحیح روایتوں میں ہے کہ آپ راتوں کو اتنی دیر تک نماز میں کھڑے رہتے تھے کہ پائے مبارک پر ورم آجاتا تھا، یہ دیکھ کر بعض صحابہ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! آپ کی مغفرت تو خدا کر چکا ہے آپ یہ زحمت کیوں اٹھاتے ہیں؟ ارشاد ہوا کہ "کیا میں عبدِ شکور نہ بنوں" ارباب باطن کہتے ہیں کہ لوگ سمجھتے تھے کہ آپ کی عبادتیں خشیۃ الٰہی سے ہیں، اور چونکہ آپ گناہوں سے پاک کر دیئے گئے تھے، اس لئے آپ کو

---

[1] صحیح مسلم باب بکائہ صلی اللہ علیہ وسلم لامتہ،

ریاضاتِ شاقہ کی ضرورت نہ تھی، آپنے اپنے جواب میں اسی شبہہ کو دفع فرمایا اور بتایا کہ ان کا مقتضا محبتِ الٰہی ہے خشیتہ الٰہی نہیں ہے، اسی لئے آپ فرمایا کرتے تھے،

وجعلت لی قرۃ عینی فی الصّلوٰۃ — میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے،

راتوں کو سناٹے میں اٹھ کر آپ کبھی دعا وزاری میں مصروف ہوتے، کبھی قبرستان کی طرف نکل جاتے اور فرمایا کرتے تھے کہ نصف شب کے سکوت میں خدا سمائے دنیا پر نزول فرماتا ہے[۱] عبادتِ شبانہ کا خاتمہ صبح کی دو رکعتوں پر ہوتا تھا، جن کی نسبت آپ کا ارشاد تھا کہ ان کے معاوضہ میں دنیا اور مافیہا کی نعمتیں بھی میرے سامنے ہیچ ہیں[۲]"

ایک دفعہ ایک غزوہ میں کوئی عورت گرفتار ہوکر آئی، اس کا بچہ گم تھا محبت کا یہ جوش تھا کہ کوئی بچہ مل جاتا تو وہ سینہ سے لگا لیتی، اور اس کو دودھ پلاتی، آپنے دیکھا تو حاضرین سے مخاطب ہوکر فرمایا کہ "کیا یہ ہو سکتا ہے کہ یہ عورت خود اپنے بچہ کو آگ میں ڈال دے" لوگوں نے عرض کی "ہرگز نہیں" فرمایا تو خدا کو اپنے بندوں سے اس سے زیادہ محبت ہے، جتنی اس کو اپنے بچہ سے ہے[۳]"

اسی طرح ایک اور واقعہ اوپر گذر چکا ہے کہ آپ ایک غزوہ سے واپس آرہے تھے، ایک عورت اپنے بچہ کو گود میں لیکر خدمتِ اقدس میں آئی، اور عرض کی "یا رسول اللہ! ایک ماں کو اپنے بچہ سے جس قدر محبت ہوتی ہے کیا خدا کو اپنے بندوں سے اس سے زیادہ نہیں ہے؟" فرمایا، ہاں بیشک ہے اس نے کہا کوئی ماں تو اپنے بچہ کو آگ میں ڈالنا گوارا نہیں کرتی، یہ سن کر فرطِ اثر سے آپ پر گریہ طاری ہوگیا، پھر سر اٹھا کر فرمایا، خدا صرف اس بندہ کو عذاب دیگا جو سرکشی سے ایک کو دو کہتا ہے[۴]،

---

[۱] صحیح بخاری [۲] صحیح مسلم کتاب الصلوٰۃ [۳] صحیح بخاری صفحہ ۸۰ باب رحمۃ الولد [۴] سنن ابن ماجہ باب ما یرجی من رحمۃ

ایک دفعہ آپ صحابہ کی مجلس میں تشریف فرما تھے، ایک صاحب ایک چادر میں ایک پرند کو مع اس کے بچوں کے لپیٹے ہوئے لائے، اور عرض کی کہ یا رسول اللہ! میں نے ایک جھاڑی سے ان بچوں کو اٹھا کر کپڑے میں لپیٹ لیا۔ اس کی ماں نے یہ دیکھا تو میرے سر پر منڈلانے لگی میں نے ذرا سا کپڑے کو کھولدیا تو وہ فوراً بچوں پر گر پڑی، ارشاد ہوا کہ کیا اپنے بچوں کے ساتھ ماں کی اس محبت پر تم کو تعجب ہے، قسم ہے اس ذات کی جس نے مجکو حق کے ساتھ مبعوث کیا ہے جو محبت اس ماں کو اپنے بچوں کے ساتھ ہے، خدا کو اپنے بندوں کے ساتھ اس سے بدرجہا زیادہ ہے۔[1]

آپ محبتِ الٰہی کے سامنے دنیا کی تمام محبتوں کو ہیچ سمجھتے تھے، وفات سے پانچ دن پہلے آپ نے صحابہ کے مجمع میں ایک خطبہ دیا، اس میں فرمایا "میں خدا کے سامنے اس بات سے برات کرتا ہوں کہ تم میں سے (یعنی انسانوں میں سے) کوئی میرا دوست ہو کیونکہ خدا نے مجھے اپنا دوست بنالیا، جس طرح ابراہیم کو اس نے اپنا دوست بنالیا تھا، اگر میں اپنی امت میں سے کسی کو دوست بنا سکتا تو ابوبکر رضی کو بناتا"۔[2]

وفات کے وقت زبانِ مبارک سے جو فقرہ بار بار ادا ہو رہا تھا یہ تھا۔

اَللّٰهُمَّ الرَّفِيْقَ الْاَعْلٰى ۔۔۔۔ خدایا صرف رفیقِ اعلیٰ مطلوب ہے۔

یہ الفاظ سن کر حضرت عائشہ رضی نے کہا کہ "اب آپ ہم لوگوں کو چھوڑ دیں گے"۔[3]

اس "رفاقتِ علوی" کے راز سے جو کسی قدر آشنا ہیں وہ اس فقرہ کی یہ تشریح کرتے ہیں۔

انبیاء علیہم السلام چوں از مقام دعوت فارغ میگردند و متوجہ عالم بقا میشوند مصلحت رجوع الی الخلق تمام می شود

[1] مشکوٰۃ بحوالہ ابوداؤد باب رحمۃ اللہ [2] صحیح مسلم ص ۲۰۰ باب النہی عن بناء المساجد علی القبور [3] صحیح بخاری باب الوفات)

بشوق تمام ندائے الرفیق الاعلیٰ برآوردہ بہ کلیت متوجہ حق جل شانہ میگردند و در مراتب قرب سیر مینمایند[1]

توکل علی اللہ

(توکل کے یہ معنی ہیں کہ انسان کوششوں کے نتائج اور واقعات عالم کے فیصلہ کو خدا کے سپرد کر دے، اسباب و علل کے پردے اس کے سامنے سے اٹھ جائیں، اور وہ براہ راست ہر چیز اللہ تعالیٰ کے قبضۂ قدرت میں نظر آئے، بظاہر اسباب و علل گو ناموافق ہوں مگر یہ غیر متزلزل یقین پیدا ہو کہ یہ ناموافق حالات ہمارے کام میں ذرہ بھر موثر نہیں ہو سکتے، بلکہ اصلی قوت و قدرت عالم اسباب سے ماوراء ہستی کے ہاتھ میں ہے، انسان کا استقلال، عزم، جرأت و بیباکی یہ تمام باتیں ان ہی ایک اصل کی پرتو ہیں، اسی کی بدولت مشکل سے مشکل اوقات میں بھی زمام صبر اس کے ہاتھ سے نہیں چھوٹتی، پر خطر سے پر خطر راستوں میں بھی جبن اور ضعف ہمت اس کے قلب میں راہ نہیں پاتا، شدید سے شدید حالات میں بھی اس کے دل پر مایوسی کا بادل نہیں چھاتا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سوانح زندگی کا ایک ایک حرف بڑھ جاؤ تم کو صاف نظر آئیگا کہ آسمان کے نیچے شدائد اور مصیبتوں کی کوئی ایسی صنف نہ ہوگی جو آپ کی راہ میں حائل نہ ہوئی ہو لیکن آپ کا دل کبھی اضطراب و انتشار، مایوسی و ناامیدی اور خوف و بیم سے آشنا نہ ہوا، مکہ کی تنہائیوں میں مصائب کے ہجوم میں، دشمنوں کے نرغہ میں حنین و احد کے خونریز معرکوں میں ہر جگہ توکل و اعتماد علی اللہ کا ایک ہی جلوہ نظر آتا ہے۔ ابوطالب سمجھاتے ہیں کہ "جان پدر! اس کام سے ہاتھ اٹھاؤ" آپ فرماتے ہیں عم محترم میری تنہائی کا خیال نہ کیجئے، حق زیادہ دیر تک تنہا نہیں رہے گا، عجم و عرب ایک دن اس کے ساتھ ہوگا[2]، ایک دوسرے کے جواب میں آپ فرماتے ہیں کہ "خدا مجھے تنہا نہیں چھوڑیگا"[2] مکہ میں ایک مصیبت زدہ

---

[1] مکتوبات امام ربانی مجدد الف ثانی مکتوب ۲، ۲ ج اول [2] یہ دونوں واقعے ابن ہشام میں ہیں۔

یا دوس صحابی سے ارشاد ہوتا ہے "خدا کی قسم عنقریب وہ وقت آتا ہے جب یہ دین مرتبۂ کمال کو پہنچ جائے گا، اور خدا کے سوا کسی اور کا ڈر نہیں رہے گا"[۱]

ایک دفعہ حرم میں بیٹھکر کفار نے باہم مشورہ کیا کہ محمد اب جیسے ہی یہاں قدم رکھیں، ان کی بوٹی بوٹی اڑا دیجائے، حضرت فاطمہؓ ان کی یہ تقریر سن رہی تھیں، وہ روتی ہوئی آپ کے پاس آئیں اور واقعہ عرض کیا، آپنے ان کو تسکین دی، اور وضو کے لیے پانی مانگا، وضو کرکے آپ خود حرم کی سمت روانہ ہوگئے، جب خاص صحن حرم میں پہنچے، اور کفار کی نظر آپ پر پڑی تو خود بخود انکی نگاہیں جھک گئیں،[۲]

جلد اول میں پڑھ چکے ہو کہ شب ہجرت میں قریش کے بہادر خون آشام ارادوں کے ساتھ کاشانۂ اقدس کا محاصرہ کیے ہوئے تھے لیکن آپنے نہایت سکون و اطمینان کے ساتھ اپنے عزیز قوت بازو علی مرتضیٰؓ کو اپنی جگہ بستر پر لٹا دیا، حالانکہ اچھی طرح معلوم تھا کہ یہ قتل گاہ ہے، بستر خواب نہیں، لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی معلوم تھا کہ ایک قادر کل ہستی ہے، جو تختۂ مقتل کو فرش گل بنا سکتی ہے، ان کو لٹاتے ہوئے نہایت بے پروائی سے فرمایا کہ تم کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا[۳]

گھر کے چاروں طرف دشمنان قریش محاصرہ کیے ہوئے تھے، اور خیال ہو سکتا تھا کہ صبح امید کے انتظار میں مکہ کے پیر و جوان عجب نہیں کوچوں اور گلیوں میں مشتاق خبر پھر رہے ہوں، لیکن آپ نے اذن الٰہی کے اعتماد پر ان تمام ناموافق حالات کی موجودگی میں گھر سے باہر قدم نکالا، اس وقت سورۂ یٰسین کی ابتدائی آیتیں زبان مبارک پر تھیں، جن میں نبوت کی اور اپنے راہ راست پر ہونے کی تصدیق ہے، آخری آیت یہ تھی،

---

[۱] صحیح بخاری اول خرج اول [۲] مسند احمد ج اول صفحہ ۳۶۸ [۳] ابن ہشام و طبری۔

وَجَعَلْنَا مِنْ بَيْنِ أَيْدِيهِمْ سَدًّا وَمِنْ خَلْفِهِمْ	ہم نے ان کے آگے اور انکے پیچھے دیواریں کھڑی کر دی ہیں
سَدًّا فَأَغْشَيْنَاهُمْ فَهُمْ لَا يُبْصِرُونَ (یٰسین)	انکی آنکھوں پر پردہ ڈالدیا ہے کہ وہ نہیں دیکھتے ہیں،

اور یہ بالکل سچ تھا۔

مکہ سے نکل کر آپنے مع حضرت ابوبکرؓ کے غار ثور میں پناہ لی، قریش میں خون آشامی کے ساتھ اب اپنی ناکامی کا غصہ بھی تھا، اور اس لیے اس وقت ان کے انتقام کے جذبات میں غیر معمولی تلاطم ہو گا، وہ آپکے تعاقب میں نشانِ قدم کو دیکھتے ہوئے ٹھیک اسی غار کے پاس پہنچ گئے. کون کہہ سکتا ہے کہ اس پرخطر حالت میں کسی کے حواس برجا رہ سکتے ہیں، چنانچہ حضرت ابوبکرؓ نے گھبرا کر عرض کی کہ "یارسول اللہ! دشمن اس قدر قریب ہیں کہ اگر ذرا نیچے جھک کر اپنے پانوں کی طرف دیکھیں گے تو ہم پر نظر پڑ جائے گی"، لیکن آپنے روحانیت کی پرسکون آواز میں فرمایا "ان دو کو کیا غم ہے جن کے ساتھ تیسرا خدا ہو"[1] پھر جیسا کہ قرآن مجید میں ہے، فرمایا۔

لَا تَحْزَنْ إِنَّ اللَّهَ مَعَنَا	غم نہ کر، خدا ہمارے ساتھ ہے۔

سینۂ نبوت کے سوا اس روحانی سکون کا جلوہ اور کہاں نظر آسکتا ہے۔

قریش کے اس اعلان کے بعد کہ جو محمد کو زندہ یا ان کا سر کاٹ کر لائے گا، اسکو سو اونٹ ملیں گے سراقہ بن جعشم نے آپ کا تعاقب کیا، اور اسقدر قریب پہنچ گیا کہ وہ آپ کو پاسکتا تھا، حضرت ابوبکرؓ بار بار گھبرا کر ادھر دیکھ رہے تھے، لیکن آپنے ایک دفعہ بھی مڑ کر نہیں دیکھا کہ سراقہ کس ارادہ سے آرہا ہے، یہاں دل پر وہی سکینۂ ربانی طاری تھی، اور لب ہائے مبارک تلاوتِ قرآن میں مصروف تھے،[2]

[1] صحیح بخاری و مسلم ہجرت [2] صحیح بخاری ہجرت،

عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ مدینہ آکر آپ کی زندگی ہر قسم کے خطروں سے محفوظ ہوگئی تھی لیکن واقعہ یہ ہے کہ گو اسلام کو یہاں اعوان و انصار کی ایک معتدبہ تعداد مل گئی تھی لیکن اسی کے ساتھ ان دشمنوں کا سامنا بھی تھا جو دشمنان مکہ سے زیادہ خطرناک تھے، مکہ میں قریش گو آپکے دشمن تھے لیکن ان میں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں نسبی تعلقات تھے، جو کبھی کبھی کسی کو غمخواری اور مواسات پر بھی مائل کر دیتے تھے لیکن مدینہ کے منافقین اور یہود کو مواسات و ہمدردی کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی تھی، علاوہ بریں یہود و منافقین مدینہ اور قریش مکہ میں باہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل و جلاوطنی کی سازشیں شروع ہو گئی تھیں[1]، اس بنا پر صحابہ جاں نثاری کی بنا پر اکر راتوں کو پہرہ دیا کرتے تھے، اسی زمانہ میں ایک رات صحابہ آپکے خیمہ کا پہرہ دے رہے تھے کہ یہ آیت نازل ہوئی۔

وَاللّٰہُ یَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ (مائدہ) اور اللہ لوگوں سے تیری حفاظت کرے گا،

اور آپ نے اسی وقت خیمہ سے باہر سر نکال کر صحابہ سے فرمایا[2]،

ایہا الناس انصرفوا فقد عصمنی اللہ لوگو واپس جاؤ میری حفاظت کا ذمہ خود خدا نے لیا ہے

غزوۂ نجد سے واپسی میں آپنے ایک مقام پر پڑاؤ کیا، یہاں بہت سے درختوں کے جھنڈ تھے دوپہر کا وقت تھا صحابہ درختوں کے سایہ میں اِدھر اُدھر سو رہے تھے، آپ بھی ایک درخت کے نیچے تنہا استراحت فرما تھے، آپ کی تلوار ایک درخت سے لٹکی تھی، کہ ناگاہ ایک بدو جو شاید اسی موقع کی تاک میں تھا چپکے سے آیا اور آپ کی تلوار اتار کر نیام سے باہر کی اور آپکے سامنے آیا کہ دفعۃً آپ ہشیار ہوئے، دیکھا کہ ایک بدو تیغ بکف کھڑا ہے، بدو نے پوچھا "اے محمد! اب مجھ سے تم کو کون بچا سکتا ہے"

[1] سیرۃ جلد اول سلسلۂ غزوات [2] جامع ترمذی، تفسیر مائدہ،

ایک پر اطمینان صدا آئی کہ "اللہ"!

ایک دفعہ ایک شخص گرفتار ہو کر پیش ہوا کہ یہ آپ پر حملہ کی گھات میں تھا، آپ نے فرمایا "اس کو چھوڑ دو کہ یہ مجھکو قتل کرنا بھی چاہتا تو نہیں کر سکتا تھا، یہ اس بات کی طرف اشارہ تھا کہ میری حفاظت کا ذمہ دار کوئی اور ہے، خیبر میں جس یہودیہ نے آپ کو زہر دیا تھا، اس سے آپ نے دریافت کیا کہ تم نے یہ حرکت کیوں کی؟ اس نے جواب دیا کہ "آپ کے قتل کرنے کے لیے" آپ نے فرمایا کہ خدا تم کو اس پر مسلط نہ کرتا"[۳]

اُحد اور حنین کے معرکوں میں جب میدانِ جنگ تھوڑی دیر کے لیے جان نثاروں سے خالی ہو گیا تھا، آپ کا استقلال، توکل علی اللہ و سکینت رحانی کی معجزانہ مثال ہے۔

یہ توکل اور اعتماد علی اللہ کی یکرخی تصویر ہے، اس مرقع کا دوسرا رخ بھی کچھ اس سے کم مؤثر نہیں ہے، آپ پر فقر و غنا کے مختلف دور گذرے، کوئی دن ایسا آتا کہ مسجد نبوی کا صحن زر و مال سے معمور ہو جاتا، اور پھر متصل کئی کئی دن ایسے آتے کہ فاقہ سے شکم مبارک پر دو دو تین تین پتھر بندھے ہوتے، حالانکہ بالکل ممکن تھا کہ آج کا سرمایہ کل کے مصارف کے لیے اٹھا رکھا جائے، لیکن تمام عمر آپ کا طرز عمل اس کے خلاف رہا، کبھی ایک دن کی آمدنی دوسرے دن کے لیے اٹھا کر نہیں رکھی گئی، ضروری اور بقدر کفاف اخراجات کے بعد جو کچھ بچ جاتا وہ شام تک اہلِ استحقاق پر صرف کر دیا جاتا تھا، ترمذی میں حضرت انس رضؓ سے روایت ہے۔

ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کان لا یدخر لغد | آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کل کیلئے کوئی چیز اٹھا کر نہیں رکھتے تھے۔

---

[۱] صحیح بخاری کتاب الجہاد [۲] مسند ابن حنبل ج ۳ صفحہ ۱۰۴ [۳] صحیح مسلم باب السم۔

اتفاق سے یا بھولے سے اگر کوئی چیز گھر میں رہ جاتی تو آپ کو سخت تکلیف ہوتی تھی، بلکہ آپ اس وقت تک گھر میں تشریف نہیں لیجاتے تھے، جب تک یہ نہ معلوم ہوجاتا کہ اب وہاں خدا کی برکت کے سوا کچھ نہیں ہے[۱]، اس قسم کے متعدد واقعات جود وسخا کے عنوان میں مذکور ہیں،

نزع کے وقت جب انسان ہر چیز کو فراموش کر دیتا ہے. آپ کو یاد آیا کہ حضرت عائشہ کے پاس کچھ اشرفیاں رکھوائی تھیں، وہ پڑی ہونگی، اس نازک موقع پر بھی یہ سہو آپ کو توکل علی اللہ کی شان کے خلاف نظر آیا، ارشاد ہوا کہ "عائشہ! کیا محمد! خدا سے بدگمان ہو کر ملیگا! جاؤ پہلے ان کو خیرات کر دو"[۲]

صبر و شکر

(رنج وغم کے متناقب اور توام دور کس کی زندگی میں نہیں آتے، لیکن انسان کے روحانی کمال کا جوہر یہ ہے کہ ایک طرف حصول مقصد اور کامیابی کے نشہ میں سرشار اور از خود رفتہ نہ ہو تو دوسری طرف مصائب و آلام کی تلخی کو خندہ جبینی اور کشادہ دلی کے ساتھ گوارا کرلے اور یقین رکھے کہ انسان کا فرض صرف عمل ہے، کامیابی و ناکامی کا سر رشتہ کسی بالاتر ہستی کے ہاتھ میں ہے، قرآن مجید نے اس آیت میں اسی نکتہ کی طرف اشارہ کیا ہے.

مَا اَصَابَ مِنْ مُّصِیْبَۃٍ فِی الْاَرْضِ وَلَا فِیْٓ اَنْفُسِکُمْ	جتنی مصیبتیں زمین پر اور خود تم پر نازل ہوتی ہیں، وہ ان کے
اِلَّا فِیْ کِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَهَا اِنَّ ذٰلِکَ	وجود سے پہلے دیوان قضا میں لکھ لی گئی ہیں، یہ بات خدا
عَلَی اللّٰهِ یَسِیْرٌ لِّکَیْلَا تَاْسَوْا عَلٰی مَا	کے لیے آسان ہے، یہ اس لیے کیا گیا تاکہ تم ناکامی پر
فَاتَکُمْ وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَآ اٰتٰکُمْ وَاللّٰهُ	غم اور حصول مقصد پر فخر نہ کرو، خدا مغرور اور مختار

[۱] صحیح بخاری باب من صلی بالناس فذکر حاجۃ فتخطاہم و مسند احمد ج ۶ ص ۲۹۳ [۲] ابوداؤد باب قبول ہدایا المشرکین [۳] مسند احمد و ابن سعد جزء الوفاۃ،

لَا یُحِبُّ کُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ (حدید - ۳) کو دوست نہیں رکھتا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی زندگی میں وہ بڑی سے بڑی کامیابیاں حاصل ہوئیں، جو اس آسمان کے نیچے نوع انسان کے کسی فرد کو حاصل ہو سکتی تھیں، تاہم آپ کے آئینۂ دل میں کبھی فخر و غرور نے اپنا عکس نہیں ڈالا، آپ نے فرمایا انا سید ولد ادم ولا فخر "میں آدم کے بیٹوں کا سردار ہوں لیکن مجھے اس پر فخر نہیں"، عدی بن حاتم طائی نے جو مذہباً عیسائی تھے، آپ کے جو حالات سنے تھے ان کی بنا پر ان کو شک تھا کہ آپ بادشاہ ہیں یا پیغمبر؟ جب وہ اپنے قبیلہ کا وفد لیکر حاضر خدمت ہوئے تو عین اسی وقت ایک مسکین سی عورت اپنی کسی غرض کے لیے بارگاہ اقدس میں آئی اور مجمع سے ذرا ہٹ کر کچھ سن لینے کی درخواست کی، آپ فوراً اٹھ کھڑے ہوئے اور اس وقت تک گلی میں کھڑے رہے جب تک وہ خود اپنی مرضی سے چلی نہیں گئی، عدی کہتے ہیں کہ آپ کی تواضع اور خاکساری کا یہ عالم دیکھ کر مجھے یقین ہو گیا آپ پیغمبر ہیں، بادشاہ نہیں۔[۱]

مفتوح شہروں میں داخل ہوتے ہوئے دنیا کے ہر فاتح کا سر غرور و ناز سے بلند ہو جاتا ہے۔ لیکن مکہ و خیبر کا فاتح اس وقت بھی اپنا سر نیاز بارگاہ ایزدی میں جھکا کر شہر میں داخل ہوا، ابن اسحاق نے روایت کی ہے کہ فتح مکہ میں جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ذی طویٰ میں پہنچے اور دیکھا کہ خدا نے آپ کو فتح کی عزت عطا کی ہے تو آپ نے اپنی سواری پر توقف کیا۔

ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لما انتھی	جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ذی طویٰ میں پہنچے اور دیکھا کہ خدا نے
الی ذی طوی وقف علی راحلتہ ... لبضع راسہ	آپ کو فتح کی عزت عطا کی ہو تو آپ نے اپنی سواری پر توقف کیا

---

[۱] سیرۃ ابن ہشام صفحہ ۴۰۰ جلد ۲

تواضعاً لله حین رای ما اکرمه الله من الفتح | تاکہ اپنا سر خدا کے سامنے جھکائیں، پھر یہاں تک آپ جھکے
حتی ان عثونه لیکاد یمس واسطة الرحل[1] | آپ کی ٹھڈی قریب تھی کہ کجاوہ کی لکڑی سے لگ جائے

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کثرت سے عبادت اور تسبیح و تہلیل کیا کرتے تھے، بعض صحابہ نے عرض کی

یا رسول اللہ، خدا تو آپ کو بے گناہ اور معصوم بنا چکا، اب آپ کیوں یہ زحمت اٹھاتے ہیں، ارشاد ہوا،

افلا اکون عبداً شکوراً[2] | کیا میں خدا کا شکر گذار بندہ نہ بنوں

یعنی اگر یہ تعبد و تسبیح و تحمید پہلے اس مرتبہ کے حصول کے لیے تھی تو اب اس مرتبہ کے حصول پر شکر گذاری اور احسان مندی کے اعتراف میں ہے۔

دنیا کے اعاظم رجال جن کو روحانیت کا کوئی حصہ نہیں دیا گیا اپنی ہر کامیابی کو اپنی قوت بازو اپنے حسن تدبیر اور اپنے ذاتی رعب و داب کی طرف منسوب کرتے ہیں، لیکن مقربین الٰہی کی اصطلاح میں یہ تخیل شرک و کفر کے ہم پایہ ہے، ان کو ہر کامیابی اور مسرت کے واقعہ کے اندر قادر کل کا دست غیر مرئی کام کرتا ہوا نظر آتا ہے، حدیث میں ہے[3] کہ

انه کان اذا جاءه امر سرور او بشر به | آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جب کوئی خوشی کی خبر آتی
خر ساجدا شاکرا لله تعالیٰ | تھی تو خدا تعالیٰ کا شکر ادا کرنے کے لیے آپ فوراً سجدہ میں گر پڑتے

قبیلۂ ہمدان کے اسلام لانے کی خبر جب آپ کو پہنچی تو آپ نے سجدۂ شکر ادا کیا،[4] اسی طرح ایک دفعہ اور کسی بات کی آپ کو خبر دی گئی تو آپ فوراً سجدۂ الٰہی بجا لائے،[5]

---

[1] سیرت ابن ہشام ذکر فتح مکہ [2] صحیح بخاری قیام اللیل [3] ابو داؤد کتاب الجہاد باب فی سجود الشکر [4] زاد المعاد بحوالہ بیہقی بسند علی شرط البخاری ج اول ص ۰، [5] زاد المعاد مذکور بحوالہ ابن ماجہ۔

وحی کے ذریعہ سے جب آپ کو یہ معلوم ہوا کہ جو مجھ پر درود بھیجے گا، اس پر خدا درود بھیجے گا تو اس رفع منزلت پر آپ نے سجدۂ شکر ادا کیا ۱؎

حضرت سعدؓ بیان کرتے ہیں کہ ہم لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مکہ کو مدینہ طیبہ روانہ ہوئے اور جب مقام زوعرا کے قریب پہنچے تو سواری سے اتر گئے اور ہاتھ اٹھا کر دیر تک بارگاہ الٰہی میں دعا کی، پھر سجدہ میں گئے، اور دیر تک اسی حالت میں پڑے رہے پھر سر اٹھا کر بدستور دعا کے لیے ہاتھ پھیلائے اور پھر دیر تک سجدہ میں رہے، پھر اٹھ کر تضرع کے ساتھ دعا شروع کی اور اس کے بعد جبین نیاز خاک پر رکھی، اس دعا و سجود سے فارغ ہو کر آپ نے صحابہ سے فرمایا میں نے اپنی امت کی مغفرت کے لیے خدا سے دعا مانگی تھی، جس کا ایک حصہ مقبول ہوا، میں شکر کے لیے سجدہ میں گرا، پھر مزید درخواست کی اس نے وہ بھی قبول کی، میں سجدۂ شکر بجا لایا اور پھر دعا و زاری کی، اس نے اس کو بھی درجۂ استجابت بخشا، اور پھر میں سجدہ میں گر پڑا ۲؎"

سورۂ والضحیٰ میں اللہ تعالیٰ نے آپ کے اسی وصف کو نمایاں فرمایا ہے۔

وَالضُّحٰی وَالَّیْلِ اِذَا سَجٰی، مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلٰی، وَلَلْاٰخِرَةُ خَیْرٌ لَّكَ مِنَ الْاُوْلٰی، وَلَسَوْفَ یُعْطِیْكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰی، اَلَمْ یَجِدْكَ یَتِیْمًا فَاٰوٰی، وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰی، وَوَجَدَكَ عَآئِلًا	(اے پیغمبر) دن کے پہلے پہر کی قسم، اور رات کی قسم جب پردہ ڈالدے کہ تیرے پروردگار نے نہ تو تجھکو چھوڑا اور نہ تجھ کو ناراض ہوا یقیناً تیری پچھلی زندگی پہلی سے بہتر ہے، وہ تجھکو وہ کچھ دیگا جس سے تو خوش ہو جائیگا، کیا اس نے تجھکو یتیم نہیں پایا تو اپنے پناہ میں لے لیا، اور تجھ کو راہ حق کا جویاں پایا تو اس نے سیدھی

۱؎ مسند احمد عن عبد الرحمن بن عوفؓ ۲؎ ابو داؤد کتاب السجود،

فَاَغْنیٰ، فَاَمَّا الْیَتِیْمَ فَلَا تَقْهَرْ وَ اَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنْهَرْ، وَ اَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّکَ فَحَدِّثْ (ضحیٰ۔۱)

راہ دکھا دی، اور تجھکو مفلس پایا تو غنی کر دیا ان نعمتوں کے شکریہ میں، یتیم پر ظلم نہ کرنا اور سائل کو نہ جھڑکنا اور اپنے پروردگار کے احسان کو یاد کرتے رہنا،

آپ کی سوانحِ زندگی کا حرف حرف شاہد ہے کہ آپ عمر بھر کیونکر اس ارشادِ ربانی کی تعمیل کرتے رہے، صبر کا مفہوم بالکل شکر کے مخالف ہے لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ پاک میں یہ دونوں متضاد اوصاف ایک ساتھ جمع ہو گئے تھے، اور آپ کو عملاً دونوں کے اظہار کا موقع ملا، حدیث شریف میں ہے، ایک صحابی نے آپ سے دریافت کیا کہ "یا رسول اللہ! سب سے زیادہ مصیبت کس پر آئی ہے؟" ارشاد ہوا کہ پیغمبروں پر، پھر اسی طرح درجہ بدرجہ لوگوں پر،[۱] واقعات بھی اس روایت کی تصدیق کرتے ہیں، آپ سرورِ انبیاء تھے، اس بنا پر دنیا کے شدائد اور مصائب کا بار اس مقدس گروہ میں سب سے زیادہ آپ کے دوشِ مبارک پر تھا، اسی لیے قرآن مجید میں بار بار آپ کو صبر کی تلقین کی گئی ہے سورۂ احقاف میں ہے،

وَاصْبِرْ کَمَا صَبَرَ اُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ

(اے پیغمبر! جس طرح اولوالعزم پیغمبروں نے صبر کیا تم بھی صبر کرو)

آپ ابھی پیدا نہ ہوئے تھے کہ والد نے انتقال کیا، عہدِ طفولیت میں تھے کہ سر سے ماں کا سایہ اٹھ گیا، اس کے دو برس کے بعد دادا نے جن کی نگاہ لطف زخمِ یتیمی کا مرہم تھی، وفات پائی، نبوت کے بعد ابو طالب نے جو قریش کے ظلم و ستم کے سپر تھے، مفارقت کی، محرمِ اسرار ام المومنین خدیجۃ الکبریٰ رضی جو اس ہجومِ مصائب میں آپ کی تنہا مونس و غمخوار تھیں، موت نے ان کو بھی اسی زمانہ میں آپ سے علیحدہ کر دیا، والدین اور بیوی کے بعد انسان کو سب سے زیادہ اولاد سے محبت ہوتی ہے، جس کی مفارقت کا زخم تمام عمر مندمل نہیں ہوتا،

---

[۱] سنن ابن ماجہ باب الصبر علی البلاء،

آپ کی اولاد ذکور حسب اختلاف روایت کم سے کم دو اور زیادہ سے زیادہ آٹھ تھی، لڑکیوں کی تعداد چار تھی، لیکن، ایک (حضرت فاطمہ رضؓ) کے سوا سب نے کمسنی یا جوانی میں آپ کی نگاہوں کے سامنے جان دی، ان واقعات پر اگرچہ کبھی کبھی آپ کی آنکھیں اشک آلود ہوگئیں، لیکن زبان و دل پر ہمیشہ صبر و سکینت کی مہر لگی رہی اور کبھی کوئی کلمہ زبان مبارک سے ایسا نہیں نکلا جس سے کارکنان قضا کی شکایت کا پہلو نکلتا ہو،

آپ کی سب سے بڑی صاحبزادی حضرت زینب رضؓ نے ۸ھ میں وفات پائی تو تجہیز و تکفین کے متعلق آپنے خود بہ نفس نفیس ہدایات دیں، جنازہ قبر کے سامنے رکھا گیا تو آپ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے لیکن زبان مبارک سے ایک لفظ بھی نہ نکلا حضرت زیدؓ (پروردہ خاص) اور حضرت جعفرؓ (ابن عم) دونوں آپ کو بہت محبوب تھے، غزوۂ موتہ میں ان کی شہادت کی خبر آئی، تو چشم مبارک اشک آلود ہو گئی، لیکن اسی اثنا میں حضرت جعفرؓ کے گھر سے نوحہ کی آواز آئی تو آپنے منع کرا بھیجا، آپ کا ایک نواسا جس سے آپ کو محبت تھی مبتلائے نزع ہوا تو صاحبزادی نے بلا بھیجا لیکن آپنے اس کے جواب میں سلام کے بعد یہ پیغام بھیجا،

ان لِلّٰہ ما اخذ ولہ ما اعطی وکل عندہٗ	اللہ نے جو لے لیا وہ اسی کا تھا، او جو دیا وہ بھی اسی کا ہے اسکا
باجل مسمّٰی فلتصبر ولتحتسب	ہر کام وقت مقررہ پر ہوتا ہے، صبر کرو اور اس سے خیر طلب کرو

صاحبزادی نے دوبارہ بہ اصرار بلایا، آپ چند صحابہ کے ساتھ وہاں تشریف لے گئے، بچہ آپ کی گود میں رکھ دیا گیا، وہ دم توڑ رہا تھا، آپ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے، ایک صحابی نے کہا یا رسول اللہ یہ کیا ہے؟ فرمایا جذبۂ محبت ہے، جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے دل میں رکھا ہے خدا اپنے بندوں میں سے رحم دلوں ہی پر رحم کرتا ہے۔

ایک بار آپ سعد بن عبادہ رضؓ کی عیادت کو تشریف لائے، اور ان کی حالت دیکھکر فرمایا کہ انتقال کر گئے، صحابہ نے کہا نہیں یارسول اللہ! آپ رو پڑے، تو آپ کو روتے دیکھ کر صحابہ بھی رو پڑے، آپ نے فرمایا "اللہ تعالیٰ آنکھوں کے آنسو اور دل کے غم کو منع نہیں کرتا، لیکن زبان کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ) اس سے عذاب ہوتا ہے، حضرت ابراہیمؑ کی وفات کے وقت جب آپکی آنکھوں سے اشکِ محبت جاری ہوئے تو عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے کہا "یارسول اللہ! یہ کیا بات ہے" فرمایا "یہ رحمت وشفقت ہے" حضرت عبدالرحمٰن رضؓ نے دوبارہ گذارش کی، ارشاد ہوا،[۱]

ان العین تدمع والقلب یحزن ولا نقول	آنکھ اشک ریز ہے، دل غمگین ہو لیکن ہم وہی کہیں گے
الا ما یرضی ربنا وانا بفراقک یا ابراھیم	جو ہمارے رب کی مرضی ہو، اے ابراہیم ہم تیرے
لمحزونون	فراق میں بہت غمگین ہیں۔

بہر حال یہ واقعات آنی ہیں، یعنی ان کا اثر ایک خاص وقت تک انسان پر رہتا ہے پھر مٹ جاتا ہے لیکن مسلسل اور غیر منقطع مصائب و حوادث کو اس طرح برداشت کرنا کہ کبھی پیمانۂ صبر لبریز نہ ہونے پائے، سخت مشکل ہی، ہجرت سے پہلے ۱۳ سال تک طائف اور مکہ کے اشقیا نے دعوتِ حق کا جس تحقیر و استہزا، سب و شتم، تعذیب و ایذا رسانی کے ساتھ جواب دیا، اس کے دہرانے کی حاجت نہیں، مدینہ منورہ میں آٹھ نو برس تک جن خونی معرکوں کا ہمیشہ سامنا رہا، اور دشمنوں نے آپ کی جلاوطنی و قتل و شکست کے جو جو منصوبے باندھے، ان کے اعادہ کی بھی ضرورت نہیں لیکن ان تمام تیروں کی بوچھار صبر کے سوا آپ نے کس سپر پر روکی، ؟

[۱] ان تمام واقعات کے لیے صحیح بخاری کتاب الجنائز دیکھو۔

اس سے بھی زیادہ مشکل ان واقعات پر صبر ہے جو خود اختیاری ہوں، فتوحات کی کثرت گو ہر دفعہ بیت المال کو معمور کر دیتی تھی لیکن دستِ کرم کو اسی وقت آرام ملتا، جب سارا خزانہ ارباب حاجت اور فقراء میں لٹ چکا ہوتا چنانچہ اسی بنا پر خود آپ اور تمام اہلبیت کی زندگی اکثر فقر و فاقہ میں گذرتی تھی جسم مبارک کے لیے ایک کے سوا کپڑے کا کوئی دوسرا جوڑا نہیں ہوتا تھا تاہم یہ تمام شدائد اس لیے گوارا تھے کہ صبر کی لذت الوانِ نعمت کی خوش گواری اور لباس ہائے فاخرہ کی مسرت سے کہیں زیادہ تھی۔

لیکن سب سے زیادہ حوصلہ شکن اور صبر آزما اس تیر کا نشانہ ہے جو دشمنوں کے نہیں بلکہ دوستوں کے ہاتھ سے لگایا جائے، دو دفعہ ایسا ہوا کہ بعض جلد باز نوجوانوں نے آپ کے کسی فعل پر جو کسی مصلحت پر مبنی تھا، اعتراض کیا، اس موقع پر بھی صبر کا رشتہ آپ کے ہاتھ سے نہ چھوٹا، صحیح بخاری میں ہے کہ غنائم حنین کے متعلق ایک دو انصاریوں نے اعتراض کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دوسروں کو کیوں دیدیا، حق تو ہمارا تھا۔ آپ کو اس کی خبر پہنچی تو فرمایا۔

رحمۃ اللہ علی موسیٰ قد اوذی اکثر من ذلک فصبر	موسیٰ پر خدا کی رحمت ہو وہ اس سے بھی زیادہ (اپنے دوستوں کی طرف سے) ستائے گئے ہیں لیکن انھوں نے صبر کیا۔

(باب غزوہ حنین)

اخلاقِ نبوی صلعم

اِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیۡمٍ

(حضرت رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات اقدس کا یہ وہ حصہ ہے جہاں آکر آپ کی زندگی تمام انبیائے کرام اور مصلحین عالم سے علانیہ ممتاز نظر آتی ہے، تاریخی ہستی کا ثبوت ایک طرف اگر یہ سوال کیا جائے کہ ان اخلاقی واعظوں کا خود عملی نمونہ کیا تھا تو دنیا اس کے جواب سے عاجز رہ جائیگی، دنیا کے تمام مصلحینِ اخلاق میں گوتم بدھ اور مسیح کا درجہ سب سے بڑا ہے لیکن کیا کوئی بتا سکتا ہے کہ ہندوستان کا یہ مصلح اعظم (بودھ) عملاً کیا تھا، کوہ زیتون کے حکیمانہ اخلاق کا واعظ (مسیح) دنیا کو اخلاق کا بہترین درس دیتا تھا، لیکن اس کی زندگی کا ایک واقعہ بھی اس کے زریں مقولوں کی تائید میں تم کو معلوم ہے؛ لیکن مکہ کا معلم امی پکار کر کہتا تھا۔

لِمَ تَقُوۡلُوۡنَ مَا لَا تَفۡعَلُوۡنَ (بقرہ) — جو نہیں کرتے، وہ کہتے کیوں ہو،

وہ خود اپنی تعلیم کا آپ نمونہ تھا، انسانوں کے مجمع عام میں وہ جو کچھ کہتا تھا، گھر کے خلوت کدہ میں وہ اسی طرح نظر آتا تھا، اخلاق و عمل کا جو نکتہ وہ دوسروں کو سکھاتا تھا وہ خود اس کا عملی پیکر بنجاتا تھا، بیوی سے بڑھ کر انسان کے اخلاق کا اور کون راز داں ہو سکتا ہے، چند صاحبوں نے اگر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے درخواست کی کہ حضرت کے اخلاق بیان کیجئے، انھوں نے پوچھا کیا تم قرآن نہیں پڑھتے ان خلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کان القرآن، آپ کا اخلاق ہمہ تن قرآن تھا۔[1]

---

[1] ابوداؤد باب الصلوٰۃ فی اللیل۔

موجودہ صحائف آسمانی اپنے داعیوں کے بہترین اقوال کا مجموعہ ہیں، لیکن کیا انکا ایک حرف بھی اپنے مبلغین کے عمل کا مدعی ہے، قرآن مجید لاکھوں مخالفین و اہل عناد کی بھیڑ میں اپنے داعی حق کی نسبت گویا تھا۔

اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ (ن) — اے محمد تم اخلاق کے بڑے درجہ پر ہو۔

بید رد نکتہ چیں آج تیرہ سو برس کے بعد آپ کو سنگدل کہتے ہیں لیکن اس وقت جب یہ سب کچھ ہو رہا تھا قرآن خود دشمنوں کے مجمع میں آپ کی نسبت کیا شہادت دے رہا تھا،

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ (آل عمران) — خدا کی عنایت سے تم ان سے بہ نرمی پیش آتے ہو، اگر تم کہیں کج خلق اور سخت دل ہوتے تو یہ لوگ تمہارے اس پاس سے ہٹ جاتے

دوسری جگہ کہتا ہے ا۔

لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ (توبہ) — تمہارے پاس تم میں سے خود ایک پیغمبر آیا، اس پر تمہاری تکلیف بہت شاق گذرتی ہے، تمہاری بھلائی کا وہ بھوکا ہے اہل ایمان پر نہایت نرم اور مہربان ہے۔

مسئلہ اخلاق کی نسبت ایک بڑی غلطی یہ کی گئی ہے کہ صرف رحم و رافت اور تواضع و خاکساری کو پیغمبرانہ اخلاق کا مظہر قرار دیدیا گیا، حالانکہ اخلاق وہ چیز ہے جو زندگی کی ہر تہ میں اور واقعات کے ہر پہلو میں نمایاں ہوتی ہے، دوست و دشمن، عزیز و بیگانہ، صغیر و کبیر، مفلس و تونگر، صلح و جنگ خلوت و جلوت غرض ہر جگہ اور ہر ایک تک دائرۂ اخلاق کی وسعت ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عنوانِ اخلاق پر اسی حیثیت سے نظر ڈالنی چاہیے)

اخلاق نبوی کا جامع بیان

اس سے پہلے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق مبارکہ کے جزئی اور تفصیلی واقعات لکھے جائیں، اُن صاحبوں کے بیانات زیر تحریر آتے ہیں جنھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں سالہا سال اور مدتہائے دراز بسر کی ہیں اور جو آپ کے اخلاق و عادات کے دفتر کے ایک ایک حرف سے واقف تھے، انسان کے حالات کا واقفکار بیوی سے بڑھکر دنیا میں کون ہو سکتا ہے، حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی جو نبوت سے پہلے اور نبوت کے بعد ۲۵ برس تک آپ کی خدمتِ زوجیت میں رہی تھیں، زمانہ آغاز وحی میں آپ کو ان الفاظ میں تسلی دیتی تھیں "ہرگز نہیں، خدا کی قسم، خدا آپ کو کبھی غمگین نہ کریگا، آپ صلہ رحم کرتے ہیں، مقروضوں کا بار اٹھاتے ہیں، غریبوں کی اعانت کرتے ہیں، مہمانوں کی ضیافت کرتے ہیں، حق کی حمایت کرتے ہیں، مصیبتوں میں لوگوں کے کام آتے ہیں"[۱]

امہات المومنین میں حضرت عائشہ رضی سے بڑھ کر کسی نے آپ کے اوصاف تفصیل سے نہیں بیان کئے ہیں، فرماتی ہیں "آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عادت کسی کو برا بھلا کہنے کی نہ تھی، برائی کے بدلہ میں برائی نہیں کرتے تھے، بلکہ درگذر کرتے تھے، اور معاف فرما دیتے تھے[۲]، آپ کو جب دو باتوں میں اختیار دیا جاتا تو ان میں جو آسان ہوتی اس کو اختیار فرماتے بشرطیکہ وہ گناہ نہ ہو، ورنہ آپ اس سے بہت دور رہتے، آپ نے کبھی کسی سے اپنے ذاتی معاملہ میں انتقام نہیں لیا، لیکن جو احکام الٰہی کی خلاف ورزی کرتا خدا اس سے انتقام لیتا تھا[۳]، (یعنی خدا کی طرف سے بموجب احکام ربانی آپ اس پر حد جاری فرماتے تھے) آپنے نام لیکر کبھی کسی مسلمان پر لعنت نہیں کی، آپ نے کبھی کسی غلام کو، لونڈی کو، کسی عورت کو[۴]، جانور کو اپنے

---

[۱] صحیح بخاری باب بدء الوحی [۲] جامع ترمذی وشمائل ترمذی [۳] صحیح بخاری ومسلم وابوداود، کتاب الادب [۴] یہ تفصیل مسلم اور ابوداود وغیرہ احادیث کی مختلف روایات میں حضرت عائشہ رضی سے مروی ہے۔

ہاتھ سے نہیں مارا، آپ نے کسی کی کوئی درخواست رد نہیں فرمائی لیکن یہ کہ وہ ناجائز ہو[1]، آپ جب گھر کے اندر تشریف لاتے تو نہایت خنداں، ہنستے اور مسکراتے ہوئے، دوستوں میں پانوں پھیلا کر نہیں بیٹھے تھے[2]، باتیں ٹھہر ٹھہر کر اس طرح فرماتے تھے کہ کوئی یاد رکھنا چاہے تو رکھ لے[3]۔

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تربیت یافتہ تھے، اور آغاز نبوت سے آخر عمر تک کم از کم ۲۳ برس آپ کی خدمتِ اقدس میں رہے تھے، ایک دفعہ حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ نے ان سے آپ کے اخلاق و عادات کی نسبت سوال کیا، فرمایا، آپ خندہ جبیں، نرم خو، مہربان طبع تھے، سخت مزاج اور تنگدل نہ تھے، بات بات پر شور نہیں کرتے تھے، کوئی برا کلمہ منہ سے کبھی نہیں نکالتے تھے، عیب جو اور تنگ گیر نہ تھے، کوئی ایسی بات ہوتی جو آپ کو ناپسند ہوتی تو اس سے اغماض فرماتے تھے کوئی آپ سے اس کی امید رکھتا تو نہ اس کو مایوس بناتے تھے اور نہ منظوری ظاہر فرماتے تھے، (یعنی صراحۃً انکا تردید نہیں کرتے تھے، بلکہ خاموش رہتے تھے، اور مزاج شناس آپ کے تیور سے آپ کا مقصد سمجھ جاتے تھے اپنے نفس سے تین چیزیں آپ نے بالکل دور کر دی تھیں، بحث و مباحثہ، ضرورت سے زیادہ بات کرنا اور جو بات مطلب کی نہ ہو اس میں پڑنا، دوسروں کے متعلق بھی تین باتوں سے پرہیز کرتے تھے کسی کو برا نہیں کہتے تھے کسی کی عیب گیری نہیں کرتے تھے کسی کے اندرونی حالات کی ٹوہ میں نہیں رہتے تھے، وہی باتیں کرتے تھے جن سے کوئی مفید نتیجہ نکل سکتا تھا جب آپ کلام کرتے تو صحابہ اس طرح خاموش ہو کر اور سر جھکا کر سنتے گویا ان کے سروں پر پرندے بیٹھے ہیں، جب آپ چپ ہو جاتے تو پھر وہ آپس میں بات چیت کرتے، کوئی دوسرا بات کرتا تو جب تک وہ بات ختم نہ کر لیتا، چپ سنا کرتے، لوگ جن باتوں پر

---

[1] حاکم بہ سند متصل، اس کے بعض ٹکڑے صحیح مسلم میں بھی ہیں [2] ابن سعد [3] صحیح بخاری و مسلم و ابو داؤد،

ہنستے آپ بھی مسکرا دیتے، جن پر لوگ تعجب کرتے، آپ بھی کرتے، کوئی باہر کا آدمی اگر بیباکی سے گفتگو کرتا تو آپ تحمل فرماتے، دوسروں کے منہ سے اپنی تعریف سننا پسند نہیں کرتے تھے، لیکن اگر کوئی آپکے احسان وانعام کا شکریہ ادا کرتا، تو قبول فرماتے، جبتک بولنے والا خود چپ نہ ہو جاتا آپ اس کی بات درمیان سے نہیں کاٹتے تھے، نہایت فیاض، نہایت راست گو، نہایت نرم طبع اور نہایت خوش صحبت تھے، اگر کوئی دفعۃً آپ کو دیکھتا تو مرعوب ہو جاتا، لیکن جیسے جیسے آشنا ہوتا جاتا آپسے[۲] محبت کرنے لگتا۔

ہند بن ابی ہالہ جو گویا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے آغوش پروردہ تھے، وہ بیان کرتے ہیں کہ آپ[۳] نرم خو تھے، سخت مزاج نہ تھے، کسی کی توہین روا نہیں رکھتے تھے، چھوٹی چھوٹی باتوں پر اظہار شکر فرماتے تھے، کسی چیز کو برا نہیں کہتے تھے، کھانا جس قسم کا سامنے آتا تناول فرماتے، اور اسکو برا بھلا نہ کہتے، کوئی اگر کسی امر حق کی مخالفت کرتا تو آپ کو غصہ آجاتا، اور اس کی پوری حمایت کرتے، لیکن خود اپنے ذاتی معاملہ پر کبھی آپ کو غصہ نہیں آیا اور نہ کسی سے انتقام لیا)

مداومت عمل (اخلاق کا سب سے مقدم اور ضروری پہلو یہ ہے کہ انسان جس کام کو اختیار کرے اُس کو اسقدر استقلال کے ساتھ قائم رہے کہ گویا وہ اس کی فطرتِ ثانیہ بنجائے، انسان کے سوا تمام دنیا کی مخلوقات صرف ایک ہی قسم کا کام کر سکتی ہیں، اور وہ فطرۃً اسی پر مجبول ہیں، آفتاب صرف روشنی بخشتا ہے، اس سے تاریکی کا صدور نہیں ہو سکتا، رات تاریکی ہی پھیلاتی ہے، وہ روشنی کی علت نہیں، درخت اپنے موسم ہی میں پھلتے ہیں اور پھول ایام بہار ہی میں پھولتے ہیں، حیوانات کا ایک ایک فرد اپنے نوعی افعال واخلاق سے ایک سر مو تجاوز نہیں کر سکتا، لیکن انسان خدا کی طرف سے مختار پیدا ہوا ہے، وہ آفتاب بھی ہے اور

---

[۱] یہ پوری تفصیل شمائل ترمذی بیان اخلاق میں ہے، [۲] یہ ٹکڑا شمائل ترمذی بیان حلیۂ مبارک میں ہے، [۳] شمائل ترمذی

رات کی تاریکی بھی، اس کے جوہر کا درخت ہر موسم میں پھلتا ہے، اور اس کے اخلاق کے پھول ایام بہار کے پابند نہیں، وہ حیوانات کی طرح کسی ایک ہی خاص قسم کے اعمال و اخلاق پر مجبور نہیں، اس کو اختیار دیا گیا ہے اور یہی اختیار اس کے مکلف اور ذمہ دار ہونے کا راز ہے۔

لیکن اخلاق کا ایک دقیق نکتہ یہ ہے کہ انسان اپنے لیے اخلاق حسنہ کا جو پہلو پسند کرے اس کی شدت سے پابندی کرے، اور اس طرح دائمی اور غیر متبدل طریقے سے اس پر عمل کرے کہ گویا وہ اپنے اختیار کے باوجود اس کام کے کرنے پر مجبور ہے، اور لوگ دیکھتے دیکھتے یہ یقین کرلیں کہ اس شخص سے اس کے علاوہ اور کوئی بات سرزد ہو ہی نہیں سکتی، گویا اس سے یہ افعال اس طرح صادر ہوتے ہیں، جیسے آفتاب سے روشنی، درخت سے پھل اور پھول سے خوشبو کہ یہ خصوصیات ان سے کسی حالت میں الگ نہیں ہوسکتیں، اسی کا نام استقامت حال اور مداومت عمل ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے تمام کاموں میں اسی اصول کی پابندی فرماتے تھے جس کام کو جس طریقہ سے جس وقت آپ نے شروع فرمایا، اس پر برابر شدت کے ساتھ قائم رہتے تھے، سنت کا لفظ ہماری شریعت میں اسی اصول سے پیدا ہوا ہے، سنت وہ فعل ہے جس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیشہ مداومت فرمائی اور بغیر کسی قوی مانع کے کبھی اس کو ترک نہیں فرمایا، اس بنا پر جس قدر سنن ہیں وہ درحقیقت آپ کی استقامتِ حال اور مداومتِ عمل کی ناقابلِ انکار مثالیں ہیں، آپ کے معمولات کا ذکر اس سے پہلے ہوچکا ہے جس سے یہ معلوم ہوا ہوگا کہ آپ کے تمام اخلاق و اعمال کس قدر پختہ اور مستحکم تھے، کہ کبھی تمام عمر ان میں ایک ذرہ فرق نہیں پیدا ہوا، ایک دفعہ ایک شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عبادات و اعمال کے متعلق حضرت عائشہؓ سے دریافت فرمایا، کہ کیا آپ کسی خاص دن یہ کرتے تھے، انھوں نے جواب دیا لا کان عملہ دیمۃ

آپ کا عمل جھڑی ہوتا تھا، یعنی جس طرح بادل کی جھڑی برسنے پر آتی ہے تو نہیں رکتی، اسی طرح آپ کا حال تھا کہ جو بات ایک دفعہ آپ نے اختیار کرلی، ہمیشہ اس کی پابندی کی، پھر فرمایا وایکم یستطیع ما کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم یستطیع، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جو کرسکتے تھے وہ تم میں سے کون کرسکتا ہے۔[۱] دوسری روایت میں ہے

وکان اذا عمل عملاً اثبتہ[۲] — جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کوئی کام کرتے تھے تو اس پر مداومت فرماتے تھے

اس لیے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کا خود ارشاد ہے[۳]

ان احب العمل الی اللہ ادومہ — خدا کے نزدیک سب سے محبوب وہ کام ہے جس پر سب سے زیادہ انسان مداومت کرے

آپ راتوں کو اٹھ کر عبادت کیا کرتے تھے حضرت عائشہ رضی کہتی ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی رات کی یہ عبادت ترک نہیں کی، اگر کبھی مزاج اقدس ناساز یا سست ہوا تو بیٹھ کر ادا کرتے تھے[۴] جریر بن عبد اللہ رض ایک صحابی ہیں، جن کو دیکھ کر آپ محبت سے مسکرا دیا کرتے تھے، ان کا بیان ہے کہ کبھی ایسا نہ ہوا کہ میں خدمتِ اقدس میں حاضر ہوا ہوں اور آپ نے مسکرا نہ دیا ہو،[۵]

جس کام کے کرنے کا جو وقت آپ نے مقرر کرلیا تھا، اس میں کبھی تخلف نہ ہوا، نماز اور تسبیح و تہلیل کے اوقات، نوافل کی تعداد، خواب اور بیداری کے مقررہ ساعات، ہر شخص سے ملنے جلنے کے طرز و انداز میں کبھی فرق نہ آیا، اب وہی مسلمانوں کی زندگی کا دستور العمل ہے)

حسن خلق (حضرت علی رض، حضرت عائشہ رض، حضرت انس رض، حضرت ہند ابی ہالہ وغیرہ جو مدتوں آپ کی خدمت میں رہے تھے، ان سب کا متفقاً بیان ہے کہ آپ نہایت نرم مزاج خوش اخلاق اور نکوسیرت تھے، آپ کا

---

[۱] صحیح بخاری کتاب الرقاق [۲] ابو داؤد، آخر کتاب الصلوٰۃ وصحیح بخاری کتاب الادب [۳] ایضاً [۴] ابو داؤد قیام اللیل [۵] صحیح مسلم مناقب جریر بن عبد اللہ،

چہرہ ہنستا تھا، وقار و متانت سے گفتگو فرماتے تھے، کسی کی خاطر شکنی نہیں کرتے تھے،

معمول یہ تھا کہ کسی سے ملنے کے وقت ہمیشہ پہلے خود سلام اور مصافحہ فرماتے، کوئی شخص جھک کر آپ کے کان میں کچھ بات کہتا تو اس وقت تک اسکی طرف سے رخ نہ پھیرتے جب تک وہ خود منھ نہ ہٹائے، مصافحہ میں بھی یہی معمول تھا یعنی کسی سے ہات ملاتے تو جب تک وہ خود نہ چھوڑ دے، اسکا ہاتھ نہ چھوڑتے، مجلس میں بیٹھتے تو آپکے زانوں کبھی ہمنشینوں سے آگے نکلے ہوئے نہ ہوتے،[1]

اکثر نوکر چاکر، لونڈی غلام خدمتِ اقدس میں پانی لیکر آتے کہ آپ اس میں ہات ڈالدیں تاکہ متبرک ہو جائے، جاڑوں کے دن اور صبح کا وقت ہوتا، تاہم آپ کبھی انکار نہ فرماتے۔[2]

ایک دفعہ آپ سعد بن عبادہؓ سے ملنے گئے، واپس آنے لگے تو انھوں نے اپنے صاحبزادہ قیسؓ کو ساتھ کر دیا، کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمرکاب جائیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قیسؓ سے کہا تم بھی میرے اونٹ پر سوار ہو لو، انھوں نے بے ادبی کے لحاظ سے تامل کیا، آپنے ارشاد فرمایا کہ یا سوار ہو لو یا گھر واپس جاؤ، وہ واپس چلے آئے۔[3]

ایک دفعہ نجاشی کے ہاں سے ایک سفارت آئی، آپنے اس کو اپنے ہاں مہمان رکھا، اور خود بہ نفس نفیس مہمانداری کے تمام کام انجام دیے، صحابہ نے عرض کی کہ ہم یہ خدمت انجام دیں گے ارشاد ہوا کہ ان لوگوں نے میرے دوستوں کی خدمت گذاری کی ہے، اس لیے میں خود ان کی خدمت گذاری کرنی چاہتا ہوں۔[4]

---

[1] ابو داؤد و ترمذی [2] صحیح مسلم باب فی قرب النبی صلی اللہ علیہ وسلم من الناس [3] سنن ابو داؤد کتاب الادب [4] شرح شفاء، قاضی عیاض بحوالہ دلائل بیہقی جلد اخلاق۔

عتبان بن مالکؓ جو اصحابِ بدر میں تھے انکی بینائی میں فرق آگیا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آکر درخواست کی کہ میں اپنے محلہ کی مسجد میں نماز پڑھاتا ہوں لیکن جب بارش ہو جاتی ہے تو مسجد تک جانا مشکل ہو جاتا ہے، اس لیے اگر آپ میرے گھر میں تشریف لاکر نماز پڑھ لیتے تو میں اسی جگہ کو سجدہ گاہ بنالیتا، دوسرے دن صبح کے وقت آپ حضرت ابوبکرؓ کو ساتھ لیکر ان کے گھر گئے اور دروازہ پر ٹھہر کر اذن مانگا، اندر سے جواب آیا تو گھر میں تشریف لے گئے اور دریافت فرمایا کہ کہاں نماز پڑھوں؟ انھوں نے جگہ بتادی، آپ نے تکبیر کہکر دو رکعت نماز ادا کی، نماز کے بعد لوگوں نے کھانے کے لیے اصرار کیا، خزیرہ ایک کھانا ہوتا ہے قیمہ پر آٹا چھڑک کر تیار کرتے ہیں، وہ سامنے آیا، محلہ کے تمام لوگ کھانے میں شریک ہوئے، حاضرین میں سے کسی نے کہا مالک بن دخشن نظر نہیں آتے، ایک نے کہا وہ منافق ہے، ارشاد فرمایا یہ نہ کہو، وہ لا الٰہ الا اللہ کہتے ہیں، لوگوں نے کہا ہاں انکا میلان منافقین کی طرف ہے، آپ نے فرمایا جو شخص خدا کی مرضی کے لیے لا الٰہ الا اللہ کہتا ہے، خدا اس پر آگ کو حرام کر دیتا ہے۔[1]

ابتداے ہجرت میں خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور تمام مہاجرین انصار کے گھر میں مہمان رہے تھے، دس دس آدمیوں کی ایک ایک جماعت ایک ایک گھر میں مہمان اتاری گئی تھی مقداد بن الاسودؓ کہتے ہیں کہ میں اس جماعت میں تھا جسمیں خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم شامل تھے، گھر میں چند بکریاں تھیں جن کے دودھ پر گذارا تھا، دودھ دوہ چکتا تو سب لوگ اپنے اپنے حصہ کا پی لیتے، اور آپ کے لیے پیالہ میں چھوڑ دیتے، ایک شب کا واقعہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری میں تاخیر ہوئی لوگ دودھ پی کر سو رہے، آپ نے آکر دیکھا تو پیالہ خالی پایا، خاموش ہو رہے، پھر فرمایا خدایا، جو آج کھلائے اسکو

[1] بخاری ج اول ص ۶۰ کتاب الصلوٰۃ؛

تو بھی کھلا دینا، حضرت مقداد چھری لیکر کھڑے ہوئے کہ بکری کو ذبح کرکے گوشت پکائیں، آپ نے روکا
اور بکری کو دوبارہ دوہ کر جو کچھ نکلا اسی کو پی کر سو رہے، اور کسی کو اس فعل پر ملامت نہ کی۔[۱]

ابو شعیب رضؓ ایک انصاری تھے، ان کا غلام بازار میں گوشت کی دوکان رکھتا تھا، ایک دن
وہ خدمت اقدس میں آئے، آپ صحابہ کے حلقہ میں تشریف فرما تھے، اور چہرہ سے بھوک کا اثر پیدا تھا،
ابو شعیب رضؓ نے جا کر غلام سے کہا کہ پانچ آدمیوں کا کھانا تیار کرو، کھانا تیار ہوچکا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
سے درخواست کی کہ صحابہ کے ساتھ قدم رنجہ فرمائیں، کل پانچ آدمی تھے، راہ میں ایک اور شخص ساتھ
ہو لیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ابو شعیب رضؓ سے کہا کہ یہ شخص بے کہے ساتھ ہو لیا ہے، تم اجازت دو تو یہ بھی
ساتھ آئے، ورنہ رخصت کر دیا جائے، انھوں نے کہا آپ ان کو بھی ساتھ لائیں۔[۲]

عقبہ بن عامر رضؓ ایک صحابی تھے، ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پہاڑ کے درہ میں اونٹ پر
سوار جارہے تھے، یہ بھی ساتھ تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے کہا کہ "آؤ سوار ہو لو" انھوں نے اسکو
گستاخی سمجھا کہ رسول اللہ کو پیادہ بنا کر خود سوار ہوں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دوبارہ کہا اب
انکار کرنا امتثالِ امر کے خلاف تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اتر پڑے اور یہ سوار ہو لیے۔[۳]

مجالسِ صحبت میں لوگوں کی ناگوار باتوں کو برداشت فرماتے، اور اس کا اظہار نہ کرتے، حضرت
زینب رضؓ سے جب نکاح ہوا، اور دعوتِ ولیمہ کی تو کچھ لوگ کھانا کھا کر وہیں بیٹھے رہے، اسوقت پردہ کا
حکم نازل نہیں ہوا تھا، اور حضرت زینب رضؓ بھی مجلس میں شریک تھیں، آپ چاہتے تھے کہ لوگ اٹھ جائیں
لیکن زبان سے کچھ نہیں فرماتے تھے، لوگوں نے کچھ خیال نہ کیا، آپ اٹھ کر حضرت عائشہ رضؓ کے حجرہ تک گئے

[۱] مسند ابن حنبل ج ۶ ص ۴ [۲] بخاری صفحہ ۸۲۱ [۳] نسائی صفحہ ۸۰۳

واپس آئے تو اسی طرح مجمع موجود تھا، پھر واپس چلے گئے، اور دوبارہ تشریف لائے، پردہ کی آیت اسی موقع پر اتری،[1]

غزوۂ حنین سے واپس آرہے تھے کہ راہ میں نماز کا وقت آگیا، حسب دستور ٹھہر گئے، موذن نے اذان دی، ابو محذورہ جو اس وقت تک اسلام نہیں لائے تھے، چند دوستوں کے ساتھ گشت لگا رہے تھے، اذان سن کر سب نے چلا چلا کر استہزاء کے طور پر اذان کی نقل اتارنی شروع کی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سب کو بلوا کر ایک ایک سے اذان کہلوائی، ابو محذورہؓ خوش لحن تھے، انکی اذان پسند آئی، سامنے بٹھا کر سر پر ہات پھیرا اور برکت کے لیے دعا کی، پھر ان کو اذان سکھلا کر ارشاد فرمایا کہ جاؤ، اسی طرح حرم میں اذان دیا کرنا،[2]

ایک صحابی کا بیان ہے کہ بچپن میں انصار کے نخلستان میں چلا جاتا اور ڈھیلوں سے مار کر کھجوریں گراتا، لوگ مجکو خدمت اقدس میں لے گئے، آپ نے پوچھا ڈھیلے کیوں چلاتے ہو؟ میں نے کہا کھجوروں کے لیے، ارشاد فرمایا کہ زمین پر ٹپکی ہوئی کھجوریں کھا لیا کرو، ڈھیلے نہ مارو، یہ کہکر میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور دعا دی،[3]

عباد بن شرجیل مدینہ میں ایک صاحب تھے، ایک دفعہ قحط پڑا اور بھوک کی حالت میں ایک باغ میں گھس گئے، اور خوشے توڑ کر کچھ کھائے، کچھ دامن میں رکھ لیے، باغ کے مالک کو معلوم ہوا تو اس نے آکر انکو مارا اور کپڑے اتروا لیے، یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس شکایت لیکر آئے، مدعا علیہ بھی ساتھ تھا، آپ نے اسکی طرف مخاطب ہوکر فرمایا کہ یہ جاہل تھا، اسکو تعلیم دینا تھا، یہ بھوکا تھا اسکو کھانا کھلانا تھا

---

[1] بخاری ص ۷۰۲۲ باب آیۃ الحجاب [2] دار قطنی مطبوعہ دہلی ج ۱ ص ۸۶ کتاب الصلوٰۃ [3] ابوداؤد کتاب الجہاد،

یہ کہکر کپڑے واپس دلوائے اور ساٹھ صاع غلہ اپنے پاس سے عنایت فرمایا[1]،

یہود کا دستور تھا کہ عورتوں کو جب ایام آتے تو اُن کو گھروں سے نکال دیتے اور ان کے ساتھ کھانا پینا چھوڑ دیتے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ میں تشریف لائے، تو انصار نے آپ سے اس کے متعلق سوال کیا، اس پر آیت اتری کہ اس حالت میں مقاربت ناجائز ہے، اس بنا پر آپنے حکم دیا کہ مقاربت کے سوا کوئی چیز منع نہیں یہودیوں نے آپ کا حکم سنا تو بولے کہ یہ شخص بات بات میں ہماری مخالفت کرتا ہے، صحابہ آپ کی خدمت میں آئے کہ یہود جب یہ کہتے ہیں تو ہم مقاربت بھی کیوں نہ کریں، رخسارۂ مبارک غصہ سے سرخ ہوگیا، دونوں صاحب چلے گئے، آپنے ان کے پاس کچھ کھانے کی چیزیں بھیجیں، اس وقت اُن کو تسکین ہوئی کہ آپ ناراض نہ تھے[2]،

کسی شخص کی کوئی بات ناپسند آتی تو اکثر اس کے سامنے اس کا تذکرہ نہ فرماتے، ایکدفعہ ایک صاحب عرب کے دستور کے مطابق زعفران لگاکر خدمت میں حاضر ہوئے، آپنے کچھ نہ فرمایا، جب وہ اٹھ کر چلے گئے تو لوگوں سے کہا کہ ان سے کہدینا کہ یہ رنگ دھو ڈالیں[3]،

ایک دفعہ ایک شخص نے باریابی کی اجازت چاہی، آپنے فرمایا اچھا آنے دو، وہ اپنے قبیلہ کا اچھا آدمی نہیں ہے، لیکن جب وہ خدمتِ مبارک میں حاضر ہوا تو نہایت نرمی کے ساتھ اس سے گفتگو فرمائی، حضرت عائشہؓ کو اس پر تعجب ہوا، اور آپ سے دریافت فرمایا کہ آپ تو اس کو اچھا نہیں سمجھتے تھے، پھر اس رفق و ملاطفت کے ساتھ کلام کیا، آپنے فرمایا خدا کے نزدیک سب سے بدتر وہ شخص ہے جس کی بدزبانی کی وجہ سے لوگ اس سے ملنا جلنا چھوڑ دیں[4]،

---

[1] ابوداؤد جلد ا کتاب الجہاد [2] ابوداؤد باب مواکلۃ الحائض [3] ابوداؤد ج ۲ کتاب الادب [4] صحیح بخاری و ابوداؤد جلد ۲ کتاب الادب باب حسن العشرہ باب الترجل

یہود جس درجہ شقی اور دشمنِ اسلام تھے، اس کا اندازہ گذشتہ واقعات سے ہوچکا ہوگا، باایں ہمہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان سنگدلوں کے ساتھ ہمیشہ نرمی اور لطف کا برتاؤ کرتے اور ان سے داد و ستد رکھتے، سخت سے سخت غصہ کی حالت میں صرف اسقدر فرماتے "اس کی پیشانی خاک آلود ہو"[۱]

حضرت جابر بن عبداللہ انصاری کہتے ہیں کہ مدینہ میں ایک یہودی رہتا تھا جس سے میں قرض لیا کرتا تھا، ایک سال اتفاق سے کھجوریں نہیں پھلیں اور قرضہ ادا نہ ہوسکا، اس پر پورا سال گذر گیا، بہار آئی تو یہودی نے تقاضا شروع کیا، اب کی بھی پھل کم آئے، میں نے آیندہ فصل کی مہلت مانگی، اس نے انکار کیا، میں نے آنحضرت صلعم سے آکر تمام واقعات بیان کیے، آپ چند صحابہ کیساتھ خود یہودی کے گھر تشریف لے گئے اور سمجھایا کہ مہلت دیدو، اس نے کہا "ابو القاسم! میں کبھی مہلت نہ دونگا" آپ نخلستان میں تشریف لے گئے، اور ایک چکر لگا کر پھر یہودی کے پاس آئے اور اس سے گفتگو کی لیکن وہ کسی طرح راضی نہ ہوا، بالآخر آپ نے مجھ سے فرمایا کہ چبوترہ پر جو مسقف تھا، فرش بچھا دو، اس پر آرام فرمایا اور سوگئے، سو کر اٹھے تو پھر یہودی سے خواہش ظاہر کی کہ مہلت دیدے، اس شقی نے اب بھی نہ مانا، آپ درختوں کے جھنڈ میں جا کر کھڑے ہوگئے، اور جابر سے کہا کہ کھجوریں توڑنی شروع کرو، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی برکت سے اتنی کھجوریں نکلیں کہ یہودی کا قرضہ ادا کر کے بچ رہیں[۲]

مجلس نبوی میں جگہ بہت کم ہوتی تھی، جو لوگ پہلے سے آکر بیٹھ جاتے تھے، ان کے بعد جگہ باقی نہیں رہتی تھی، ایسے موقع پر اگر کوئی آجاتا تو اس کے لیے آپ خود اپنی ردائے مبارک بچھا دیتے تھے، ایک دفعہ مقام جعرانہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما تھے، اور اپنے ہاتھوں سے لوگوں کو گوشت

---

[۱] ادب المفرد امام بخاری [۲] بخاری ص ۸۱۰ باب الرطب والتمر۔

تقسیم فرما رہے تھے کہ اتنے میں ایک عورت آئی اور آپ کے پاس چلی گئی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا تو اس کی نہایت تعظیم کی، اپنی چادر مبارک اس کے لیے بچھا دی، راوی کہتا ہے کہ میں نے دریافت کیا کہ یہ کون عورت تھی، تو لوگوں نے کہا یہ حضورؐ کی رضاعی ماں تھیں[1]

اسی طرح ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما تھے، کہ آپ کے رضاعی والد آئے، آپ نے ان کے لیے چادر کا ایک گوشہ بچھا دیا، پھر رضاعی ماں آئیں، آپ نے دوسرا گوشہ بچھا دیا، آخر میں رضاعی بھائی آئے تو آپ اٹھ کھڑے ہوئے اور ان کو اپنے سامنے بٹھا لیا۔[2]

حضرت ابوذرؓ مشہور صحابی ہیں، ایک دفعہ ان کو بلا بھیجا، تو وہ گھر میں نہیں ملے تھوڑی دیر کے بعد حاضر خدمت ہوئے تو آپ لیٹے ہوئے تھے، ان کو دیکھکر اٹھ کھڑے ہوئے اور اپنے سینہ سے لگا لیا[3] حضرت جعفرؓ بھی جب حبشہ سے واپس آئے تھے تو انکو گلے لگا لیا اور انکی پیشانی کو بوسہ دیا،[4]

سلام میں پیشدستی فرماتے، راستہ میں جب چلتے تو مرد، عورتیں، بچے جو سامنے آتے ان کو سلام کرتے،[5] ایک دفعہ آپ راستہ سے گذر رہے تھے، ایک مقام پر مسلمان اور منافق وکافر یکجا بیٹھے ملے آپ نے سب کو سلام کیا،[6]

کسی کی کوئی بات بری معلوم ہوتی تو مجلس میں نام لیکر اس کا ذکر نہیں کرتے تھے، بلکہ صیغۂ تعمیم کے ساتھ فرماتے تھے کہ لوگ ایسا کرتے ہیں، لوگ ایسا کہتے ہیں، بعض لوگوں کی یہ عادت ہے، یہ طریقۂ ابہام اس لیے اختیار فرماتے تھے کہ شخص مخصوص کی ذلت نہ ہو، اور اس کے احساس غیرت

---

[1] ابوداؤد کتاب الادب [2] ابوداؤد کتاب الادب بر الوالدین [3] ابوداؤد کتاب الادب باب المعانقہ [4] حوالہ سابق [5] بخاری وابوداؤد باب السلام [6] بخاری باب السلام علی جماعۃ فیہا الکافر،

میں کمی نہ آجائے۔

حسن معاملہ

اگرچہ غایتِ فیاضی کی وجہ سے اکثر مقروض رہتے تھے، یہاں تک کہ وفات کے وقت بھی آپ کی زرہ من بھر غلّہ پر ایک یہودی کے ہاں گرو تھی، لیکن ہر حال میں حسنِ معاملت کا سخت اہتمام تھا۔ مدینہ میں دولتمند عموماً یہودی تھے، اور اکثر ان ہی سے آپ قرض لیا کرتے یہودی عموماً دنی الطبع اور سخت گیر ہوتے ہیں، آپ ان کی ہر قسم کی بدمزاجیاں برداشت فرماتے تھے،

(نبوت سے پہلے جن لوگوں سے آپ کے تاجرانہ تعلقات تھے، انھوں نے ہمیشہ آپ کی دیانت اور حسنِ معاملہ کا اعتراف کیا ہے، اسی لیے قریش نے متفقاً آپ کو امین کا خطاب دیا تھا، نبوت کے بعد بھی گو قریش بغض وکینہ کے جوش سے لبریز تھے، تاہم ان کی دولت کے لیے مامون مقام آپ ہی کا کاشانہ تھا، عرب میں سائبؓ نام ایک تاجر تھے، وہ مسلمان ہو کر بارگاہ نبوت میں حاضر ہوئے، لوگوں نے مدحیہ الفاظ میں آپ سے ان کا تعارف کرایا، آپ نے فرمایا "میں ان کو تم سے زیادہ جانتا ہوں"، سائبؓ نے کہا میرے ماں باپ فدا، آپ میرے ساجھی تھے، لیکن ہمیشہ معاملہ صاف رکھا[1]

ایک دفعہ ایک شخص سے کچھ کھجوریں قرض کے طور پر لیں، چند روز کے بعد وہ تقاضے کو آیا، آپ نے ایک انصاری کو حکم دیا کہ اس کا قرضہ ادا کر دیں، انصاری نے کھجوریں دیں لیکن ویسی عمدہ نہ تھیں جیسی اس نے دی تھیں، اس شخص نے لینے سے انکار کیا، انصاری نے کہا تم رسول اللہ ﷺ کی عطا کردہ کھجور کے لینے سے انکار کرتے ہو، بولا ہاں، رسول اللہ ﷺ عدل نہ کریں گے تو اور کس سے توقع رکھی جائے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ جملے سنے تو آپ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور فرمایا کہ یہ بالکل سچ ہے[2]

---

[1] ابوداؤد ج ۲ ص ۱۰۲ ، [2] ترغیب وترہیب بحوالہ مسند احمد ص ۲۳ مطبوعہ مصر ج ۲

ایک دن ایک بدو آیا جس کا کچھ قرضہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر تھا، بدو عموماً وحشی مزاج ہوتے ہیں اس نے نہایت سختی سے گفتگو شروع کی، صحابہ نے اس گستاخی پر اس کو ڈانٹا، اور کہا کہ تجھکو خبر ہے تو کس سے ہمکلام ہے، بولا کہ میں تو اپنا حق مانگ رہا ہوں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے ارشاد فرمایا کہ تم لوگوں کو اسی کا ساتھ دینا چاہیے، کیونکہ اس کا حق ہے، (قرض خواہ کو بولنے کا حق ہے، اس کے بعد صحابہ کو اس کا قرض ادا کر دینے کا حکم صادر فرمایا اور زیادہ دلوایا)[1]

ایک غزوہ میں حضرت جابر بن عبد اللہ انصاری رضہ ہمرکاب تھے، ان کی سواری میں جو اونٹ تھا سست رو تھا، اور تھک جانے کی وجہ سے اور بھی سست ہو گیا تھا، آپ نے اونٹ ان سے خرید لیا اور دام کے ساتھ اونٹ بھی ان کو دیدیا، کہ دونوں تمہارے ہیں،[2]

یہی واقعہ ایک روایت میں اس طرح پر ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا تمہارے پاس کوئی لکڑی ہو تو دو، انھوں نے دی، آپنے اس سے اونٹ کو مارا، تو وہ اسقدر تیز دوڑنے لگا کہ سب سے آگے نکل گیا، پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے چار دینار پر اونٹ اس شرط پر خرید لیا کہ مدینہ تک انکا سواری کا حق ہے، مدینہ پہنچکر جابر بن عبد اللہ نے قیمت طلب کی، آپنے بلال رضہ سے فرمایا کہ ان کو قیمت چار دینار اور اس سے کچھ اور زیادہ بھی دو، چنانچہ حضرت بلال رضہ نے چار دینار پر ایک قیراط سونا اور زیادہ دیا،[3]

معمول تھا کہ کوئی جنازہ لایا جاتا تو پہلے فرماتے کہ میت پر کچھ قرض تو نہیں ہے، اگر معلوم ہوتا کہ مقروض تھا، تو صحابہ سے فرماتے کہ جنازہ کی نماز پڑھا دو، خود شریک نہ ہوتے،[4]

ایک دفعہ کسی سے اونٹ قرض لیا جب واپس کیا تو اس سے بہتر اونٹ واپس کیا اور فرمایا

---

[1] ابن ماجہ باب لصاحب الحق سلطان [2] بخاری ص ۲۸۲ باب شری الدواب [3] صحیح بخاری کتاب الوکالۃ [4] صحیح بخاری ص ۸۰۹ کتاب النفقات،

سب سے بہتر وہ لوگ ہیں جو قرض کو خوش معاملگی سے ادا کرتے ہیں[1]،

ایک دفعہ کسی شخص سے ایک پیالہ مستعار لیا، سو اتفاق سے وہ گم گیا، تو اس کا تاوان ادا فرمایا[2]، عموماً فرمایا کرتے تھے کہ میں تین دن سے زیادہ اپنے پاس ایک دینار بھی رکھنا پسند نہیں کرتا، بجز اس دینار کے جن کو قرض ادا کرنے کے انتظار میں اپنے پاس رکھ چھوڑتا ہوں[3]،

ایک دفعہ ایک بدو اونٹ کا گوشت بیچ رہا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ خیال تھا کہ گھر میں چھوہارے موجود ہیں، آپنے ایک وسق چھوہاروں پر گوشت چکالیا، گھر میں آکر دیکھا تو چھوہارے نہ تھے، باہر تشریف لاکر قصاب سے فرمایا کہ میں نے چھوہاروں پر گوشت چکایا تھا، لیکن چھوہارے میرے پاس نہیں ہیں، اس نے داویلا مچائی کہ ہائے بد دیانتی! لوگوں نے سمجھایا کہ رسول اللہ بد دیانتی کریں گے؟ آپ نے فرمایا نہیں چھوڑ دو، اس کو کہنے کا حق ہے، پھر قصاب کی طرف خطاب کرکے وہی فقرہ ادا کیا، اس نے پھر وہی لفظ کہے، لوگوں نے پھر روکا، آپنے فرمایا اس کو کہنے دو، اس کو کہنے کا حق ہے، اور اس جملہ کو کئی بار دہراتے رہے، اس کے بعد آپنے ایک انصاریہ کے ہاں اس کو بھجوایا کہ اپنے دام کے چھوہارے وہاں سے لے لے، جب وہ چھوہارے لیکر پلٹا تو آپ صحابہ کے ساتھ تشریف فرما تھے، اس کا دل آپکے حلم وعفو اور حسنِ معاملت سے متاثر تھا، دیکھنے کے ساتھ بولا محمد! تم کو خدا جزائے خیر دے، تم نے قیمت پوری دی اور اچھی دی[4]،

ایک دفعہ مدینہ منورہ کے باہر ایک مختصر سا قافلہ آکر فروکش ہوا، ایک سرخ رنگ کا اونٹ اس کے ساتھ تھا، اتفاقاً ادھر سے آپ کا گذر ہوا، آپنے اونٹ کی قیمت پوچھی، لوگوں نے قیمت بتائی

---

[1] ترمذی باب استقراض البعیر ص ۲۲۵ [2] ترمذی ابواب الکلام ص ۲۳۱ [3] بخاری ج ۱ ص ۱۰۲۳ کتاب الاستقراض [4] مسند ابن حنبل ج ۶ ص ۲۶۸۔

بے مول تول لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے وہی قیمت منظور کر لی، اونٹ کی نہار پکڑ کر شہر کی طرف روانہ ہو گئے، بعد کو لوگوں کو خیال آیا کہ بے جان پہچان ہم نے جانور کیوں حوالہ کر دیا۔ اور اس حماقت پر اب پورے قافلہ کو ندامت تھی، قافلہ کے ساتھ ایک خاتون بھی تھی، اس نے کہا "مطئین رہو، ہم نے کسی شخص کا چہرہ ایسا روشن نہیں دیکھا" یعنی ایسا شخص دغا نہ کرے گا۔ رات ہوئی تو آپ نے ان کے لیے کھانا اور قیمت بھر کھجوریں بھجوا دیں [1]،

غزوۂ حنین میں آپ کو کچھ اسلحہ کی ضرورت تھی، صفوان اس وقت تک کافر تھے، ان کے پاس بہت سی زرہیں تھیں، آپ نے ان سے کچھ زرہیں طلب کیں، انھوں نے کہا محمد؟ کیا کچھ غصب کا ارادہ ہے؟ فرمایا نہیں، میں عاریۃً مانگتا ہوں، اگر ان میں سے کوئی تلف ہوئی تو میں تاوان دوں گا، چنانچہ انھوں نے چالیس زرہیں مسلمانوں کو عاریۃً دیں، حنین سے واپسی کے بعد جب اسلحہ اور دیگر سامانوں کا جائزہ لیا گیا، تو کچھ زرہیں کم نکلیں، آپ نے صفوان سے کہا، تمھاری چند زرہیں کم ہیں، ان کا معاوضہ لو، صفوان نے عرض کی، "یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرے دل کی حالت اب پہلی جیسی نہیں [2]" یعنی مسلمان ہو گیا، اب معاوضہ کی حاجت نہیں)

عدل و انصاف کوئی شخص گوشہ نشین ہو کر بیٹھ جائے، تو اس کے لیے عدل و انصاف سے کام لینا نہایت آسان ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو عرب کے سیکڑوں قبائل سے کام پڑتا تھا، یہ آپس میں ایک ایک کے دشمن تھے، ایک کے موافق فیصلہ کیا جاتا تو دوسرا دشمن بنجاتا، اسلام کی اشاعت کی غرض سے ہمیشہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تالیف قلوب سے کام لینا پڑتا، ان سب مشکلات اور پیچیدگیوں پر بھی عدل و

[1] دار قطنی جلد ثانی صفحہ ۳۰۸ کتاب البیوع [2] ابو داؤد باب تضمین العاریۃ۔

کا پلہ کبھی کسی طرف جھکنے نہ پاتا،

فتح مکہ کے بعد تمام عرب میں صرف طائف رہ گیا تھا، جس نے گردن تسلیم خم نہیں کی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا محاصرہ کیا، لیکن پندرہ بیس روز کے بعد محاصرہ اٹھا لینا پڑا، صخرؓ ایک رئیس تھے، ان کو یہ حال معلوم ہوا، تو خود جاکر طائف کی حصار بندی کی اور اہل شہر کو اس قدر دبایا کہ بالآخر وہ مصالحت پر راضی ہو گئے، صخرؓ نے بارگاہ نبوت میں اطلاع کی، مغیرہ بن شعبہ ثقفی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے کہ صخرؓ نے میری پھوپھی کو قبضہ میں کر رکھا ہے، آپ نے صخرؓ کو بلا بھیجا اور حکم دیا کہ مغیرہ کی پھوپھی کو ان کے گھر پہنچا دو، اس کے بعد بنو سلیم آئے کہ جس زمانہ میں ہم کافر تھے صخرؓ نے ہمارے چشمہ پر قبضہ کر لیا تھا، اب ہم اسلام لائے، ہمارا چشمہ ہم کو واپس دلا دیا جائے، آپ نے صخرؓ کو بلا بھیجا، اور فرمایا کہ جب کوئی قوم اسلام قبول کرتی ہے تو اپنے جان و مال کی مالک ہو جاتی ہے، اس لیے ان کو انکا چشمہ دیدو، صخرؓ کو منظور کرنا پڑا، راوی کا بیان ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے صخرؓ نے دونوں حکم منظور کیے تو میں نے دیکھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرہ پر شرم سے سرخی آگئی[1] کہ صخرؓ کو دونوں معاملوں میں شکست ہوئی، اور فتح طائف کا ان کو کوئی صلہ نہ ملا۔

ایک دفعہ ایک عورت نے جو خاندان مخزوم سے تھی، چوری کی، قریش کی عزت کے لحاظ سے لوگ چاہتے تھے کہ سزا سے بچ جائے اور معاملہ دب جائے حضرت اسامہ بن زیدؓ رسول اللہ کے محبوب خاص تھے، لوگوں نے ان سے کہا کہ آپ سفارش کیجئے، انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے معافی کی درخواست کی، آپ نے غضب آلود ہو کر فرمایا کہ بنی اسرائیل اسی کی بدولت تباہ ہوئے کہ وہ غرباء پر حد جاری کرتے اور امراء سے درگذر کرتے تھے[2]

[1] ابوداؤد ص ۸۰ ج ۲ [2] صحیح بخاری کتاب الحدود،

خیبر کے یہودیوں سے جب صلح ہو کر وہاں کی زمین مجاہدین میں تقسیم کر دی گئی تو عبد اللہ بن سہل ایک دفعہ کھجوروں کی بٹائی کے لیے گیے، محیصہ ان کے چچیرے بھائی ساتھ تھے، عبد اللہ گلی میں جا رہے تھے کہ کسی نے ان کو قتل کر کے لاش ایک گڈھے میں ڈال دی، محیصہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جا کر استغاثہ کیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، "تم قسم کھا سکتے ہو کہ یہودیوں نے ان کو قتل کیا" بولے میں نے اپنی آنکھ سے نہیں دیکھا" آپ نے فرمایا تو یہود سے حلف لیا جائے، بولے" حضرت یہودیوں کی قسم کا اعتبار کیا، یہ سو دفعہ جھوٹی قسم کھا لیں گے ۔"

خیبر میں یہود کے سوا اور کوئی قوم آباد نہ تھی، یہ یقینی تھا کہ یہودیوں ہی نے عبد اللہ بن سہل رضؓ کو قتل کیا ہے، تاہم چونکہ کوئی عینی شہادت موجود نہ تھی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہود سے تعرض نہیں فرمایا اور خونبہا کے سو اونٹ بیت المال سے دلوائے۔[1]

طارق محاربی کا بیان ہے کہ جب اسلام عرب میں پھیلنا شروع ہوا تو ہم چند آدمی ربذہ سے نکلے اور مدینہ کو روانہ ہوئے، شہر کے قریب پہنچکر مقام کیا، زنانی سواری بھی ساتھ تھی، ہم سب بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک صاحب سفید کپڑے پہنے ہوئے آئے، اور سلام علیک کی، ہم نے سلام کا جواب دیا، ہمارے ساتھ سرخ رنگ کا اونٹ تھا، اس کی قیمت پوچھی، ہم نے جواب دیا، اتنی کھجوریں انھوں نے کچھ مول تول نہیں کیا اور وہی قیمت منظور کر لی، پھر اونٹ کی مہار پکڑ کر شہر کی طرف بڑھے، نظروں سے اوجھل ہو گئے، تو سب کو خیال آیا کہ دام رہ گئے، اور ہم لوگ ان کو پہچانتے نہیں، لوگوں نے ایک دوسرے کو ملزم ٹھہرانا شروع کیا، محمل نشین خاتون نے کہا مطمئن رہو، ہم نے کسی شخص کا چہرہ اس قدر

[1] یہ واقعہ بخاری و نسائی وغیرہ میں (باب القسامۃ) میں باختلاف روایات مذکور ہے،

چودھویں رات کے چاند کی طرح روشن نہیں دیکھا (یعنی ایسا شخص دغا نہ کریگا) رات ہوئی تو ایک شخص آیا کہ رسول اللہ نے تمھارے لیے کھانا اور کھجوریں بھیجی ہیں، دوسرے دن صبح کو ہم لوگ مدینہ میں آئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں خطبہ دے رہے تھے، ہم لوگوں کو دیکھکر ایک انصاری نے اٹھ کر کہا، یا رسول اللہ! یہ لوگ بنو ثعلبہ کے قبیلہ کے ہیں، اور ان کے مورث نے ہمارے خاندان کے ایک شخص کو قتل کر دیا تھا، اس کے بدلہ میں ان کا ایک آدمی قتل کرا دیجئے، آپ نے فرمایا، باپ کا بدلہ بیٹے سے نہیں لیا جا سکتا[۱]۔

سرق رض ایک صحابی تھے، انھوں نے ایک بدوی سے ایک اونٹ مول لیا، لیکن قیمت نہ ادا ہو سکی، بدوان کو پکڑ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لے گیا اور واقعہ بیان کیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ قیمت ادا کر دو، انھوں نے ناداری کا عذر کیا، آپ نے بدو سے کہا کہ بازار لیجا کر ان کو فروخت کر لو، بدوان کو بازار میں لے گیا، ایک صاحب نے دام دے کر بدو سے خریدا اور آزاد کر دیا[۲]۔

ابو حدرد اسلمی رض ایک صحابی تھے جن پر ایک یہودی کا قرض آتا تھا، اور ان کے پاس بدن پر جو کپڑے تھے، ان کے سوا کچھ نہ تھا، یہ وہ زمانہ تھا جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خیبر کی مہم کا ارادہ کر رہے تھے ابو حدرد رض نے یہودی سے کچھ مہلت طلب کی لیکن وہ نہ مانا اور انکو پکڑ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لایا، آپ نے فرمایا کہ ان کا قرض ادا کر دو، انھوں نے عذر کیا، آپ نے پھر فرمایا، انھوں نے پھر یہی جواب دیا، اور عرض کی کہ یا رسول اللہ! غزوۂ خیبر قریب ہے، شاید وہاں سے واپسی پر کچھ ہاتھ آئے تو میں اسکو ادا کر دوں، آپ نے پھر یہی حکم دیا کہ فوراً ادا کر دو، آخر اپنا تہبند اس یہودی کو قرض میں نذر کیا، اور سر سے جو عمامہ بندھا تھا، اس کو کھول کر کمر سے لپیٹ لیا[۳]۔

---

[۱] دار قطنی ج ۲ ص ۳۰۰، ۳۰۳ [۲] ایضاً ص ۳۱۴ [۳] مسند احمد ج ۳ ص ۲۲۳، معجم صغیر طبرانی معجم عبدان

اس عدل و انصاف کا یہ اثر تھا کہ مسلمان ایک طرف، یہود بھی جو آپ کے شدید ترین دشمن تھے اپنے مقدمات اسی بارگاہِ عدالت میں لاتے تھے،[1] اور ان کی شریعت کے مطابق اس کا فیصلہ ہوتا تھا، چنانچہ قرآن مجید میں اس واقعہ کا مصرح ذکر ہے، اسلام سے پہلے یہودیان بنو نضیر و قریظہ میں عزت و شرافت کی عجیب و غریب حد قائم تھی، کوئی قریظی اگر کسی نضیر کو قتل کرتا تو قصاص میں وہ مارا جاتا، لیکن اگر کوئی قریظی کسی نضیری کے ہاتھ سے مارا جاتا تو اس کے خون کی قیمت سو بارِ شتر چھوہارا تھی، اسلام میں جب یہ واقعہ پیش آیا، تو قریظہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے مقدمہ پیش کیا، آپ نے فوراً توراۃ کے مطابق النفس بالنفس کے حکم سے دونوں قبیلوں میں برابر کا قصاص[2] جاری کر دیا۔

عدل و انصاف کا سب سے نازک پہلو یہ ہے کہ خود اپنے مقابلہ میں بھی حق کا رشتہ چھوٹنے نہ پائے ایک بار آپ مالِ غنیمت تقسیم فرما رہے تھے، لوگوں کا گرد و پیش ہجوم تھا، ایک شخص آ کر منہ کے بل آپ پر لد گیا، دستِ مبارک میں پتلی سی لکڑی تھی آپ نے اس سے اس کو ٹھوکا دیا، اتفاق سے لکڑی کا سرا اس کے منہ میں لگ گیا اور خراش آ گئی، فرمایا مجھ سے انتقام لے لو، اس نے عرض کیا یا رسول اللہ میں نے معاف کر دیا[3]

مرض الموت میں آپ نے مجمع عام میں اعلان کیا کہ اگر میرے ذمہ کسی کا قرض آتا ہو، اگر میں نے کسی کی جان و مال یا آبرو کو صدمہ پہنچایا ہو، تو میری جان و مال و آبرو حاضر ہے، اسی دنیا میں وہ انتقام لے لے، مجمع میں سناٹا تھا، صرف ایک شخص نے چند درہم کا دعویٰ کیا جو دلوا دیے گئے[4]

جود و سخا | جود و سخا آپ کی فطرت تھی، ابن عباسؓ کی روایت ہے کہ آپ تمام لوگوں سے زیادہ سخی تھے اور خصوصاً رمضان کے مہینہ میں آپ بہت زیادہ سخاوت فرماتے تھے،[5] تمام عمر کسی کے سوال پر "نہیں" کا لفظ نہیں فرمایا[6]

[1] ابو داؤد باب تضمین العاریۃ جلد ثانی [2] ابو داؤد کتاب الدیات [3] ابو داؤد باب القود بغیر حدید [4] ابن اسحٰق بروایت ابن ہشام [5] صحیح بخاری باب بدء الوحی [6] صحیح بخاری کتاب الادب باب حسن الخلق۔

انما انا قاسم وخازن واللہ یعطی (بخاری) میں تو صرف دینے بانٹنے والا اور خازن ہوں اور دیتا اللہ ہے[۱]

ایک دفعہ ایک شخص خدمتِ اقدس میں آیا اور دیکھا کہ دور تک آپ کی بکریوں کا ریوڑ پھیلا ہوا ہے اس نے آپ سے درخواست کی اور آپ نے سب کی سب دیدیں، اس نے اپنے قبیلہ میں جاکر کہا کہ اسلام قبول کرلو محمد صلی اللہ علیہ وسلم) ایسے فیاض ہیں کہ مفلس ہو جانے کی پروا نہیں کرتے۔[۲]

ایک دفعہ ایک شخص نے کچھ مانگا آپ نے فرمایا، اس وقت میرے پاس کچھ نہیں ہے، تم میرے ساتھ آؤ، حضرت عمرؓ بھی ساتھ تھے، عرض کی کہ آپ کے پاس کچھ موجود نہیں تو آپ پر کیا ذمہ داری ہے، ایک اور صاحب حاضر تھے، انھوں نے کہا یا رسول اللہ! آپ دیے جائیے اور عرش والے خدا سے نہ ڈریے، وہ آپ کو محتاج نہ کرے گا، آپ فرط بشاشت سے مسکرا دیے۔[۳]

(عام فیاضی کا یہ حال تھا کہ جو شخص آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا، اگر آپ کے پاس کچھ سرمایہ موجود رہتا تو اس کو کچھ نہ کچھ ضرور عطا فرماتے، ورنہ وعدہ فرماتے، اس معمول کی بنا پر لوگ اس قدر دلیر ہو گئے تھے کہ ایک مرتبہ عین اقامتِ نماز کے وقت ایک بدو آیا، آپ کا دامن پکڑ کر کہا کہ میری ایک معمولی سی حاجت باقی رہ گئی ہے، خوف ہے کہ میں اس کو بھول نہ جاؤں، اسکو پورا کر دیجئے، چنانچہ آپ اس کے ساتھ تشریف لے گئے اور اس کی حاجت برآری کر کے آئے تو نماز پڑھی،[۴]

بعض اوقات ایسا ہوتا کہ ایک شخص سے ایک چیز خریدتے قیمت چکا دینے کے بعد پھر وہ چیز اس کو بطور عطیہ کے عنایت فرماتے، چنانچہ ایک مرتبہ حضرت عمرؓ سے ایک اونٹ خریدا اور پھر اسی وقت اس کو عبداللہ بن عمرؓ کو دیدیا، حضرت جابرؓ کے ساتھ بھی اس قسم کا ایک واقعہ مذکور ہے۔[۵]

---

[۱] صحیح بخاری باب فرض الخمس [۲] صحیح مسلم ج ۲ ص ۲۰۹ [۳] ادب المفرد امام بخاری [۴] صحیح بخاری ج ۱ ص ۲۸۴ [۵] ایضاً ص ۲۸۲

کھانے پینے کی چیزوں میں معمولی سے معمولی چیز بھی تنہا نہ کھاتے، بلکہ تمام صحابہ کو شریک فرمالیتے کسی غزوہ میں ۱۳۰ صحابہ ہمراہ تھے، آپ نے ایک بکری خرید کر ذبح کروائی، اور کلیجی کے بھونتے کا حکم دیا وہ تیار ہوئی تو تمام صحابہ کو تقسیم فرمایا، جو لوگ موجود نہ تھے، ان کا حصہ الگ محفوظ رکھا،[1]

جو چیز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آتی، جبتک صرف نہ ہوجاتی، آپ کو چین نہ آتا بیقراری سی رہتی، ام المومنین ام سلمہ رضی بیان کرتی ہیں کہ ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم گھر میں تشریف لائے تو چہرہ متغیر تھا، ام سلمہ رضی نے عرض کیا یا رسول اللہ خیر ہے؟ فرمایا کل جو سات دینار آئے تھے شام ہوگئی اور وہ بستر پر پڑے رہ گئے[2]

حضرت ابوذر رضی سے مروی ہے کہ ایک شب کو وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک راستہ سے گذر رہے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، ابوذر! اگر احد کا پہاڑ میرے لیے سونا ہوجائے تو میں کبھی یہ پسند نہ کرونگا کہ تین راتیں گذر جائیں اور میرے پاس ایک دینار بھی رہ جائے، لیکن ہاں وہ دینار جس کو میں ادائے قرض کے لیے چھوڑوں[3]

اکثر یہاں تک معمول تھا کہ گھر میں نقد کی قسم سے کوئی چیز موجود ہوتی تو جب تک کل خیرات نہ کردی جاتی گھر میں آرام نہ فرماتے، رئیس فدک نے ایک دفعہ چار اونٹ پر غلہ بار کرکے خدمت نبوی میں بھیجا حضرت بلال رضی نے بازار میں غلہ فروخت کرکے ایک یہودی کا قرض تھا وہ ادا کیا، پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آکر اطلاع کی، آپ نے پوچھا کچھ بچ تو نہیں رہا، بولے ہاں کچھ بچ بھی رہا، فرمایا کہ جب تک کچھ باقی رہیگا میں نہیں جاسکتا حضرت بلال رضی نے کہا میں کیا کروں، کوئی سائل نہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد میں رات بسر کی، دوسرے دن حضرت بلال رضی نے آکر کہا یا رسول اللہ! خدا نے آپ کو سبکدوش کردیا،

---

[1] صحیح مسلم ج ۲ ص ۱۹۹ [2] مسند ابن حنبل ج ۶ ص ۲۹۳ [3] صحیح بخاری کتاب الاستقراض ص ۳۲۱،

یعنی جو کچھ تھا وہ بھی تقسیم کر دیا گیا، آپ نے خدا کا شکر ادا کیا اور اٹھ کر گھر تشریف لے گئے۔[1]

اسی طرح ایک بار عصر کی نماز پڑھ کر خلاف معمول فوراً گھر کے اندر تشریف لیگئے اور پھر فوراً نکل آئے لوگوں کو تعجب ہوا، آپنے فرمایا، مجکو نماز میں خیال آیا کہ کچھ سونا گھر میں پڑا رہ گیا ہے، گمان ہوا کہیں ایسا نہ ہو کہ رات ہو جائے اور وہ گھر میں پڑا رہ جائے، اس لیے جا کر اسکو خیرات کر دینے کو کہہ آیا۔[2]

غزوۂ حنین میں جو کچھ ملا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس کو خیرات فرما کر واپس آرہے تھے، راہ میں بدوؤں کو خبر ملی کہ ادھر سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا گذر ہونے والا ہے، آس پاس سے دوڑ کر آئے اور لپٹ گئے کہ ہمیں بھی کچھ عنایت ہو، آپ ازدحام سے گھبرا کر ایک درخت کی آڑ میں کھڑے ہو گئے، انھوں نے ردائے مبارک تھام لی، بالآخر اس کشاکش میں جسم اطہر سے چادر اتر کر ان کے ہاتھ میں رہ گئی، فیاض عالم نے کہا میری چادر دیدو، خدا کی قسم، اگر ان جنگلی درختوں کے برابر بھی اونٹ میرے پاس ہوتے تو میں سب تم کو دیدیتا، اور پھر مجکو بخیل نہ پاتے، نہ دروغگو نہ نامرد۔[3]

لوگوں کو عام حکم تھا کہ جو مسلمان مرجائے اور اپنے ذمہ قرض چھوڑ جائے تو مجھے اطلاع دو، میں اس کو ادا کر دوں گا، اور جو ترکہ چھوڑ جائے وہ وارثوں کا حق ہے، مجھے اس سے کوئی مطلب نہیں۔[4]

ایک دفعہ آپ صحابہ کے مجمع میں تشریف فرما تھے، ایک بدو آیا اور آپ کی چادر کا گوشہ زور سے کھینچکر بولا "محمد! یہ مال نہ تیرا ہے، نہ تیرے باپ کا ہے، ایک بار شتر دے" آپنے اس کے اونٹ کو جو اور کھجوروں سے لدوا دیا۔[5]

ایک دفعہ بحرین سے خراج آیا اور اسقدر کثیر رقم تھی کہ اس سے پہلے کبھی دارالاسلام میں

---

[1] ابوداؤد باب قبول ہدایا المشرکین [2] صحیح بخاری یفکر الرجل الشئی فی الصلوٰۃ [3] صحیح بخاری باب الشجاعۃ فی الحرب [4] صحیح بخاری [5] ابوداؤد کتاب الادب۔

نہیں آئی تھی، آپنے حکم دیا کہ اس کو صحنِ مسجد میں ڈلوادو، اسکے بعد جب آپ مسجد میں تشریف لائے تو اس پر مڑکر بھی نظر نہ ڈالی، نماز سے فارغ ہوکر آپنے اس کی تقسیم شروع کی، جو سامنے آتا اس کو دیتے چلے جاتے، حضرت عباسؓ کو جو غزوہ بدر کے بعد دولتمند نہیں رہے تھے، اتنا دیا کہ اٹھاکر چل نہیں سکتے تھے، اسی طرح اور لوگوں کو بھی عنایت فرماتے جاتے تھے، جب کچھ نہ رہا تو کپڑے جھاڑ کر اٹھ کھڑے ہوئے، [1]

اسلام میں قاعدہ یہ ہے کہ اگر کوئی آزاد شدہ غلام مرجائے تو اس کا ترکہ اس کے آقا کو ملتا ہے، ایک دفعہ آپ کا اسی قسم کا ایک غلام مرگیا، لوگ اسکا متروکہ سامان اٹھاکر آپکے پاس لائے آپنے دریافت فرمایا کہ کوئی اس کا یہاں ہموطن ہے، لوگوں نے کہا ہاں ہے آپنے فرمایا یہ تمام چیزیں اسی کے حوالہ کردو، [2]

ایک دفعہ چند انصار نے آپسے کچھ مانگا، آپنے دیدیا، پھر مانگا، پھر دیا، پھر جبتک رہا آپ دیتے رہے، یہانتک کہ آپکے پاس کچھ نہیں رہا، لیکن وہ باوجود اس کے حاضر ہوئے اور درخواست کی، فرمایا میرے پاس جو کچھ ہو میں اس کو تم سے بچا کر نہیں رکھوں گا۔ [3]

ایثار آپکے اخلاق وعادات میں جو وصف سب سے زیادہ نمایاں اور جس کا اثر ہر موقع پر نظر آتا تھا وہ ایثار تھا، اولاد سے آپ کو بے انتہا محبت تھی، اور ان میں حضرت فاطمہ زہراؓ اس قدر عزیز تھیں کہ جب آتیں تو فرطِ محبت سے کھڑے ہوجاتے، پیشانی کو بوسہ دیتے، اور اپنی جگہ بٹھاتے، تاہم حضرت فاطمہؓ کی عسرت اور تنگدستی کا یہ حال تھا کہ گھر میں کوئی خادمہ نہ تھی، خود چکی پیستیں، خود ہی پانی کی مشک بھرلاتیں، چکی پیستے پیستے ہتھیلیاں گھس گئی تھیں، اور مشک کے اثر سے سینہ پر نیل پڑگئے تھے، ایک دن خدمت اقدس میں حاضر ہوئیں، خود تو پاس حیا سے عرض حال نہ کرسکیں، جناب امیرؓ نے انکی طرف سے یہ حال عرض کیا

[1] صحیح بخاری ج ۲ باب القسمۃ [2] مسند ابن حنبل ج ۲ ص ۵۰۱ [3] صحیح بخاری ص ۱۹۸ کتاب الصدقات۔

اور درخواست کی کہ فلاں غزوہ میں جو کنیزیں آئی ہیں ان میں سے ایک کنیز مل جائے، آپ نے ارشاد فرمایا ابھی اصحابِ صفہ کا انتظام نہیں ہوا، اور جب تک انکا بندوبست نہ ہولے میں اور طرف توجہ نہیں کر سکتا۔[۱]

ایک روایت میں ہے کہ حضرت زبیرؓ کی صاحبزادیاں اور حضرت فاطمہ زہراؓ خدمتِ اقدس میں گئیں، اور اپنے افلاس و تنگدستی کی شکایت کر کے عرض کی کہ اب کی غزوہ میں جو کنیزیں آئی ہیں ان میں سے ایک دو ہم کو مل جائیں، آپ نے فرمایا بدر کے یتیم تم سے پہلے درخواست کر چکے۔[۲]

ایک دفعہ حضرت علیؓ نے کسی امر کی درخواست کی، فرمایا یہ نہیں ہو سکتا کہ میں تم کو دوں اور اہل صفہ کو اس حال میں چھوڑ دوں کہ وہ بھوک سے اپنے پیٹ لپیٹے پھریں۔[۳]

ایک دفعہ ایک عورت نے ایک چادر لا کر پیش کی، آپ کو ضرورت تھی، آپ نے لے لی، ایک صاحب حاضر خدمت تھے، انھوں نے کہا کیا اچھی چادر ہے، آپ نے اتار کر ان کو دیدی، جب اٹھ کر چلے گئے تو لوگوں نے ان کو ملامت کی کہ تم جانتے ہو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو چادر کی ضرورت تھی، یہ بھی جانتے ہو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کسی کا سوال رد نہیں کرتے انھوں نے کہا ہاں لیکن میں نے تو برکت کے لیے لی ہے کہ مجھکو اسی چادر کا کفن دیا جائے۔[۴]

زہد و قناعت کے عنوان سے جو واقعات لکھے گئے ہیں، ان سے ظاہر ہوگا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کس عسرت اور تنگدستی میں بسر فرماتے تھے، ۳ ھ کے بعد فتوحات کو جو وسعت

---

[۱] یہ روایت کتب احادیث (سنن ابوداؤد وغیرہ) میں مختلف طریقوں سے مروی ہے، ایک روایت میں ہے کہ آپ نے حضرت فاطمہؓ کو ایک دعا بتادی کہ یہ لونڈی سے بڑھ کر ہے، [۲] ابوداؤد ج ۲ ص ۴۳ [۳] مسند احمد ج ۱ ص ۷، [۴] صحیح بخاری باب حسن الخلق و السخا، و باب من استعد لکفن۔

حاصل ہوئی ہے، عرب میں باغات سب سے بہتر جائداد تھے، ۳ھ میں یہود ان بنو نضیر میں سے مخیریق نامی ایک شخص نے اپنے سات باغ مثیب، صائفہ، دلال، حسنیٰ، برقہ، اعواف، مشربہ ام ابراہیم مرتے وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو وصیت کر دیے، آپنے سب کو خیرات کر دیا، یعنی وہ خدا کی راہ میں وقف تھے، جو کچھ پیدا ہوتا تھا، غربا اور مساکین کو دیدیا جاتا تھا[۱]،

ایک صحابی نے شادی کی، سامان ولیمہ کے لیے گھر میں کچھ نہ تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا کہ عائشہؓ کے پاس جاؤ اور آٹے کی ٹوکری مانگ لاؤ، وہ گئے اور جاکر لے آئے، حالانکہ کاشانۂ نبوت میں اس ذخیرے کے سوا شام کے کھانے کو کچھ نہ تھا[۴]،

ایک دفعہ ایک غفاری آکر مہمان ہوا، رات کو کھانے کے لیے صرف بکری کا دودھ تھا وہ آپنے اس کے نذر کر دیا، یہ تمام رات خانۂ نبوی میں فاقہ سے گذری، حالانکہ اس سے پہلی شب میں بھی یہاں فاقہ ہی تھا[۵]

مہمان نوازی

(عرب میں مختلف اطراف اور صوبوں سے جوق جوق لوگ بارگاہ نبوتؐ میں آتے تھے، رملہؓ ایک صحابیہ تھیں، ان کا گھر دار الضیوف تھا[۶]، یہیں لوگ مہمان اترتے تھے، ام شریکؓ جو ایک دولتمند اور فیاض انصاریہ تھیں، انکا گھر بھی گویا ایک مہمان خانہ تھا[۷]، مخصوص لوگ مسجد نبویؐ میں اتارے جاتے تھے، چنانچہ وفد ثقیف یہیں اترا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خود بہ نفس نفیس ان مہمانوں کی خاطر داری اور تواضع فرماتے تھے، یوں بھی جو لوگ حاضر ہوتے تھے بغیر کچھ کھائے پیے واپس نہ آتے تھے[۸]۔

---

[۱] فتح الباری شرح کتاب الفرائض [۲] اصابہ تذکرہ مخیریق [۳] مسند احمد ج ۴ ص ۵۸ [۴] مسند احمد ج ۶ ص ۳۹۷ [۵] زرقانی ذکر وفود [۶] مسلم ج ۲ ص ۱۹۸ [۷] شمائل ترمذی۔

فیاضی میں کافر و مسلمان کا امتیاز نہ تھا، مشرک و کافر سب آپ کے مہمان ہوتے اور آپ یکساں ان کی مہمان نوازی کرتے، جب اہل حبشہ کا وفد آیا تو آپ نے خود اپنے ہاں ان کو مہمان اتارا اور خود بہ نفس نفیس ان کی خدمت کی[1]، ایک دفعہ کافر مہمان ہوا، آپ نے ایک بکری کا دودھ اسے پلایا، وہ سب کے کا سارا پی گیا، آپ نے دوسری بکری منگوائی، وہ بھی کافی نہ ہوئی غرض سات بکریوں تک نوبت آئی جب تک وہ سیر نہ ہوا، آپ پلاتے گئے[2]،

کبھی ایسا ہوتا کہ مہمان آجاتے اور گھر میں جو کچھ موجود رہتا وہ ان کی نذر ہو جاتا اور تمام اہل وعیال فاقہ کرتے[3]، آپ راتوں کو اٹھ اٹھ کر اپنے مہمانوں کی خبر گیری کرتے تھے[4]،

صحابہ میں سب سے مفلس اور نادار گروہ اصحاب صفہ کا تھا، وہ مسلمانوں کے مہمان عام تھے لیکن ان کو زیادہ تر خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مہمان ہونے کا شرف حاصل ہوتا، ایک بار آپ نے فرمایا کہ جس شخص کے پاس دو آدمی کا کھانا ہو وہ ان میں سے تین آدمی کو اور جن کے پاس چار آدمی کا کھانا ہو وہ ان میں سے پانچ آدمی کو ساتھ لیجائے، چنانچہ حضرت ابو بکرؓ تین آدمی کو ساتھ لائے، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دس آدمیوں کو ہمراہ لے گئے[5]،

اصحاب صفہ میں حضرت ابو ہریرہؓ اپنے فقر و فاقہ کی داستان نہایت درد انگیز طریقہ سے بیان کرتے ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ میں ایک روز شدت گرسنگی کی حالت میں گذرگاہ عام پر بیٹھ گیا، حضرت ابو بکرؓ راستے سے گذرے تو میں نے بطور حسن طلب کے ان سے قرآن مجید کی ایک آیت پوچھی لیکن وہ گذر گئے، اور میری حالت کی طرف توجہ نہ کی، حضرت عمرؓ کے ساتھ بھی یہی واقعہ پیش آیا، اور وہی نتیجہ ہوا، اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا گذر ہوا، تو آپ مجھکو دیکھ کر مسکرائے اور فرمایا کہ میرے ساتھ آؤ،

[1] شفائے قاضی عیاض بسند متصل [2] صحیح مسلم باب المومن یاکل فی معی [3] مسند ابن حنبل ج ۶ ص ۹۰، [4] ابو داؤد کتاب الادب [5] صحیح مسلم ج ۲ صفحہ ۲۰۰)

آپ گھر میں پہنچے تو دودھ کا ایک پیالہ نظر آیا، آپنے دریافت فرمایا تو معلوم ہوا کہ کسی نے ہدیۃً بھیجا ہو، آپنے مجھ سے کہا کہ اصحاب صفہ کو بلا لاؤ، میں ان کو بلا لایا تو آپنے مجکو دودھ کا پیالہ دیا کہ سب کو تقسیم کردو۔[1]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں ایک پیالہ اسقدر بھاری تھا کہ اس کو چار آدمی اٹھا سکتے تھے جب دوپہر ہوتی تو وہ پیالہ آتا، اور اصحاب صفہ اس کے گرد بیٹھ جاتے، یہانتک کہ جب زیادہ مجمع ہوجاتا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اوکڑوں بیٹھنا پڑتا کہ لوگوں کے لیے جگہ نکل آئے۔[2]

مقدادؓ کا بیان ہو کہ میں اور میرے دو رفیق اسقدر تنگ دست تھے کہ بھوک سے بینائی جاتی رہی ہم لوگوں نے اپنے تکفل کی درخواست کی لیکن کسی نے منظور نہیں کیا، آخر ہم لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، آپ دولتخانہ پر لوا گئے، اور تین بکریوں کو دکھا کر فرمایا کہ انکا دودھ پیا کرو، چنانچہ ہم میں ہر شخص دودھ دوہ کر اپنا اپنا حصہ پی لیا کرتا تھا،[3]

ایکدن اصحاب صفہ کو لیکر حضرت عائشہؓ کے گھر پہنچے اور فرمایا کھانے کو جو کچھ ہو لاؤ، چونی کا پکا ہوا کھانا سامنے لاکر رکھا گیا، آپنے کھانے کی کوئی اور چیز طلب کی تو چھوہارے کا حریرہ پیش ہوا، اس کے بعد بڑے پیالہ میں دودھ حاضر کیا گیا اور یہی سامانِ مہمانی کی آخری قسط تھی،[4]

گداگری اور سوال سے نفرت، باوجود اس کے کہ آپ کا ابر کرم ہر وقت برستا رہتا تھا تاہم کسی کا بے ضرورت شدید سوال کرنا آپ پر سخت گراں ہوتا تھا، ارشاد فرماتے کہ "اگر کوئی شخص لکڑی کا گٹھا پیٹھ پر لاد لائے اور بیچکر اپنی آبرو بچائے تو اس سے بہتر ہے کہ لوگوں سے سوال کرے"[5]

ایکدفعہ ایک انصاری آئے اور کچھ سوال کیا، آپنے فرمایا تمھارے پاس کچھ نہیں ہے؟

---

[1] ترمذی ص ۲۹۹ [2] ابوداؤد کتاب الاطعمہ [3] صحیح مسلم ج ۲ ص ۱۹۸ [4] ابوداؤد کتاب الادب [5] صحیح بخاری کتاب الصدقات صفحہ ۱۹۸۔

بولے کہ بس ایک بچھونا ہے جس کا کچھ حصہ اوڑھ لیتا اور کچھ بچھا لیتا ہوں اور ایک پانی پینے کا پیالہ ہے، آپنے دونوں چیزیں منگوائیں، پھر فرمایا یہ چیزیں کون خریدتا ہی؟ ایک شخص نے دو درم لگائے، آپنے فرمایا اس سے بڑھ کر بھی کوئی دام لگاتا ہی؟ ایک صاحب نے ایک کے دو کر دیے، آپنے دونوں چیزیں دیدیں اور درہم انصاری کو دیے کہ ایک درہم کا کھانا خرید کر گھر میں دے آؤ، اور دوسرے سے رسّی خریدو اور جنگل سے لکڑیاں لاکر شہر میں بیچو، پندرہ دن کے بعد وہ خدمت اقدس میں آئے تو دس درہم ان کے پاس جمع ہو گئے تھے، اس سے کچھ کپڑا خریدا، کچھ کا غلہ مول لیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہ اچھا ہے یا یہ کہ قیامت میں چہرہ پر گدائی کا داغ لگا کر جاتے؟[1]

ایک دفعہ چند انصاری آئے اور سوال کیا، آپنے عنایت فرمایا، پھر جبتک کچھ رہا آپنے انکی درخواست رد نہیں فرمائی، جب کچھ نہیں رہا تو آپنے فرمایا میرے پاس جبتک کچھ رہے گا میں تم سے بچا کر اسکو نہیں رکھوں گا، لیکن جو شخص اللہ سے یہ دعا مانگے کہ وہ اسکو سوال وگداگری کی ذلت سے بچائے تو وہ اس کو بچا دیتا ہے اور جو خدا سے غنی کا طالب ہوتا ہے وہ اس کو غنی مرحمت فرماتا ہے اور جو صبر کرتا ہے اللہ اس کو صابر بنا دیتا ہے، اور صبر سے کوئی بہتر اور وسیع تر دولت کسی کو نہیں دی گئی ہے۔[2]

حکیمؓ بن حزام فتح مکہ میں اسلام لائے تھے، ایک دفعہ انھوں نے آپ سے کچھ طلب کیا، آپ نے عنایت فرمایا، کچھ دن کے بعد پھر مانگا، آپنے پھر ان کو دیا، تیسری دفعہ پھر سوال کیا، پھر کچھ مرحمت کیا، اس کے بعد فرمایا "اے حکیم یہ دولت سبز وشیریں ہی، جو استغنا کیساتھ اس کو قبول کرتا ہی اسکو برکت ملتی ہی اور جو حرص وطمع کیساتھ اسکو حاصل کرتا ہے، وہ اس سے محروم رہتا ہی، اور اسکی مثال اس شخص کی

[1] ابوداؤد وترمذی صدقات [2] صحیح بخاری ص ۱۹۰ کتاب الصدقات۔

جیسی ہے جو کھاتا جاتا ہے اور سیر نہیں ہوتا، دستِ بالا دستِ زیریں سے بہتر ہے۔ حکیم پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نصیحت کا یہ اثر ہوا کہ جب تک زندہ رہے کبھی کسی سے کوئی معمولی چیز بھی نہیں مانگی،

حجۃ الوداع میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صدقات کا مال تقسیم فرما رہے تھے کہ دو صاحب آ کر سائل ہوئے، آپ نے ان کی طرف نظر اٹھا کر دیکھا تو وہ تومند اور ہاتھ پاؤں کے درست معلوم ہوئے، آپنے فرمایا اگر تم چاہو تو میں اس میں سے دے سکتا ہوں لیکن غنی اور تندرست کام کرنے کے لائق لوگوں کا اس میں کوئی حصہ نہیں ہے۔[۱]

قبیصہ نام ایک صاحب تھے، وہ مقروض ہو گئے تھے، آپکے پاس آئے تو اپنی حاجت عرض کی، آپنے وعدہ کیا، اس کے بعد ارشاد فرمایا "اے قبیصہ! سوال کرنا اور لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلانا صرف تین شخصوں کو روا ہے، ایک اس شخص کو جو قرض سے زیادہ زیر بار ہو، وہ مانگ سکتا ہے لیکن جب اسکی ضرورت پوری ہو جائے تو اس کو رک جانا چاہیے، دوسرے اس شخص کو جس پر کوئی ایسی ناگہانی مصیبت آ گئی جس نے اس کے تمام مالی سرمایہ کو برباد کیا، اس کو اسوقت تک مانگنا جائز ہے جبتک اسکی حالت کسی قدر درست نہ ہو جائے، تیسرے اس شخص کو جو مبتلائے فاقہ ہو، اور محلہ کے تین معتبر آدمی گواہی دیں کہ ہاں اسکو فاقہ ہے، اس کے علاوہ جو کوئی کچھ مانگ کر حاصل کرتا ہے، وہ حرام کھاتا ہے۔[۲]

صدقہ سے پرہیز | آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی اور اپنے خاندان کے لیے صدقہ و زکوٰۃ لینے کو سخت موجب ننگ و عار سمجھتے تھے، فرمایا کرتے تھے کہ میں گھر میں آتا ہوں تو کبھی کبھی اپنے بستر پر کھجور پاتا ہوں، جی میں آتا ہے کہ اٹھا کر منھ میں ڈال لوں، پھر خیال ہوتا ہے کہ کہیں صدقہ کی کھجور نہ ہو، اس لیے ڈال دیتا ہوں۔[۳]

[۱] صحیح بخاری ص ۹۹ کتاب الصدقات [۲] ابوداؤد کتاب الزکوٰۃ [۳] ایضاً [۴] بخاری ج ۱ ص ۳۲۸ کتاب اللقطہ

ایک دفعہ راستہ میں ایک کھجور ہاتھ آگئی، فرمایا اگر صدقہ کا شبہ نہ ہوتا تو میں اس کو کھا جاتا[1]،

ایک بار امام حسن علیہ السلام نے صدقہ کی کھجوروں میں سے منہ میں ایک کھجور ڈال لی، آپ نے ڈانٹ کر کہا "کیا تمھیں یہ خبر نہیں کہ ہمارا خاندان صدقہ نہیں کھاتا[2]" پھر منہ سے اگلوادیا۔

آپکے سامنے جب کوئی شخص کوئی چیز لیکر آتا تو دریافت فرماتے کہ ہدیہ ہے یا صدقہ؟ اگر ہدیہ کہتا قبول فرماتے، اور اگر یہ کہتا کہ صدقہ تو آپ ہاتھ روک لیتے اور دوسرے صاحبوں کو عنایت فرمادیتے[3]

ہدایا اور تحفے قبول کرنا

دوست واحباب کے ہدایا اور تحفے آپ قبول فرماتے تھے، بلکہ آپ نے اسکو ازدیاد محبت کا بہترین ذریعہ فرمایا ہے۔

تهادوا تحابوا (حدیث) باہم ایک دوسرے کو ہدیہ بھیجو تو باہم محبت ہوگی۔

اسی لیے صحابہ عموماً کچھ نہ کچھ روزانہ آپکے گھر بھیجا کرتے تھے اور خصوصیت کے ساتھ اس دن بھیجتے تھے، جس دن آپ حجرہ عائشہ میں قیام فرماتے تھے[4]، اوپر گذر چکا ہے کہ کوئی چیز آپکے سامنے پیش کیجاتی تو آپ دریافت فرماتے تھے کہ یہ صدقہ ہے یا ہدیہ؟ اگر ہدیہ ہوتا تو قبول فرماتے، ورنہ احتراز کرتے[5]،

ایک دفعہ ایک عورت نے ایک چادر خدمت اقدس میں پیش کی، آپ نے لے لی، اسی وقت ایک صاحب نے مانگ لی، آپ نے ان کو عنایت فرمادی[6]،

آس پاس کے ملوک وسلاطین بھی آپ کو تحفے بھیجا کرتے تھے۔ حدود شام کے ایک رئیس نے ایک سفید خچر تحفہ دیا تھا، عزیز مصر نے ایک خچر مصر سے بھیجا تھا، ایک امیر نے آپ کو موزے بھیجے تھے ایک دفعہ قیصر روم نے آپ کی خدمت میں ایک پوستین بھیجی جسمیں دیبا کی سنجاف لگی ہوئی تھی،

---

[1] بخاری ج ا ص ۲۹۳ کتاب اللقطہ [2] بخاری ج ص ۲۰۱ کتاب الصدقات [3] بخاری مناقب عائشہ [4] صحیح بخاری کتاب الصدقہ [5] صحیح بخاری کتاب الجنائز۔

آپنے ذرا دیر کے لیے پہن لی، پھر اتار کر حضرت جعفرؓ (حضرت علیؓ کے بھائی) کے پاس بھیجدی، وہ پہنکر خدمتِ اقدس میں آئے، آپنے ارشاد فرمایا کہ میں نے اس لیے نہیں بھیجی کہ تم خود پہنو، عرض کی پھر کیا کروں، ارشاد فرمایا کہ اپنے بھائی نجاشی کو بھیجدو[1] حضرت جعفرؓ ایک مدت یعنی فتح خیبر تک حبش میں رہے تھے، اور نجاشی نے ان ہی سے اسلام کی تعلیم پائی تھی۔

ہدایا اور تحفے دینا (جن لوگوں کے ہدایا اور تحفے قبول فرماتے تھے، ان کو ان کا صلہ بھی ضرور عطا فرماتے تھے، حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کان یقبل الھدیۃ ویثیب علیھا[2] آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہدیہ قبول فرماتے تھے اور اس کا معاوضہ دیتے تھے) یمن کا مشہور بادشاہ ذی یزن جس نے حبشی حکومت مٹا کر ایران کے زیر اثر عربی حکومت قائم کی تھی، اس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک قیمتی حلہ بھیجا، جس کو اس نے ۳۳ اونٹوں کے بدلہ میں خرید ا تھا، آپنے قبول فرمایا اور پھر اسکو ایک حُلہ ہدیۃً بھیجا جو ۲۰ سے کچھ زیادہ اونٹ دیکر خریدا گیا تھا۔

(ایک دفعہ قبیلہ بنی فزارہ کے ایک شخص نے آپ کی خدمت میں ہدیۃً ایک اونٹنی پیش کی، آپ نے اس کا صلہ دیا تو وہ سخت ناراض ہوا، آپنے منبر پر کھڑے ہوکر خطاب عام کیا اور فرمایا کہ تم لوگ مجھے ہدیہ دیتے ہو اور میں بقدر استطاعت اس کا صلہ دیتا ہوں تو ناراض ہوتے ہو، آیندہ قریش انصار، ثقیف اور دوس کے سوا کسی قبیلہ کا ہدیہ قبول نہ کرونگا۔[3]

حضرت ایوب انصاریؓ جن کے مکان میں آپ چھ مہینہ تک فروکش رہے تھے، آپ اکثر انکو بچا ہوا کھانا بھیجا کرتے[4]، ہمسایوں اور پڑوسیوں کے گھروں میں بھی تحفے بھیجتے تھے، اصحاب صفہ اکثر آپ کے

[1] ابو داؤد ص ۲۰۵ ج دوم [2] ایضاً ص ۲۰۳ (۳) ادب المفرد امام بخاری ص ۸۱، [4] مسلم کتاب الاطعمہ)

تحفوں سے مشرف ہوا کرتے تھے،

عدم قبول احسان کبھی کسی کا احسان گوارا نہ فرماتے، حضرت ابوبکرؓ سے بڑھ کر جان نثار کون ہوسکتا تھا تاہم ہجرت کے وقت جب انھوں نے سواری کے لیے ناقہ پیش کیا تو آپ نے قیمت ادا کی،[1] مدینہ میں مسجد کے لیے جو زمین درکار تھی، مالکانِ زمین نے مفت نذر کرنی چاہی تھی، لیکن آپ نے قیمت دیکر لی، ایک دفعہ عبداللہ بن عمرؓ اور حضرت عمرؓ دونوں ہمسفر تھے، عبداللہ بن عمرؓ کی سواری کا اونٹ سرکش تھا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ناقہ سے آگے نکل نکل جاتا تھا، عبداللہ بن عمرؓ روکتے تھے، لیکن وہ قابو کا نہ تھا حضرت عمرؓ بار بار عبداللہ بن عمرؓ کو ڈانٹتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمرؓ سے کہا یہ اونٹ میرے ہاتھ بیچ ڈالو، انھوں نے کہا نذر ہے، آپ نے فرمایا نہیں دام لو، انھوں نے دوبارہ عرض کی کہ یوں ہی حاضر ہے آپ نے انکار کیا، بالآخر حضرت عمرؓ نے دام لینے منظور کیے، آپ نے خرید کر عبداللہ بن عمرؓ کو دیدیا کہ اب یہ تمہارا ہے۔[2]

عدم تشدد حضرت معاذ بن جبلؓ (جو اکابر صحابہ میں سے تھے) ایک محلہ میں امامت کرتے اور نماز فجر میں بڑی بڑی سورتیں پڑھتے تھے، ایک شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایت کی کہ وہ اسقدر لمبی نماز پڑھتے ہیں کہ میں ان کے پیچھے نماز پڑھنے سے قاصر رہتا ہوں، ابو مسعود انصاریؓ کا بیان ہے کہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کبھی اسقدر غضبناک نہیں دیکھا جس قدر اس موقع پر دیکھا آپ نے لوگوں سے خطاب کر کے فرمایا بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جو لوگوں کو متنفر کر دیتے ہیں، جو شخص تم میں سے نماز پڑھائے مختصر پڑھائے کیونکہ نماز میں بوڑھے، کمزور، کام والے سبھی طرح کے آدمی ہوتے ہیں[3]

حدود قصاص میں نہایت احتیاط فرماتے اور جہانتک ممکن ہوتا درگذر کرنا چاہتے، اعزاسلمی ایک

---

[1] بخاری ص ۵۵۳ [2] ایضاً ص ۸۴ [3] بخاری کتاب الصلوٰۃ و باب اہل یقضی الحاکم و ہو غضبان ص ۱۰۶۰

صاحب تھے، جو زنا میں مبتلا ہو گئے تھے، لیکن فوراً مسجد میں آئے، اور کہا یا رسول اللہ! میں نے بدکاری کی، آپ نے منھ پھیر لیا، وہ دوسری سمت آئے، آپ نے اور طرف منھ پھیر لیا، آپ بار بار منھ پھیر لیتے اور وہ بار بار سامنے آکر زنا کا اقرار کرتے، بالآخر آپ نے فرمایا کہ تم کو جنون تو نہیں ہے؟ بولے نہیں! پھر پوچھا تمھاری شادی ہو چکی ہے، بولے ہاں، آپ نے فرمایا کہ تم نے صرف ہاتھ لگایا ہوگا، بولے نہیں بلکہ مجامعت کی، آخر مجبور ہو کر آپ نے حکم سنا دیا کہ سنگسار کیے جائیں[1]۔

ایک دفعہ ایک شخص نے آکر عرض کی کہ مجھ سے گناہ سرزد ہوا، آپ حد (سزا) کا حکم دیں، آپ چپ رہے، اور نماز کا وقت آگیا، نماز کے بعد انھوں نے پھر آکر وہی درخواست کی آپ نے فرمایا کیا تم نے نماز نہیں پڑھی، بولے ہاں پڑھ لی، ارشاد فرمایا تو خدا نے تمھارا گناہ معاف کر دیا[2]۔

ایک دفعہ قبیلہ غامد کی ایک عورت آئی، اور اظہار کیا کہ میں نے بدکاری کی، آپ نے فرمایا واپس جاؤ، دوسرے دن پھر آئی، اور بولی کہ کیا آپ مجھکو ماعز کی طرح چھوڑ دینا چاہتے ہیں، خدا کی قسم مجھکو حمل رہ گیا ہے، پھر فرمایا، واپس جاؤ، وہ چلی گئی تیسرے دن پھر واپس آئی، آپ نے ارشاد فرمایا کہ بچہ کے پیدا ہونے تک انتظار کرو، جب بچہ پیدا ہوا تو بچہ کو گود میں لیے ہوئے آئی، (یعنی اب زنا کی سزا دینے میں کیا تامل ہے؟) آپ نے فرمایا کہ دودھ پینے کی مدت تک انتظار کرو، جب دودھ چھوٹ جائے تب آنا، جب رضاعت کا زمانہ گذر گیا تو پھر حاضر ہوئی، اب آپ نے مجبور ہو کر سنگسار کرنے کا حکم دیا، لوگوں نے اس پر پتھر برسانے شروع کیے، ایک صاحب کا پتھر اس کے چہرہ پر لگا اور خون کی چھینٹیں اڑ کر ان کے چہرہ پر آئیں انھوں نے اس کو گالی دی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا زبان روکو، خدا کی قسم اس نے ایسی توبہ کی ہے کہ جبراً عشور

[1] یہ حدیث بخاری کے مختلف ابواب میں ہے، موقع کیلیے صفحہ ۱۰۰۸ دیکھنا چاہیے [2] بخاری صفحہ ۱۰۰۸۔

لینے والا بھی اگر یہ توبہ کرتا تو بخشدیا جاتا۔[1]

ایک دن ایک صاحب نے عرض کی کہ ہم لوگ یہودیوں اور عیسائیوں کے ملک میں رہتے ہیں، کیا ان کے برتنوں میں کھانا کھایا کریں؟ فرمایا اور برتن ہات آئیں تو ان کے برتنوں میں نہ کھاؤ ورنہ ان کو دھو کر کھا سکتے ہو۔[2]

ایک بار ایک صحابی نے ماہ رمضان تک کے لیے اپنی بی بی سے ظہار کر لیا، لیکن ابھی یہ مدت گذرنے نہ پائی تھی کہ اس سے مقاربت کر لی، پھر لوگوں کو اس واقعہ کی خبر کی اور کہا مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لیچلو، سب نے انکار کر دیا، انھوں نے خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر واقعہ بیان کیا، آپ نے پہلے تو تعجب ظاہر کیا، پھر ایک غلام کے آزاد کرنے کا حکم دیا، انھوں نے ناداری کا عذر کیا، تو آپ نے متصل دو ماہ تک روزہ رکھنے کی ہدایت فرمائی، انھوں نے کہا یہ سب تو رمضان ہی کی وجہ سے ہوا ہے، اب آپ نے ساٹھ مسکینوں پر صدقہ کرنے کو فرمایا، انھوں نے کہا ہم تو خود فاقہ کر رہے ہیں، آپ نے فرمایا کہ صدقہ کے عامل کے پاس جاؤ وہ تمھیں ایک وسق کھجور دیگا، اس میں سے ساٹھ مسکینوں کو دیدینا، اور جو بچے وہ اپنے اہل و عیال پر صرف کرنا، وہ پلٹے تو لوگوں سے کہا کہ تم لوگ تشدد اور بدتدبیر تھے، لیکن مجھے رسول اللہ کی خدمت میں حسن رائے اور آسانی نظر آئی۔[3]

ایک بار ایک اور صحابی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور عرض کی کہ یارسول اللہ! میں برباد ہو گیا، روزہ میں اپنی بیوی سے ہمبستر ہوا، آپ نے فرمایا، ایک غلام آزاد کر سکتے ہو، کہا نہیں، فرمایا دو مہینے تک متصل روزہ رکھ سکتے ہو، کہا نہیں، فرمایا ساٹھ محتاجوں کو کھانا کھلا سکتے ہو، کہا اسکی بھی قدرت نہیں،

---

[1] ابوداؤد کتاب الحدود [2] بخاری ج ۲ ص ۸۲۳ [3] ابوداؤد ج ۱ ص ۲۳۰

آنحضرتؐ نے تامل فرمایا، کچھ دیر نہ گزری تھی کہ ایک شخص نے کھجوروں کی ایک ٹوکری ہدیۃً پیش کی آپؐ نے فرمایا سائل کہاں گیا، سائل نے کہا یارسول اللہؐ میں یہ ہوں، فرمایا ان کھجوروں کو لیجاؤ اور کسی غریب کو خیرات دیدو، سائل نے عرض کی یارسول اللہ! مدینہ میں مجھ سے زیادہ غریب کون ہوگا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہنس پڑے اور فرمایا "جاؤ گھر ہی والوں کو کھلادو"[1]

تقشف ناپسند تھا

رہبانیت اور تقشف کو ناپسند فرماتے تھے صحابہ میں سے بعض بزرگ میلانِ طبعی یا عیسائی راہبوں کے اثر سے رہبانیت پر آمادہ تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو باز رکھا، بعض صحابہ ناداری کی وجہ سے شادی نہیں کرسکتے تھے، اور ضبط نفس پر بھی قادر نہ تھے، انھوں نے قطعِ اعضا کرنا چاہا، آپؐ نے سخت ناراضی ظاہر کی، قدامہ بن مظعونؓ ایک اور صحابی آئے کہ ہم میں سے ایک نے ترکِ حیوانات اور دوسرے نے ترکِ نکاح کا عزم کرلیا ہے، آپ نے فرمایا کہ "میں تو دونوں سے متمتع ہوتا ہوں" آپ کی مرضی نہ پاکر دونوں صاحب اپنے ارادہ سے باز رہے، عرب میں صوم وصال کا طریقہ مدت سے جاری تھا یعنی کئی کئی دن متصل روزے رکھتے تھے صحابہ نے بھی اس کا ارادہ کیا، لیکن آپؐ نے سختی سے روکا، حضرت عبداللہؓ بن عمرو نہایت مرتاض زاہد تھے، انھوں نے عہد کرلیا تھا کہ ہمیشہ دن کو روزے رکھیں گے اور رات بھر عبادت کرینگے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر ہوئی، تو بلا بھیجا اور پوچھا کہ کیا یہ خبر صحیح ہے، عرض کی "ہاں" فرمایا "تم پر تمھارے جسم کا حق ہے، آنکھ کا حق ہے، بیوی کا حق ہے، مہینہ میں تین دن کے روزے کافی ہیں" عبداللہ بن عمروؓ نے کہا مجھ کو اس سے زیادہ طاقت ہے، فرمایا کہ اچھا تیسرے دن، بولے میں اس سے بھی زیادہ طاقت رکھتا ہوں، ارشاد فرمایا کہ ایک دن بیچ دیکر کہ یہی داؤد کا روزہ تھا، اور یہی افضل الصیام ہے، انھوں نے

---

[1] بخاری ص ۲۰۹ باب اذا جامع فی رمضان۔

عرض کی کہ مجھکو اس سے بھی زیادہ قدرت ہے، ارشاد ہوا بس اس سے زیادہ بہتر نہیں[1]،

ایک روایت میں ہے کہ عبداللہ بن عمروؓ کی روزہ داری کا چرچا ہوا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خود ان کے پاس تشریف لے گئے، انھوں نے استقبال کیا، اور چمڑے کا گدا بچھا دیا، آپ زمین پر بیٹھ گئے، اور ان سے کہا کہ تم کو مہینہ میں تین روزے بس نہیں کرتے، عرض کی نہیں، فرمایا پانچ، بولے نہیں، عرض آپ بار بار تعداد بڑھاتے جاتے اور وہ اس پر راضی نہ ہوتے، بالآخر آپ نے فرمایا کہ اخیر حد یہ ہے کہ ایک دن افطار کرو اور ایک دن روزہ رکھو[2]،

ایک دفعہ حضرت ابوہریرہؓ نے عرض کی کہ یا رسول اللہ میں جوان آدمی ہوں اور اتنا مقدور نہیں کہ نکاح کروں، نہ اپنے نفس پر اطمینان ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم چپ رہے، حضرت ابوہریرہؓ نے پھر ان ہی الفاظ کا اعادہ کیا، آپ چپ رہے، سہ بارہ کہا تو آپ نے فرمایا کہ خدا کا حکم ٹل نہیں سکتا[3]،

قبیلۂ باہلہ کے ایک صاحب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر واپس گئے، سال بھر کے بعد آنے کا اتفاق ہوا لیکن اتنے ہی زمانہ میں ان کی شکل و صورت اسقدر بدل گئی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کو نہ پہچان سکے، انھوں نے اپنا نام بتایا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تعجب سے پوچھا کہ تم تو نہایت خوش جمال تھے، تمھاری صورت کیوں بگڑ گئی، انھوں نے کہا جب سے آپ سے رخصت ہوا متصل روزے رکھتا ہوں، آپ نے فرمایا اپنی جان کو کیوں عذاب میں ڈالا، رمضان کے علاوہ ہر مہینہ میں ایک دن کا روزہ کافی ہے، انھوں نے کہا اس سے زیادہ کی قوت رکھتا ہوں، آپ نے ایک دن کا اور اضافہ کر دیا، انھوں نے اور اضافہ کی درخواست کی، آپ نے تین کر دیے، ان کو اس سے بھی تسکین نہ ہوئی، تو آپ نے شہر حرام کے روزوں

[1] صحیح بخاری کتاب الصوم [2] بخاری کتاب النکاح [3] ایضاً

کا حکم دیا۔[1]

ایک دن چند صحابہ خاص اس غرض سے ازواج مطہرات کی خدمت میں حاضر ہوئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عبادت کے حالات دریافت کریں، وہ سمجھتے تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم رات دن عبادت کے سوا کچھ نہ کرتے ہوں گے، حالات سنے تو ان کے معیار کے موافق نہ تھے، بولے کہ بھلا ہم کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا نسبت؟ ان کے پچھلے پہلے گناہ سب خدا نے معاف کر دیئے ہیں پھر ایک صاحب نے کہا کہ میں رات بھر نماز پڑھا کرونگا، دوسرے صاحب بولے میں عمر بھر روزہ رکھوں گا، ایک اور صاحب نے کہا میں کبھی شادی نہ کرونگا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سن رہے تھے، فرمایا کہ خدا کی قسم میں تم سے زیادہ خدا سے ڈرتا ہوں، تاہم روزہ بھی رکھتا ہوں اور افطار بھی کرتا ہوں، نماز بھی پڑھتا ہوں اور سوتا بھی ہوں عورتوں سے نکاح بھی کرتا ہوں، جو شخص میرے طریقہ پر نہیں چلتا وہ میرے گروہ سے خارج ہے۔[2]

کسی غزوہ میں ایک صحابی کا ایک غار پر گذر ہوا جس میں پانی تھا، اور اس پاس کچھ ہریالیں تھیں، خدمت اقدس میں حاضر ہوئے تو عرض کی، یا رسول اللہ! مجھ کو ایک غار مل گیا ہے جسمیں ضرورت کی سب چیزیں ہیں، میرا دل چاہتا ہے کہ وہاں گوشہ نشین ہو کر ترک دنیا کر لوں، آپ نے فرمایا میں یہودیت یا نصرانیت لیکر دنیا میں نہیں آیا، میں آسان اور سہل ابراہیمی مذہب لیکر آیا ہوں۔[3]

عیب جوئی اور مداحی کی ناپسندیدگی

مداحی اور تعریف کو بھی (گو دل سے ہو) ناپسند فرماتے تھے ایک دفعہ مجلس اقدس میں ایک شخص کا مذکور نکلا، حاضرین میں سے ایک شخص نے انکی بہت تعریف کی، آپ نے فرمایا تم نے اپنے دوست کی گردن کاٹی، یہ الفاظ چند بار فرمائے پھر ارشاد کیا کہ

---

[1] ابو داؤد ص ۴۲ [2] صحیح بخاری کتاب النکاح [3] مسند ابن حنبل ج ۵ ص ۲۶۶،

تم کو اگر کسی کی خواہی نخواہی مدح کرنی ہو تو یوں کہو کہ میرا ایسا خیال ہے[1]"

ایک دفعہ ایک شخص کسی حاکم کی مدح کر رہا تھا حضرت مقدادؓ بھی موجود تھے، انھوں نے زمین سے خاک اٹھا کر اس کے منھ میں جھونک دی اور حکم دیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا ہے کہ مداحوں کے منھ میں خاک بھر دیں،[2]

ایک دفعہ آپ مسجد میں تشریف لائے، ایک شخص نماز پڑھ رہا تھا، محجن ثقفیؓ سے پوچھا یہ کون ہے، محجنؓ نے ان کا نام بتایا، اور نہایت تعریف کی، ارشاد فرمایا کہ دیکھو یہ سن نہ پائے ورنہ تباہ ہو جائیگا، یعنی دل میں غرور پیدا ہوگا۔ جو موجب ہلاکت ہوگا[3]

ایک دفعہ اسود بن سریع جو شاعر تھے، خدمت عالی میں آئے اور عرض کی کہ میں نے خدا کی حمد اور حضور کی مدح میں کچھ اشعار کہے ہیں، فرمایا کہ ہاں خدا کو حمد پسند ہے، اسود نے اشعار پڑھنے شروع کیے، اسی اثنا میں کوئی صاحب باہر سے آگئے، آپ نے اسود کو روک دیا، وہ کچھ دیر باتیں کر کے چلے گئے، پھر اسود نے پڑھنے شروع کیے، وہ صاحب پھر آگئے، آپ نے اسود کو روک دیا، دو دفعہ یہی اتفاق ہوا، اسود نے عرض کی کہ یہ کون صاحب ہیں، جن کے لیے آپ مجھکو بار بار روک دیتے ہیں، فرمایا کہ یہ وہ شخص ہے جو فضول باتیں پسند نہیں کرتا[4]

اس موقع پر یہ خیال پیدا ہو سکتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حسانؓ کو منبر پر بٹھا کر ان کے اشعار سنتے تھے، اور فرماتے تھے، اللھم ایدہ بروح القدس حالانکہ یہ اشعار آنحضرتؐ کی مدح میں ہوتے تھے لیکن واقعہ یہ ہے کہ حسانؓ کے اشعار کفار کے مطاعن کا جواب تھے، عرب میں شعرا کو

[1] ادب المفرد صفحہ ۶۶ [2] ایضاً ص ۶۷ [3] ایضاً ص ۶۷ [4] ایضاً ص ۸۰

یہ رتبہ حاصل تھا کہ زور کلام سے جس شخص کو چاہتے ذلیل اور جس کو چاہتے معزز کر دیتے، ابن الزبعریٰ اور کعب بن اشرف وغیرہ نے اس طریقہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ضرر پہنچانا چاہا تھا، حسان کی مداحی انکا رد عمل تھا

سادگی اور بے تکلفی

معمول تھا کہ مجلس سے اٹھ کر گھر میں تشریف لیجاتے تو کبھی کبھی ننگے پاؤں چلے جاتے اور جوتی وہیں چھوڑ جاتے۔ یہ اس بات کی علامت تھی کہ پھر واپس تشریف لائیں گے[1]،

روز روز کنگھا کرنا ناپسند فرماتے، ارشاد تھا کہ ایک دن بیچ دے کر کنگھا کرنا چاہیے[2]،

(کھانے پینے پہننے اوڑھنے، اٹھنے بیٹھنے کسی چیز میں تکلف نہ تھا، کھانے میں جو سامنے آتا، تناول فرماتے، پہننے کو موٹا جھوٹا جو ملجاتا پہن لیتے، زمین پر، چٹائی پر، فرش پر جہاں جگہ ملتی بیٹھ جاتے[3]، آپکے لیے آٹے کی بھوسی کبھی صاف نہیں کیجاتی تھی[4]، کرتہ کا تکمہ اکثر کھلا رکھتے تھے، لباس میں نمائش کو ناپسند فرماتے تھے، سامانِ آرایش سے طبعاً نفور تھے[5]، غرض ہر چیز میں سادگی اور بے تکلفی پسند خاطر تھی)

امارت پسندی سے اجتناب

اسلام رہبانیت اور جوگی پن کا سخت مخالف ہے (لا رھبانیۃ فی الاسلام) اسی بنا پر آپ ہر قسم کے جائز حظوظ دنیوی سے متمتع ہونا جائز رکھتے تھے، اور خود بھی کبھی کبھی ان چیزوں سے تمتع اٹھاتے تھے، تاہم ناز و نعمت، تکلف و عیش پرستی کو ناپسند فرماتے اور اوروں کو بھی اس سے روکتے،

ایک دفعہ ایک شخص نے حضرت علی رضی کی دعوت کی اور کھانا پکوا کر گھر بھیج دیا، حضرت فاطمہ زہرا رضی نے کہا کہ رسول اللہ بھی تشریف لائے اور ہمارے ساتھ کھاتے تو خوب ہوتا، حضرت علی رضی گئے، اور آپ سے جاکر عرض کی، آپ تشریف لاتے لیکن دروازہ پر پہنچے تو یہ دیکھ کر کہ گھر میں دیواروں پر پردے لٹکے ہوئے ہیں، واپس چلے گئے، حضرت علی رضی نے واپسی کی وجہ دریافت کی، تو فرمایا، پیغمبر کی شان کے خلاف ہے کہ وہ

[1] ابوداؤد ج ۲ ص ۲۱۰ [2] دیکھو شمائل [3] صحیح بخاری کتاب الاطعمہ ص ۸۱۴ [4] صحاح کی کتاب اللباس میں متعدد واقعات ہیں

کسی زیب وزینت کے مکان میں داخل ہوئے[۱]

فرمایا کرتے کہ گھر میں ایک بستر اپنے لیے، ایک بیوی کے لیے اور ایک مہمان کے لیے کافی ہے چوتھا شیطان کا حصہ ہے،[۲]

ایک دفعہ کسی غزوہ میں تشریف لے گئے، حضرت عائشہؓ رہ گئیں، لڑائی سے واپس تشریف لائے اور حضرت عائشہؓ کے پاس آئے تو دیکھا کہ گھر میں چھت گیر لگی ہوئی ہے، اسی وقت پھاڑ ڈالی اور فرمایا کہ خدا نے ہم کو دولت اس لیے نہیں دی ہے کہ اینٹ پتھر کو کپڑے پہنائے جائیں،[۳]

ایک انصاری نے ایک مکان بنوایا جس کا گنبد بہت بلند تھا، آپ نے دیکھا تو پوچھا کس نے بنایا ہے لوگوں نے نام بتایا، آپ چپ ہو رہے، جب وہ حسب معمول خدمت اقدس میں آئے اور سلام کیا تو آپ نے منھ پھیر لیا، انھوں نے پھر سلام کیا، آپ نے پھر منھ پھیر لیا، وہ سمجھ گئے کہ ناراضی کی کیا وجہ ہے، جاکر گنبد کو زمین کے برابر کر دیا، ایک دن آپ بازار میں نکلے تو گنبد نظر نہ آیا، معلوم ہوا کہ انصاری نے اس کو ڈھا دیا، ارشاد فرمایا کہ ضروری عمارت کے سوا ہر عمارت انسان کے لیے وبال ہے"[۴]

ایک دفعہ کسی نے کمخواب کی قبا بھیجی، آپ نے پہن لی، پھر خیال آیا اور اتار کر حضرت عمرؓ کے پاس بھیجدی، حضرت عمرؓ ڈرتے ہوئے آئے اور عرض کی کہ آپ نے جو چیز ناپسند کی وہ مجکو عنایت ہوتی ہے، ارشاد ہوا کہ میں نے استعمال کے لیے نہیں بلکہ فروخت کے لیے بھیجی، چنانچہ حضرت عمرؓ نے فروخت کیا تو دو ہزار درہم اٹھے،[۵]

ایک دفعہ کسی نے ایک مخطط جوڑا بھیجا، آپ نے حضرت علیؓ کو عنایت فرمایا، وہ پہنکر خدمت اقدس میں

---

۱ ابوداؤد ج ۲ ص ۱۷۱، ۲ ابوداؤد ج ۲ ص ۲۱۸ کتاب اللباس ۳ ابوداؤد ج ۲ ص ۲۱۹،

۴ ایضاً ص ۳۴۷ ۵ ایضاً کتاب اللباس

میں آئے، آپ کے چہرہ پر غضب کے آثار پیدا ہوئے، اور فرمایا کہ "میں نے اس لیے بھیجا تھا کہ پھاڑ کر زنانی چادریں بنائی جائیں"[1]

مہر کرنے کی ضرورت سے جب آپ نے انگوٹھی بنوائی تو پہلے سونے کی بنوائی، آپ کی تقلید سے صحابہ نے بھی زریں انگوٹھیاں بنوائیں، آپ منبر پر چڑھے اور انگوٹھی اتار کر پھینک دی اور فرمایا کہ "اب نہ پہنوں گا" صحابہ نے بھی اسی وقت اتار کر پھینک دیں[2]

جس طرح آپ خود سادگی پسند فرماتے تھے، اسی طرح آپ یہ بھی چاہتے تھے کہ آپ کے اہل و عیال بھی سادہ زندگی بسر کریں اور تکلف و تنعم سے پاک رہیں، عورتوں کو شریعت میں سونے کے زیور کا استعمال مباح ہے، مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اہلبیت کرام کے لیے اس بات کو بھی خلافِ اولیٰ تصور فرماتے تھے،

ایک دفعہ حضرت فاطمہؓ کے گلے میں سونے کا ہار دیکھا تو فرمایا کہ تم کو یہ ناگوار نہ ہوگا جب لوگ کہیں گے کہ پیغمبر کی لڑکی کے گلے میں آگ کا ہار ہے۔[3]

ایک دفعہ حضرت عائشہؓ کے ہاتھوں میں سونے کے کنگن (مسکۃ) دیکھے، فرمایا کہ اگر اسکو اتار کر دس کے کنگن کو زعفران سے رنگ کر پہن لیتیں تو بہتر ہوتا۔[4]

ایک دفعہ نجاشی نے کچھ زیورات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ہدیۃً بھیجے، ان میں ایک انگوٹھی تھی، جس میں حبشی پتھر کا نگینہ جڑا تھا، آپ کے چہرہ پر کراہت کے آثار ظاہر ہوتے تھے اور لکڑی سے اس کو چھوتے تھے۔ ہاتھ نہیں لگاتے تھے۔[5]

---

[1] ابوداؤد ج ۲ ص ۲۰۴ کتاب اللباس [2] ابوداؤد کتاب الخاتم [3] نسائی ج ۲ ص ۲۸۴ [4] ایضاً [5] مسند ابن حنبل ج ۶ ص ۱۱۹،

ایک دفعہ کسی نے ریشم کا شلوکہ ہدیۃً بھیجا، آپ نے پہن لیا، اور اس کو پہنکر نماز ادا فرمائی، نماز سے فارغ ہوکر نہایت کراہت اور نفرت کے ساتھ نوچ کر اتار ڈالا، پھر فرمایا "پرہیزگاروں کے لیے یہ کپڑے مناسب نہیں"۔

تواضع اور خاکساری کی راہ سے اکثر معمولی کپڑے استعمال فرماتے تھے، حضرت عمرؓ کو خیال تھا کہ جمعہ وعیدین میں یا سفراء کے ورود کے موقع پر آپ شان وتجمل کے کپڑے زیب تن فرمائیں، اتفاق سے ایک بار راستہ میں ایک ریشمی کپڑا (حلہ سیرا) بک رہا تھا حضرت عمرؓ نے موقع پاکر عرض کیا، یارسول اللہ یہ کپڑا حضور خرید لیں، اور جمعہ میں اور سفراء کی آمد کے موقع پر ملبوس فرمائیں، ارشاد فرمایا کہ "یہ وہ پہنے جس کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں"۔[1]

اکثر موٹے جھوٹے اور بھیڑ کے بال کے بنے ہوئے کپڑے پہنتے تھے، اور ان ہی کپڑوں میں وفات پائی،[2]

بستر کمبل کا تھا، کبھی چمڑے کا جس میں کھجور کی کھال بھری ہوتی تھی، کبھی معمولی کپڑا جو دو تہ کر دیا جاتا تھا، حضرت حفصہؓ بیان کرتی ہیں کہ ایک شب کو میں نے بستر مبارک چار تہ کرکے بچھایا کہ ذرا نرم ہوجائے، صبح اٹھ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ناگواری ظاہر فرمائی،[3]

۹ھ میں جب کہ یمن سے شام تک صرف اسلامی حکومت تھی، فرمانروائے اسلام کے گھر میں صرف ایک کھری چارپائی اور چمڑے کا سوکھا ہوا مشکیزہ[4] تھا، حضرت عائشہؓ بیان کرتی ہیں کہ جب آپ نے وفات پائی تو تھوڑے سے جو کے سوا گھر میں کھانے کو کچھ نہ تھا،[5] صحابہ سے فرمایا۔

---

[1] اوپر کی تمام روایتیں صحیح بخاری کتاب اللباس سے ماخوذ ہیں [2] شمائل ترمذی [3] صحیح بخاری کتاب اللباس [4] مسند ابن حنبل ج ۲ ص ۱۰۰۔

کرتے تھے کہ "دنیا میں انسان کے لیے اتنا کافی ہے جتنا ایک مسافر کو زادِ راہ کے لیے"[1] ایک دفعہ ایک بوریے پر آرام فرما رہے تھے، اٹھے تو لوگوں نے دیکھا کہ پہلوے مبارک پر نشان پڑ گئے ہیں عرض کی یا رسول اللہ! کیا ہم لوگ کوئی گدا بنوا کر حاضر کریں، ارشاد ہوا کہ مجکو دنیا سے کیا غرض؟ مجکو دنیا سے اسقدر تعلق ہے جس قدر اس سوار کو جو تھوڑی دیر کے لیے راہ میں کسی درخت کے سایہ میں بیٹھ جاتا ہے، پھر اس کو چھوڑ کر آگے بڑھ جاتا ہے[2]۔

ایلاد کے زمانہ میں حضرت عمرؓ جب مشربہ میں جو اسباب کی کوٹھری تھی حاضر ہوئے تو ان کو نظر آیا کہ سرورِ عالمؐ کے بیت قدس میں دنیاوی سازو سامان کی کیا کیفیت ہے؟ جسمِ مبارک پر صرف ایک تہبند ہے، ایک کھری چارپائی بچھی ہے، سرہانے ایک تکیہ پڑا ہے جسمیں خرمے کی چھال بھری ہے ایک طرف مٹھی بھر جو رکھے ہیں، ایک کونے میں پائے مبارک کے پاس کسی جانور کی کھال پڑی ہے کچھ مشکیزہ کی کھالیں سر کے پاس کھونٹی پر لٹک رہی ہیں، یہ دیکھ کر حضرت عمرؓ کہتے ہیں کہ میری آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے رونے کا سبب دریافت فرمایا، عرض کی یا رسول اللہ میں کیوں نہ روؤں، چارپائی کے بان سے جسم اقدس میں بدھیاں پڑ گئی ہیں، یہ آپکے اسباب کی کوٹھری ہے، اس میں جو سامان ہے وہ نظر آ رہا ہے، قیصر و کسریٰ تو باغ و بہار کے مزے لوٹیں، اور آپ خدا کے پیغمبر اور برگزیدہ ہو کر آپکے سامان خانہ کی یہ کیفیت ہو، ارشاد ہوا، اے ابن خطاب! تم کو یہ پسند نہیں کہ وہ دنیا لیں اور ہم آخرت![3]

مساوات | آپ کی نظر میں امیر و غریب صغیر و کبیر، آقا و غلام سب برابر تھے، سلمانؓ و صہیبؓ و

---

[1] ابن ماجہ کتاب الزہد [2] جامع ترمذی کتاب الزہد [3] صحیح مسلم کتاب الطلاق باب تخییر الازواج۔

بلالؓ کہ سب کے سب غلام رہ چکے تھے، آپ کی بارگاہ میں روساے قریش سے کم رتبہ نہ تھے، ایک دفعہ حضرت سلمانؓ و بلالؓ ایک موقع پر جمع تھے، اتفاق سے ابوسفیان نکلے، ان لوگوں نے کہا ابھی تلوار نے اُس دشمنِ خدا کے گردن پر پورا قبضہ نہیں پایا ہے، حضرت ابوبکرؓ نے ان لوگوں سے کہا سردارِ قریش کی شان میں یہ الفاظ! پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے اور واقعہ بیان کیا، آپنے ارشاد فرمایا کہ کہیں تم نے ان لوگوں کو ناراض تو نہیں کیا، ان لوگوں کو ناراض کیا تو تو خدا کو ناراض کیا، حضرت ابوبکرؓ نے فوراً جاکر ان بزرگوں سے کہا بھائیو، آپ لوگ مجھ سے ناراض تو نہیں ہوئے، ان لوگوں نے کہا نہیں، خدا تم کو معاف کرے۔[1]

قبیلۂ مخزوم کی ایک عورت چوری کے جرم میں گرفتار ہوئی، اسامہ بن زیدؓ جن سے آنحضرت صلعم نہایت محبت رکھتے تھے، لوگوں نے ان کو شفیع بناکر خدمتِ نبویؐ میں بھیجا، آپنے فرمایا "اسامہ! کیا تم حدود خداوندی میں سفارش کرتے ہو" پھر آپنے لوگوں کو جمع کرکے خطاب فرمایا "تم سے پہلے کی امتیں اسی لیے برباد ہوگئیں کہ جب معزز آدمی کوئی جرم کرتا تو تسامح کرتے اور معمولی آدمی مجرم ہوتے تو سزا پاتے، خدا کی قسم اگر محمد کی بیٹی فاطمہ سرقہ کرتی تو اس کے بھی ہاتھ کاٹے جاتے"۔[2]

غزوۂ بدر میں دوسرے قیدیوں کے ساتھ آپکے چچا حضرت عباسؓ بھی گرفتار ہوکر آئے تھے، قیدیوں کو زرِ فدیہ لیکر رہا کیا جاتا تھا، بعض نیک دل انصار نے اس بنا پر کہ وہ آپ سے قرابت قریبہ رکھتے تھے، عرض کی کہ یا رسول اللہ! اجازت دیجئے کہ ہم اپنے بھانجے (عباس) کا زرِ فدیہ معاف کردیں، آپ نے فرمایا نہیں، ایک درہم بھی معاف نہ کرو۔[3]

---

[1] صحیح مسلم فضائل سلمانؓ و صہیبؓ [2] بخاری و مسلم و ابوداؤد کتاب الحدود [3] صحیح بخاری باب فداء المشرکین،

مجلس میں جو چیزیں آتیں ہمیشہ داہنی طرف سے اس کی تقسیم شروع فرماتے اور ہمیشہ اس میں امیر و غریب، صغیر و کبیر سب کی مساوات کا لحاظ ہوتا۔)

ایک دفعہ خدمتِ اقدس میں صحابہ کا مجمع تھا، اتفاق سے داہنی طرف حضرت عبداللہ بن عباسؓ بیٹھے ہوئے تھے، جو بہت کمسن تھے بائیں جانب بڑے بڑے معمر صحابہ تھے، کہیں سے دودھ آیا، آپ نے نوش فرما کر عبداللہ بن عباسؓ سے کہا تم اجازت دو تو میں ان لوگوں کو دوں، انھوں نے عرض کی، اس عطیہ میں میں ایثار نہیں کر سکتا، چونکہ وہ داہنی جانب تھے اور ترتیبِ مجلس کی رو سے ان ہی کا حق تھا، آپ نے ان ہی کو ترجیح دی،[1]

حضرت انسؓ کا بیان ہے کہ ایک دفعہ میرے مکان پر تشریف لائے اور پینے کا پانی مانگا میں نے بکری کا دودھ پیش کیا، مجلس کی ترتیب یہ تھی کہ حضرت ابوبکرؓ بائیں جانب، حضرت عمرؓ سامنے اور ایک بدو داہنی جانب تھا، آپ نے پی لیا، تو حضرت عمرؓ نے حضرت ابوبکرؓ کی طرف اشارہ کیا، یعنی بقیہ ان کو عنایت ہو، آپ نے فرمایا پہلے داہنی طرف والے کا حق ہے، یہ کہکر بچا ہوا دودھ بدو کو عنایت فرمایا،[2]

(قریش اپنے فخر و امتیاز کے لیے مزدلفہ میں قیام کرتے تھے، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس تفریق کو کبھی پسند نہ فرمایا، بعثت[3] سے پہلے اور بعثت کے بعد[4] بھی ہمیشہ عام لوگوں کے ساتھ مقام کرتے تھے، علاوہ بریں یہ بھی گوارا نہ تھا کہ وہیں خاص طور سے کوئی عمدہ جگہ دیکھ کر آپ کے لیے مخصوص کر دی جائے اور وہاں سایہ کے لیے کوئی چھپر ڈال دیا جائے، صحابہ نے یہ تجویز پیش کی تو فرمایا جو پہلے

---

[1] صحیح بخاری ص ۸۰۰ [2] بخاری ص ۳۵۰ [3] ابوداؤد کتاب المناسک [4] ایضاً

پہنچ جائے، اسی کا مقام ہے"۔[1]

صحابہ جب سب مل کر کوئی کام کرتے تو ہمیشہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کے ساتھ شریک ہو جاتے اور معمولی مزدور کی طرح کام انجام دیتے، مدینہ میں آکر سب سے پہلا کام مسجد نبویؐ کی تعمیر تھی، اس مسجد اقدس کی تعمیر میں دیگر صحابہ کی طرح خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی بہ نفس نفیس شریک تھے، خود اپنے دست مبارک سے اینٹ اٹھا اٹھا کر لاتے تھے، صحابہ عرض کرتے تھے کہ ہماری جانیں قربان آپ کیوں زحمت فرماتے ہیں، لیکن آپ اپنے فرض سے باز نہ آتے[2] غزوۂ احزاب کے موقع پر بھی جب تمام صحابہ مدینہ کے چاروں طرف خندق کھود رہے تھے، آپ بھی ایک ادنیٰ مزدور کی طرح کام کر رہے تھے، یہاں تک کہ شکم مبارک پر مٹی اور خاک کی تہ جم گئی تھی۔[3]

ایک سفر میں کھانا تیار نہ تھا، تمام صحابہ نے مل کر کھانا پکانے کا سامان کیا، لوگوں نے ایک ایک کام بانٹ لیا، جنگل سے لکڑی لانے کا کام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ذمہ لیا، صحابہ نے عرض کی یا رسول اللہ! یہ کام ہم خدام کر لیں گے، فرمایا ہاں سچ ہے، لیکن مجھے یہ پسند نہیں کہ میں تم سے اپنے کو ممتاز کر دوں، خدا اس بندہ کو پسند نہیں کرتا، جو اپنے ہمراہیوں میں ممتاز بنتا ہے"۔[4]

غزوۂ بدر میں سواریوں کا سامان بہت کم تھا، تین تین آدمیوں کے بیچ میں ایک ایک اونٹ تھا، لوگ باری باری سے چڑھتے اترتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی عام آدمیوں کی طرح ایک اونٹ میں دو اور آدمیوں کے ساتھ شریک تھے، ہمراہ جاں نثارانہ اپنی باری پیش کرتے، اور عرض کرتے کہ یا رسول اللہ! آپ سوار رہیں حضورؐ کے بدلہ میں ہم پیادہ چلیں گے، ارشاد ہوتا کہ نہ تم مجھ سے زیادہ پیادہ پا چل سکتے ہو،

---

[1] مسند ابن حنبل ج ۳ ص ۱۰۸۔ [2] صحیح بخاری باب الہجرۃ و بناء المسجد۔ [3] صحیح بخاری باب غزوۂ احزاب۔ [4] زرقانی ج ۴ ص ۳۰۶ بحوالہ سیرت محب طبری، یہ روایت کسی اور کتاب میں نہیں ہے۔

اور نہ میں تم سے کم ثواب کا محتاج ہوں[1]

تواضع: گھر کا کام کاج خود کرتے، کپڑوں میں پیوند لگاتے، گھر میں خود جھاڑو دیتے، دودھ دوہ لیتے، بازار سے سودا لاتے، جوتی پھٹ جاتی تو خود گانٹھ لیتے (گدھے کی سواری سے آپ کو عار نہ تھا، غلاموں اور مسکینوں کے ساتھ بیٹھنے اور ان کے ساتھ کھانا کھانے سے پرہیز نہ تھا)[2] ایک دفعہ گھر سے باہر تشریف لائے، لوگ تعظیم کو اٹھ کھڑے ہوئے، فرمایا کہ اہل عجم کی طرح تعظیم کیلئے نہ اٹھو۔[3]

غریب سے غریب بیمار ہوتا تو عیادت کو تشریف لیجاتے، مفلسوں اور فقیروں کے ہاں جاکر انکے ساتھ بیٹھتے تو اس طرح بیٹھتے کہ امتیازی حیثیت کی بنا پر کوئی آپ کو پہچان نہ سکتا، کسی مجمع میں جاتے تو جہاں جگہ مل جاتی بیٹھ جاتے۔[4]

ایک دفعہ ایک شخص ملنے آیا، لیکن نبوت کا رعب اسقدر طاری ہوا کہ کانپنے لگا، آپ نے فرمایا کہ گھبراؤ نہیں، میں بادشاہ نہیں، ایک قریشی عورت کا بیٹا ہوں جو سوکھا گوشت پکا کر کھایا کرتی تھی۔[5]

تواضع اور خاکساری کی راہ سے آپ اکڑوں بیٹھ کر کھانا تناول فرماتے تھے، اور فرمایا کرتے تھے "میں بندہ اور بندوں کی طرح کھاتا اور بندوں ہی کی طرح بیٹھتا ہوں"، ایک دفعہ کھانے کے موقع پر جگہ تنگ تھی، اور لوگ زیادہ آگئے، آپ اکڑوں بیٹھ گئے کہ جگہ نکل آئے، ایک بدو بھی مجلس میں شریک تھا، اس نے کہا محمدؐ! یہ کیا طرز نشست ہے، آپ نے فرمایا خدا نے مجھے خاکسار بندہ بنایا ہے۔ جبار اور سرکش نہیں بنایا ہے۔[6]

تواضع کی انتہا یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے متعلق جائز تعظیمی الفاظ بھی نہیں پسند فرماتے

---

[1] مسند ابن حنبل ج ۱ ص ۴۲۴ و مسند ابو داؤد طیالسی [2] شمائل ترمذی [3] ابو داؤد و ابن ماجہ [4] شمائل ترمذی [5] مستدرک ج ۳ ص ۴۸ علی شرط الشیخین واقعہ فتح مکہ [6] ابو داؤد کتاب الاطعمہ۔

ایک بار ایک شخص نے ان الفاظ سے آپ کو خطاب کیا "اے ہمارے آقا اور ہمارے آقا کے فرزند اور اے ہم میں سب سے بہتر اور ہم میں سب سے بہتر کے فرزند" آپ نے فرمایا، لوگو پرہیزگاری اختیار کرو، شیطان تمھیں گرا نہ دے، میں عبداللہ کا بیٹا محمد ہوں، خدا کا بندہ اور اس کا رسول، مجکو خدا نے جو مرتبہ بخشا میں پسند نہیں کرتا کہ تم مجھے اس سے زیادہ بڑھاؤ[1]

ایک دفعہ ایک شخص نے آپ کو یا خیر البریۃ (یعنی اے بہترین خلق) کہکر مخاطب کیا، آپ نے فرمایا وہ ابراہیم تھے،[2]

عبداللہ بن سخیر کا بیان ہے کہ بنی عامر کی سفارت کے ساتھ جب ہم لوگ خدمتِ اقدس میں آئے تو عرض کی کہ حضور ہمارے آقا (سید) ہیں، ارشاد فرمایا کہ "آقا خدا ہے" پھر ہم لوگوں نے عرض کی کہ آپ ہم میں سب سے افضل اور سب سے برتر ہیں، ارشاد ہوا کہ "بات کہو تو دیکھ لو کہ شیطان تمکو نہیں چلا رہا ہے"

مدینہ منورہ میں ایک عورت تھی جس کے دماغ میں کچھ فتور تھا، آپ کی خدمت میں آئی، اور کہا کہ محمد! مجکو تم سے کچھ کام ہے، فرمایا جہاں کہو چل سکتا ہوں، وہ آپ کو ایک کوچہ میں لے گئی، اور وہیں بیٹھ گئی، آپ بھی اس کے ساتھ بیٹھ گئے، اور جو کام تھا انجام دیدیا،[3]

مخرمہؓ ایک صحابی تھے، ایک دفعہ انھوں نے اپنے بیٹے مسور سے کہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کہیں سے چادریں آئی ہیں، اور وہ تقسیم فرما رہے ہیں آؤ ہم بھی چلیں، آئے تو آپ زنانہ میں تشریف لیجا چکے تھے کہا آواز دو، انھوں نے کہا میرا یہ رتبہ ہے کہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو آواز دوں مخرمہ نے کہا بیٹے! محمد جبار نہیں ہیں، انکی جرأت دلانے سے مسور نے آواز دی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

[1] مسند ابن حنبل ج ۳ ص ۱۵۳ [2] صحیح مسلم باب فضائل ابراہیم [3] ابو داؤد کتاب الادب باب کراہیۃ التمادح [4] ایضاً

فوراً نکل آئے اور ان کو دیبا کی قبا عنایت کی جس کی گھنڈیاں زریں تھیں[1]،

ایک دفعہ ایک انصاری نے ایک یہودی کو یہ کہتے سنا کہ اُس خدا کی قسم جس نے موسیٰ کو تمام انسانوں پر فضیلت دی، یہ سمجھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر تعریض ہے، غصہ میں آکر اس کے منھ پر تھپڑ کھینچ مارا، وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس فریادی آیا، آپ نے انصاری کو بلا بھیجا، اور واقعہ کی تحقیق کے بعد فرمایا کہ "مجکو انبیاء پر فضیلت نہ دو[2]"

(انسان کے غرور و ترفع کا اصلی موقع وہ ہوتا ہے، جب وہ اپنے چپ و راست جلو میں ہزاروں آدمیوں کو چلتے ہوئے دیکھتا ہے، جو اس کے ایک اشارہ پر اپنی جان تک قربان کر دینے کو تیار ہو جاتے ہیں، خصوصاً جب وہ فاتحانہ ایک جرار و پُرجوش لشکر کے ساتھ شہر میں داخل ہوتا ہے، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تواضع و خاکساری کا منظر اُسوقت اور نمایاں ہو جاتا ہے، فتح مکہ کے موقع پر جب آپ شہر میں داخل ہوئے تو تواضعاً سر مبارک کو اس قدر جھکا دیا کہ کجاوہ سے آکر مل گیا[3]، غزوۂ خیبر میں جب آپ کا داخلہ ہوا تو آپ ایک گدھے پر سوار تھے، جس میں لگام کی جگہ کھجور کی چھال بندھی تھی[4]، حجۃ الوداع میں جس کجاوہ پر آپ سوار تھے، سن چکے ہو کہ اس کی قیمت کیا تھی)

تعظیم اور مدح مفرط سے روکتے تھے، (شرک کا پہلا دیباچہ انبیاء اور صلحا کی مبالغہ آمیز تعظیم ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس نکتہ کا بڑا لحاظ فرماتے تھے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی مثال پیش نظر تھی، فرمایا کرتے تھے کہ میری اس قدر مبالغہ آمیز مدح نہ کیا کرو جسقدر نصاریٰ ابن مریم کی کرتے ہیں، میں تو خدا کا بندہ اور اسکا فرستادہ ہوں[5]،

[1] بخاری ص ۱۱۰ [2] بخاری کتاب الانبیاء ذکر موسیٰ [3] شرح شفا قاضی عیاض و سیرت ابن ہشام، مستدرک حاکم ج ۲ ص ۴۷ [4] مشکوٰۃ اخلاق النبی بحوالہ حاکم ابن ماجہ و بیہقی [5] صحیح بخاری ج ۱ ص ۴۹۰ کتاب الانبیاء

قیس بن سعد کہتے ہیں کہ ایک دفعہ میں حیرہ گیا، وہاں لوگوں کو دیکھا کہ رئیسِ شہر کے دربار میں جاتے ہیں تو اس کے سامنے سجدہ کرتے ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں واقعہ بیان کیا اور عرض کی کہ آپ کو سجدہ کیا جائے تو آپ اس کے زیادہ مستحق ہیں، آپ نے فرمایا کہ تم میری قبر پر گذرو گے تو سجدہ کرو گے؟ کہا نہیں، فرمایا تو جیتے جی بھی سجدہ نہیں کرنا چاہیے۔[1]

معوذ بن عفراء کی صاحبزادی (ربیع) کی جب شادی ہوئی تو آپ اُن کے گھر تشریف لے گئے اور دلہن کے لیے جو فرش بچھایا گیا تھا، اس پر بیٹھ گئے، گھر کی لڑکیاں آس پاس جمع ہو گئیں اور دف بجا بجا کر شہداے بدر کا مرثیہ گانے لگیں، گاتے گاتے ایک نے یہ مصرع گایا۔

فینا نبیٌّ یعلم ما فی غد | ہم میں ایک پیغمبر ہے جو کل کی باتیں جانتا ہے،

فرمایا "یہ چھوڑ دو اور وہی کہو جو پہلے کہہ رہی تھیں"۔[2]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صاحبزادے حضرت ابراہیمؑ نے جس روز انتقال کیا، اتفاق سے اس روز سورج گرہن لگا، لوگوں کے خیال میں ایک پیغمبر کی ظاہری عظمت کا فرضی تخیل یہ تھا کہ اس درد و صدمہ سے کم از کم اجرامِ سماوی میں انقلاب پیدا ہو جائے، لوگوں نے اس اتفاقی واقعہ کو اسی کے واقعہ پر محمول کیا، ایک جاہ پسند انسان کے لیے اس قسم کا اتفاق بہترین موقع ہو سکتا تھا، لیکن نبوت کی شان اس سے بدرجہا ارفع و اعلیٰ ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی وقت لوگوں کو مسجد میں جمع کیا اور خطبہ دیا کہ چاند اور سورج میں گرہن لگنا خدا کی آیاتِ قدرت میں ہے کسی کی زندگی اور موت سے ان میں گرہن نہیں لگتا۔[3]

ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم وضو کر رہے تھے، وضو کا پانی جو دستِ مبارک سے گرتا، فدائی

---

[1] ابوداود، کتاب النکاح باب حق الزوج علی المرأۃ [2] صحیح مسلم باب ضرب الدف فی النکاح [3] صحیح بخاری و مسلم باب صلوٰۃ الخسوف

برکت کے خیال سے اس کو چلو میں لیکر بدن میں مل لیتے، آپ نے پوچھا کہ تم یہ کیوں کر رہے ہو، انھوں نے عرض کیا کہ خدا اور خدا کے رسول کی محبت میں، فرمایا اگر کوئی اس بات کی خوشی حاصل کرنا چاہے کہ وہ خدا اور خدا کے رسول سے محبت رکھتاہے تو اس کو چاہیے کہ جب باتیں کرے سچ بولے، جب امین بنایا جائے ادا امانت کرے، اور کسی کا پڑوسی ہو تو ہمسائیگی کو اچھی طرح بناہے[1]،

ایک صاحب بارگاہ نبوت میں حاضر ہوئے، اثنائے گفتگو میں انھوں نے کہا "جو خدا چاہے اور جو آپ چاہیں"۔ ارشاد ہوا "تم نے خدا کا شریک اور ہمسر ٹھہرایا کہو کہ جو خدا تنہا چاہے[2]"،

شرم وحیا (صحاح میں ہے کہ آپ دوشیزہ لڑکیوں سے بھی زیادہ شرمیلے تھے، اور شرم وحیا کا اثر آپ کی ایک ایک ادا سے ظاہر ہوتا تھا، کبھی کسی کے ساتھ بدزبانی نہیں کی بازاروں میں جاتے تو چپ چاپ گذر جاتے، تبسم کے سوا کبھی لبِ مبارک خندہ وقہقہہ سے آشنا نہیں ہوئے)

بھری محفل میں کوئی بات ناگوار ہوتی تو لحاظ کی وجہ سے زبان سے کچھ نہ فرماتے، چہرہ کے اثر سے ظاہر ہوتا اور صحابہ متنبہ ہوجاتے۔

عرب میں اور ممالک کی طرح شرم وحیا کا بہت کم لحاظ تھا، ننگے نہانا عام بات تھی حرمِ کعبہ کا طواف ننگے ہو کر کرتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بالطبع یہ باتیں سخت ناپسند تھیں، ایک دفعہ فرمایا کہ حمام سے پرہیز کرو، لوگوں نے عرض کی کہ حمام میں نہانے سے میل چھوٹتا ہے اور بیماری میں فائدہ ہوتا ہے، ارشاد فرمایا کہ نہاؤ تو پردہ کر لیا کرو، عرب میں حمام نہ تھے، لیکن شام وعراق کے جو شہر عرب کی سرحد سے ملے ہوئے تھے، وہاں کثرت سے حمام تھے، اس بنا پر آپ نے فرمایا کہ تم جب عجم

---

[1] مشکوٰۃ بحوالہ شعب الایمان بیہقی [2] ادب المفرد امام بخاری ص، ۱۰۵ مصر،

فتح کروگے تو وہاں حمام ملیں گے، ان میں جانا تو چادر کے ساتھ جانا،

ایک دفعہ کچھ عورتیں حضرت ام سلمہؓ کے پاس آئیں، انھوں نے وطن پوچھا، بولیں حمص (شام کا ایک شہر ہے) حضرت ام سلمہؓ نے کہا تم ہی وہ عورتیں ہو؟ جو حمام میں نہاتی ہیں، بولیں کیا حمام کوئی بری چیز ہے، فرمایا کہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ جو عورت اپنے گھر کے سوا کسی گھر میں کپڑے اتارتی ہے خدا اس کی پردہ دری کرتا ہے[1]، ابو داؤد میں روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حمام میں نہانے کو مطلقاً منع کر دیا تھا، پھر مردوں کو پردوں کی قید کیساتھ اجازت دی لیکن عورتوں کے لیے وہی حکم قائم رہا، عرب میں جائے ضرور نہ تھے[2]، لوگ میدانوں میں رفعِ حاجت کے لیے جایا کرتے تھے، لیکن پردہ نہیں کرتے تھے، بلکہ آمنے سامنے بیٹھ جایا کرتے تھے اور ہر قسم کی بات چیت کرتے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسکی سخت ممانعت کی اور فرمایا کہ خدا اس سے ناراض ہوتا ہے[3]

معمول تھا کہ رفع حاجت کے لیے اسقدر دور نکل جاتے کہ آنکھوں سے اوجھل ہوجاتے، مکہ معظمہ میں جبتک قیام تھا، حدود حرم سے باہر چلے جاتے جسکا فاصلہ مکہ معظمہ سے کم از کم تین میل تھا،

اپنے ہاتھ سے کام کرنا

اگرچہ تمام صحابہ آپکے جان نثار خادموں میں داخل تھے، ابایں ہمہ آپ خود اپنے ہاتھ سے کام کرنے کو پسند کرتے تھے، حضرت عائشہؓ، ابو سعید خدریؓ اور امام حسنؓ سے روایت ہے کہ کان یخدم نفسہ یعنی آپ اپنے کام خود اپنے دست مبارک سے انجام دیا کرتے تھے[4]، ایک شخص نے حضرت عائشہؓ سے پوچھا کہ آپ گھر میں کیا کیا کرتے تھے، جواب دیا کہ گھر کے کام کاج میں مصروف

---

[1] یہ تمام روایتیں ترغیب و ترہیب میں کتب حدیث کے حوالہ سے منقول ہیں [2] صحیح بخاری حدیث افک

[3] ابو داؤد و ابن ماجہ [4] شرح شفائے قاضی عیاض ج ۲ ص ۱۱۶

رہتے تھے، کپڑوں میں اپنے ہاتھ سے خود پیوند لگا لیتے تھے، گھر میں خود جھاڑو دے لیتے تھے، دودھ دوہ لیتے تھے، بازار سے سودا خرید لاتے تھے، جوتی پھٹ جاتی تو خود گانٹھ لیتے تھے، ڈول میں ٹانکے لگا لیتے تھے، اونٹ کو اپنے ہاتھ سے باندھ دیتے تھے، اس کو چارہ دیتے، غلام کیساتھ ملکر آٹا گوندھتے۔[۱]

ایک دفعہ حضرت انس بن مالکؓ خدمتِ مبارک میں حاضر ہوئے تو دیکھا، آپ خود اپنے ہاتھ سے ایک اونٹ کے بدن پر تیل مل رہے ہیں، ان سے دوسری روایت ہے کہ انھوں نے دیکھا کہ آپ صدقہ کے اونٹوں کو داغ رہے ہیں تیسری روایت میں وہ کہتے ہیں کہ آپ بکریوں کو داغ لگا رہے تھے،[۲] ایک دفعہ مسجد نبویؐ میں تشریف لے گئے، دیکھا تو مسجد میں کسی نے ناک صاف کی ہے آپ نے خود دستِ مبارک سے ایک کنکر لیکر اس کو کھرچ ڈالا، اور آیندہ لوگوں کو اس فعل سے منع فرمایا،[۳]

آپ جب بچے تھے اور خانہ کعبہ کی تعمیر ہو رہی تھی، تو اس وقت بھی پتھر اٹھا اٹھا کر معماروں کے پاس لاتے تھے[۴] مسجد قبا اور مسجد نبویؐ کی تعمیر اور خندق کے کھودنے میں جس طرح عام مزدوروں کیساتھ مل کر آپنے کام کیا، خود دستِ مبارک سے جس طرح پتھر اٹھا اٹھا کر دیا اور جس طرح زمین کھودی اسکی تفصیل جلد اول کے واقعات میں گذر چکی ہے، ایک سفر میں صحابہ نے بکری ذبح کی اور اس کو پکانے کیلئے آپس میں کام بانٹ لیے، آپنے فرمایا "جنگل سے لکڑی میں لاؤں گا" صحابہ نے تامل کیا تو فرمایا "میں

---

[۱] صحیح بخاری کتاب الادب اور باب مایکون الرجل فی مھنتہ اہلہ میں مجمل ہے، قاضی عیاض نے شفا میں متعدد حدیثوں سے لیکر اور ٹکڑے بھی جمع کر دیے ہیں، زرقانی نے ج ۴ ص ۳۰۴ میں مسند احمد و ابن سعد سے یہ روایت نقل کی ہے اور لکھا ہے کہ ابن حبان نے اسکو صحیح کہا ہے [۲] یہ تینوں روایتیں صحیح مسلم میں ہیں، پہلی روایت کتاب الادب میں اور دوسری اور تیسری باب جواز وسم الحیوان میں ہے، [۳] سنن نسائی کتاب المساجد [۴] صحیح بخاری باب الجاہلیۃ،

امتیاز پسند نہیں کرتا۔[1] ایک اور سفر میں آپ کی جوتی کا تسمہ ٹوٹ گیا، آپ نے خود اس کو درست کرنا چاہا، ایک صحابی نے عرض کی یا رسول اللہ لایئے میں ٹانک دوں، فرمایا "یہ تشخص پسندی ہے جو مجھے محبوب نہیں ہے"۔[2] وہ صحابی بیان کرتے ہیں کہ ایک دفعہ ہم لوگ خدمت اقدس میں حاضر ہوئے، تو دیکھا کہ آپ خود اپنے دستِ مبارک سے مکان کی مرمت کر رہے ہیں، ہم لوگ بھی اس کام میں شریک ہوگئے، جب کام ختم ہوگیا تو آپ نے ہمارے لیے دعائے خیر فرمائی۔[3]

دوسروں کے کام کر دینا

خباب بن ارت ایک صحابی تھے، ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انکو کسی غزوہ پر بھیجا، جناب کے گھر میں کوئی مرد نہ تھا، اور عورتوں کو دودھ دوہنا نہیں آتا تھا، اس بنا پر آپ ہر روز انکے گھر جاتے اور دودھ دوہ دیا کرتے۔[4] حبش سے جو مہمان آئے تھے، صحابہ نے چاہا کہ وہ انکی خدمت گذاری کریں، لیکن آپ نے انکو روک دیا اور فرمایا کہ "انھوں نے میرے دوستوں کی خدمت کی ہے، اس لیے میں خود انکی خدمتگذاری کا فرض انجام دونگا"۔[5] کفار ثقیف جنھوں نے طائف میں آپکے پائے مبارک کو زخمی کر دیا تھا، ۹ھ میں وفد لیکر آئے تو آپ نے ان کو مسجد نبوی میں اتارا اور بہ نفس نفیس ان کی مہمانی کے فرائض ادا کیے۔

مدینہ کی لونڈیاں آپ کی خدمت میں آتیں اور کہتیں "یا رسول اللہ میرا یہ کام ہے"۔ آپ فوراً اٹھ کھڑے ہوتے اور ان کا کام کر دیتے، مدینہ میں ایک پاگل لونڈی تھی، وہ ایک دن حاضر ہوئی اور آپ کا دستِ مبارک پکڑ لیا، آپ نے فرمایا "اے عورت! مدینہ کی جس گلی میں تو چاہے بیٹھ، میں تیرا کام کر دونگا"۔ چنانچہ آپ اسکے ساتھ مدینہ کی ایک گلی میں جا کر بیٹھے اور اس کی ضرورت پوری کی۔[6] عبداللہ بن ابی اوفیٰ ایک صحابی ہیں، وہ

---

[1] زرقانی ج ۴ ص ۳۰۶ بحوالہ سیرت محب طبری [2] ایضاً بحوالہ کتاب تمثال النعل الشریف لابی الیمین ابن عساکر [3] مسند ابن حنبل ج ۳ ص ۴۷۶ [4] ابن سعد حصہ ششم ص ۲۱۳ ترجمہ بنت خباب [5] شفای قاضی عیاض بسند متصل بحوالہ بیہقی [6] مسلم و ابوداؤد ابوداؤد اخلاق

فرماتے ہیں،

ولا یانف ان یمشی مع الارملۃ والمسکین فیقضی لہ الحاجۃ (نسائی و دارمی)	بیوہ اور مسکین کے ساتھ چل کر ان کا کام کر دینے میں آپ کو عار نہ تھا۔

ایک دفعہ آپ نماز کے لیے کھڑے ہو چکے تھے کہ ایک بدو آیا اور آپ کا دامن پکڑ کر بولا میرا ذرا سا کام رہ گیا ہے، ایسا نہ ہو کہ میں بھول جاؤں، پہلے اس کو کر دو" آپ اس کے ساتھ فوراً مسجد سے باہر نکل آئے اور اس کا کام انجام دیکر نماز ادا کی[۱]

عزم و استقلال خدا نے قرآن مجید میں اولوا العزم من الرسل کہکر انبیائے کبار کی مدح فرمائی ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ خاتم الرسل تھے، اس لیے خصوصیت کے ساتھ خدا نے یہ وصف آپکی ذات میں ودیعت کیا تھا، ابتدا سے انتہا تک اسلام کا ایک ایک کارنامہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عزم و استقلال کا مظہر اتم ہے، عرب کے کفرستان میں ایک شخص تنہا کھڑا ہوتا ہے بے یار و مددگار دعوت حق کی صدائیں بلند کرتا ہے ریگستان کا ذرہ ذرہ اس کی مخالفت میں پہاڑ بنکر سامنے آتا ہے، لیکن وقار نبوت اور عزم ربانی سے ٹھوکر کھاکر پیچھے ہٹ جاتا ہے، اور مخالفتوں کی تمام قوت اس کے سامنے چور چور ہو جاتی ہے،

تیرہ برس کی متواتر ناکامیوں کے بعد بھی ذاتِ اقدس جبین دیاس سے آشنا نہیں ہوتی اور بالآخر وہ دن آتا ہے، جب ایک تنہا انسان ایک لاکھ جان نثاروں کو چھوڑ کر دنیائے فانی کو الوداع کہتا ہے، ہجرت سے قبل ایک دفعہ صحابہ نے کفار کی ایذارسانیوں سے تنگ آکر خدمتِ مبارک میں عرض کی کہ آپ ہمارے لیے کیوں دعا نہیں فرماتے" آپکا چہرہ غصہ سے سرخ ہو گیا اور فرمایا کہ تم سے پہلے جو لوگ گذرے ہیں

---

[۱] ابو داؤد کتاب الادب و بخاری کتاب الصلوٰۃ مختصراً

ان کو آرے سے چیر کر دو ٹکڑے کر دیا جاتا تھا، ان کے بدن پر لوہے کی کنگھیاں چلائی جاتی تھیں جس سے گوشت پوست علیحدہ ہو جاتا تھا، لیکن یہ آزمائشیں بھی ان کو مذہب سے برگشتہ نہیں کر سکتی تھیں، خدا کی قسم دین اسلام اپنے مرتبۂ کمال کو پہنچکر رہے گا، یہاں تک کہ صنعاء سے حضرموت تک ایک سوار اس طرح بیخطر چلا آئے گا کہ اس کو خدا کے سوا کسی کا ڈر نہ ہوگا"[۱]

مکہ میں رؤسائے قریش جب ہر قسم کی تدبیروں سے تھک گئے تو انھوں نے آپکے سامنے حکومت کے تخت، زر و جواہر کا خزانہ اور حسن کی دولت پیش کی، ان میں سے ہر چیز بہادر سے بہادر انسان قدم کو ڈگمگا دینے کے لیے کافی تھی، لیکن آپنے ذلت کے ساتھ ان کی درخواست کو ٹھکرا دیا اور بالآخر وہ وقت آیا جب آخری ہمدم و دمساز یعنی ابو طالب نے بھی ساتھ چھوڑنا چاہا تو یہ غور و فکر کا آخری لمحہ اور عزم و استقلال کا آخری امتحان تھا، اس وقت آپنے جواب میں جو فقرے فرمائے، عالم کائنات میں ثبات و پامردی کے اظہار کا سب سے آخری طریقۂ تعبیر ہے، آپنے فرمایا "چچا جان! اگر قریش میرے داہنے ہاتھ میں سورج اور بائیں میں چاند رکھدیں تب بھی اپنے اعلان حق سے باز نہ آؤں گا" (ابن ہشام)

غزوۂ بدر میں جب تین سو بے سر و سامان مسلم اور ایک ہزار با ساز و سامان فوج سے معرکہ آرا تھے، کفار قریش اپنے زور و کثرت سے بپھرتے آتے تھے، اس وقت مسلمان سمٹ سمٹ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پہلو میں آجاتے تھے، اور یا ایں ہمہ نبوت کا کوہ وقار اپنی جگہ پر قائم تھا،[۲]

غزوۂ احد میں آپنے صحابہ سے مشورہ کیا، تو سب نے حملہ کی رائے دی، لیکن جب آپ زرہ پہنکر تیار ہو گئے تو صحابہ نے رک جانے کا مشورہ دیا، آپنے فرمایا "پیغمبر زرہ پہنکر اتار نہیں سکتا"[۳]

---

[۱] صحیح بخاری ج ۱ باب مالقی النبیؐ [۲] مسند ابن حنبل ج ۱ ص ۱۲۶ [۳] بخاری ج ۲ ص ۱۰۹ باب قول اللہ وامرہم شوریٰ بینہم

غزوۂ حنین میں جب قبیلہ ہوازن کے قدر اندازوں نے متصل تیروں کی بوچھار کی تو اکثر صحابہ کے قدم اکھڑ گئے، لیکن آپ نہایت سکون و اطمینان سے چند جان نثاروں کے ساتھ میدان میں جمے رہے، اس وقت زبانِ مبارک پر یہ رجز جاری تھا۔

انا النبی لاکذب انا ابن عبد المطلب[1] میں پیغمبر صادق ہوں، میں فرزند عبد المطلب ہوں

ایک بار آپ کسی غزوہ میں درخت کے نیچے آرام فرما رہے تھے، ایک کافر آیا اور اسی حالتِ خواب میں تلوار کھینچکر بولا "محمد اب تم کو مجھ سے کون بچا سکتا ہے"، آپ نے فرمایا "خدا" اس عزم و استقلال اور جرأت صادقہ نے اس کو اسقدر مرعوب کر دیا کہ فوراً اس نے تلوار میان میں کر لی اور پاس بیٹھ گیا۔[2]

شجاعت یہ وصف انسانیت کا اعلیٰ جوہر اور اخلاق کا سنگ بنیاد ہے، عزم، استقلال، حق گوئی، راست گفتاری، پُردلی، یہ تمام باتیں شجاعت ہی سے پیدا ہوتی ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو سیکڑوں مصائب و خطرات اور بیسیوں معرکے اور غزوات پیش آئے لیکن کبھی پامردی اور ثبات کے قدم نے لغزش نہیں کھائی، غزوۂ بدر کی گھمسان لڑائی میں ۳۰۰ نہتے مسلمانوں کے قدم جب ایکہزار مسلح فوج کے حملوں سے ڈگمگا جاتے تھے تو دوڑ کر مرکزِ نبوت ہی کے دامن میں آکر پناہ لیتے تھے، حضرت علیؓ جن کے دستِ بازو نے بڑے بڑے معرکے سر کیے، کہتے ہیں کہ جب بدر میں زور کا رن پڑا تو ہم لوگوں نے آپ ہی کی آڑ میں آکر پناہ لی آپ سب سے زیادہ شجاع تھے مشرکین کی صف سے اس دن آپ سے زیادہ کوئی قریب نہ تھا۔[3]

غزوۂ حنین میں ہوازن کے بے پناہ تیروں کی بارش ہوئی، تو مسلمانوں کی کثیر التعداد فوج دفعۃً میدان سے ہٹ گئی لیکن آپ مع چند جان نثاروں کے بدستور میدان میں کھڑے رہے، اس وقت بار بار

---

[1] صحیح بخاری حنین [2] بخاری ج ۲ ص ۵۹۳ غزوۂ ذات الرقاع [3] مسند ابن حنبل ج ۱ ص ۱۲۶،

آپ اپنے خچر کو ایڑ لگا کر آگے بڑھانے کا قصد فرما رہے تھے، لیکن جان نثار مانع آتے تھے، اب دشمنوں کی تمام فوج کا نشانہ صرف آپ کی ذات تھی، بااینہمہ پائے اقدس میں لغزش نہیں ہوئی، حضرت براءؓ جو اس معرکہ میں شریک تھے، کسی نے ان سے پوچھا کہ کیا حنین میں تم بھاگ کھڑے ہوئے تھے؟ جواب دیا ہاں یہ سچ ہے، لیکن میں گواہی دیتا ہوں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی جگہ سے نہیں ہٹے تھے، خدا کی قسم جب لڑائی پورے زور پر ہوتی تھی تو ہم لوگ آپ ہی کے پہلو میں آکر پناہ لیتے تھے، ہم میں سب سے بڑا بہادر وہ شمار ہوتا تھا، جو آپ کے ساتھ کھڑا ہوتا تھا۔[1]

حضرت انس بن مالکؓ کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سب سے زیادہ شجاع تھے، ایک دفعہ مدینہ میں شور ہوا کہ دشمن آگئے، لوگ مقابلہ کے لیے تیار ہو گئے، لیکن سب سے پہلے جو آگے بڑھ کر نکلا وہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تھے، جلدی میں آپ نے اس کا بھی انتظار نہیں کیا کہ گھوڑے پر زین کسی جائے، گھوڑے کی برہنہ پشت پر سوار ہو کر آپ تمام خطروں کے مقامات میں گشت لگا آئے اور واپس آکر لوگوں کو تسکین دی کہ کوئی خطرہ کی بات نہیں ہے۔[2]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی کسی کو اپنے دست خاص سے قتل نہیں کیا، ابی بن خلف آپ کا سخت دشمن تھا، بدر میں فدیہ دیکر رہا ہوا تو ساتھ ساتھ یہ کہتا گیا کہ "میرے پاس ایک گھوڑا ہے جسکو میں ہر روز جوار کھلایا کرتا ہوں، اسی پر چڑھ کر محمد کو قتل کروں گا"، احد میں اسی گھوڑے کو اڑاتا اور صفوں کو چیرتا ہوا آپ کے پاس پہنچ گیا، مسلمانوں نے چاہا کہ اس کو بیچ میں روک لیں، آپ نے منع فرمایا اور ایک مسلمان

---

[1] صحیح مسلم غزوۂ حنین [2] صحیح بخاری کے متفرق ابواب میں یہ حدیث ہے، مثلاً باب الشجاعۃ فی الحرب و باب اذا فزعوا باللیل

کے ہاتھ سے نیزہ لیکر آپ اس کی طرف بڑھے اور آہستہ سے اس کی گردن میں انی چبھو دی، وہ چنگھاڑ مار کر بھاگا، لوگوں نے کہا یہ تو کوئی بڑا زخم نہیں، تم اس قدر خوف زدہ کیوں ہو؟ اس نے کہا ہاں سچ ہے، لیکن یہ محمدؐ کے ہاتھ کا زخم ہے[1]۔

راست گفتاری

راست گفتاری پیغمبر کی ایک ضروری صفت ہے، اور اس کا وجود ان کی ذات سے کبھی منفک نہیں ہو سکتا، اس بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کے عنوان میں اس کے جزئیات کی تفصیل کی ضرورت نہ تھی، لیکن اس موقع پر ہم صرف اُن شہادتوں کو قلمبند کرنا چاہتے ہیں جو دشمنوں کے اعتراف سے ہاتھ آسکی ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب نبوت کا دعویٰ کیا تو کفار میں جو لوگ آپ سے واقف تھے، انھوں نے آپ کو کاذب اور دروغ گو یقین نہیں کیا، بلکہ یہ سمجھا کہ نعوذ باللہ آپ کے حواس درست نہیں ہیں، یا اب عقل بجا نہیں رہی ہے، یا یہ کہ ان میں اب شاعرانہ تخیل پرستی آگئی ہے، اسی بنا پر انھوں نے آپ کو مجنون کہا، مسحور کہا، شاعر کہا، لیکن کاذب نہیں کہا۔

ایک روز قریش کے بڑے بڑے رؤسا جلسہ جمائے بیٹھے تھے، اور آپ کا ذکر ہو رہا تھا، نضر بن حارث نے جو قریش میں سب سے زیادہ جہاندیدہ تھا، کہا اے قریش! تم پر جو مصیبت آئی ہے، ابتک تم اس کی کوئی تدبیر نہ نکال سکے، محمد تمھارے سامنے بچہ سے جوان ہوا، وہ تم میں سب سے زیادہ پسندیدہ، صادق القول اور امین تھا، اب جب اس کے بالوں میں سپیدی آچلی اور تمھارے سامنے یہ باتیں پیش کیں تو کہتے ہو کہ وہ ساحر ہے، کاہن ہے، شاعر ہے، مجنون ہے، خدا کی قسم میں نے انکی باتیں سنی ہیں

[1] شرح شفا قاضی عیاض ج ۲ ص ۴۲ و بحوالہ بیہقی بسند صحیح و مصنف عبدالرزاق و ابن سعد و واقدی،

محمد میں یہ کوئی بات نہیں، تم پر یہ کوئی مصیبت ہی نئی آئی ہے[1]،

ابوجہل کہا کرتا تھا "محمد! میں تم کو جھوٹا نہیں کہتا، البتہ جو کچھ کہتے ہو، اُن کو صحیح نہیں سمجھتا" قرآن مجید کی یہ آیت اسی موقع پر نازل ہوئی ہے[2]،

قَدْ نَعْلَمُ اِنَّهٗ لَيَحْزُنُكَ الَّذِىْ يَقُوْلُوْنَ	ہم جانتے ہیں کہ اے پیغمبر ان کافروں کی باتیں تم کو
فَاِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُوْنَكَ وَلٰكِنَّ الظّٰلِمِيْنَ	غمگین کرتی ہیں، کیونکہ وہ تجھکو جھٹلاتے نہیں، البتہ یہ
بِاٰيٰتِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ (انعام-۴)	ظالم اللہ کی آیتوں کا انکار کرتے ہیں۔

جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو پیش گاہِ الٰہی سے حکم ہوا کہ اپنے اہلِ خاندان کو اسلام کی دعوت دو، تو آپ نے ایک پہاڑ پر چڑھ کر پکارا "یا معشر قریش!" جب سب لوگ جمع ہو گئے تو فرمایا "اگر میں تم سے یہ کہوں کہ پہاڑ کے عقب سے ایک لشکر آرہا ہے، تو تم کو یقین آئے گا" سب نے کہا ہاں، کیونکہ ہم نے تم کو کبھی جھوٹ بولتے نہیں دیکھا[3]۔

قیصر روم نے دربار میں ابوسفیان سے پوچھا کہ تمھارے ہاں جو مدعی پیدا ہوا ہے اس کی دعویٰ سے پہلے کبھی تم نے اس کو دروغ گو بھی پایا، ابوسفیان نے کہا نہیں، آخر میں قیصر نے جو تقریر کی اس میں کہا میں نے تم سے پوچھا کہ تمھارے نزدیک وہ کبھی کذب کا بھی مرتکب ہوا تو تم نے جواب دیا کہ نہیں، مجھے یقین ہے کہ اگر وہ خدا پر افترا باندھتا تو وہ آدمیوں پر افترا باندھنے سے کب باز رہتا[4]،

ایفاے عہد — ایفاے عہد آپ کی ایک ایسی عام خصوصیت تھی کہ دشمن بھی اس کا اعتراف کرتے تھے چنانچہ قیصر نے اپنے دربار میں آپ کے متعلق ابوسفیان سے جو سوالات کیے، ان میں ایک یہ بھی تھا کہ کیا کبھی

[1] ابن ہشام [2] جامع ترمذی تفسیر انعام [3] صحیح بخاری تفسیر سورۂ تبت [4] صحیح بخاری باب بدء الوحی،

محمد نے بدعہدی بھی کی ہے؟ ابوسفیان کو مجبوراً یہ جواب دینا پڑا کہ نہیں[1]، وحشی جنھوں نے حضرت حمزہؓ کو شہید کیا تھا، اسلام کے ڈر سے شہر بہ شہر پھرا کرتے تھے، اہل طائف نے مدینہ بھیجنے کیلئے جو وفد مرتب کیا، اس میں ان کا نام بھی تھا، لیکن ان کو ڈر تھا کہ کہیں مجھ سے انتقام نہ لیا جائے، لیکن خود دشمنوں نے ان کو یقین دلایا کہ تم بے خوف خطر جاؤ، محمد سفراء کو قتل نہیں کرتے، چنانچہ وہ اس اعتماد پر دربار نبوت میں حاضر ہوئے اور اسلام لائے[2]، صفوان بن امیہ (قبل اسلام) شدید ترین دشمنوں میں تھے، جب مکہ فتح ہوا تو وہ بھاگ کر یمن کے ارادہ سے جدہ چلے گئے، عمیر بن وہب نے حاضر خدمت ہو کر واقعہ عرض کیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عمامہ مبارک عنایت کیا، اور فرمایا کہ یہ صفوان کی امان کی نشانی ہے، عمیر عمامہ مبارک لیکر صفوان کے پاس پہنچے اور کہا، تم کو بھاگنے کی ضرورت نہیں، تمکو امان ہے، جب خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئے تو عرض کی کہ کیا آپ نے مجھے امان دی ہے؟ ارشاد ہوا کہ ہاں، یہ سچ ہے[3]،

ابورافع ایک غلام تھے، حالتِ کفر میں قریش کی طرف سے سفیر بنکر مدینہ منورہ آئے، روے اقدس پر نظر پڑی تو بے اختیار اسلام کی صداقت ان کے دل میں جاگزین ہو گئی، عرض کی یارسول اللہ اب میں کبھی کافروں کے پاس لوٹ کر نہ جاؤں گا، ارشاد ہوا نہ میں عہد شکنی کر سکتا، اور نہ قاصدوں کو اپنے پاس روک سکتا، تم اس وقت واپس جاؤ، اگر وہاں پہنچکر بھی تمھارے دل کی یہی کیفیت باقی رہے تو آجانا، چنانچہ وہ اس وقت واپس گئے، پھر اسلام لائے[4]،

صلح حدیبیہ میں ایک شرط یہ تھی کہ مکہ سے جو مسلمان ہو کر مدینہ جائے گا وہ اہل مکہ کے مطالبہ پر واپس کر دیا جائے گا، عین اس وقت جب معاہدہ کی شرطیں زیر تحریر تھیں، ابوجندلؓ پابزنجیر

---

[1] صحیح بخاری باب بدء الوحی [2] صحیح بخاری غزوۂ احد [3] ابن ہشام [4] ابوداؤد باب الوفاء بالعہد

اہل مکہ کی قید سے بھاگ کر آئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے فریادی ہوئے، تمام مسلمان اس دردانگیز منظر کو دیکھ کر تڑپ اٹھے، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے باطمینان تمام ان کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا اے ابوجندل! صبر کرو، ہم بدعہدی نہیں کر سکتے، اللہ تعالیٰ عنقریب تمہارے لیے کوئی راستہ نکالیگا[۱]

نبوت سے پہلے کا واقعہ ہے کہ عبداللہ بن ابی الحمساء نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ معاملہ کیا اور آپ کو بٹھا کر چلے گئے کہ آکر حساب کر دیتا ہوں، اتفاق سے ان کو خیال نہ رہا، تین دن کے بعد آئے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اسی جگہ تشریف رکھتے تھے، ان کو دیکھکر فرمایا میں تین دن سے یہاں تمہارے انتظار میں بیٹھا ہوں[۲]

غزوۂ بدر میں کافروں کے مقابلہ میں مسلمانوں کی تعداد ایک ثلث سے بھی کم تھی، ایسے موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قدرتی خواہش یہ ہونی چاہیے تھی کہ جسقدر آدمی بڑھ سکیں بہتر ہے لیکن آپ اسوقت بھی ہمہ تن وفا تھے، حذیفہ بن الیمان اور ابوحسل دو صحابی مکہ سے آرہے تھے، راہ میں کفار نے انکو روکا کہ محمد کے پاس جارہے ہو، انھوں نے انکار کیا آخر اس شرط پر ان کو رہائی ملی کہ وہ جنگ میں آپکا ساتھ نہ دیں گے، یہ دونوں صاحب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے تو صورتِ حال عرض کی، فرمایا، تم دونوں واپس جاؤ ہم ہر حال میں وعدہ وفا کریں گے ہم کو صرف خدا کی مدد درکار ہے[۳]

زہد و قناعت مصنفین یورپ کا عام خیال ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب تک مکہ میں تھے، پیغمبر تھے، مدینہ پہنچکر پیغمبر سے بادشاہ بن گئے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ آپ تمام عرب کے زیر نگیں ہو جانے پر بھی فاقہ کش رہے، صحیح بخاری باب الجہاد میں روایت ہے کہ وفات کے وقت آپ کی زرہ ایک یہودی کے یہاں

[۱] صحیح بخاری کتاب الشروط آخری فقرے ابن ہشام میں ہیں [۲] ابوداؤد کتاب الادب [۳] صحیح مسلم باب الوفا بالعہد جلد ۲ صفحہ ۶۹

تین صاع جو پر گرو تھی، جن کپڑوں میں آپ نے وفات پائی ان میں اوپر تلے پیوند لگے ہوئے تھے، یہ وہ زمانہ ہے جب تمام عرب حدود شام سے لیکر عدن تک فتح ہو چکا ہے اور مدینہ کی سرزمین میں زر و سیم کا سیلاب آچکا ہے۔

اس میں شبہہ نہیں کہ آپ کی مہات فرائض میں رہبانیت کا قلع قمع کرنا بھی تھا، جسکی نسبت خدا نے نصاریٰ کو ملامت کی تھی کہ رھبانیۃ ابتدعوھا اس بنا پر آپ نے کبھی کبھی اچھے کھانے اور اچھے کپڑے بھی استعمال کیے ہیں، لیکن اصلی میلانِ طبع زخارفِ دنیوی سے اجتناب تھا فرمایا کرتے، فرزند آدم کو ان چند چیزوں کے سوا اور کسی چیز کا حق نہیں، رہنے کے لیے گھر، ستر پوشی کے لیے ایک کپڑا اور شکم سیری کے لیے روکھی سوکھی روٹی اور پانی[1]، حضرت عائشہ رض فرماتی ہیں، ولا یطوی لہ ثوب[2]، کبھی آپ کا کوئی کپڑا تہ کرکے نہیں رکھا گیا، یعنی صرف ایک جوڑا کپڑا ہوتا تھا دوسرا نہیں ہوتا تھا جو تہ کرکے رکھا جا سکتا۔

ایک دفعہ حضرت عبداللہ بن عمر رض گھر کی دیوار کی مرمت کر رہے تھے، اتفاقاً آپ کسی طرف سے آگئے، پوچھا کیا شغل ہے، عبداللہ بن عمر رض نے عرض کی دیوار کی مرمت کر رہا ہوں، ارشاد ہوا کہ اتنی مہلت کہاں[3]۔

گھر میں اکثر فاقہ رہتا تھا اور رات کو تو اکثر آپ اور سارا گھر بھوکا سو رہتا تھا،

کان رسول اللہ یبیت اللیالی المتتابعۃ طاویا ھو واھلہ لا یجدون عشاء[4]	آپ اور آپ کے اہل و عیال متصل کئی کئی رات بھوکے رہجاتے تھے کیونکہ رات کا کھانا میسر نہیں ہوتا تھا۔

پیہم دو دو مہینے تک گھر میں آگ نہیں جلتی تھی، حضرت عائشہ رض نے ایک موقع پر جب یہ واقعہ

---

[1] جامع ترمذی ابواب الزہد [2] ابن ماجہ کتاب اللباس [3] جامع ترمذی معیشۃ النبی

بیان کیا تو عروہ بن زبیر نے پوچھا کہ آخر گذارا کس چیز پر تھا؟ بولیں کہ پانی اور کھجور، البتہ ہمسائے کبھی کبھی بکری کا دودھ بھیجدیتے تھے تو پی لیتے تھے[1]، آپ نے تمام عمر کبھی چپاتی کی صورت نہیں دیکھی[2]، میدہ جسکو عرب میں حواری اور نقی کہتے ہیں، کبھی نظر سے نہیں گذرا، سہل بن سعد جو اس واقعہ کے راوی ہیں، ان سے لوگوں نے پوچھا کہ کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں چھلنیاں نہ تھیں؟ بولے نہیں، لوگوں نے پھر پوچھا کہ آخر کس چیز سے آٹا چھانتے تھے، بولے منہ سے پھونک کر بھوسی اڑا دیتے تھے، جو رہ جاتا اسی کو گوندھ کر پکا لیتے[3]۔

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ تمام عمر یعنی مدینہ کے قیام سے وفات تک آپ نے کبھی دو وقت سیر ہو کر روٹی نہیں کھائی[4]۔

فدک اور خیبر وغیرہ کے ذکر میں محدثین اور ارباب سیر لکھتے ہیں کہ آپ ان کی آمدنی سے سال بھر کا خرچ لے لیا کرتے تھے، یہ واقعہ بظاہر روایات مذکورۂ بالا کے مخالف معلوم ہوتا ہے، لیکن درحقیقت دونوں صحیح ہیں، بے شبہ آپ بقدر نفقہ آمدنی میں سے لے لیتے، باقی فقراء اور اہل حاجت کو دیتے تھے، لیکن آپ اپنے لیے جو رکھ لیتے تھے، وہ بھی اہلِ حاجت کی نذر ہو جاتا تھا، احادیث میں آپ کی فاقہ کشی اور تنگدستی کے واقعات نہایت کثرت سے موجود ہیں، چند روایتیں اس موقع پر ہم درج کرتے ہیں۔

ایک دفعہ ایک شخص خدمت اقدس میں حاضر ہوا کہ سخت بھوکا ہوں، آپ نے ازواج مطہرات میں سے کسی کے ہاں کہلا بھیجا کہ کچھ کھانے کو بھیجدو، جواب آیا گھر میں پانی کے سوا کچھ نہیں، آپ نے دوسرے گھر کہلا بھیجا، وہاں سے بھی یہی جواب آیا، مختصر یہ کہ آٹھ نو گھروں میں سے کہیں پانی کے سوا کھانے کی کوئی چیز نہ تھی[5]۔

حضرت انسؓ کا بیان ہے کہ ایک دن خدمت اقدس میں حاضر ہوا تو دیکھا کہ آپ نے شکم کو کپڑے

---

[1] صحیح بخاری کتاب الرقاق [2] ایضاً [3] شمائل [4] ایضاً [5] صحیح مسلم ج ۲ ص ۱۹۰ مطبوعہ مصر و صحیح بخاری ص ۵۳۵

سے کسکر باندھا ہے، سبب پوچھا تو حاضرین میں سے ایک صاحب نے کہا کہ بھوک کی وجہ سے[1]،

حضرت ابو طلحہؓ کہتے ہیں کہ ایک دن میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ مسجد میں زمین پر لیٹے ہوئے ہیں اور بھوک کی وجہ سے بار بار کروٹیں بدلتے ہیں[2]،

ایک دفعہ صحابہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں فاقہ کشی کی شکایت کی اور پیٹ کھولکر دکھایا کہ پتھر بندھے تھے، آپ نے شکم کھولا تو ایک کے بجائے دو دو پتھر تھے[3]،

اکثر بھوک کی وجہ سے آواز اسقدر کمزور ہو جاتی تھی کہ صحابہ آپ کی حالت سمجھ جاتے تھے، ایک دن ابو طلحہؓ گھر میں آئے اور بیوی سے کہا کچھ کھانے کو ہے، میں نے ابھی رسول اللہ کو دیکھا انکی آواز کمزور ہو گئی ہے[4]،

ایک دن بھوک میں ٹھیک دوپہر کے وقت گھر سے نکلے، راہ میں حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ ملے، یہ دونوں صاحب بھی بھوک سے بیتاب تھے، آپ سب کو لیکر حضرت ابوایوب انصاریؓ کے گھر آئے ان کا معمول تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے دودھ مہیا رکھتے تھے، آج آپکے آنے میں دیر ہوئی تو انھوں نے بچوں کو کھلادیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اُن کے گھر پہنچے تو وہ نخلستان میں چلے گئے تھے، ان کی بیوی کو خبر ہوئی تو باہر نکل آئیں اور عرض کی "حضورؐ کا آنا مبارک" آپنے پوچھا ابوایوب کہاں ہیں، نخلستان پاس ہی تھا، وہ آواز سنکر دوڑے آئے اور مرحبا کہکر عرض کی، یہ حضور کے آنے کا وقت نہیں، آپنے حالت بیان کی، وہ نخلستان میں جاکر کھجوروں کا ایک خوشہ توڑلائے اور کہا میں گوشت طیار کراتا ہوں، ایک بکری ذبح کی، آدھے کا سالن، آدھے کے کباب تیار کرائے، کھانا سامنے لاکر رکھا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک روٹی پر تھوڑا سا گوشت رکھکر فرمایا کہ فاطمہؓ کو بھجوا دو، کئی دن سے اس کو کھانا نصیب نہیں ہوا ہے، پھر خود صحابہ کے ساتھ مل کر

---

[1] صحیح مسلم ص ۱۹۳ [2] ایضاً [3] ایضاً [4] ایضاً ص ۱۹۱

کھانا نوش فرمایا، متعدد قسم کے کھانے دیکھکر آنکھوں میں آنسو بھر آئے، اور فرمایا کہ "خدانے جو کہا ہے کہ قیامت میں نعیم سے سوال ہوگا وہ یہی چیزیں ہیں"[1]

اکثر ایسا ہوتا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صبح کو ازواج مطہرات کے پاس تشریف لاتے اور پوچھتے کہ آج کچھ کھانے کو ہے؟ عرض کرتیں نہیں، آپ فرماتے کہ اچھا میں نے روزہ رکھ لیا،[2]

عفو و حلم

ارباب سیر نے تصریح کی ہے اور تمام واقعات شاہد ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی کسی سے انتقام نہیں لیا، صحیحین میں حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی کسی سے اپنے ذاتی معاملہ میں انتقام نہیں لیا، بجز اس صورت کے کہ اس نے احکام الہی کی تفضیح کی ہو،[3]

(جنگِ احد کی شکست سے زیادہ رؤسائے طائف کے تحقیر آمیز برتاؤ کی یاد خاطر اقدس پر گراں تھی[4]) تاہم دس برس کے بعد غزوۂ طائف میں جب وہ ایک منجنیق سے مسلمانوں پر پتھر برسائے تھے، تو دوسری طرف ایک سراپائے حلم و عفو انسان (خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم) یہ دعا مانگ رہا تھا کہ خدایا انھیں سمجھ عطا کر اور ان کو آستانۂ اسلام پر جھکا، چنانچہ ایسا ہی ہوا، ۹ھ میں جب ان کے وفد نے مدینہ کا رخ کیا تو آپ نے صحن مسجد میں ان کو مہمان اتارا اور عزت اور حرمت کے ساتھ ان سے پیش آئے۔[5]

قریش نے آپ کو گالیاں دیں، مارنے کی دھمکی دی، راستوں میں کانٹے بچھائے، جسم اطہر پر نجاستیں ڈالیں، گلے میں پھندا ڈال کر کھینچا، آپ کی شان میں گستاخیاں کیں، نعوذ باللہ کبھی جادوگر، کبھی پاگل،

---

[1] ترغیب و ترہیب ج ۲ ص ۵، (یہ واقعہ صحیح مسلم ج ۲ ص ۱۵۰ میں بھی جزئی اختلافات کے ساتھ موجود ہے)

[2] مسند ابن حنبل ج ۲ ص ۴۹ [3] صحیح بخاری ج ۴ ص ۱۰۲ و کتاب الادب [4] صحیح بخاری بدء الخلق [5] ابوداؤد ذکر طائف و مسند ابن حنبل ج ۴ ص ۲۱۸

کبھی شاعر کہا، لیکن آپ نے کبھی ان باتوں پر برہمی ظاہر نہیں فرمائی، غریب سے غریب آدمی بھی جب کسی مجمع میں جھٹلایا جاتا ہے تو وہ غصہ سے کانپ اٹھتا ہے، ایک صاحب جنھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ذی المجاز کے بازار میں اسلام کی دعوت دیتے ہوئے دیکھا تھا، بیان کرتے ہیں کہ حضور فرما رہے تھے کہ "لوگو لا الٰہ الا اللہ کہو تو نجات پاؤ گے۔" پیچھے پیچھے ابوجہل تھا، وہ آپ پر خاک اڑا اڑا کر کہہ رہا تھا، لوگو! اس شخص کی باتیں تم کو اپنے مذہب سے برگشتہ نہ کردیں، یہ یہ چاہتا ہے کہ تم اپنے دیوتاؤں لات و عزیٰ کو چھوڑ دو۔" راوی کہتا ہے کہ آپ اس حالت میں اس کی طرف مڑ کر دیکھتے بھی نہ تھے۔ (مسند احمد جلد ۴ ص ۶۳)

سب سے بڑھ کر طیش اور غضب کا موقع افک کا واقعہ تھا، جبکہ منافقین نے حضرت عائشہؓ صدیقہ کو نعوذ باللہ تہمت لگائی تھی، حضرت عائشہؓ آپ کی محبوب ترین ازواج اور ابوبکرؓ جیسے یارِ غار اور افضل الصحابہ کی صاحبزادی تھیں، شہر منافقوں سے بھرا پڑا تھا، جنھوں نے دم بھر میں اس خبر کو اس طرح پھیلا دیا کہ سارا مدینہ گونج اٹھا، دشمنوں کی شماتت، ناموس کی بدنامی، محبوب کی تفضیح، یہ باتیں انسانی صبر و تحمل کے پیمانہ میں نہیں سما سکتیں، تاہم رحمتِ عالمؐ نے ان سب باتوں کے ساتھ کیا کیا؟ تہمت کا تمامتر بانی رئیس المنافقین عبداللہ بن ابی تھا، اور آپ کو اس کا بخوبی علم تھا، بایں ہمہ آپ نے صرف اس قدر کیا کہ مجمعِ عام میں منبر پر کھڑے ہو کر فرمایا "مسلمانو! جو شخص میرے ناموس کے متعلق مجھ کو ستاتا ہے، اس سے میری داد کون لے سکتا ہے"، حضرت سعدؓ بن معاذ غصہ سے بیتاب ہو گئے اور اٹھ کر کہا میں اس خدمت کے لیے حاضر ہوں، آپ نام بتائیں تو اس کا سر اڑا دوں، سعدؓ بن عبادہ نے جو عبداللہ ابن ابی کے حلیف تھے، مخالفت کی اور اس پر دونوں طرف کے حامی کھڑے ہو گئے، قریب تھا کہ تلواریں کھنچ جائیں، آپ نے دونوں کو ٹھنڈا کیا، واقعہ کی تکذیب خود خدا نے کر دی اور تہمت لگانے والوں کو

شرعی سزا دی گئی، تاہم عبد اللہ بن ابی اس بنا پر چھوڑ دیا گیا کہ اس کو تہمت لگانے کا اقرار نہ تھا، اور ثبوت کے لیے شرعی شہادت موجود نہ تھی، تہمت لگانے والوں میں جن کو سزا دی گئی، ایک صاحب مسطح بن اثاثہ تھے، انکی معاش کے کفیل حضرت ابوبکرؓ تھے، تہمت لگانے کے جرم میں حضرت ابوبکرؓ نے انکا روزینہ بند کر دیا، اس پر یہ آیت اتری:

وَلَا يَأْتَلِ أُولُو الْفَضْلِ مِنْكُمْ وَالسَّعَةِ أَنْ	تم میں سے جو لوگ صاحب فضیلت اور ذی مقدرت ہیں انکو
يُؤْتُوا أُولِي الْقُرْبَىٰ وَالْمَسَاكِينَ وَالْمُهَاجِرِينَ	یہ قسم نہیں کھانا چاہیے کہ قرابتداروں اور مسکینوں اور مجاہدوں
فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَلْيَعْفُوا وَلْيَصْفَحُوا أَلَا تُحِبُّونَ	سے سلوک نہ کرینگے تم کو عفو اور درگذر سے کام لینا چاہیے'
أَنْ يَغْفِرَ اللَّهُ لَكُمْ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ (نور)	کیا تم نہیں چاہتے کہ خدا تمکو بخشدے، خدا غفور رحیم ہے،

اور حضرت ابوبکرؓ نے ان کا روزینہ بدستور جاری کر دیا۔

تہمت لگانے والوں میں (جیسا کہ صحیح ترمذی کتاب التفسیر سورہ نور میں تصریح ہے) حضرت حسانؓ بھی تھے حضرت عائشہؓ کو ان سے جو رنج تھا وہ عفو کی حد سے متجاوز تھا، لیکن یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فیض صحبت کا اثر تھا کہ جب عروہ بن زبیر نے حضرت عائشہؓ کے سامنے حضرت حسانؓ کو برا کہنا شروع کیا تو حضرت عائشہؓ نے روک دیا کہ یہ (حسانؓ) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے کفار کو جواب دیتے تھے،[1]

مدینہ کے منافق یہودیوں میں سے لبید بن اعصم نے آپ پر سحر کیا تاہم آپ نے کچھ تعرض نہ فرمایا (حضرت عائشہؓ نے مزید تحقیق کی تحریک کی تو فرمایا میں لوگوں میں شورش نہیں پیدا کرانا چاہتا)[2]

زید بن سعنہ جس زمانہ میں یہودی تھے، لین دین کا کاروبار کرتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے کچھ قرض لیا، میعاد ادا میں ابھی کچھ دن باقی تھے، تقاضے کو آئے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی

---

[1] صحیح بخاری قصۂ افک [2] صحیح بخاری ص ۸۹۰

چادر پکڑ کر کھینچی اور سخت سست کہکر کہا۔"عبد المطلب کے خاندان والو! تم ہمیشہ یونہی حیلے حوالے کیا کرتے ہو۔"
حضرت عمرؓ غصہ سے بیتاب ہو گئے، اس کی طرف مخاطب ہو کر کہا "او دشمنِ خدا تو رسول اللہ کی شان میں گستاخی کرتا ہے۔" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مسکرا کر فرمایا "عمر! تم سے کچھ اور امید تھی، اس کو سمجھانا چاہئے تھا کہ نرمی سے تقاضا کرے، اور مجھ سے یہ کہنا چاہیے تھا کہ میں اس کا قرض ادا کر دوں۔" یہ فرما کر حضرت عمرؓ کو ارشاد فرمایا کہ قرض ادا کر کے بیس صاع کھجور کے اور زیادہ دیدو۔[۱]

(ایک دفعہ آپ کے پاس صرف ایک جوڑا کپڑا رہ گیا تھا، اور وہ بھی موٹا اور گندہ تھا، پسینہ آتا تو اور بھی بوجھل ہو جاتا، اتفاق سے ایک یہودی کے یہاں شام سے کپڑے آئے، حضرت عائشہؓ نے عرض کی کہ ایک جوڑا اس سے قرض منگوا لیجئے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہودی کے پاس آدمی بھیجا، اس گستاخ نے کہا میں سمجھا مطلب یہ ہے کہ میرا مال یونہی اڑا لیں اور دام نہ دیں۔" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ناگوار جملے سنکر صرف اسقدر فرمایا کہ "وہ خوب جانتا ہے کہ میں سب سے زیادہ محتاط اور سب سے زیادہ امانت کا ادا کرنے والا ہوں۔[۲])

ایک دفعہ کہیں تشریف لیجا رہے تھے، ایک عورت قبر کے پاس بیٹھی رو رہی تھی، آپ رک گئے اور اس سے مخاطب ہو کر فرمایا "صبر کرو"، وہ آپ کو پہچانتی نہ تھی گستاخی کے ساتھ بولی، ہٹو تم کیا جان سکتے ہو کہ مجھ پر کیا کیفیت ہے، آپ چلے آئے، لوگوں نے عورت سے کہا تو نے نہیں پہچانا، وہ رسول اللہ تھے، دوڑی ہوئی آئی اور کہا میں حضور کو پہچانتی نہ تھی، ارشاد فرمایا، صبر وہی معتبر ہے جو عین مصیبت کے وقت کیا جائے۔[۳]

ایک دفعہ حضرت سعد بن عبادہ بیمار ہوئے، آپ عیادت کو سواری پر تشریف لے گئے، راہ میں ایک

---

[۱] یہ روایت بیہقی، ابن حبان، طبرانی اور ابو نعیم نے روایت کی ہے، اور سیوطی نے کہا ہے کہ اس کی سند صحیح ہے (شرح شفا از شہاب خفاجی) [۲] جامع ترمذی کتاب البیوع [۳] بخاری کتاب الجنائز۔

جلسہ تھا، آپ ٹھہر گئے، عبداللہ بن ابی جو رئیس المنافقین تھا، وہ بھی جلسہ میں موجود تھا، آپ کی سواری کی گرد اڑی تو اس نے چادر ناک پر رکھ لی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا دیکھو گرد نہ اڑاؤ (جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قریب پہنچے تو اس نے کہا "محمد اپنا گدھا ہٹاؤ، تمھارے گدھے کی بو نے میرا دماغ پریشان کردیا" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سلام کیا، پھر سواری سے اترے اور اسلام کی دعوت دی، عبداللہ بن ابی نے کہا "ہمارے گھر آکر ہم کو نہ ستاؤ، جو شخص خود تمھارے پاس جائے اس کو تعلیم دو" عبداللہ بن رواحہؓ جو مشہور شاعر تھے انھوں نے کہا، آپ ضرور تشریف لائیں، بات بڑھتے بڑھتے یہاں تک پہنچی کہ قریب تھا کہ تلواریں نکل آئیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں فریق کو سمجھا بجھا کر ٹھنڈا کیا) جلسہ سے اٹھ کر آپ سعد بن عبادہؓ کے پاس آئے اور ان سے کہا تم نے عبداللہ کی باتیں سنیں، سعدؓ بن عبادہ نے عرض کی کہ آپ کچھ خیال نہ فرمائیں، یہ وہ شخص ہے کہ آپ کی تشریف آوری سے پہلے اہل مدینہ نے اس کے لیے ریاست کا تاج تیار کرلیا تھا۔[1]

غزوۂ حنین میں آپ نے مال غنیمت تقسیم فرمایا تو ایک انصاری نے کہا "یہ تقسیم خدا کی رضامندی کے لیے نہیں ہے۔" آپ نے سنا تو فرمایا "خدا موسیٰ پر رحم کرے، ان کو لوگوں نے اس سے بھی زیادہ ستایا تھا۔"[2]

ایک دفعہ ایک بدو خدمت اقدس میں آیا، آپ مسجد میں تشریف رکھتے تھے، اس کو پیشاب کی حاجت معلوم ہوئی، آداب مسجد سے واقف نہ تھا، وہیں کھڑے ہو کر پیشاب کرنے لگا، لوگ ہر طرف سے دوڑ پڑے کہ اس کو سزا دیں، آپ نے فرمایا "جانے دو، اور پانی کا ایک ڈول لاکر بہا دو، خدا نے تم لوگوں کو دشواری کے لیے نہیں، بلکہ آسانی کے لیے بھیجا ہے۔"[3]

حضرت انسؓ جو خادم خاص تھے، ان کا بیان ہے کہ ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ کو کسی کام کے لیے

---

[1] صحیح بخاری جلد ۲ ص ۹۲۴ [2] ایضاً غزوۂ حنین ص ۶۲۱ [3] ایضاً ص ۳۵

بھیجنا چاہا میں نے کہا نہ جاؤں گا، آپ چپ رہ گئے ہیں یہ کہکر باہر چلا گیا، دفعۃً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پیچھے سے آکر میری گردن پکڑ لی، میں نے مڑ کر دیکھا تو آپ ہنس رہے ہیں، پھر پیار سے فرمایا "انیس! جس کام کے لیے کہا تھا اب تو جاؤ"۔ میں نے عرض کی اچھا جاتا ہوں، انسؓ نے اسی واقعہ کے ساتھ بیان کیا کہ میں نے سات برس آپ کی ملازمت کی، کبھی یہ نہ فرمایا کہ تم نے یہ کام کیوں کیا، یا یہ کیوں نہیں کیا۔[1]

حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ آپ کی عادت تھی کہ ہم لوگوں کے ساتھ مسجد میں بیٹھ جاتے اور باتیں کرتے، جب اٹھ کر گھر میں جاتے تو ہم لوگ بھی چلے جاتے، ایک دن حسب معمول مسجد سے نکلے، ایک بدو آیا اور اس نے آپ کی چادر اس زور سے پکڑ کر کھینچی کہ آپ کی گردن سرخ ہو گئی، آپ نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا، بولا کہ میرے اونٹوں کو غلہ سے لاد دے، تیرے پاس جو مال ہے وہ نہ تیرا ہے نہ تیرے باپ کا ہے، آپ نے فرمایا پہلے میری گردن کا بدلہ دو، تب غلہ دیا جائے گا، وہ بار بار کہتا تھا کہ خدا کی قسم میں ہرگز بدلہ نہ دوں گا، آپ نے اس کے اونٹوں پر جو اور کھجوریں لدوا دیں[2] اور کچھ تعرض نہ فرمایا۔

(قریش نعوذ باللہ) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو گالیاں دیتے تھے، برا بھلا کہتے تھے، ضد سے آپ کو محمدؐ (تعریف کیا گیا) نہیں کہتے تھے، بلکہ مذمم (مذمت کیا گیا) کہتے تھے لیکن آپ اس کے جواب میں اپنے دوستوں کو خطاب کر کے صرف اسی قدر فرمایا کرتے کہ تمھیں تعجب نہیں آتا کہ اللہ تعالیٰ قریش کی گالیوں کو مجھ سے کیونکر پھیرتا ہے، وہ مذمم کو گالیاں دیتے ہیں اور مذمم پر لعنت بھیجتے ہیں اور میں محمدؐ ہوں۔"[3]

جس زمانہ میں آپ فتح مکہ کے لیے تیاریاں کر رہے تھے، اس بات کی خاص احتیاط فرما رہے تھے کہ قریش کو ہمارے ارادوں کی خبر نہ ہو، حاطب بن بلتعہؓ ایک صحابی تھے، انھوں نے چاہا کہ قریش کو

[1] صحیح مسلم و ابو داؤد کتاب الادب [2] ابو داؤد کتاب الادب (یہی واقعہ حضرت انسؓ سے بخاری و مسلم میں مروی ہے بتغیر یسیر) [3] مشکوٰۃ باب اسماء النبیؐ

اس کی اطلاع کردیں، چنانچہ ایک خط لکھ کر انھوں نے چپکے سے ایک عورت کی معرفت مکہ روانہ کیا، آپ کو اس کی خبر ہوگئی، حضرت علیؓ اور حضرت زبیرؓ اسی وقت بھیجے گئے، جو قاصد کو مع خط کے گرفتار کر لائے، حاطب کو بلا کر دریافت کیا تو انھوں نے صاف صاف اپنے قصور کا اعتراف کیا اور معذرت چاہی، یہ موقع تھا کہ ہر سیاست داں مجرم کی سزا کا فتویٰ دیتا، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس لیے ان کو معاف فرمایا کہ وہ شرکائے بدر میں تھے، عورت جو اس جرم میں شریک تھی، اس سے بھی کسی قسم کا تعرض نہیں فرمایا[۱]، حالانکہ یہ خط اگر دشمنوں تک پہنچ جاتا تو مسلمانوں کو سخت خطرات کا سامنا ہو جاتا،

فرات بن حیان ایک شخص تھا، ابوسفیان کی طرف سے مسلمانوں کی جاسوسی پر مامور تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجو میں اشعار کہا کرتا تھا، ایک دفعہ وہ پکڑا گیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے قتل کا حکم دیا، لوگ اس کو پکڑ کر لے چلے، جب انصار کے ایک محلہ میں پہنچا تو بولا کہ میں مسلمان ہوں، ایک انصاری نے آکر اطلاع دی کہ وہ کہتا ہے کہ میں مسلمان ہوں، آپ نے فرمایا کہ تم میں کچھ لوگ ایسے ہیں جن کے ایمان کا حال ہم ان ہی پر چھوڑتے ہیں، ان میں سے ایک فرات بن حیان ہے[۲]، مورخین نے لکھا ہے کہ وہ بعد کو صدق دل سے مسلمان ہو گئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو یمامہ میں ایک زمین عنایت فرمائی جس کی آمدنی ۲۰۰۰ ہزار تھی[۳])

دشمنوں سے عفو و درگذر اور حسن سلوک (انسان کے ذخیرۂ اخلاق میں سب سے زیادہ کمیاب، نادر الوجود چیز دشمنوں پر رحم اور ان سے عفو و درگذر ہے، لیکن حاملِ وحی و نبوت کی ذاتِ اقدس میں یہ جنس فراوان تھی، دشمن سے انتقام لینا انسان کا قانونی فرض ہے لیکن اخلاق کے دائرہ شریعت میں آکر یہ فرضیت کمردہ تحریمی

[۱] صحیح بخاری فتح مکہ [۲] ابوداؤد کتاب الجہاد باب الجاسوس الذمی، یہ حدیث سفیان ثوری کے واسطہ سے دو طریقوں سے مروی ہے، ایک میں ابوہمام الدلائل ہے اور یہی ابوداؤد کا طریق ہے، یہ طریق ضعیف ہے، دوسرا طریق بشر بن سری البصری کے ذریعہ سے ہے جو صحیح ہے، امام احمد نے بھی مسند میں یہ روایت نقل کی ہے [۳] اصابہ ترجمہ فرات مذکور،

بنجاتی ہے، تمام روایتیں اس بات پر متفق ہیں کہ آپ نے کبھی کسی سے انتقام نہیں لیا،

دشمنوں سے انتقام کا سب سے بڑا موقع فتح حرم کا دن تھا، جبکہ وہ کینہ خواہ سامنے آئے، جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خون کے پیاسے تھے، اور جن کے دستِ ستم سے آپ نے طرح طرح کی اذیتیں اٹھائی تھیں، لیکن ان سب کو یہ کہکر چھوڑ دیا

لا تثریب علیکم الیوم اذھبوا فانتم الطلقاء — تم پر کوئی ملامت نہیں جاؤ تم سب آزاد ہو۔

وحشی جو اسلام کے قوت بازو اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عزیز ترین چچا حضرت حمزہؓ کا قاتل تھا، مکہ میں رہتا تھا، جب مکہ میں اسلام کی قوت نے ظہور کیا، وہ بھاگ کر طائف آیا، طائف نے بھی آخر سر اطاعت خم کیا، اور وحشی کے لیے یہ بھی مامن نہ رہا، لیکن اس نے سنا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سفراء سے کبھی سختی کے ساتھ پیش نہیں آتے، ناچار خود رحمت عالمؐ کے دامن میں پناہ لی، اور اسلام قبول کیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف اسقدر فرمایا کہ "میرے سامنے نہ آیا کرنا کہ تم کو دیکھ کر مجھے چچا کی یاد آتی ہے"[1]۔

ہند **ابوسفیان** کی بیوی جس نے حضرت حمزہؓ کا سینہ چاک کیا اور دل و جگر کے ٹکڑے کیے، فتح مکہ کے دن نقاب پوش آئی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پہچان نہ سکیں اور بیخبری میں بیعت اسلام کر کے سند امان حاصل کر لے، پھر اس موقع پر بھی گستاخی سے باز نہ آئی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہند کو پہچان لیا، لیکن اس واقعہ کا ذکر تک نہ فرمایا، ہند اس کرشمۂ اعجاز سے متاثر ہو کر بے اختیار بول اٹھی، "یا رسول اللہ! آپ کے خیمہ سے مبغوض تر خیمہ کوئی میری نگاہ میں نہ تھا، لیکن آج آپ کے خیمہ سے کوئی زیادہ محبوب خیمہ میری نگاہ میں دوسرا نہیں"[2]۔

عکرمہ دشمنِ اسلام ابوجہل کے فرزند تھے، اور اسلام سے پہلے باپ کی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے

---

[1] صحیح بخاری قتل حمزہ [2] صحیح بخاری ذکر ہند

سخت ترین دشمن تھے، فتح مکہ کے وقت مکہ سے بھاگ کر یمن چلے گئے، ان کی بیوی مسلمان ہو چکی تھیں، وہ یمن گئیں اور عکرمہ کو تسکین دی اور ان کو مسلمان کیا اور خدمت اقدس میں لیکر حاضر ہوئیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب ان کو دیکھا تو فرطِ مسرت سے فوراً اٹھ کھڑے ہوئے اور اس تیزی سے انکی طرف بڑھے کہ جسم مبارک پر چادر تک نہ تھی اور زبانِ مبارک پر یہ الفاظ تھے،

مرحبا بالراکب المہاجر[۲] اے ہجرت کرنے والے سوار تمھارا آنا مبارک ہو،

(صفوان بن امیہ، قریش کے رؤسائے کفر میں سے اور اسلام کے شدید ترین دشمن تھے، ان ہی نے عمیر بن وہب کو انعام کے وعدہ پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل پر مامور کیا تھا، جب مکہ فتح ہوا تو اسلام کے ڈر سے جدہ بھاگ گئے، اور قصد کیا کہ سمندر کے راستہ سے یمن چلے جائیں، عمیر بن وہب نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کی کہ یا رسول اللہ! صفوان ابن امیہ اپنے قبیلے کے رئیس ہیں، وہ ڈر سے بھاگ گئے ہیں کہ اپنے کو سمندر میں ڈالدیں، ارشاد ہوا کہ اسکو امان ہے کہ عرض کی یا رسول اللہ! امان کی کوئی نشانی مرحمت فرمایئے جس کو دیکھکر انکو میرا اعتبار آئے، آپ نے عمامۂ مبارک انکو عنایت فرمایا، جسکو لیکر وہ صفوان کے پاس پہنچے، صفوان نے کہا مجھے وہاں جانے میں اپنی جان کا ڈر ہے عمیر نے جواب دیا، "صفوان! ابھی تمھیں محمدؐ کے حلم و عفو کا حال معلوم نہیں"، یہ سنکر وہ عمیر کے ساتھ دربار نبوی میں حاضر ہوئے اور سب سے پہلا سوال یہ کیا کہ عمیر کہتے ہیں کہ تم نے مجھے امان دیا ہے، فرمایا "سچ ہے"، صفوان نے کہا "تو مجھے دو مہینے کی مہلت دو"، ارشاد ہوا کہ "دو نہیں تم کو چار مہینے کی مہلت دیجاتی ہے"،

اس کے بعد وہ اپنی خوشی سے مسلمان ہو گئے، یہ واقعہ بہ تفصیل ابن ہشام میں مذکور ہے،

---

[۱] موطا امام مالک کتاب النکاح [۲] مشکوٰۃ کتاب الادب بحوالہ ترمذی،

ہبار بن الاسود وہ شخص تھا جس کے ہاتھ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی زینبؓ کو سخت تکلیف پہنچی تھی، حضرت زینبؓ حاملہ تھیں اور مکہ سے مدینہ ہجرت کر رہی تھیں، کفار نے مزاحمت کی، ہبار بن الاسود نے جان بوجھ کر ان کو اونٹ سے گرا دیا، جس سے ان کو سخت چوٹ آئی اور حمل ساقط ہو گیا، اس کے علاوہ اور بھی بعض جرائم کا وہ مرتکب ہوا تھا اور اسی بنا پر فتح مکہ کے وقت ہبار اشتہاریانِ قتل میں داخل تھا، چاہا کہ بھاگ کر ایران چلا جائے کہ داعیِ ہدایت نے خود آستانۂ نبوت کی طرف جھکا دیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کی یا رسول اللہ میں بھاگ کر ایران چلا جانا چاہتا تھا لیکن پھر مجھے حضور کے احسانات اور حلم و عفو یاد آئے، میری نسبت آپ کو جو خبریں پہنچی تھیں وہ صحیح تھیں، مجھے اپنی جہالت اور قصور کا اعتراف ہے، اب اسلام سے مشرف ہونے آیا ہوں، دفعۃً بابِ رحمت وا تھا، اور دوست دشمن کی تمیز یکسر مفقود تھی،[1]

ابو سفیان اسلام سے پہلے جیسے کچھ تھے، غزواتِ نبوی کا ایک ایک حرف اس کا شاہد ہے، بدر سے لیکر فتح مکہ تک جتنی لڑائیاں اسلام کو لڑنی پڑیں ان میں سے اکثر میں ان کا ہاتھ تھا لیکن فتح مکہ کے موقع پر جب وہ گرفتار کر کے لائے گئے اور حضرت عباسؓ ان کو لیکر خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئے تو آپ ان کے ساتھ محبت سے پیش آئے، حضرت عمرؓ نے گذشتہ جرائم کی پاداش میں ان کے قتل کا ارادہ کیا، لیکن آپ نے منع فرمایا، اور نہ صرف یہ بلکہ ان کے گھر کو امن و امان کا حرم بنا دیا۔ فرمایا کہ "جو ابوسفیان کے گھر میں داخل ہو جائے گا اس کا قصور معاف ہو گا"[2]۔ کیا دنیا کے کسی فاتح نے اپنے دشمن کے ساتھ یہ برتاؤ کیا ہے؟

---

[1] ابن اسحٰق و اصابہ ذکر ہبار [2] صحیح بخاری و صحیح مسلم فتح مکہ مع فتح الباری

عرب کا ایک ایک قبیلہ اطاعت کیشانہ اسلام کے پرچم کے نیچے جمع ہو رہا تھا، اگر کسی قبیلہ نے آخر تک سرتابی کی تو وہ بنو حنیفہ کا قبیلہ تھا جس میں مسیلمہ نے ادعائے نبوت کیا تھا، ثمامہ ابن آثال اس قبیلہ کے رؤسا میں تھا، اتفاق سے وہ مسلمانوں کے ہاتھ لگ گیا، گرفتار کر کے مدینہ لے آئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ اس کو مسجد کے ستون میں باندھ دیا جائے، اس کے بعد آپ مسجد میں تشریف لائے اور اس سے دریافت کیا کہ کیا کہتے ہو، اس نے کہا "اے محمدؐ! اگر تم مجھے قتل کرو گے تو ایک خونی کو کرو گے، اور اگر احسان کرو گے تو ایک شکر گذار پر احسان ہوگا، اور اگر زر فدیہ چاہتے ہو تو تم مانگو میں دوں گا" یہ جواب سنکر آپ خاموش رہے، دوسرے دن بھی یہی تقریر ہوئی، تیسرے دن بھی جب اس نے یہی جواب دیا تو آپ نے حکم دیا کہ ثمامہ کی رسی کھول دو، اور آزاد کر دو، ثمامہ پر اس خلافِ توقع لطف و عنایت کا یہ اثر ہوا کہ قریب ایک درخت کی آڑ میں جا کر غسل کیا اور مسجد میں واپس آکر کلمہ پڑھا اور مسلمان ہو گیا، اور عرض کی یا رسول اللہ! دنیا میں کوئی شخص میری نظر میں آپ سے زیادہ مبغوض نہ تھا، اور اب آپ سے زیادہ دنیا میں مجھے کوئی محبوب نہیں، کوئی مذہب آپ کے مذہب سے زیادہ میری آنکھوں میں برا نہ تھا اور اب وہی سب سے زیادہ پیارا ہے، کوئی شہر آپ کے شہر سے زیادہ ناپسند نہ تھا، اور اب وہی پسندیدہ ہے۔"

قریش کی ستمگری و جفاگری کی داستان دہرانے کی ضرورت نہیں، یاد ہوگا کہ شعب ابی طالب میں تین برس تک ان ظالموں نے آپ کو اور آپ کے خاندان کو اس طرح محصور کر رکھا تھا کہ غلہ کا ایک دانہ اندر پہنچ نہیں سکتا تھا، بچے بھوک سے روتے اور تڑپتے تھے اور یہ بے درد ان کی آوازیں سنکر ہنستے اور خوش ہوتے تھے لیکن معلوم ہے کہ رحمتِ عالمؐ نے اس کے معاوضہ میں قریش کے ساتھ کیا سلوک کیا؟ مکہ میں غلہ یمامہ سے آتا تھا، یمامہ کے رئیس یہی ثمامہ بن آثال تھے، مسلمان ہو کر جب یہ

مکہ گئے تو قریش نے تبدیل مذہب پر اُن کو طعنہ دیا، انھوں نے غصہ سے کہا کہ "خدا کی قسم اب رسول اللہ ؐ کی اجازت کے بغیر گیہوں کا ایک دانہ نہیں ملے گا"۔ اس بندش سے مکہ میں اناج کا کال پڑ گیا، آخر گھبرا کر قریش نے اس آستانہ کی طرف رجوع کیا جس سے کوئی سائل کبھی محروم نہیں گیا، حضورؐ کو رحم آیا اور کہلا بھیجا کہ بندش اٹھا لو، چنانچہ پھر حسب دستور غلہ جانے لگا[1]

کفار اور مشرکین کے ساتھ برتاؤ کفار کے ساتھ آپ کے حسن خلق کے بہت سے واقعات مذکور ہیں، مورخین یورپ مدعی ہیں کہ یہ اُس وقت تک کے واقعات ہیں جب تک اسلام ضعیف تھا، اور مجاملت اور لطف و آشتی کے سوا چارہ نہ تھا، اس لیے ہم اس عنوان کے نیچے صرف وہ واقعات نقل کریں گے جو اس زمانہ کے ہیں، جبکہ مخالفین کی قوتیں پامال ہو چکی تھیں، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو پورا اقتدار حاصل ہو چکا تھا،

(ابو بصرہ غفاری کا بیان ہے کہ جب وہ کافر تھے، مدینہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آکر مہمان اُترے رات کو گھر کی تمام بکریوں کا دودھ پی گئے، لیکن آپ نے کچھ نہ فرمایا، رات بھر تمام اہل بیت نبوی بھوکا رہا،[2]

اسی طرح ایک اور واقعہ حضرت ابو ہریرہؓ بیان کرتے ہیں، شب کو ایک کافر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مہمان ہوا، آپ نے ایک بکری کا دودھ اس کے سامنے پیش کیا، وہ پی گیا، پھر دوسری بکری دوہی گئی، وہ دودھ بھی بے تامل پی گیا، پھر تیسری، پھر چوتھی، یہاں تک کہ سات بکریاں دوہی گئیں، اور وہ سب دودھ پیتا گیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی تنغص ظاہر نہ فرمایا، شاید اسی حسن اخلاق کا اثر تھا کہ وہ صبح کو مسلمان تھا، اور صرف ایک بکری کے دودھ پر قانع ہو گیا،[3]

---

[1] ثمامہ کا پورا واقعہ صحیح بخاری ص ۶۲۷ (باب وفد بنی حنیفہ میں ہے، آخری ٹکڑا ابن ہشام میں مذکور ہے۔

[2] مسند ابن حنبل ج ۶ ص ۳۹۷ [3] جامع ترمذی باب ان المومن یاکل فی معاء واحدۃ،

حضرت اسماءؓ بیان کرتی ہیں کہ صلح حدیبیہ کے زمانہ میں ان کی ماں جو مشرکہ تھیں، اعانت خواہ مدینہ حضرت اسماءؓ کے پاس آئیں، ان کو خیال ہوا کہ اہل شرک کے ساتھ کیا برتاؤ کیا جائے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آکر دریافت کیا، آپ نے فرمایا "اُن کے ساتھ نیکی کرو"۔[۱] حضرت ابوہریرہؓ کی ماں کافرہ تھیں، اور بیٹے کے ساتھ مدینہ میں رہتی تھیں، جہالت سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو گالیاں دیتی تھیں، ابوہریرہؓ نے خدمتِ اقدس میں عرض کی، آپ نے بجائے غیظ و غضب کے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے۔[۲]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر کا تمام کاروبار حضرت بلالؓ کے سپرد تھا، روپیہ پیسہ جو کچھ آتا تھا انکے پاس رہتا، ناداری کی حالت میں وہ بازار سے سودا سلف قرض لاتے، اور جب کہیں سے کوئی رقم آجاتی تو اس سے ادا کر دیا کرتے، ایک دفعہ بازار جا رہے تھے، ایک مشرک نے دیکھا، ان سے کہا تم قرض لیتے ہو تو مجھ سے لیا کرو، انھوں نے قبول کیا، ایک دن اذان دینے کے لیے کھڑے ہوئے تو وہ مشرک چند سوداگروں کے ساتھ آیا، اور ان سے کہا "او حبشی!" انھوں نے اس بد تہذیبی کے جواب میں "لبیک" کہا، بولا "کچھ خبر ہے؟ وعدہ کے صرف چار دن رہ گئے ہیں، تم نے اس مدت میں قرضہ ادا نہ کیا تو تم سے بکریاں چرواکے چھوڑوں گا"۔ یہ عشا پڑھ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے، اور سارا حال بیان کر کے کہا کہ خزانہ میں کچھ نہیں ہے، کل وہ مشرک آکر مجھکو فضیحت کریگا، اس لیے مجھکو اجازت ہو کہ میں کہیں نکل جاؤں، پھر جب قرضہ ادا کرنے کا سامان ہو جائے گا، تو واپس آجاؤں گا، غرض رات کو جا کر سو رہے، اور سامان سفر یعنی تھیلا، جوتی، ڈھال سر کے نیچے رکھ لی، صبح اٹھکر سفر کا سامان کر رہے تھے کہ ایک شخص دوڑتا ہوا آیا اور کہا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یاد فرمایا ہے، یہ گئے تو دیکھا کہ

---

[۱] صحیح بخاری باب صلۃ الوالد المشرک [۲] صحیح بخاری

چار اونٹ غلہ سے لدے ہوئے دروازے پر کھڑے ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، مبارک ہو، یہ اونٹ رئیس فدک نے بھیجے ہیں، انھوں نے بازار میں جاکر سب چیزیں فروخت کیں، اور مشرک کا قرضہ ادا کر کے مسجد نبوی میں آئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی کہ سارا قرضہ ادا ہو گیا،[1]

یہ واقعہ فدک کی فتح کے بعد کا ہے، جو ہجرت کا ساتواں سال ہے، حضرت بلال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مقرب خاص اور گھر کے منتظم تھے، ایک مشرک ان کو حبشی کہکر پکارتا ہے، اور کہتا ہے کہ تجھ سے بکریاں چروا کے چھوڑ دوں گا، حضرت بلال اسکی تنگ گیری کے ڈر سے بھاگ جانے کا ارادہ کرتے ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یہ باتیں سنتے ہیں، لیکن مشرک کی نسبت ایک لفظ نہیں فرماتے، نہ بلال کی حمایت اور دلدہی کی تدبیر کرتے، اتفاق سے غلہ آجاتا ہے، اور مشرک کا قرضہ ادا کیا جاتا ہے، اور اس کی بدزبانی اور سخت گیری سے در گذر کیا جاتا ہے، یہ حلم، یہ عفو، یہ تحمل رحمتِ عالم کے سوا کس سے ہو سکتا ہے؟

سب سے مشکل معاملہ **منافقین** کا تھا، یہ کفار کا ایک گروہ تھا، جس کا رئیس عبداللہ بن ابی تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب زمانہ میں مدینہ میں تشریف لائے، اس سے کچھ پہلے تمام شہر نے اس پر اتفاق کر لیا تھا کہ وہ مدینہ کا فرمانروا بنا دیا جائے، جنگِ بدر کے بعد اس نے اسلام کا اعلان کیا، لیکن دل سے کافر تھا، اس کے پیرو بھی اسی قسم کا منافقانہ اسلام لائے، اور منافقین کی ایک مستقل جماعت قائم ہو گئی، یہ لوگ در پردہ اسلام کے خلاف ہر قسم کی تدبیریں کرتے تھے، **قریش** اور دیگر مخالف قبائل سے سازش رکھتے، ان کو مسلمانوں کے مخفی رازوں کی خبر دیتے رہتے، بایںہمہ بظاہر اسلام کے مراسم ادا کرتے، جمعہ جماعت میں شریک ہوتے اور لڑائیوں میں ساتھ جاتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کے حالات اور ایک ایک

---

[1] ابوداؤد جلد ۲ باب قبول ہدایا المشرکین۔

کے نام و نشان سے واقف تھے، لیکن چونکہ شریعت اور قانون کے احکام، دلوں کے اسرار سے نہیں، بلکہ ظاہری اعمال سے متعلق ہیں، اس لیے آپ اُن پر کفر کے احکام جاری نہیں فرماتے تھے، یہاں تک تو شریعت اور قانون کا معاملہ تھا، لیکن فیاض دلی اور عفو و حلم کے اقتضا سے آپ ان سے ہمیشہ حسنِ اخلاق کا بھی برتاؤ کرتے تھے،

ایک دفعہ ایک غزوہ میں ایک مہاجر نے ایک انصاری کو تھپڑ مارا، انصاری نے کہا "یا للانصار" (یعنی انصار کی دہائی) مہاجر نے بھی مہاجرین کی دہائی دی، قریب تھا کہ دونوں میں تلوار چل جائے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "یہ کیا جاہلیت کی باتیں ہیں"، دونوں رک گئے، عبداللہ بن ابی نے سنا تو کہا "مدینہ چل کر ذلیل مسلمانوں کو نکال دونگا"۔ ساتھیوں سے کہا آسان بات یہ ہے کہ تم لوگ مہاجرین کی خبر گیری سے ہاتھ اٹھالو، یہ خود تباہ ہو جائینگے"۔ چنانچہ قرآن مجید میں یہ واقعہ مذکور ہے

هُمُ الَّذِينَ يَقُولُونَ لَا تُنْفِقُوا عَلَىٰ مَنْ	یہی لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ پیغمبر کے ساتھیوں پر
عِنْدَ رَسُولِ اللَّهِ حَتَّىٰ يَنْفَضُّوا (منافقون)	خرچ نہ کرو تاکہ وہ منتشر ہو جائیں۔
يَقُولُونَ لَئِنْ رَجَعْنَا إِلَى الْمَدِينَةِ	کہتے ہیں کہ جب ہم مدینہ کو واپس چلیں گے تو معزز
لَيُخْرِجَنَّ الْأَعَزُّ مِنْهَا الْأَذَلَّ (منافقون)	لوگ کمینوں کو مدینہ سے نکال دیں گے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عبداللہ بن ابی کو بلا بھیجا کہ تم نے یہ الفاظ کہے تھے، اس نے صاف انکار کیا حضرت عمرؓ موجود تھے، بولے یا رسول اللہ! اجازت دیجئے کہ اس منافق کی گردن اڑادوں، آپؐ نے فرمایا لوگ چرچا کریں گے کہ محمد اپنے ساتھیوں کو قتل کرتے ہیں۔[1]

---

[1] صحیح بخاری تفسیر سورہ منافقون۔

جنگِ احد میں عبد اللہ بن ابی عین لڑائی کے پیش آنے کے وقت تین سو آدمیوں کے ساتھ واپس چلا آیا، جس سے مسلمانوں کی قوت کو سخت صدمہ پہنچا، تاہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے درگذر فرمایا (اور وہ جب مرا تو اس احسان کے معاوضہ میں کہ . . . حضرت عباسؓ کو اس نے اپنا کرتہ دیا تھا مسلمانوں کی ناراضی کے باوجود آپ نے اپنا قمیص مبارک اس کو پہنا کر دفن کیا[۱])

یہود و نصاریٰ کے ساتھ برتاؤ

خلق عمیم میں کافر و مسلم، دوست و دشمن، عزیز و بیگانہ کی تمیز نہ تھی، ابرِ رحمت دشت و چمن پر یکساں برستا تھا (یہود کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے جس شدت کی عداوت تھی، اسکی شہادت غزوۂ خیبر تک کے ایک ایک واقعہ سے ملتی ہے) لیکن آپ کا طرزِ عمل مدت تک یہ رہا کہ جن امور کی نسبت مستقل حکم نازل نہ ہوتا، آپ ان میں ان ہی کی تقلید فرماتے[۲])

ایک دفعہ ایک یہودی نے برسر بازار کہا "قسم ہے اُس ذات کی جس نے موسیٰ کو تمام انبیاء پر فضیلت دی" ایک صحابیؓ کھڑے سن رہے تھے، ان سے رہا نہ گیا، انھوں نے پوچھا کیا محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی؟" اس نے کہا "ہاں" انھوں نے غصہ میں ایک تھپڑ اس کے مار دیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عدل اور اخلاق پر دشمنوں کو بھی اس درجہ اعتبار تھا کہ وہ یہودی سیدھا آپ کی خدمت میں حاضر ہوا، اور واقعہ عرض کیا، آپ نے ان صحابی پر برہمی ظاہر فرمائی[۳]

ایک یہودی کا لڑکا بیمار ہوا تو آپ اس کی عیادت کو تشریف لے گئے اور اس کو اسلام کی دعوت دی، اس نے اپنے باپ کی طرف دیکھا، گویا باپ کی رضامندی دریافت کی، اس نے کہا کہ "آپ جو فرماتے ہیں اس کو بجا لاؤ" چنانچہ اس نے کلمہ پڑھا[۴]

---

[۱] بخاری میں یہ واقعہ متعدد روایتوں اور متعدد طریقوں سے منقول ہے [۲و۳] صحیح بخاری [۴] صحیح بخاری کتاب الجنائز۔

ایک دفعہ سرراہ ایک یہودی کا جنازہ گذرا تو آپ کھڑے ہوگئے،[1]

ایک دفعہ چند یہودی آپ کی خدمت میں آئے، اور شرارت سے سلام علیکم کے بجائے "السام علیکم" (تم پر موت) کہا، حضرت عائشہؓ نے غصہ میں آکر ان کو بھی سخت جواب دیا لیکن آپنے روکا اور فرمایا "عائشہ بد زبان نہ ہو، نرمی کرو، اللہ تعالیٰ ہر بات میں نرمی پسند کرتا ہے"[2]

یہودیوں کے ساتھ داد و ستد کرتے تھے، ان کے سخت و ناجائز تقاضوں اور درشت کلمات کو برداشت کرتے تھے، یہودیوں اور مسلمانوں میں اگر معاملات میں اختلاف پیش آتا، تو مسلمانوں کی بلاوجہ جنبہ داری نہ فرماتے، اس قسم کی متعدد مثالیں دوسرے عنوانات میں مذکور ہیں، ایک دفعہ ایک یہودی نے آکر شکایت کی کہ "محمد! دیکھو ایک مسلمان نے مجکو تھپڑ مارا ہے" آپنے اس مسلمان کو اسی وقت بلوا کر زجر فرمایا،

نصاریٰ کا وفد جب نجران سے مدینہ حاضر ہوا تو آپنے اسکی مہمانداری کی، مسجد نبوی میں ان کو جگہ دی، بلکہ ان کو اپنے طریق پر مسجد میں نماز پڑھنے کی بھی اجازت دیدی اور جب عام مسلمانوں نے ان کو اس کام سے روکنا چاہا تو آپ نے منع فرمایا،[3]

یہود و نصاریٰ کے ساتھ کھانے پینے، نکاح و معاشرت کی اجازت دی اور ان کے لیے مخصوص امتیازی احکام شریعت اسلامیہ میں جاری فرمائے)

غریبوں کے ساتھ محبت و شفقت | مسلمانوں میں امیر بھی تھے، اور غریب بھی، دولتمند بھی اور فاقہ کش بھی، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا برتاؤ سب کے ساتھ یکساں تھا، بلکہ غریبوں کے ساتھ آپ اس طرح پیش آتے تھے کہ دنیاوی دولت کی محرومی ان کے دلوں کو صدمہ نہیں پہنچاتی تھی، ایک دفعہ تقاضائے بشریت سے

---

[1] صحیح بخاری کتاب الجنائز [2] صحیح مسلم کتاب الادب ج ۲ ص ۲۳۹ مصر [3] زاد المعاد

آپ کا ایک فعل اس کے خلاف ہوا تو بارگاہِ احدیت سے اس پر بازپرس ہوئی، مکہ کا واقعہ ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس چند اکابر قریش بیٹھے تھے، اور آپ ان کو اسلام کی دعوت دے رہے تھے، اتفاق سے عبداللہ بن ام مکتوم جو آنکھوں سے معذور اور غریب تھے، ادھر آنکلے اور وہ بھی ان لوگوں کے ساتھ بیٹھ کر آپ سے باتیں کرنے لگے، رؤسائے قریش چونکہ سخت متکبر اور مغرور تھے، ان کو یہ برابری ناگوار گذری، آپ نے ابن ام مکتوم کیطرف توجہ نہیں فرمائی، اور اس امید پر ان ہی سے باتیں کرتے رہے کہ شاید اشقیا اسلام کی سعادت کو قبول کرلیں، اور ان کے دل حق کی لذت سے آشنا ہوں لیکن خدا کو یہ امتیاز زیبا نہ آیا اور یہ آیت اتری:[1]

عَبَسَ وَتَوَلّٰی اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰی وَمَا یُدْرِیْكَ لَعَلَّهٗ یَزَّكّٰی اَوْ یَذَّكَّرُ فَتَنْفَعَهُ الذِّكْرٰی اَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰی فَاَنْتَ لَهٗ تَصَدّٰی وَمَا عَلَیْكَ اَلَّا یَزَّكّٰی وَاَمَّا مَنْ جَآءَكَ یَسْعٰی وَهُوَ یَخْشٰی فَاَنْتَ عَنْهُ تَلَهّٰی كَلَّآ اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ فَمَنْ شَآءَ ذَكَرَهٗ (عبس)	پیغمبر نے ترش روئی کی اور منھ پھیر لیا کہ اس کے پاس اندھا آیا (اے پیغمبر!) تجھے کیا خبر کہ تیری باتوں سے وہ پاک ہوجاتا یا نصیحت حاصل کرتا، تو نصیحت اس کو نفع پہنچاتی لیکن جو بے پروائی برتتا ہے اسکی طرف متوجہ ہوتا ہے اور تیرا کیا نقصان ہے اگر وہ پاک صاف نہ بنے، اور تیرے پاس دوڑتا آتا ہے اور وہ خدا سے ڈرتا بھی ہے تو تو اس سے بے اعتنائی کرتا ہے، نہیں ہرگز نہیں، یہ نصیحت عام ہے جو چاہے اس کو قبول کرے

یہی غربا، اور مفلس اسلام کے سب سے پہلے جان نثار بنے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کو لیکر حرم میں نماز پڑھنے جاتے تھے، تو رؤسائے قریش ان کی ظاہری بدحیثیتی کو دیکھکر استہزاءً کہتے تھے،

اَهٰٓؤُلَآءِ مَنَّ اللّٰهُ عَلَیْهِمْ مِّنْۢ بَیْنِنَا	یہی وہ لوگ ہیں جنپر خدا نے ہم لوگوں کو چھوڑ کر احسان کیا ہے

---

[1] ترمذی، تفسیر سورۂ عبس۔

لیکن آپ ان کے اس استہزا کو خوشی سے برداشت کرتے تھے،

حضرت سعد بن ابی وقاص کے مزاج میں کسی قدر تعلی تھی اور وہ اپنے آپ کو غریبوں سے بالاتر سمجھتے تھے، آپنے ان کی طرف خطاب کر کے فرمایا "تم کو جو نصرت اور روزی میسر آتی ہے وہ ان ہی غریبوں کی بدولت آتی ہے[۱]"۔

اسامہ بن زید سے فرمایا "میں نے در جنت پر کھڑے ہو کر دیکھا کہ زیادہ تر غریب مفلس ہی لوگ اس میں داخل ہیں[۲]"۔

عبداللہ بن عمرو بن العاص روایت کرتے ہیں کہ ایک دفعہ میں مسجد نبوی میں بیٹھا تھا، اور غریب مہاجر لوگ حلقہ باندھے ایک طرف بیٹھے تھے، اس اثنا میں آپ تشریف لے آئے اور ان ہی کے ساتھ مل کر بیٹھ گئے، یہ دیکھکر میں بھی اپنی جگہ سے اٹھا، اور ان کے پاس جا کر بیٹھ گیا، آپنے فرمایا "فقرائے مہاجرین کو بشارت ہو کہ وہ دولتمندوں سے چالیس برس پہلے جنت میں داخل ہوں گے"، عبداللہ بن عمرو کہتے ہیں کہ "میں نے دیکھا کہ یہ سن کر ان کے چہرے خوشی سے چمک اٹھے، اور مجھے حسرت ہوئی کہ کاش میں بھی ان ہی میں ہوتا[۳]"۔

ایک دفعہ آپ ایک مجلس میں تشریف فرما تھے، اس اثنا میں ایک شخص سامنے سے گذرا، آپنے اپنے پہلو کے ایک آدمی سے دریافت فرمایا کہ "اسکی نسبت تمھاری کیا رائے ہے"، اس نے جواب دیا کہ یہ امراء کے طبقہ میں سے ایک صاحب ہیں، خدا کی قسم یہ اس لائق ہیں کہ اگر رشتہ چاہے تو کیا جائے اور اگر کسی کی سفارش کرے تو قبول کیجائے"، یہ سن کر آپ خاموش ہو گئے، کچھ دیر کے بعد ایک اور صاحب

---

[۱] مشکوٰۃ باب فضل الفقراء بروایت صحیح مسلم [۲] حوالۂ مذکور بروایت بخاری و مسلم [۳] حوالۂ مذکور بروایت دارمی،

اسی راہ سے گذرے، آپ نے پھر اس سے استفسار فرمایا کہ "اس کی نسبت کیا کہتے ہو؟" عرض کی یا رسول اللہ! یہ فقرائے مہاجرین میں سے ہیں، اور اس لائق ہے کہ اگر رشتہ چاہے تو واپس کر دیا جائے اور سفارش کرے تو رد کر دی جائے، اگر کچھ کہنا چاہے تو نہ سنا جائے۔" ارشاد ہوا کہ "تمام روئے زمین میں اگر اس امیر جیسے آدمی ہوں تو اس سے یہ ایک غریب بہتر ہے۔"[1]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اکثر دعا میں فرمایا کرتے تھے "خداوندا! مجھے مسکین زندہ رکھ، مسکین اٹھا اور مسکینوں ہی کے ساتھ میرا حشر کر۔" حضرت عائشہؓ نے دریافت کیا، یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ کیوں؟ فرمایا "اس لیے کہ یہ دولتمندوں سے پہلے جنت میں جائیں گے۔" پھر فرمایا "اے عائشہ! کبھی مسکین کو اپنے دروازہ سے نامراد نہ پھیرو، گو چھوہارے کا ایک ٹکڑا ہی کیوں نہ ہو، اے عائشہ غریبوں سے محبت رکھو اور ان کو اپنے سے نزدیک کرو تو خدا بھی تم کو اپنے سے نزدیک کرے گا۔"[2]

ایک دفعہ چند غریب مسلمانوں نے آکر خدمت اقدس میں عرض کی کہ یا رسول اللہ! امراء ہم سے درجۂ اخروی میں بھی بڑھتے جاتے ہیں، نماز، روزہ جس طرح ہم کرتے ہیں، وہ بھی کرتے ہیں، لیکن صدقات و خیرات سے جو نیکیاں ان کو ملتی ہیں، ان سے ہم محروم ہیں، آپ نے فرمایا "کیا میں تم کو وہ بات نہ بتاؤں جس سے تم اگلوں کے برابر ہو جاؤ، اور پچھلوں سے بڑھ جاؤ، اور پھر کوئی تمھاری برابری نہ کر سکے۔" عرض کی ہاں یا رسول اللہ! بتائیے۔" ارشاد ہوا ہر نماز کے بعد ۳۳ - ۳۳ دفعہ سبحان اللہ اور الحمد للہ اللہ اکبر پڑھ لیا کرو" کچھ دن کے بعد یہ دفعہ پھر حاضر خدمت ہوا اور عرض کی یا رسول اللہ! ہمارے دولتمند بھائیوں نے بھی یہ وظیفہ سن لیا، اور پڑھنا شروع کر دیا، فرمایا ذلک فضل اللہ یوتیہ من یشاء

[1] حوالہ مذکور بروایت صحیح بخاری و صحیح مسلم [2] مشکوٰۃ باب فضل الفقراء بروایت ترمذی و بیہقی و ابن ماجہ۔

یعنی یہ خدا کی دین ہے جس کو چاہے دے،[۱]

مسلمانوں سے جو زکوٰۃ وصول ہوتی تھی اس کی نسبت عام حکم تھا کہ

توخذ من امرائھم وترد علی فقرائھم ہر قبیلہ کے یا ہر شہر کے امراء سے لیکر وہیں کے غرباء میں تقسیم کردیجائے،

صحابہ اس کی شدت سے پابندی کرتے تھے اور ایک جگہ کی زکوٰۃ دوسری جگہ نہیں بھیجتے تھے،[۲]

مساوات کے بیان میں یہ واقعہ بہ تفصیل مذکور ہے کہ ایکدفعہ حضرت ابوبکرؓ نے کسی بات پر حضرت سلمانؓ و بلالؓ کو جن کا شمار فقرائے مہاجرین میں ہے، ڈانٹا، آپ نے حضرت ابوبکرؓ سے فرمایا کہ "تم نے ان لوگوں کو آزردہ تو نہیں کیا" یہ سن کر حضرت ابوبکرؓ ان لوگوں کے پاس آئے اور معافی مانگی اور اُن لوگوں نے معاف کیا،

عوالی میں ایک عورت رہتی تھی، وہ بیمار پڑی، اس کے بچنے کی کوئی امید نہ تھی، خیال تھا کہ وہ آج کسی وقت مرجائے گی، آپ نے لوگوں سے کہا کہ وہ مرجائے تو میں جنازہ کی نماز خود پڑھاؤں گا اس کے بعد دفن کیجائے اتفاق سے اس نے کچھ رات گئے انتقال کیا، اسکا جنازہ جب تیار ہوکر لایا گیا تو آپ آرام فرما رہے تھے، صحابہ اس وقت آپ کو تکلیف دینی مناسب سمجھے اور رات ہی کو دفن کردیا، صبح کو آپ نے دریافت فرمایا تو لوگوں نے واقعہ عرض کیا، آپ یہ سنکر کھڑے ہوگئے اور صحابہ کو ساتھ لے کر دوبارہ اس کی قبر پر جاکر نماز جنازہ ادا کی،[۳]

حضرت جریرؓ بیان کرتے ہیں کہ ایک دن پہلے پہر ہم لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک پورا قبیلہ مسافروار حاضر خدمت ہوا، ان کی ظاہری حالت اس درجہ خراب تھی کہ کسی کے

---

[۱] صحیح بخاری ومسلم باب استحباب الذکر بعد الصلوٰۃ [۲] ابوداؤد، زکوٰۃ [۳] یہ واقعہ بخاری وغیرہ میں بھی ہے لیکن سنن نسائی کتاب الجنائز باب الصلوٰۃ فی اللیل سے لیا گیا ہے،

بدن پر کوئی کپڑا ثابت نہ تھا، برہنہ تن، برہنہ پا، کھالیں بدن سے بندھی ہوئی، تلواریں گلوں میں پڑی ہوئی، ان کی یہ حالت دیکھ کر آپ بیحد متاثر ہوئے، چہرۂ مبارک کا رنگ بدل گیا، اضطراب میں آپ اندر گئے باہر آئے، پھر حضرت بلالؓ کو اذان دینے کا حکم دیا، نماز کے بعد آپ نے خطبہ دیا، اور تمام مسلمانوں کو ان کی امداد و اعانت کے لیے آمادہ کیا[۱]

دشمنانِ جان سے عفو و درگذر (جانی دشمنوں اور قاتلانہ حملہ آوروں سے عفو و درگزر کا واقعہ پیغمبرِ دل کے صحیفۂ اخلاق کے سوا اور کہاں مل سکتا ہے، جس شب کو آپ نے ہجرت فرمائی ہے، کفار قریش کے نزدیک یہ طے شدہ تھا کہ صبح کو محمد کا سر قلم کر دیا جائے، اس لیے دشمنوں کا ایک دستہ رات بھر خانۂ نبوی کا محاصرہ کیے کھڑا رہا، اگرچہ اس وقت دشمنوں سے انتقام لینے کی آپ میں ظاہری قوت نہ تھی، لیکن ایک وقت آیا جب ان میں سے ایک ایک کی گردن اسلام کی تلوار کے نیچے تھی، اور اسکی جان صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے رحم و کرم پر موقوف تھی، لیکن ہر شخص کو معلوم ہے کہ ان میں سے کوئی شخص اس جرم میں کبھی مقتول نہیں ہوا،

ہجرت کے دن قریش نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سر کی قیمت مقرر کی تھی، اور اعلان کیا تھا کہ جو محمد کا سر لائیگا یا زندہ گرفتار کریگا اس کو سو اونٹ انعام میں دیے جائیں گے، سراقہ بن جعشم پہلے شخص تھے جو اس نیت سے اپنے صبا رفتار گھوڑے پر سوار، ہاتھ میں نیزہ لیے ہوئے آپ کے قریب پہنچے، آخر دو تین دفعہ کرشمۂ اعجاز دیکھ کر اپنی نیتِ بد سے توبہ کی اور خواہش کی کہ مجکو سند امان لکھ دیجائے، چنانچہ سند امان لکھکر ان کو دیگئی[۲]، اس کے آٹھ برس کے بعد فتحِ مکہ کے موقع پر حلقۂ اسلام میں داخل ہوئے، اور اس جرم کے متعلق ایک حرفِ سوال بھی درمیان میں نہیں آیا[۳]

---

[۱] صحیح مسلم صدقات [۲] صحیح بخاری باب الہجرۃ [۳] سراقہ بن مالک بن جعشم مدلجی کا حال استیعاب اصابہ وغیرہ میں دیکھو۔

عمیر بن وہب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا سخت دشمن تھا، مقتولین بدر کے انتقام کے لیے جب سارا قریش بیتاب تھا تو صفوان بن امیہ نے اس کو بیش قرار انعام کے وعدہ پر مدینہ بھیجا تھا کہ وہ چپکے سے جاکر نعوذ باللہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا کام تمام کردے، عمیر اپنی تلوار زہر میں بجھا کر مدینہ آیا، لیکن وہاں پہنچنے کے ساتھ اس کے تیور دیکھ کر لوگوں نے پہچان لیا، حضرت عمرؓ نے اس کے ساتھ سختی کرنی چاہی لیکن آپ نے منع فرمایا، اور اپنے قریب بٹھا کر اس سے باتیں کیں، اور اصلی راز ظاہر کر دیا، یہ سنکر وہ سناٹے میں آگیا، لیکن آپ نے اس سے کوئی تعرض نہیں فرمایا، یہ دیکھکر وہ اسلام لایا اور مکہ میں جاکر دعوتِ اسلام پھیلائی، یہ واقعہ ۳ھ کا ہے۔[1]

ایک دفعہ آپ ایک غزوہ سے واپس آرہے تھے، راہ میں ایک میدان آیا، دھوپ تیز تھی، لوگوں نے درختوں کے نیچے بستر لگادیے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ایک درخت کے نیچے آرام فرمایا، تلوار درخت کی شاخ سے لٹکادی، کفار موقع کے منتظر رہتے تھے، لوگوں کو غافل دیکھکر ناگاہ ایک طرف سے ایک بدو نے آکر بیخبری میں تلوار اتارلی، دفعۃً آپ بیدار ہوئے تو دیکھا کہ ایک شخص سرہانے کھڑا ہے، اور ننگی تلوار اس کے ہاتھ میں ہے، آپ کو بیدار دیکھکر بولا "کیوں محمد! اب بتاؤ تم کو اس وقت مجھ سے کون بچاسکتا ہے"، آپ نے فرمایا "اللہ" یہ پُر اثر آواز سنکر اس نے تلوار نیام میں کرلی، اتنے میں صحابہ آگئے، آپ نے ان سے واقعہ دہرایا، اور بدو سے کسی قسم کا تعرض نہیں فرمایا،[2]

ایک دفعہ ایک اور شخص نے آپ کے قتل کا ارادہ کیا، صحابہ اس کو گرفتار کرکے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے لائے، وہ آپ کو دیکھکر ڈر گیا، آپ نے اس کو مخاطب کرکے فرمایا "نہیں ڈرو اگر تم مجھے قتل کرنا چاہتے بھی تو نہیں کرسکتے تھے"[3]

---

[1] تاریخ طبری بروایت عروہ بن زبیر [2] صحیح بخاری کتاب الجہاد ص ۲۰۸ [3] مسند ابن حنبل ج ۳ ص ۴۷۱

صلح حدیبیہ کے زمانہ میں ایک دفعہ اسی آدمیوں کا ایک دستہ منھ اندھیرے جبل تنعیم سے اتر کر آیا اور چھپکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کرنا چاہا، اتفاق سے وہ لوگ گرفتار ہو گئے، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انکو چھوڑ دیا، اور کچھ تعرض نہیں کیا، قرآن مجید کی یہ آیت اسی واقعہ کے متعلق نازل ہوئی ہے،[1]

وَهُوَ الَّذِي كَفَّ أَيْدِيَهُمْ عَنكُمْ وَأَيْدِيَكُمْ عَنْهُم (فتح) اسی خدانے انکے ہاتھ تم سے اور تمھارے ہاتھ ان سے روک لیے

خیبر میں ایک یہودیہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کھانے میں زہر دیا، آپنے کھانا کھایا تو زہر کا اثر محسوس کیا، آپنے یہودیوں کو بلا کر دریافت کیا تو انھوں نے اقرار کیا، لیکن آپنے کسی کچھ تعرض نہیں فرمایا لیکن اسی زہر کے اثر سے جب ایک صحابی نے انتقال کیا تو آپنے صرف اس یہودیہ کو قصاص کی سزا دی (حالانکہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو زہر کا اثر مرتے دم تک محسوس ہوتا رہتا تھا)[2]

دشمنوں کے حق میں دعاے خیر دشمنوں کے حق میں بد دعا کرنا انسان کی فطری عادت ہے لیکن پیغمبروں کا مرتبہ عام انسانی سطح سے بدرجہا بلند ہوتا ہے، جو لوگ ان کو گالیاں دیتے ہیں، وہ ان کے حق میں دعاے خیر کرتے ہیں اور جو ان کے تشنۂ خون ہوتے ہیں وہ ان کو پیار کرتے ہیں، ہجرت سے قبل مکہ میں مسلمانوں پر اور خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر جو بیہم مظالم ہو رہے تھے، اس داستان کے دہرانے کے لیے بھی سنگدلی درکار ہے، اسی زمانہ میں خباب بنؓ ارت ایک صحابی نے عرض کی کہ "یا رسول اللہ! دشمنوں کے حق میں بددعا فرمائیے، یہ سنکر چہرۂ مبارک سرخ ہو گیا،[3] ایک دفعہ چند صاحبوں نے مل کر اسی قسم کی بات کہی تو فرمایا کہ "میں دنیا کے لیے لعنت نہیں بلکہ رحمت بنا کر بھیجا گیا ہوں"[4]

وہ قریش جنھوں نے تین برس تک آپ کو محصور رکھا، اور جو آپکے پاس غلہ کے ایک دانہ کے

---

[1] جامع ترمذی تفسیر فتح [2] صحیح بخاری وفات النبیؐ [3] صحیح بخاری مبعث النبیؐ [4] مشکوٰۃ اخلاق النبیؐ بحوالہ صحیح مسلم

پہنچنے کے روادار نہ تھے، ان کی شرارتوں کی پاداش میں دعائے نبوی کی استجابت نے ابر رحمت کا سایہ ان کے سر سے اٹھالیا، اور مکہ میں اس قدر قحط پڑا کہ لوگ ہڈی اور مردار کھانے لگے، ابو سفیان نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کی کہ "محمد! تمھاری قوم ہلاک ہو رہی ہے، خدا سے دعا کرو کہ یہ مصیبت دور ہو" آپ نے بلا عذر فوراً دعا کیلئے ہاتھ اٹھائے، اور خدا نے اس مصیبت سے انکو نجات دی،[1]

جنگ احد میں دشمنوں نے آپ پر پتھر پھینکے، تیر برسائے، تلواریں چلائیں، دندان مبارک کو شہید کیا، جبین اقدس کو خون آلود کیا، لیکن ان حملوں کا وار آپ نے جس سپر پر روکا وہ صرف یہ دعا تھی،

اللھم اھد قومی فانھم لا یعلمون — خدایا! ان کو معاف کرنا کہ یہ نادان ہیں،

وہ **طائف** جس نے دعوت اسلام کا جواب استہزا اور تمسخر سے دیا تھا، وہ طائف جس نے داعی اسلام کو اپنی پناہ میں لینے سے انکار کر دیا تھا، وہ طائف جس نے پائے مبارک کو لہو لہان کیا تھا، ان کی نسبت فرشتۂ غیب پوچھتا ہے کہ حکم ہو تو ان پر پہاڑ الٹ دیا جائے، جواب ملتا ہے کہ "شاید انکی نسل سے کوئی خدا کا پرستار پیدا ہو"[2] دس بارہ برس کے بعد یہی طائف اسلام کی دعوت کا جواب تیر و تفنگ (منجنیق) سے دیتا ہے، جاں نثاروں کی لاشوں پر لاشیں گر رہی ہیں، صحابہ عرض کرتے ہیں کہ "یا رسول اللہ! انکے حق میں بد دعا کیجئے"، آپ دعا کے لیے ہاتھ اٹھاتے ہیں، لوگ سمجھتے ہیں کہ حضور ان کے حق میں بد دعا فرمائیں گے، لیکن زبان مبارک سے یہ الفاظ نکلتے ہیں "خداوندا! ثقیف (اہل طائف) کو اسلام نصیب کر اور دوستانہ ان کو مدینہ لا"۔ وہ تیر جو میدان جنگ میں نشانہ پر نہیں لگے تھے، وہ مدینہ کے صحن مسجد میں زبان مبارک سے نکل کر ٹھیک اپنے ہدف پر پہنچے یعنی وہ مدینہ آکر خاص مسجد نبوی میں ٹھیکر، جہاں وہ مہمان

---

[1] صحیح بخاری تفسیر سورۂ دخان ج ۲ [2] صحیح بخاری

ٹھہرائے گئے تھے، مسلمان ہوئے،[1]

دوس کا قبیلہ یمن میں رہتا تھا **طفیلؓ** بن عمرو دوسی اس قبیلہ کے رئیس تھے، وہ قدیم الاسلام تھے، مدت تک وہ اپنے قبیلہ کو اسلام کی دعوت دیتے رہے، لیکن وہ اپنی کفر پر اڑا رہا، ناچار وہ خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئے، اور قبیلے کی حالت عرض کرکے گذارش کی کہ ان کے حق میں بددعا فرمائیے، لوگوں نے سنا تو کہا کہ اب دوس کی بربادی میں کوئی شک نہیں رہا، لیکن رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے جن الفاظ میں دعا فرمائی، وہ یہ تھے:-[2]

اللھم اھد دوسًا وائت بھم — خداوندا دوس کو ہدایت کر اور ان کو لا،

حضرت **ابوہریرہؓ** کی ماں مشرکہ تھیں، اپنی ماں کو وہ جس قدر اسلام کی تبلیغ کرتے تھے وہ اباء کرتی تھیں، ایک دن انھوں نے اسلام کی دعوت دی تو انکی ماں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کی حضرت ابوہریرہؓ کو اسقدر صدمہ ہوا کہ وہ رونے لگے، اور اسی حالت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور واقعہ عرض کیا، آپ نے دعا کی "الٰہی ابوہریرہ کی ماں کو ہدایت نصیب کر"، وہ خوش خوش گھر واپس آئے تو دیکھا کہ کواڑ بند ہیں اور ماں نہا رہی ہیں، غسل سے فارغ ہو کر کواڑ کھولے اور کلمہ پڑھا۔[3]

عبداللہ بن ابی بن سلول وہ شخص تھا جو عمر بھر منافق رہا، اور کوئی موقع اس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کے خلاف خفیہ سازشوں اور علانیہ استخفاف و اہانت کا ہاتھ سے جانے نہ دیا، کفار قریش کے ساتھ اس کی خفیہ خط و کتابت تھی، غزوۂ احد میں عین موقع پر اپنے ہمراہیوں کے ساتھ مسلمانوں کی فوج سے الگ ہو گیا، واقعۂ افک میں حضرت عائشہؓ پر الزام لگانے والوں میں وہ سب سے آگے تھا،

[1] ابن سعد غزوہ طائف [2] صحیح مسلم مناقب دوس [3] صحیح مسلم فضائل ابی ہریرہؓ۔

یا اینہمہ اس کی فرد جرم کو رحمت عالم کا حلم وعفو ہمیشہ دھوتا رہا، وہ مرا تو آپ نے اسکی مغفرت کی نماز پڑھی، اس پر حضرت عمرؓ نے کہا "یا رسول اللہ آپ اس کے جنازہ کی نماز پڑھتے ہیں، حالانکہ اس نے یہ کہا اور یہ کہا، یہ سنکر آپ متبسم ہوئے اور فرمایا "ہٹو اے عمر"، جب زیادہ اصرار کیا تو فرمایا "اگر مجھے اختیار دیا جاتا کہ اگر ستر دفعہ میں نماز پڑھوں تو اس کی بخشش ہو سکتی ہے تو میں اس سے بھی زیادہ پڑھتا"[۱]۔

بچوں پر شفقت | بچوں پر نہایت شفقت فرماتے تھے معمول تھا کہ سفر سے تشریف لاتے تو راہ میں جو بچے ملتے ان میں سے کسی کسی کو اپنے ساتھ سواری پر آگے پیچھے بٹھاتے (راستہ میں بچے مل جاتے تو ان کو خود سلام کرتے[۲])

ایک دن خالد بن سعیدؓ خدمت اقدس میں آئے، ان کی چھوٹی لڑکی بھی ساتھ تھی، اور سرخ رنگ کا کرتہ بدن میں تھا، آپ نے فرمایا سنہ سنہ، حبشی زبان میں حسنہ کو سنہ کہتے ہیں، چونکہ ان کی پیدائش حبش میں ہوئی تھی، اس لیے آپ نے اس مناسبت سے حبشی لفظ میں حسنہ کے بجائے سنہ کہا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پشت پر جو مہر نبوت تھی ابھری ہوئی تھی، بچوں کی عادت ہوتی ہے کہ غیر معمولی چیز نظر آئے تو اس سے کھیلنے لگتے ہیں، وہ بھی مہر نبوت سے کھیلنے لگیں، خالدؓ نے ڈانٹا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے روکا کہ کھیلنے دو[۳]۔

ایک دفعہ آپ کے پاس کہیں سے کپڑے آئے جن میں ایک سیاہ چادر بھی تھی جس میں دونوں طرف آنچل تھے، آپ نے حاضرین سے کہا یہ چادر کس کو دوں، لوگ چپ رہے، آپ نے فرمایا ام خالد کو لاؤ، وہ آئیں تو آپ نے ان کو پہنایا، اور دو دفعہ فرمایا "پہننا اور پرانی کرنا"، چادر میں جو بوٹے تھے، آپ ان کو دکھا دکھا کر فرماتے تھے "ام خالد دیکھنا یہ سنا ہے یہ سنا ہے[۴]"، اوپر گذر چکا ہے کہ ام خالد حبش میں پیدا ہوئی تھیں اور کچی

---

[۱] صحیح بخاری کتاب الجنائز [۲] ابوداؤد کتاب الادب [۳] بخاری جلد ۲ ص ۸۸۶ [۴] اصابہ میں ہے کہ وہ اسقدر چھوٹی تھیں کہ لوگ ان کو گود میں اٹھا کر لائے (اصابہ ترجمہ ام خالد) [۵] بخاری کتاب اللباس، سنا حبشی میں حسن کو کہتے ہیں

مہینے تک وہیں رہی تھیں، اس لیے ان سے حبشی زبان میں خطاب کیا،

ایک صحابی کا بیان ہے کہ بچپن میں انصار کے نخلستان میں چلا جاتا اور ڈھیلوں سے مار کر کھجوریں گراتا، لوگ مجکو خدمت اقدس میں لے گئے، آپ نے پوچھا ڈھیلے کیوں مارتے ہو، میں نے کہا، کھجوریں کھانے کے لیے، ارشاد فرمایا کہ کھجوریں جو زمین پر ٹپکتی ہیں، ان کو اٹھا کر کھا لیا کرو، ڈھیلے نہ مارو، یہ کہکر میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور دعا دی، [1]

ماں بچے کی محبت کے واقعات سے آپ پر سخت اثر ہوتا تھا، ایک دفعہ ایک نہایت غریب عورت حضرت عائشہ رضی کے پاس آئی، دو چھوٹی چھوٹی لڑکیاں بھی ساتھ تھیں، اس وقت حضرت عائشہ رضی کے پاس کچھ نہ تھا، ایک کھجور زمین پر پڑی ہوئی تھی، وہی اٹھا کر دیدی، عورت نے کھجور کے دو ٹکڑے کیے، اور دونوں میں برابر تقسیم کر دیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم باہر سے تشریف لائے تو حضرت عائشہ رضی نے یہ واقعہ سنایا، ارشاد فرمایا، خدا جس کو اولاد کے محبت میں ڈالے اور وہ ان کا حق بجالائے وہ دوزخ سے محفوظ رہیگا، [2]

حضرت انس رضی کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے کہ میں نماز شروع کرتا ہوں اور ارادہ ہوتا ہے کہ دیر میں ختم کروں گا، دفعۃً صف سے کسی بچہ کے رونے کی آواز آتی ہے اور مختصر کر دیتا ہوں، کہ اس کی ماں کو تکلیف ہوتی ہوگی، [3]

یہ محبت اور شفقت مسلمان بچوں تک محدود نہ تھی، بلکہ مشرکین کے بچوں پر بھی اسی طرح لطف فرماتے تھے، ایک دفعہ ایک غزوہ میں چند بچے جھپٹ میں آکر مارے گئے، آپ کو خبر ہوئی تو نہایت آزردہ ہوئے ایک صاحب نے کہا یا رسول اللہ وہ مشرکین کے بچے تھے، آپ نے فرمایا مشرکین کے بچے بھی تم سے بہتر ہیں،

---

[1] ابوداؤد کتاب الجہاد [2] صحیح بخاری ص ۷۰ [3] بخاری کتاب الصلوٰۃ .

خبردار بچوں کو قتل نہ کرو، خبردار! بچوں کو قتل نہ کرو، ہر جان خدا ہی کی فطرت پر پیدا ہوتی ہے۔"[1]

معمول تھا کہ جب فصل کا نیا میوہ کوئی خدمت اقدس میں پیش کرتا تو حاضرین میں جو سب سے زیادہ کم عمر بچہ ہوتا، اس کو عنایت فرماتے،[2] بچوں کو چومتے اور ان کو پیار کرتے تھے، ایک دفعہ آپ اسی طرح بچوں کو پیار کر رہے تھے کہ ایک بدوی آیا، اس نے کہا "تم لوگ بچوں کو پیار کرتے ہو، میرے دس بچے ہیں مگر اب تک میں نے کسی کو پیار نہیں کیا،" آپ نے فرمایا "اللہ تعالیٰ اگر تمھارے دل سے محبت کو چھین لے تو میں کیا کروں"[3]۔"

جابرؓ بن سمرہ صحابی تھے، وہ اپنے بچپن کا واقعہ بیان کرتے ہیں کہ ایک دفعہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے نماز پڑھی، نماز سے فارغ ہو کر آپ اپنے گھر کی طرف چلے، میں بھی ساتھ ہو لیا کہ ادھر سے چند اور لڑکے نکل آئے، آپ نے سب کو پیار کیا اور مجھے بھی پیار کیا،[4]

ہجرت کے موقع پر جب مدینہ میں آپ کا داخلہ ہو رہا تھا، انصار کی چھوٹی لڑکیاں خوشی سے دروازوں سے نکل نکل کر گیت گا رہی تھیں، جب آپ کا ادھر گذر ہوا، فرمایا "اے لڑکیو! تم مجھے پیار کرتی ہو۔" سب نے کہا "ہاں یا رسول اللہ!" فرمایا "میں بھی تمھیں پیار کرتا ہوں[5]۔"

حضرت عائشہؓ کمسنی میں بیاہ کر آئی تھیں، محلہ کی لڑکیوں کے ساتھ وہ کھیلا کرتی تھیں، آپ جب گھر میں تشریف لاتے تو لڑکیاں آپ کا لحاظ کر کے ادھر اُدھر چھپ جاتیں، آپ انھیں تسکین دیتے اور کھیلنے کو کہتے[6]۔

غلاموں پر شفقت | آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم غلاموں پر خصوصیت کے ساتھ شفقت فرماتے تھے، فرمایا کرتے تھے کہ یہ تمھارے

[1] مسند ابن حنبل ج ۳ ص ۴۳۵ [2] معجم صغیر طبرانی باب المیم معجم محمد [3] صحیح بخاری و مسلم کتاب الادب [4] صحیح مسلم باب طیب رائحۃ النبی صلعم [5] سیرۃ جلد اول، ہجرت [6] ابوداؤد کتاب الادب باب اللعب،

بھائی ہیں جو خود کھاتے ہو وہ ان کو کھلاؤ، اور جو خود پہنتے ہو وہ ان کو پہناؤ"۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ملکیت میں جو غلام آتے، ان کو آپ ہمیشہ آزاد فرما دیتے تھے، لیکن وہ حضورؐ کے احسان وکرم کی زنجیر سے آزاد نہیں ہو سکتے تھے، ماں، باپ، قبیلہ، رشتہ کو چھوڑ کر عمر بھر آپ کی غلامی کو شہرت جانتے تھے، زید بن حارثہؓ غلام تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو آزاد کر دیا، اُن کے باپ ان کو لینے آئے، لیکن وہ آستانۂ رحمت پر باپ کے ظلِ عاطفت کو ترجیح نہ دے سکے اور اپنے جانے سے قطعاً انکار کر دیا، زیدؓ کے بیٹے اسامہ سے آپ اسقدر محبت کرتے تھے کہ آپ فرمایا کرتے تھے کہ اگر اسامہ بیٹی ہوتی تو میں اسکو زیور پہناتا، خود اپنے دست مبارک سے انکی ناک صاف کرتے تھے،

غلاموں کو لفظ "غلام" کا سنکر اپنی نظر میں اپنی آپ ذلت محسوس ہوتی تھی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کی یہ تکلیف بھی گوارا نہ تھی، فرمایا کوئی "میرا غلام"، "میری لونڈی" نہ کہے، "میرا بچہ"، "میری بچی" کہے، اور غلام بھی اپنے آقا کو خداوند نہ کہیں، خداوند خدا ہے، آقا کہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو غلاموں پر شفقت اتنی ملحوظ تھی کہ مرض الموت میں سب سے آخری یہ وصیت فرمائی کہ "غلاموں کے معاملہ میں خدا سے ڈرا کرنا"۔

حضرت ابوذرؓ بہت قدیم الاسلام صحابی تھے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم انکی راست گوئی کی مدح فرماتے تھے، ایک دفعہ انھوں نے ایک عجمی آزاد غلام کو برا بھلا کہا، غلام نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے جاکر شکایت کی، آپ نے ابوذر کو زجر فرمایا کہ "تم میں ابتک جاہلیت باقی ہے، یہ غلام تمھارے بھائی ہیں، خدا نے تم کو ان پر فضیلت عطا کی ہے، اگر وہ تمھارے مزاج کے موافق نہ ہوں تو ان کو فروخت کر ڈالو، خدا کی مخلوق کو ستایا نہ کرو، جو خود کھاؤ وہ ان کو کھلاؤ، جو خود پہنو وہ انکو پہناؤ، انکو اتنا کام نہ دو جو وہ نہ کر سکیں، اور اتنا کام دو تو خود بھی انکی اعانت کرو"۔[1]

ایک دفعہ ابومسعود انصاریؓ اپنے غلام کو مار رہے تھے کہ پیچھے سے آواز آئی، ابومسعود! تم کو جسقدر

---

[1] بخاری باب المعاصی من امر الجاہلیہ و ابوداؤد کتاب الادب۔

اس غلام پر اختیار رہے، خدا کو اس سے زیادہ تم پر اختیار ہے، ابو مسعودؓ نے مڑ کر دیکھا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تھے، عرض کی یا رسول اللہ میں نے لوجہ اللہ اس غلام کو آزاد کیا، فرمایا "اگر تم ایسا نہ کرتے تو آتش دوزخ تم کو چھو لیتی"۔

ایک شخص خدمت نبویؐ میں حاضر ہوا، عرض کی یا رسول اللہ! میں غلاموں کا قصور کتنی دفعہ معاف کروں؟ آپ خاموش رہے، اس نے پھر عرض کی، آپ نے پھر خاموشی اختیار کی، اس نے تیسری بار عرض کی، آپ نے فرمایا "ہر روز ستر بار معاف کیا کرو"۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں ایک خاندان میں سات آدمی تھے، اور سات آدمیوں کے بیچ میں ایک ہی لونڈی تھی، ایک دفعہ ان میں سے ایک نے اس لونڈی کو تھپڑ مارا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہوا، تو آپ نے فرمایا کہ اس کو آزاد کردو، لوگوں نے کہا "یا رسول اللہ! ہم سات آدمیوں کے بیچ میں یہی ایک خادمہ ہے، آپ نے فرمایا "اچھا اس وقت تک خدمت گذاری کرے جب تک تم اس سے بے نیاز نہ ہو جاؤ، جب حاجت نہ رہے تو وہ آزاد ہے"[1]۔

ایک صاحب کے پاس دو غلام تھے جن کے وہ بہت شاکی تھے، وہ ان کو مارتے تھے، برا بھلا کہتے تھے، لیکن وہ دونوں باز نہ آتے تھے، انھوں نے آکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایت کی اور اس کا علاج پوچھا، آپ نے فرمایا "تمھاری سزا اگر ان کے قصور کے برابر ہوگی تو خیر ورنہ سزا کی جو مقدار زاید ہوگی، اسکے برابر تمھیں بھی خدا سزا دیگا"۔ یہ سن کر وہ بیقرار ہو گئے اور گریہ وزاری شروع کی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہ شخص قرآن نہیں پڑھتا، ونضع الموازین القسط الخ، یہ سنکر انھوں نے عرض کیا کہ "یا رسول اللہ! بہتر یہ ہے کہ میں ان کو اپنے سے جدا کردوں، آپ گواہ رہیں کہ اب وہ آزاد ہیں"[2]۔

---

[1] یہ تمام واقعات ابوداؤد کتاب الادب باب حق المملوک میں مذکور ہیں [2] مسند ابن حنبل جلد ۶ ص ۲۸۰

غلاموں کا لوگ بیاہ کر دیتے تھے، اور پھر جب چاہتے تھے، جبراً ان میں تفریق کر دیتے تھے چنانچہ ایک شخص نے اپنی لونڈی سے اپنے غلام کا عقد کر دیا، اور پھر دونوں میں علیحدگی کرنی چاہی، غلام نے خدمتِ نبویؐ میں آکر شکایت کی، آپؐ نے منبر پر خطبہ دیا کہ "لوگ کیوں غلاموں کا نکاح کر کے پھر تفریق کرانا چاہتے ہیں، نکاح و طلاق کا حق صرف شوہر کو ہے۔"[1]

اسی رحم و شفقت کا اثر تھا کہ اکثر کافروں کے غلام بھاگ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے، اور آپ انھیں آزاد فرما دیتے تھے۔[2] مالِ غنیمت جب تقسیم ہوتا تو آپ اس میں سے غلاموں کو بھی حصہ دیتے تھے،[3] جو غلام نئے آزاد ہوتے تھے، چونکہ انکے پاس کوئی مالی سرمایہ نہیں ہوتا تھا، اسلیے جو آمدنی وصول ہوتی تھی، اس میں سب سے پہلے آپ انہی کو عنایت فرماتے تھے)

مستورات کے ساتھ برتاؤ دنیا میں یہ صنفِ ضعیف (عورتیں) چونکہ ہمیشہ ذلیل رہی ہیں، اسلیے کسی نامور شخص کے حالات میں یہ پہلو کبھی پیش نظر نہیں رہا کہ اس مظلوم گروہ کے ساتھ اس کا طریق معاشرت کیا تھا، اسلام دنیا کا سب سے پہلا مذہب ہے جس نے عورتوں کی حق رسی کی اور عزت و منزلت کے دربار میں ان کو مردوں کے برابر جگہ دی، اس لیے شارحِ اسلام کے واقعاتِ زندگی میں ہم کو یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ مستورات کے ساتھ ان کا طرزِ عمل کیا تھا۔

صحیح بخاری میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ایلا (ازواج مطہرات سے چند روزہ علیحدگی) کی جو روایت مذکور ہے، اس میں حضرت عمرؓ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ "مکہ میں ہم لوگ عورتوں کو بالکل ناقابل التفات سمجھتے تھے، مدینہ میں نسبۃً عورتوں کی قدر تھی لیکن نہ اسقدر جس کی وہ مستحق تھیں۔" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

[1] سنن ابن ماجہ کتاب الطلاق [2] ابوداؤد کتاب الجہاد و مسند ابن حنبل ج ۱ ص ۲۴۳ [3] ابوداؤد باب قسمۃ الفئ

نے جس طرح اپنے ارشاد و احکام سے ان کے حقوق قائم کیے، آپ کے برتاؤ نے اور زیادہ اس کو قوی اور نمایاں کر دیا، ازواج مطہرات کے واقعات مستقلاً مذکور ہیں، یہاں ہم عام واقعات لکھتے ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دربار میں چونکہ ہر وقت مردوں کا ہجوم رہتا تھا، عورتوں کو وعظ و پند سننے اور مسائل دریافت کرنے کا موقع نہیں ملتا تھا، مستورات نے اگر درخواست کی کہ مردوں سے ہم عہدہ برآ نہیں ہو سکتے، اس لیے ہمارے لیے ایک دن خاص مقرر کر دیا جائے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی درخواست قبول فرمائی[۱]، اور ان کے دربار کا ایک خاص دن مقرر ہو گیا۔

جن لوگوں نے آغاز اسلام میں حبش کو ہجرت کی تھی، ان میں اسماء بنت عمیس بھی تھیں، خیبر کی فتح کے زمانہ میں مہاجرین حبش مدینہ میں آئے تو وہ بھی آئیں، ایک دن وہ حضرت حفصہؓ سے ملنے گئیں، اتفاق یہ کہ اس وقت حضرت عمرؓ بھی موجود تھے، ان کو دیکھ کر پوچھا یہ کون ہیں، حضرت حفصہؓ نے نام بتایا، حضرت عمرؓ نے کہا "ہاں وہ حبش والی وہ سمندر والی"، اسماء بنت عمیسؓ نے کہا، ہاں، وہی حضرت عمرؓ نے کہا "ہم نے تم لوگوں سے پہلے ہجرت کی، اور اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ہمارا زیادہ حق ہے"، اسماءؓ کو سخت غصہ آیا، بولیں "ہرگز نہیں، تم لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہتے تھے، وہ بھوکوں کو کھلاتے تھے، ہمارا یہ حال تھا کہ گھر سے دور، بیگانے حبشیوں میں رہتے تھے، لوگ ہم کو ستاتے تھے، اور ہر وقت جان کا ڈر لگا رہتا تھا۔"

یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آ گئے، اسماءؓ نے کہا "یا رسول اللہ! عمر نے یہ یہ کہا" آپ نے فرمایا تم نے کیا جواب دیا، انھوں نے ماجرا سنایا، آپ نے فرمایا عمر کا حق مجھ پر تم سے زیادہ نہیں، عمر اور ان کے

[۱] صحیح بخاری کتاب العلم ہل یجعل للنساء یوماً علی حدۃ الخ

ساتھیوں نے صرف ایک ہجرت کی اور تم لوگوں نے دو ہجرتیں کیں"۔

اس واقعہ کا چرچا پھیلا تو مہاجرین حبش جوق جوق اسماءؓ کے پاس آتے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ ان سے بار بار دہرواکر سنتے، حضرت اسماءؓ کا بیان ہے کہ مہاجرین حبش کے لیے دنیا میں کوئی چیز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ان الفاظ سے زیادہ مسرت انگیز نہ تھی۔[1]

حضرت انسؓ بن مالک جو خادم خاص تھے، ان کی خالہ کا نام ام حرام تھا (جو رضاعت کے رشتہ سے آپ کی بھی خالہ تھیں) معمول تھا، جب آپ قبا تشریف لیجاتے تو ان کے پاس ضرور جاتے، وہ اکثر کھانا لاکر پیش کرتیں، اور آپ نوش فرماتے، آپ سو جاتے تو بالوں میں سے جوئیں نکالتیں،[2] حضرت انسؓ کی والدہ ام سلیمؓ سے آپ کو نہایت محبت تھی، آپ اکثر ان کے گھر تشریف لیجاتے وہ بچھونا بچھا دیتیں، آپ آرام فرماتے، جب سو کر اٹھتے تو وہ آپ کا پسینہ ایک شیشی میں جمع کرلیتیں، مرتے وقت وصیت کی کہ کفن میں حنوط ملایا جائے تو عرق مبارک کے ساتھ ملایا جائے۔[3]

ایک دفعہ حضرت انسؓ کی والدہ ملیکہ نے آپ کی دعوت کی، کھانا خود تیار کیا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کھانا نوش فرما کر فرمایا "آؤ میں تمھیں نماز پڑھاؤں"، گھر میں صرف ایک چٹائی تھی، اور وہ بھی پرانی ہو کر سیاہ ہوگئی تھی، حضرت انسؓ نے پہلے اس کو پانی سے دھویا، اور پھر نماز کے لیے بچھایا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے امامت کی حضرت انسؓ اور ان کی دادی اور یتیم (غلام) صف باندھکر کھڑے ہوئے، آپ نے دو رکعت نماز ادا کی اور واپس آئے۔[4]

حضرت ابوبکرؓ کی صاحبزادی (اسماءؓ) جو حضرت عائشہؓ کی علاتی بہن تھیں، حضرت زبیرؓ سے بیاہی

---

[1] صحیح بخاری غزوۂ خیبر [2] بخاری کتاب الجہاد صفحہ ۳۹۱ [3] بخاری کتاب الاستیذان [4] بخاری باب الصلوٰۃ علی الحصیر

تھیں، مدینہ میں آئیں تو اس وقت حضرت زبیرؓ کی یہ حالت تھی کہ ایک گھوڑے کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ حضرت اسماءؓ خود ہی گھوڑے کے لیے جنگل سے گھاس لاتیں اور کھانا پکاتیں، حضرت زبیرؓ کو جو زمین آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عطا فرمائی تھی اور جو مدینہ سے دو میل پر تھی، وہاں سے کھجور کی گٹھلیاں سر پر لاد کر لاتیں، ایک دن وہ گٹھلیاں لیے ہوئے آرہی تھیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا، آپ اس وقت اونٹ پر سوار تھے، اونٹ کو بٹھا دیا کہ وہ سوار ہولیں، حضرت اسماءؓ شرمائیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دیکھ کر کہ وہ حجاب کرتی ہیں کچھ نہیں فرمایا اور ان کو چھوڑ کر آگے بڑھ گئے، حضرت اسماءؓ کا بیان ہے کہ اس کے بعد حضرت ابو بکرؓ نے ایک خادم بھیجا جو گھوڑے کی خدمت کرتا تھا، مجکو اس قدر غنیمت معلوم ہوا گویا میں غلامی سے آزاد ہو گئی،[۱]

ایک بار قرابت کی بہت سی بیبیاں بیٹھی ہوئی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ بڑھ کر باتیں کر رہی تھیں، حضرت عمرؓ آئے تو سب اٹھکر چلدیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہنس پڑے، حضرت عمرؓ نے کہا خدا آپکو خنداں رکھے کیوں ہنسے، فرمایا ان عورتوں پر تعجب ہوا کہ وہ تمہاری آواز سنتے ہی سب آڑ میں چھپ گئیں، حضرت عمرؓ نے ان کی طرف مخاطب ہو کر کہا "اے اپنی جان کی دشمنو! مجھ سے ڈرتی ہو اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے نہیں ڈرتیں" سب نے کہا "تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت سخت فراج ہو"[۲]

ایک دفعہ حضرت عائشہؓ کے گھر میں آپ منہ ڈھانک کر سوئے ہوئے تھے، عید کا دن تھا، چھوکریاں گا بجا رہی تھیں، حضرت ابو بکرؓ آئے تو ان کو ڈانٹا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "ان کو گانے دو، ان کی عید کا دن ہے"[۳]

عورتیں نہایت دلیری کے ساتھ آپ سے بے محابا مسائل دریافت کرتی تھیں، اور صحابہ

---

[۱] بخاری ص ۷۸۰، کتاب النکاح [۲] صحیح بخاری مناقب عمرؓ بن خطاب [۳] مسلم کتاب العیدین۔

کو ان کی اس جرات پر حیرت ہوتی تھی لیکن آپ کسی قسم کی ناگواری نہیں ظاہر فرماتے تھے۔

چونکہ عورتیں عموماً نازک طبع اور ضعیف القلب ہوتی ہیں، ان کی خاطرداری کا نہایت خیال رکھتے تھے۔

انجشہ نام ایک حبشی غلام حدی خواں تھے، یعنی اونٹ کے آگے حدی پڑھتے جاتے تھے، ایک دفعہ سفر میں ازواج مطہراتؓ ساتھ تھیں، انجشہ حدی پڑھتے جاتے تھے، اونٹ زیادہ تیز چلنے لگے تو آپ نے فرمایا "انجشہ! دیکھنا شیشے (عورتیں) ٹوٹنے نہ پائیں"۔

حیوانات پر رحم | حیوانات پر نہایت رحم فرماتے تھے۔ ان بے زبانوں پر جو ظلم مدت سے عرب میں چلے آتے تھے، موقوف کرا دیے، اونٹ کے گلے میں قلادہ لٹکانے کا عام دستور تھا۔ اس کو روک دیا،[1] (زندہ جانور کے بدن سے گوشت کا لوتھڑا کاٹ لیتے تھے، اور اس کو پکا کر کھاتے تھے، اس کو منع کر دیا، جانور کی دم اور ایال کاٹنے سے بھی منع کیا اور فرمایا کہ "دم ان کا مورچھل ہے اور ایال ان کا لحاف ہے" جانوروں کو دیر تک ساز میں باندھ کر کھڑا رکھنے کی بھی ممانعت کی اور فرمایا کہ "جانوروں کی پیٹھوں کو اپنی نشستگاہ اور کرسی نہ بناؤ"، اسی طرح جانوروں کو باہم لڑانا بھی ناجائز بتایا، ایک بیرحمی کا دستور یہ تھا کہ کسی جانور کو باندھ کر اس کا نشانہ بناتے تھے اور مشق تیر اندازی کرتے تھے، اس سنگ دلی کی بھی قطعاً ممانعت کر دی)

ایک دفعہ ایک گدھا راہ میں نظر پڑا جس کا چہرہ داغا گیا تھا، فرمایا کہ "جس نے اس کا چہرہ داغا ہے، اس پر خدا کی لعنت ہو"۔ علامت یا بعض دیگر ضرورتوں کی وجہ سے اونٹوں اور بکریوں کو داغنا پڑتا تھا، ایسی حالت میں آپ ان اعضا کو داغتے جو زیادہ نازک نہیں ہوتے، حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ میں ایک دفعہ بکریوں کے

---

[1] صحیح مسلم باب اللباس والزینۃ۔

ریوڑ میں گیا تو دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بکریوں کے کان داغ رہے ہیں۔[۱]

(ایک بار آپ کسی سفر میں جا رہے تھے، لوگوں نے مقام پر منزل کیا، وہاں ایک پرندہ نے انڈا دیا تھا، ایک شخص نے وہ انڈا اٹھا لیا، چڑیا بیقرار ہو کر پر مار رہی تھی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت کیا کہ "اس کا انڈا چھین کر کس نے اس کو اذیت پہنچائی"۔ ان صاحب نے کہا "یا رسول اللہ! مجھ سے یہ حرکت ہوئی ہے۔" آپ نے فرمایا "وہیں رکھ دو۔"[۲]

ایک صحابی خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئے، ان کے ہاتھوں میں چادر سے چھپے ہوئے کسی پرندہ کے بچے تھے، آپ نے دریافت فرمایا تو عرض کی کہ ایک جھاڑی سے آواز آ رہی تھی، جا کر دیکھا تو یہ بچے تھے، میں نے ان کو نکال لیا، پرندہ نے یعنی ان بچوں کی ماں نے یہ دیکھا تو میرے سر منڈلانے لگی، آپ نے فرمایا "جاؤ اور بچوں کو وہیں پھر رکھ آؤ۔"[۳]

ایک بار راستہ میں ایک اونٹ نظر سے گذرا جس کے پیٹ اور پیٹھ شدتِ گرسنگی سے ایک ہو گئے تھے، فرمایا کہ "ان بے زبانوں کے متعلق خدا سے ڈرو"۔[۴] ایک دفعہ ایک انصاری کے باغ میں آپ تشریف لے گئے، ایک گرسنہ اونٹ نظر پڑا، آپ کو دیکھ کر بلبلایا، آپ نے شفقت سے اس پر ہاتھ پھیرا، پھر لوگوں سے ان کے مالک کا نام پوچھا، معلوم ہوا کہ ایک انصاری کا ہے، ان سے آپ نے فرمایا کہ "اس جانور کے معاملہ میں تم خدا سے نہیں ڈرتے۔"[۵])

رحمت ومحبت عام | (حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پاک تمام دنیا کے لیے رحمت بن کر آئی تھی، حضرت

۱؎ یہ حدیثیں ترمذی وابوداؤد وغیرہ میں مذکور ہیں ۲؎ ادب المفرد امام بخاری باب رحمۃ البہائم ۳؎ مشکوٰۃ بحوالہ ابوداؤد باب رحمۃ اللہ ۴؎ ابوداؤد کتاب الجہاد ۵؎ ایضاً

مسیح نے کہا تھا میں امن کا شہزادہ ہوں" لیکن شہزادۂ امن کی اخلاقی حکومت کا ایک کارنامہ بھی اسکے ثبوت میں محفوظ نہیں، لیکن امن کے شہنشاہ کو خداوند ازل ہی نے خطاب کیا،

وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِيْنَ — محمد ہم نے تم کو تمام دنیا کے لیے رحمت بناکر بھیجا ہے۔

تم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے علم وعفو، مسامحت و درگذر کے سینکڑوں واقعات پڑھ چکے، نظر آیا ہو گا کہ اس خزانۂ رحمت میں دوست و دشمن، کافر و مسلم، بوڑھے بچے، عورت مرد، آقا و غلام، انسان و حیوان ہر ایک صنفِ ہستی برابر کی حصہ دار تھی،

ایک صاحب نے آپ سے کسی پر بد دعا کرنے کی درخواست کی تو غضبناک ہو کر فرمایا "میں دنیا میں لعنت کے لیے نہیں آیا ہوں[۱]، رحمت بنا کر بھیجا گیا ہوں" آپ نے[۲] دنیا کو پیغام دیا:

لا تباغضوا ولا تحاسدوا ولا تدابروا وكونوا عباد الله اخوانا — ایک دوسرے پر بغض وحسد نہ کرو، ایک دوسرے سے منھ نہ پھیرو، اور اے خدا کے بندو سب آپس میں بھائی بھائی بنجاؤ۔

ایک اور حدیث میں حکم فرمایا:-

احب للناس ما تحب لنفسك تكن مسلما[۳] — لوگوں کے لیے وہی چاہو جو اپنے لیے چاہتے ہو تو مسلم ہوگے۔

حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا:-

لا يؤمن احدكم حتى يحب للناس ما يحب لنفسه وحتى يحب المرء لا يحبه الا الله عز وجل — تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک کامل مومن نہیں ہو سکتا جب تک وہ سب لوگوں کے لیے وہی محبوب رکھے جو اپنے لیے رکھتا ہے، جب تک وہ دوسرے کو بے غرض صرف خدا کے لیے پیار نہ کرے۔

(مسند احمد جلد ۳ ص ۲۷۲)

---

[۱] زرقانی ج ۶ ص ۲۰۹ جلد ۴ [۲] صحیح بخاری باب الہجرۃ ص ۸۹۰ [۳] جامع ترمذی ابواب الزہد بسند غریب

ایک شخص نے مسجد نبوی میں آکر دعا کی "خدایا! مجکو اور محمد کو مغفرت عطا کر" آپ نے فرمایا "خدا کی رحمت کو تم نے تنگ کر دیا"[1] ایک اور روایت میں ہے کہ ایک اعرابی مسجد نبوی میں آیا اور آپ کے پیچھے نماز پڑھی، نماز پڑھ کر اپنے اونٹ پر سوار ہوا، اور بولا "خداوندا! مجھ پر اور محمد پر رحمت بھیج اور ہماری رحمت میں کسی اور کو شریک نہ کر" آپ نے صحابہ کی طرف خطاب کر کے فرمایا "بتاؤ یہ زیادہ راہ بھولا ہوا ہے یا اس کا اونٹ" (یعنی آپ نے اس قسم کی دعا کو ناپسند فرمایا)[2]

رقیق القلبی | آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نہایت رحم دل اور رقیق القلب تھے، (مالک بن حویرث ایک وفد کے رکن بنکر خدمت اقدس میں حاضر ہوئے تھے، انکو بیس دن تک مجلس نبوی میں شرکت کا موقع ملا تھا، وہ فرماتے تھے:

کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رحیماً رفیقاً[3] | آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم رحیم المزاج اور رقیق القلب تھے،

حضرت زینبؓ کا بچہ مرنے لگا تو انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بلا بھیجا، اور قسم دلائی کہ ضرور تشریف لائیے، مجبوراً آپ تشریف لیگئے، حضرت سعد بن عبادہؓ، معاذ بن جبلؓ، ابی بن کعبؓ، زید بن ثابتؓ بھی ساتھ تھے، بچہ کو لوگ ہاتھ میں لیکر سامنے لائے، وہ دم توڑ رہا تھا، بے اختیار آپ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے، حضرت سعدؓ کو تعجب ہوا کہ یا رسول اللہ! یہ کیا، فرمایا "خدا ان ہی بندوں پر رحم کرتا ہے جو اوروں پر رحم کرتے ہیں"[4]

غزوۂ احد کے بعد جب آپ مدینہ تشریف لائے تو گھر گھر شہیدوں کا ماتم برپا تھا، مستورات اپنے اپنے شہیدوں پر نوحہ کر رہی تھیں، یہ دیکھ کر آپ کا دل بھر آیا اور فرمایا "حمزہؓ (عم رسول اللہ) کا کوئی نوحہ خواں نہیں"[5]

---

[1] صحیح بخاری کتاب الادب [2] ابو داؤد کتاب الادب، شاید یہ دونوں واقعے ایک ہوں [3] بخاری ص ۸۸۸ باب رحمت الناس [4] صحیح بخاری ص ۸۴۴ باب المرضی [5] سیرت جلد اول، احد

ایک بار ایک صحابی جاہلیت کا اپنا ایک قصہ بیان کر رہے تھے کہ میری ایک چھوٹی لڑکی تھی، عرب میں لڑکیوں کے مار ڈالنے کا کہیں کہیں دستور تھا میں نے بھی اپنی لڑکی کو زندہ زمین میں گاڑ دیا، وہ ابا ابا کہکر پکار رہی تھی اور میں اس پر مٹی کے ڈھیلے ڈال رہا تھا، اس بیدردی کو سنکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری ہو گئے، آپنے فرمایا کہ "اس قصہ کو پھر دہراؤ۔" ان صحابی نے اس دردناک ماجرے کو دوبارہ بیان کیا، آپ بے اختیار روئے، یہانتک کہ روتے روتے محاسن مبارک تر ہو گئے۔[۱]

حضرت عباسؓ بدر میں گرفتار ہو کر آئے تو لوگوں نے ان کے ہاتھ پاؤں جکڑ کر باندھ دیے تھے، اور وہ درد سے کراہتے تھے، ان کے کراہنے کی آواز گوش مبارک میں بار بار پہنچ رہی تھی لیکن اس خیال سے ان کے ہاتھ نہیں کھولتے تھے کہ لوگ کہیں گے کہ یہ اپنے عزیز کے ساتھ غیر مساویانہ رحمدلی ہے تاہم نیند نہیں آتی تھی، آپ بے چین ہو ہو کر کروٹیں بدل رہے تھے، لوگوں نے بیقراری کا سبب سمجھکر گرہیں ڈھیلی کر دیں، حضرت عباسؓ کی کرب اور بیچینی رفع ہوئی تو آپنے استراحت فرمایا،

مصعب بن عمیرؓ ایک صحابی تھے، جو اسلام سے پہلے بہت ناز و نعمت میں پلے تھے، ان کے والدین بیش قیمت سے بیش قیمت لباس ان کو پہناتے تھے، خدانے ان کو اسلام کی توفیق عطا فرمائی اور وہ مسلمان ہو گئے، یہ دیکھکر کہ لڑکے نے اپنے آبائی مذہب کو ترک کر دیا ہے، والدین کی محبت دفعۃً عداوت سے بدل گئی، ایک دفعہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت مبارک میں اس حال میں آئے کہ وہ جسم جو حریر و قاقم میں ملبوس رہتا تھا، اس پر پیوند سے ایک کپڑا سالم نہ تھا، یہ پراثر منظر دیکھکر آپ آبدیدہ ہو گئے[۲])

عیادت و تعزیت و غمخواری و عزا | بیماروں کی عیادت میں دوست و دشمن، مومن و کافر کسی کی تخصیص نہ تھی

[۱] مسند دارمی ص اول [۲] ترغیب و ترہیب ج ۲ ص ۲۰۴ بحوالہ ترمذی و مسند ابو یعلیٰ،

(سنن نسائی باب التکبیر علی الجنازہ میں ہے کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم احسن شی عیادۃ المریض، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بیمار کی عیادت کا بہت اچھی طرح خیال رکھا کرتے تھے، بخاری وابوداؤد وغیرہ) میں روایت ہے کہ ایک یہودی غلام مرض الموت میں بیمار ہوا تو آپ عیادت کو تشریف لے گئے۔[1]

عبداللہ بن ثابتؓ جب بیمار ہوئے اور آپ عیادت کو گئے تو ان پر غشی طاری تھی، آواز دی، وہ خبر نہوئے، فرمایا "افسوس ابو الربیع تم پر ہمارا زور اب نہیں چلتا"، یہ سنکر عورتیں بے اختیار چیخ اٹھیں اور رونے لگیں، لوگوں نے روکا، آپنے ارشاد فرمایا "اس وقت رونے دو، مرنے کے بعد البتہ رونا نہیں چاہیے"، عبداللہ بن ثابتؓ کی لڑکی نے کہا، مجکو ان کی شہادت کی امید تھی، کیونکہ جہاد کے سب سامان تیار کر لیے تھے، آپنے فرمایا ان کو نیت کا ثواب مل چکا"۔[2]

حضرت جابرؓ بیمار ہوئے تو اگرچہ ان کا گھر فاصلہ پر تھا، پیادہ پا انکی عیادت کو جایا کرتے تھے،[3] ایک دفعہ وہ بیمار ہوئے تو آپ حضرت ابوبکرؓ کو ساتھ لیکر پیدل انکی عیادت کو گئے، ان پر غشی طاری تھی، پانی منگوا کر وضو کیا، اور بچے ہوئے پانی کو ان کے منہ پر چھڑکا، جابرؓ ہوش میں آگئے، اور عرض کی یا رسول اللہ! اپنا ترکہ کس کو دوں، اس پر یہ آیت اتری یُوصِیکُمُ اللّٰهُ فِی اَوۡلَادِکُمۡ۔[4]

ایک صاحب بیمار ہوئے، آپ چند دفعہ ان کی عیادت کو گئے، جب انھوں نے انتقال کیا تو لوگوں نے اس خیال سے کہ اندھیری رات ہے، آپ کو تکلیف ہوگی خبر نہ کی اور دفن کر دیا، صبح کو معلوم ہوا تو آپنے شکایت کی، اور قبر پر جا کر نماز جنازہ پڑھی،[5]

عبداللہ بن عمروؓ نے غزوۂ احد میں شہادت پائی تھی، اور کافروں نے انکے ہاتھ پاؤں

[1] صحیح بخاری باب عیادۃ المشرک [2] ابوداؤد باب الجنائز [3] ایضاً [4] صحیح بخاری ج ۲ ص ۶۵۸ تفسیر آیت مذکور [5] بخاری کتاب الجنائز

کاٹ ڈالے تھے، ان کی لاش آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے لاکر رکھی گئی اور اس پر چادر ڈالدی گئی، ان کے صاحبزادے (جابر) آئے اور جوش محبت میں چاہا کہ کپڑا اٹھاکر دیکھیں، حاضرین نے روکا، انھوں نے دوبارہ ہاتھ بڑھایا، لوگوں نے پھر روک دیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے درد پدری کے خیال سے حکم دیا کہ چادر اٹھادیجائے، چادر کا اٹھانا تھا کہ عبداللہؓ کی بہن بے اختیار چلا اٹھیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، رونے کی بات نہیں، فرشتے ان کو اپنے پروں کے سایہ میں لے گئے،[1]

ایک دفعہ حضرت سعدؓ بن عبادہ بیمار ہوئے، آپ عیادت کو تشریف لے گئے، ان کو دیکھ کر آپ پر رقت طاری ہوئی، اور آنکھوں سے آنسو نکل آئے، آپ کو روتا دیکھکر سب رو پڑے،[2]

ایک حبشی مسجد میں جھاڑو دیا کرتا تھا، مر گیا، تو لوگوں نے آپ کو خبر نہ کی، ایک دن آپنے اس کا حال دریافت فرمایا، لوگوں نے کہا وہ انتقال کر گیا، ارشاد فرمایا کہ تم نے مجھکو خبر نہ کی، لوگوں نے اس کی تحقیر کی (یعنی وہ اس قابل نہ تھا کہ آپ کو اس کے مرنے کی خبر کیجاتی) آپ نے لوگوں سے اس کی قبر دریافت کی اور جاکر جنازہ کی نماز پڑھی۔[3]

جنازہ جاتا تو آپ کھڑے ہوجاتے، بخاری میں روایت ہے کہ آپنے فرمایا کہ جنازہ جاتا ہو تو اسکے ساتھ جاؤ، ورنہ کم از کم کھڑے ہو جاؤ، اور اسوقت تک کھڑے رہو کہ سامنے سے نکل جائے،[5]

اگرچہ آپ نہایت رقیق القلب اور متاثر الطبع تھے خصوصاً اعزہ کی وفات کا آپ کو سخت صدمہ ہوتا تھا تاہم نوحہ اور ماتم کو نہایت ناپسند فرماتے تھے، حضرت جعفرؓ (حضرت علیؓ کے بھائی تھے) سے آپکو

---

[1] بخاری جنائز ص ۲، [2] ایضاً ص ۴، [3] بخاری باب الصلوٰۃ علی القبر میں ابوہریرہؓ کی روایت کے راوی نے شک کیا ہے کہ یہ مرد تھا یا عورت لیکن دوسری روایتوں میں اس کا عورت ہونا بہ تعیین ذکر ہے، (ام محجن اس کا نام تھا)، [4] بخاری ص ۸، الکتاب الجنائز [5] بخاری ص ۵، ج اول کتاب الجنائز،

نہایت محبت تھی، جب ان کی شہادت کی خبر آئی تو آپ مجلس ماتم میں بیٹھے، اسی حالت میں کسی نے آکر کہا کہ جعفر کی عورتیں رو رہی ہیں، آپنے فرمایا جاکر منع کر دو، وہ گئے اور واپس آکر کہا کہ میں نے منع کیا، لیکن وہ باز نہیں آتیں، آپنے دوبارہ منع کرا بھیجا، پھر بھی وہ باز نہ آئیں، سہ بارہ منع کرنے پر بھی جب وہ باز نہ آئیں تو فرمایا کہ جاکر ان کے منہ میں خاک ڈال دو۔[1]

لطف طبع | کبھی کبھی ظرافت کی باتیں فرماتے، ایک دفعہ حضرت انسؓ کو پکارا تو فرمایا "او دو کان والے"[2] اس میں یہ نکتہ بھی تھا کہ حضرت انسؓ نہایت اطاعت شعار تھے، اور ہر وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد پر کان لگائے رکھتے تھے، حضرت انسؓ کے چھوٹے بھائی کا نام ابو عمیر تھا، وہ کمسن تھے، اور ایک ممولا پال رکھا تھا، اتفاق سے وہ مر گیا، ابو عمیر کو بہت رنج ہوا، آپ نے ان کو غمزدہ دیکھا تو فرمایا یا اباعمیر مافعل النغیر[3] یعنی ابو عمیر! تمھارے ممولے نے یہ کیا کیا۔

ایک شخص نے خدمت اقدس میں آکر عرض کی کہ مجھ کو کوئی سواری عنایت ہو، ارشاد ہوا کہ "میں تم کو اونٹنی کا بچہ دوں گا۔" انھوں نے کہا "یا رسول اللہ میں اونٹنی کا بچہ لیکر کیا کروں گا۔" آپ نے فرمایا "کوئی اونٹ ایسا بھی ہوتا ہے جو اونٹنی کا بچہ نہ ہو"

ایک بڑھیا خدمت اقدس میں آئی کہ حضور میرے لیے دعا فرمائیں کہ مجھکو بہشت نصیب ہو، آپنے فرمایا بڑھیاں بہشت میں نہ جائیں گی، اس کو بہت صدمہ ہوا، اور روتی ہوئی واپس چلی، آپنے صحابہ سے فرمایا کہ "اس سے کہدو کہ بڑھیاں جنت میں جائیں گی لیکن جوان ہو کر جائیں گی۔"[4]

ایک بدوی صحابی تھے، جن کا نام زاہرؓ تھا، وہ دیہات کی چیزیں آپ کی خدمت میں ہدیۃً بھیجا کرتے

[1] بخاری کتاب الجنائز باب من جلس عند المصیبۃ [2] شمائل ترمذی [3] صحیح بخاری [4] شمائل ترمذی،

تھے، ایک دفعہ وہ شہر میں آئے، گاؤں سے جو چیزیں لائے تھے، ان کو بازار میں فروخت کر رہے تھے، اتفاقاً آپ ادھر سے گذرے، زاہرؓ کے پیچھے جا کر ان کو گود میں دبا لیا، انھوں نے کہا کون ہے چھوڑ دو، مڑ کر دیکھا تو سرور عالمؐ تھے، اپنی پیٹھ اور بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سینہ سے لپٹا دی، آپ نے فرمایا کوئی اس غلام کو خریدتا ہے! بولے کہ یا رسول اللہ مجھ جیسے غلام کو جو شخص خریدے گا نقصان اٹھائے گا، آپ نے فرمایا لیکن خدا کے نزدیک تمہارے دام زیادہ ہیں،[1]

ایک شخص نے آ کر شکایت کی کہ میرے بھائی کے شکم میں گرانی ہے، فرمایا شہد پلاؤ، وہ دوبارہ آئے کہ شہد پلایا لیکن شکایت اب بھی باقی ہے، آپ نے پھر شہد پلانے کی شکایت کی، سہ بارہ آئے پھر وہی جواب ملا، چوتھی بار آئے تو ارشاد فرمایا کہ "خدا سچا ہے" (قرآن میں ہے کہ شہد میں شفا ہے) لیکن تمہارے بھائی کا پیٹ جھوٹا ہے، جا کر شہد پلاؤ۔" اب کی پلایا تو شفا ہو گئی،[2] معدہ میں مادہ فاسد کثرت سے موجود تھا، جب پورا تنقیہ ہو گیا تو گرانی جاتی رہی۔

اولاد سے محبت

اولاد سے نہایت محبت تھی، معمول تھا کہ جب کبھی سفر فرماتے تو سب سے آخر میں حضرت فاطمہؓ کے پاس جاتے اور سفر سے واپس آتے تو جو شخص سب سے پہلے باریاب خدمت ہوتا وہ بھی حضرت فاطمہؓ ہی ہوتیں، ایک دفعہ کسی غزوہ میں گئے، اس اثنا میں حضرت فاطمہؓ نے دونوں صاحبزادوں (حسنین علیہما السلام) کے لیے چاندی کے کنگن بنوائے، اور دروازے پر پردے لٹکائے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم واپس تشریف لائے تو خلاف معمول حضرت فاطمہؓ کے گھر نہیں گئے، وہ سمجھ گئیں، فوراً پردوں کو چاک کر ڈالا اور صاحبزادوں کے ہاتھ سے کنگن اتار لیے، صاحبزادے روتے ہوئے خدمت اقدس میں حاضر ہوئے، آپ نے کنگن لیکر بازار

[1] شمائل ترمذی [2] بخاری ص ۸۴۸ باب الدواء بالعسل،

میں بھجدیئے کہ ان کے بدلے ہاتھی دانت کے کنگن لادو۔

حضرت فاطمہؓ جب آپ کی خدمت میں تشریف لاتیں تو آپ کھڑے ہوجاتے، ان کی پیشانی چومتے اور اپنی نشست گاہ سے ہٹ کر اپنی جگہ بٹھاتے۔

ابو قتادہؓ کا بیان ہے کہ ہم لوگ مسجد نبویؐ میں حاضر تھے کہ دفعۃً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم امامہؓ (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نواسی تھیں) کو کندھے پر چڑھائے ہوئے تشریف لائے، اور اسی حالت میں نماز پڑھائی، جب رکوع میں جاتے تو ان کو اتار دیتے، پھر کھڑے ہوتے تو چڑھا لیتے، اسی طرح پوری نماز ادا کی۔[1]

حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ میں نے کسی کو اپنے خاندان سے اتنی محبت کرتے نہیں دیکھا، جس قدر آپ کرتے تھے، آپ کے صاحبزادے حضرت ابراہیم عوالی میں پرورش پاتے تھے، جو مدینہ سے تین چار میل ہے، ان کے دیکھنے کے لیے مدینہ سے پیادہ پا جاتے، گھر میں دھواں ہوتا رہتا تھا، گھر میں جاتے بچہ کو انا کے ہاتھ سے لے لیتے اور منہ چومتے، پھر مدینہ کو واپس آتے۔[2]

ایک دفعہ اقرع بن حابس عرب کے ایک رئیس خدمتِ اقدس میں آئے، آپ حضرت امام حسینؓ کا منہ چوم رہے تھے، عرض کی کہ میرے دس بچے ہیں، میں نے کبھی کسی کو بوسہ نہیں دیا، ارشاد فرمایا کہ "جو اوروں پر رحم نہیں کرتا، اس پر بھی رحم نہیں کیا جاتا۔" (یعنی خدا اس پر رحم نہیں کرتا)

حسنین علیہما السلام سے بے انتہا محبت تھی، فرماتے تھے کہ میرے گلدستے ہیں، حضرت فاطمہؓ کے گھر تشریف لے جاتے تو فرماتے کہ میرے بچوں کو لانا، وہ صاحبزادوں کو لاتیں، آپ ان کو سونگھتے اور سینہ سے لپٹاتے۔

[1] نسائی ص ۱۲۰ باب ادخال الصبیان فی المساجد، صحیح بخاری میں بھی یہ حدیث مذکور ہے [2] صحیح مسلم ج ۲ ص ۲۹۱

ایک دفعہ مسجد میں خطبہ فرما رہے تھے، اتفاق سے حسنین علیہما السلام سرخ کرتے پہنے ہوئے آئے، کمسنی کی وجہ سے ہر قدم پر لڑکھڑاتے جاتے تھے، آپ ضبط نہ کرسکے، منبر سے اتر کر گود میں اٹھا لیا اور اپنے سامنے بٹھا لیا، پھر فرمایا، خدا نے سچ کہا ہے، اِنَّمَآ اَمْوَالُکُمْ وَاَوْلَادُکُمْ فِتْنَۃٌ

فرمایا کرتے تھے، حسین میرا ہے اور میں حسین کا ہوں، خدا اس سے محبت رکھے جو حسین سے محبت رکھتا ہے[1]

ایک دفعہ امام حسنؓ یا امام حسینؓ دوشِ مبارک پر سوار تھے، کسی نے کہا کیا سواری ہاتھ آئی ہے، آپ نے فرمایا سوار بھی کیسا ہے[1]

ایک دفعہ امام حسنؓ یا امام حسینؓ (راوی کو تعین یاد نہیں رہا) آپ کے قدم پر قدم رکھ کر کھڑے تھے، آپ نے فرمایا اوپر چڑھ آؤ، انھوں نے آپ کے سینہ پر قدم رکھ دیے، آپ نے منہ چوم کر فرمایا، اے خدا! میں اس سے محبت رکھتا ہوں تو بھی رکھ[2]

ایک دفعہ آپ کہیں دعوت میں جا رہے تھے، امام حسین علیہ السلام راہ میں کھیل رہے تھے آپ نے آگے بڑھ کر ہات پھیلا دیے، وہ ہنستے ہوئے پاس آ آ کر نکل جاتے تھے، بالآخر آپ نے ان کو پکڑ لیا، ایک ہات انکی ٹھوڑی پر اور ایک سر پر رکھ کر سینہ سے لپٹا لیا، پھر فرمایا حسین میرا ہے اور میں اسکا ہوں[3]

اکثر امام حسین علیہ السلام کو گود میں لیتے اور ان کے منہ میں منہ ڈالتے اور فرماتے کہ خدایا! میں اس کو چاہتا ہوں اور اس کو بھی چاہتا ہوں جو اس کو چاہے،

آپ کے داماد (حضرت زینبؓ کے شوہر) جب بدر سے قید ہو کر آئے تو فدیہ کی رقم ادا نہ کرسکے تو گھر

---

[1] یہ تمام روایتیں شمائل ترمذی میں مذکور ہیں۔ اخیر حدیث کے ایک راوی کی نسبت ترمذی نے لکھا ہے کہ بعض اہل علم نے اس کو ضعیف الحافظ کہا ہے [2] ادب المفرد بخاری ص ۱۵ [3] ایضاً ص ۷۰

کہلا بھیجا، حضرت زینب رضؓ نے اپنے گلے کا ہار بھیجدیا، یہ وہ ہار تھا کہ حضرت زینب رضؓ کے جہیز میں حضرت خدیجہ رضؓ نے ان کو دیا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہار دیکھا تو بیتاب ہو گئے اور آنکھوں سے آنسو نکل آئے، پھر صحابہ سے فرمایا کہ اگر تمھاری مرضی ہو تو یہ ہار زینب رضؓ کو بھیجدوں، سب نے بسر و چشم منظور کیا۔

حضرت زینب رضؓ کی کمسن صاحبزادی کا نام اُمامہ تھا، ان سے آپ کو بہت محبت تھی، آپ نماز پڑھتے میں بھی ان کو ساتھ رکھتے، جب آپ نماز پڑھتے تو وہ دوش مبارک پر سوار ہو جاتیں، رکوع کے وقت آپ ان کو کاندھے سے اتار دیتے تھے، پھر کھڑے ہوتے تو وہ پھر سوار ہو جاتیں، روایتوں کے الفاظ سے مفہوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خود ان کو کاندھوں پر بٹھالیتے اور اتار دیتے تھے لیکن ابن القیم نے لکھا ہے کہ یہ عمل کثیر ہے، وہ خود سوار ہو جاتی ہونگی اور منع نہ فرماتے ہوں گے۔

(آپ کی ایک نواسی حالتِ نزع میں تھیں، صاحبزادی نے بلا بھیجا، آپ تشریف لے گئے، تو لڑکی اسی حالت میں آغوش مبارک میں رکھ دی گئی، آپ نے اس کی حالت دیکھی تو آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے، حضرت سعد رضؓ نے کہا یا رسول اللہ آپ یہ کیا کر رہے ہیں، آپنے فرمایا یہ رحم ہے جس کو خدا نے اپنے بندوں کے دلوں میں ڈال دیا ہے[1]

حضرت ابراہیم کی وفات میں بھی آپنے آبدیدہ ہو کر فرمایا تھا، آنکھیں آنسو بہا رہی ہیں، دل غمزدہ ہو رہا ہے، لیکن منھ سے ہم وہی باتیں کہیں گے جس کو خدا پسند کرتا ہے[2] لیکن یہ محبت صرف اپنے ہی آل و اولاد کے ساتھ مخصوص نہ تھی، بلکہ عموماً بچوں سے آپ کو انس تھا،

---

[1] بخاری کتاب المرضی ص ۸۴۴۔ [2] بخاری کتاب الجنائز ص ۱۷۴،

ازواجِ مطہرات رضؓ کے سامعاشرت

سلسلۂ نسب یہ ہے خدیجہ بنت خویلد بن اسعد بن عبد العزیٰ بن قصی قصی پر پہنچکر ان کا خاندان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان سے مل جاتا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے طاہرہ کے لقب سے مشہور تھیں، ان کی والدہ فاطمہ بنت زائدہ تھیں، ان کے والد اپنے قبیلہ میں ممتاز تھے، مکہ میں آکر سکونت اختیار کی اور بنو عبد الدار کے حلیف بنے[1]، عامر بن لوی کے خاندان میں فاطمہ بنت زائدہ سے نکاح کیا، ان کے بطن سے حضرت خدیجہؓ پیدا ہوئیں، انکی پہلی شادی ابوہالہ بن زرارہ تمیمی سے ہوئی ان سے دو لڑکے پیدا ہوئے، ایک کا نام ہند[2] تھا اور دوسرے کا حارث، ابو ہالہ کے انتقال کے بعد عتیق بن عابد مخزومی کے عقد نکاح میں آئیں، ان سے ایک لڑکی پیدا ہوئی، اس کا نام بھی ہند تھا اسی بنا پر حضرت خدیجہؓ ام ہند کے نام سے پکاری جاتی تھیں، ہند نے اول اسلام قبول کیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مفصل حلیہ ان ہی کی روایت سے منقول ہے، نہایت فصیح و بلیغ تھے، حضرت علیؓ کے ساتھ جنگ جمل میں شریک تھے، اور شہید ہوئے[3]

عتیق کے انتقال کے بعد حضرت خدیجہؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عقد نکاح میں آئیں جسکے مفصل حالات گذر چکے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے چھ اولادیں ہوئیں، دو صاحبزادے کہ دونوں بچپن میں انتقال کر گئے، اور چار صاحبزادیاں، حضرت فاطمہ زہراؓ، حضرت زینبؓ، حضرت رقیہؓ، حضرت ام کلثومؓ، ان سب کے حالات آگے آئیں گے،

---

[1] طبقات ابن سعد ذکر خدیجہ، کتاب النساء، [2] طبقات ابن سعد [3] اصابہ ذکر ہند۔

حضرت خدیجہؓ کی ایک بہن ہالہ تھیں، وہ اسلام لائیں اور حضرت خدیجہؓ کی وفات کے بعد تک زندہ رہیں۔

حضرت خدیجہؓ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بے انتہا محبت تھی، جب وہ عقد نکاح میں آئیں تو انکی عمر چالیس ۴۰ برس کی تھی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پچیس ۲۵ سال کے تھے، نکاح کے بعد وہ پچیس ۲۵ برس تک زندہ رہیں انکی زندگی تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسری شادی نہیں کی، حضرت خدیجہؓ کی وفات کے بعد آپ کا معمول تھا کہ جب کبھی گھر میں کوئی جانور ذبح ہوتا تو آپ ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر حضرت خدیجہؓ کی ہمنشین عورتوں کے پاس گوشت بھجواتے تھے، حضرت عائشہؓ کہتی ہیں، کہ گو میں نے خدیجہؓ کو نہیں دیکھا، لیکن مجکو جس قدر اُن پر رشک آتا تھا کسی اور پر نہیں آتا تھا جس کی وجہ یہ تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ انکا ذکر کیا کرتے تھے، ایک دفعہ میں نے اس پر آپ کو رنجیدہ کیا لیکن آپنے فرمایا کہ "خدا نے مجکو انکی محبت دی ہے"۔ [۱]

ایک دفعہ ان کے انتقال کے بعد ان کی بہن ہالہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ملنے آئیں اور استیذان کے قاعدہ سے اندر آنے کی اجازت مانگی، انکی آواز حضرت خدیجہؓ سے ملتی تھی، آپ کے کانوں میں آواز پڑی تو حضرت خدیجہؓ یاد آگئیں اور آپ جھجک اٹھے اور فرمایا کہ "ہالہ ہونگی"، حضرت عائشہؓ بھی موجود تھیں انکو نہایت رشک ہوا بولیں کہ "آپ کیا ایک بڑھیا کی یاد کرتے ہیں جو مرچکیں، اور خدا نے ان سے اچھی بیویاں دیں" صحیح بخاری میں یہ روایت یہیں تک ہے لیکن استیعاب میں ہے کہ جواب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "ہرگز نہیں، جب لوگوں نے میری تکذیب کی تو انھوں نے تصدیق کی، جب لوگ کافر تھے تو وہ اسلام لائیں، جب میرا کوئی معین نہ تھا تو انھوں نے میری مدد کی"۔

[۱] صحیح مسلم فضائل خدیجہؓ

حضرت سودہؓ بنت زمعہ

ازواج مطہرات میں یہ فضیلت صرف حضرت سودہؓ کو حاصل ہے کہ حضرت خدیجہؓ کے انتقال کے بعد سب سے پہلے وہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عقد نکاح میں آئیں، وہ ابتدائے نبوت میں مشرف با سلام ہو چکی تھیں، اس بنا پر ان کو قدیم الاسلام ہونے کا شرف بھی حاصل ہے، انکی شادی پہلے سکران بن عمروؓ سے ہوئی تھی، حضرت سودہؓ ان ہی کے ساتھ اسلام لائیں، اور ان ہی کیساتھ حبشہ کی طرف ہجرت (ہجرت ثانیہ) کی، حبشہ سے مکہ کو واپس آئیں، سکران نے کچھ دن کے بعد وفات پائی، اور ایک لڑکا یادگار چھوڑا جس کا نام عبدالرحمن تھا، انھوں نے جنگ جلولا میں شہادت حاصل کی۔

حضرت خدیجہؓ کے انتقال سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نہایت پریشان و غمگین تھے، یہ حالت دیکھکر خولہؓ بنت حکیم نے عرض کی کہ آپ کو ایک مونس رفیق کی ضرورت ہے، آپنے فرمایا ہاں گھر بار بال بچوں کا انتظام سب خدیجہ کے متعلق تھا، آپکے ایما سے وہ حضرت سودہؓ کے والد کے پاس گئیں اور جاہلیت کے طریقہ پر سلام کیا انعم صباحاً، پھر نکاح کا پیغام سنایا، انھوں نے کہا ہاں محمد شریف کفو ہیں لیکن سودہ سے بھی تو دریافت کرو، غرض سب مراتب طے ہوگئے، تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خود تشریف لے گئے اور سودہ کے والد نے نکاح پڑھایا[1]، چار سو درہم مہر قرار پایا، نکاح کے بعد عبداللہ بن زمعہ (حضرت سودہؓ کے بھائی) جو اسوقت کافر تھے آئے، اور انکو یہ حال معلوم ہوا تو سر پر خاک ڈال لی کہ کیا غضب ہوگیا، چنانچہ اسلام لانے کے بعد اپنی اس حماقت پر ہمیشہ ان کو افسوس آتا تھا،

---

[1] طبقات میں ہے کہ رمضان سنہ ۱۰ھ میں انکا نکاح ہوا، زرقانی نے سنہ ۸ھ بھی لکھا ہے، یہ اختلاف اس بنا پر ہے کہ خود حضرت خدیجہؓ کے وفات کے سنہ میں اختلاف ہے۔

حضرت عائشہ رضؓ اور سودہ رضؓ کا خطبہ اور نکاح چونکہ قریب قریب ایک ہی زمانہ میں ہوا، اس لیے مورخین میں اختلاف ہے کہ کس کو تقدم حاصل ہے، ابن اسحاق کی روایت ہے کہ سودہ کو تقدم ہے، عبد اللہ بن محمد بن عقیل کا قول ہے کہ وہ حضرت عائشہ رضؓ کے بعد نکاح میں آئیں،

شکل و شباہت حضرت سودہ رضؓ بلند بالا اور فربہ اندام تھیں اور اس وجہ سے تیزی کیساتھ چل پھر نہیں سکتی تھیں، حجۃ الوداع میں جب مزدلفہ سے روانہ ہونے کا وقت آیا تو انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اسی بنا پر سب سے پہلے چلنے کی اجازت مانگی کہ انکو بھیڑ بھاڑ میں چلنے سے تکلیف ہوگی، آیت حجاب سے پہلے عرب کے قدیم طرز پر ازواج مطہرات قضائے حاجت کے لیے صحرا کو جایا کرتی تھیں، حضرت عمر رضؓ کو یہ ناگوار ہوتا تھا، اس بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پردہ کی تحریک کرتے رہتے تھے لیکن ابھی استدعا قبول نہیں ہوئی تھی کہ حضرت سودہ رضؓ رات کے وقت قضائے حاجت کے لیے نکلیں، چونکہ ان کا قد نمایاں تھا، حضرت عمر رضؓ نے کہا، سودہ رضؓ! تم کو ہم نے پہچان لیا، اسی واقعہ کے بعد آیت حجاب نازل ہوئی،[1]

اخلاق و عادات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق و عادات میں سخاوت و فیاضی ایک نمایاں وصف

---

[1] بخاری ج ۲ ص ۷۰، آیت حجاب کے شان نزول میں سخت اختلاف ہے، ایک روایت تو یہی ہے، دوسری روایت یہ ہے کہ حضرت عمر رضؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ آپکے یہاں نیک و بد ہر قسم کے لوگ آتے ہیں، کاش آپ ان کو پردے کا حکم دیتے، ابن جریر نے اپنی تفسیر میں مجاہد سے روایت کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کیساتھ کھانا کھا رہے تھے، حضرت عائشہ رضؓ بھی شریک طعام تھیں، ایک آدمی کا ہاتھ حضرت عائشہ کے ہاتھ سے چھو گیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ناگوار گذرا، اس پر یہ آیت حجاب اتری، عام طور پر مشہور ہے کہ حضرت زینب رضؓ کے دعوت ولیمہ میں آیت حجاب نازل ہوئی، چنانچہ صحاح میں یہ واقعہ بہ تفصیل موجود ہے، حافظ ابن حجر نے ان روایتوں میں یہ تطبیق دی ہے کہ آیت حجاب کے نزول کے متعدد اسباب تھے، جن میں آخری سبب حضرت زینب رضؓ کا واقعہ تھا اور وہی آیت کا شان نزول ہے، کیونکہ خود آیت میں واقعہ کی طرف اشارے پائے جاتے ہیں (فتح الباری ج ۱ ص ۲۱۹)

تھا، اس بنا پر صحابہ میں جس کو آپ سے جس قدر تقرب حاصل تھا، اسی قدر اس پر اس وصفِ خاص کا زیادہ اثر پڑتا تھا، ازواج مطہرات کو آپ کے اخلاق وعادات وفیض صحبت سے متمتع ہونیکا سب سے زیادہ موقع حاصل تھا اس لیے یہ وصف ان میں عموماً نظر آتا ہے، حضرت سودہؓ اس وصف میں باستثنائے حضرت عائشہؓ سب سے ممتاز تھیں، ایکدفعہ حضرت عمرؓ نے انکی خدمت میں ایک تھیلی بھیجی، لانے والے سے پوچھا اس میں کیا ہے، بولا درہم، بولیں کھجور کی تھیلی میں درہم بھیجے جاتے ہیں، یہ کہکر اسی وقت سب کو تقسیم کر دیا،

اطاعت اور فرمانبرداری بھی ان کا خاص وصف ہے، اور اس وصف میں وہ تمام ازواجِ مطہرات سے ممتاز ہیں۔

روایت حدیث | ان کے ذریعہ سے صرف پانچ حدیثیں مروی ہیں، جن میں سے بخاری میں صرف ایک ہے صحابہ میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور یحییٰ بن عبدالرحمٰن بن اسعد بن زرارہ نے ان سے روایت کی ہی،

وفات | حضرت سودہؓ کے سنہ وفات میں اختلاف ہی، واقدی کے نزدیک انھوں نے امیر معاویہؓ کے زمانہ خلافت ۵۴ھ میں وفات پائی، حافظ ابن حجر ان کا سال وفات ۵۵ھ قرار دیتے ہیں، امام بخاری نے تاریخ میں بسند صحیح روایت کی ہے کہ حضرت عمرؓ کے زمانہ خلافت میں انتقال کیا، ذہبی نے تاریخ کبیر میں اس پر یہ اضافہ کیا ہی کہ حضرت عمرؓ کی خلافت کے آخری زمانہ میں وفات کی، حضرت عمرؓ نے ۲۳ھ میں وفات پائی ہی اس لیے انکا زمانہ خلافت ۲۲ھ ہوگا، خمیس میں ہے کہ یہی روایت سب سے زیادہ صحیح ہے[1]۔

حضرت عائشہؓ

عائشہ[2] نام تھا، اگرچہ ان سے کوئی اولاد نہیں ہوئی، تاہم اپنے بھانجے عبداللہ بن زبیرؓ کے

[1] زرقانی ج ۳ ص ۲۶۲ میں بتفصیل مذکور ہی، طبقات ابن سعد میں صرف پہلی روایت نقل کی ہی [2] حضرت عائشہؓ کے حالات اور خصوصاً ان کے علمی اجتہادات کے لیے الگ مستقل تصنیف درکار ہی، یہاں صرف ضروری سوانح زندگی لکھدیے گئے ہیں،

تعلق سے ام عبداللہ کنیت کرتی تھیں، ماں کا نام زینب اور ام رومان کنیت تھی، بعثت کے چار برس بعد پیدا ہوئیں،

سنہ ۱۰ نبوی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کیساتھ نکاح ہوا، اس وقت شش سالہ تھیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے جبیر بن مطعم کے صاحبزادے سے منسوب تھیں حضرت خدیجہؓ کے انتقال کے بعد خولہ بنت حکیم نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے نکاح کی تحریک کی، آپنے رضامندی ظاہر کی، خولہ نے ام رومان سے کہا، انھوں نے حضرت ابوبکرؓ سے مذکور کیا، بولے کہ جبیر بن مطعم سے وعدہ کر چکا ہوں اور میں کبھی وعدہ خلافی نہیں کی، لیکن مطعم نے خود اس بنا پر انکار کر دیا کہ اگر حضرت عائشہؓ ان کے گھر میں آگئیں تو گھر میں اسلام کا قدم آجائیگا، بہرحال حضرت ابوبکرؓ نے خولہ کے ذریعہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عقد کر دیا، چار سو درہم مہر قرار پایا، لیکن مسلم میں حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ ازواج مطہرات کا مہر پانچسو درہم ہوتا تھا۔

نکاح کے بعد مکہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا قیام ۳ سال تک رہا، سنہ ۱۳ میں آپنے ہجرت کی تو حضرت ابوبکرؓ ساتھ تھے، اہل و عیال کو مکہ چھوڑ آئے تھے، جب مدینہ میں اطمینان ہوا تو حضرت ابوبکرؓ نے عبداللہ بن اریقط کو بھیجا کہ ام رومان، اسماء اور عائشہ کو لے آئیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی زید بن حارثہؓ اور ابو رافع کو حضرت فاطمہؓ، ام کلثومؓ اور حضرت سودہؓ وغیرہ کے لانے کے لیے روانہ فرمایا، مدینہ میں آکر حضرت عائشہؓ سخت بخار میں مبتلا ہوئیں، اشتداد مرض سے سر کے بال تک جھڑ گئے، صحت ہوئی تو ام رومان کو رسم عروسی ادا کرنے کا خیال آیا، اس وقت حضرت عائشہؓ کی عمر ۹ سال کی تھی، سہیلیوں کیساتھ جھولا جھول رہی تھیں، کہ ام رومان نے حضرت عائشہؓ کو آواز دی، انکو اس واقعہ کی خبر تک نہ تھی، ماں کے پاس آئیں، انھوں نے منھ دھویا بال درست کیے، گھر میں لے گئیں، انصار کی عورتیں انتظار میں تھیں، یہ گھر میں داخل ہوئیں تو

سب نے مبارکباد دی، چاشت کے وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے، اور رسم عروسی ادا ہوئی، شوال میں نکاح ہوا تھا، اور شوال ہی میں یہ رسم بھی ادا کی گئی، زمانۂ قدیم میں اس مہینہ میں طاعون آیا تھا، اس بنا پر اہل عرب اس مہینہ کو اس تقریب کے لیے مکروہ خیال کرتے تھے، اس خیال کے مٹانے کیلیے غالباً یہ مہینہ انتخاب کیا گیا تھا

وفات

حضرت عائشہ رضؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کیساتھ ۹ برس تک زندگی بسر کی، ۹ سال کی عمر میں وہ آپ کے پاس آئیں اور جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انتقال فرمایا تو انکی عمر ۱۸ سال کی تھی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد حضرت عائشہ رضؓ قریباً ۴۸ سال تک زندہ رہیں، ۵۸ھ میں وفات پائی، اسوقت انکی عمر ۶۶ سال کی تھی، وصیت کے مطابق جنۃ البقیع میں رات کے وقت دفن ہوئیں، قاسم بن محمد، عبداللہ بن عبدالرحمن، عبداللہ بن ابی عتیق، عروہ بن زبیر اور عبداللہ بن زبیر رضؓ نے قبر میں اتارا، اسوقت حضرت ابوہریرہ رضؓ مروان بن حکم کی طرف سے مدینہ کے حاکم تھے، اس لیے انھوں نے نماز جنازہ پڑھائی،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت عائشہ رضؓ سے بہت محبت تھی، اسی محبت سے آپ نے مرض الموت میں تمام ازواج مطہرات سے اجازت لی اور اپنی زندگی کے آخری دن حضرت عائشہ رضؓ کے حجرے میں بسر کیے، اس محبت کا اظہار جن طریقوں سے ہوتا تھا، ان کے متعلق احادیث وسیر میں نہایت کثرت سے واقعات درج ہیں۔

علمی زندگی

حضرت عائشہ رضؓ کی علمی زندگی بھی نمایاں حیثیت رکھتی ہے، حضرت ابوبکر رضؓ، حضرت عمر رضؓ، حضرت عثمان رضؓ کے زمانہ میں فتویٰ دیتی تھیں، اکابر صحابہ پر انھوں نے دقیق اعتراضات کیے ہیں، جنکو علامہ سیوطی نے ایک رسالہ میں جمع کر دیا ہے، ان سے ۲۲۱۰ حدیثیں مروی ہیں جن میں ۱۷۴ حدیثوں پر شیخین نے اتفاق کیا ہے، بخاری نے منفرداً ان سے ۵۴ حدیثیں روایت کی ہیں، ۶۸ حدیثوں میں امام مسلم منفرد ہیں، بعض لوگوں کا قول ہے کہ احکام شرعیہ میں سے ایک چوتھائی ان سے منقول ہے، (ترمذی میں ہے کہ صحابہ کے سامنے

جب کوئی مشکل سوال پیش آجاتا تھا تو اسکو حضرت عائشہؓ ہی حل کرتی تھیں، انکے شاگردوں کا بیان ہے کہ ہم نے ان سے زیادہ خوش تقریر نہیں دیکھا، تفسیر، حدیث، اسرار شریعت، خطابت اور ادب و انساب میں انکو کمال تھا، شعراء کے بڑے بڑے قصیدے انکو زبانی یاد تھے، حاکم نے مستدرک میں اور ابن سعد نے طبقات میں تفصیل ان واقعات کو لکھا ہے اور مسند ابن حنبل وغیرہ میں بھی جستہ جستہ انکے فضل و کمال کے دلائل و شواہد ملتے ہیں۔

حضرت حفصہؓ

حضرت حفصہؓ، حضرت عمرؓ کی صاحبزادی تھیں، ماں کا نام زینب بن مظعون تھا، بعثت سے پانچ برس پہلے عین اُس سال جب قریش خانۂ کعبہ کو تعمیر کر رہے تھے پیدا ہوئیں، انکی پہلی شادی خنیسؓ بن حذافہ سے ہوئی اور ان ہی کے ساتھ مدینہ کو ہجرت کی، خنیسؓ نے غزوۂ بدر میں زخم کھائے اور واپس آکر ان ہی زخموں کی وجہ سے شہادت[۱] پائی، خنیسؓ نے اپنی یادگار میں حضرت حفصہؓ کے بطن سے کوئی اولاد نہیں چھوڑی[۲]، حضرت حفصہؓ کے بیوہ ہوجانے کے بعد حضرت عمرؓ کو ان کے نکاح کی فکر ہوئی، اسوقت اتفاق سے اسی زمانہ میں حضرت رقیہؓ کا انتقال ہوچکا تھا، اس بنا پر سب سے پہلے حضرت عمرؓ نے ان کے نکاح کی خواہش حضرت عثمانؓ سے کی، انھوں نے کہا میں اس معاملہ میں غور کروں گا، حضرت عمرؓ نے حضرت ابوبکرؓ

---

[۱] زرقانی ج ۳ ص ۲۷۰، یہ عام طور پر یہی مشہور ہے لیکن اصابہ میں ہے کہ غزوۂ احد میں شہید ہوئے، حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں لکھا ہے کہ حضرت عمرؓ نے رقیہ کے انتقال کے بعد حضرت عثمانؓ سے انکے نکاح کی خواہش کی تھی، اور یہ مسلم ہے کہ حضرت رقیہؓ کا انتقال غزوۂ بدر کے بعد ہوا، اور اسی وجہ سے حضرت عثمانؓ شریک غزوۂ بدر نہ ہوسکے، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ خنیسؓ نے غزوۂ بدر کے بعد وفات پائی، دوسری روایت میں ہے کہ حضرت عثمانؓ مغموم بیٹھے ہوئے تھے، حضرت عمرؓ ادھر سے گذرے اور پوچھا کہ حفصہؓ سے نکاح کرتے ہو، اس کی عدت گذر گئی، اگر خنیس نے احد میں شہادت پائی ہوتی تو ان کی عدت کا زمانہ ۴ھ ہوتا، حالانکہ ان کا نکاح ۳ھ میں ہوا (فتح الباری جلد ۹ صفحہ ۱۵۲)

[۲] طبری ج ۳ ص ۱۷۷۱،

سے ذکر کیا، انھوں نے خاموشی اختیار کی حضرت عمرؓ کو انکی بے التفاتی سے رنج ہوا، اس کے بعد خود جناب رسالت پناہؐ نے حضرت حفصہؓ سے نکاح کی خواہش کی نکاح ہوگیا تو حضرت ابو بکرؓ حضرت عمرؓ سے ملے، اور کہا کہ جب تم نے مجھ سے حفصہ کے نکاح کی درخواست کی اور میں خاموش رہا تو تم کو ناگوار گذرا لیکن میں نے اسی بنا پر کچھ جواب نہیں دیا کہ رسول اللہؐ نے ان کا ذکر کیا تھا، اور میں آپ کا راز فاش کرنا نہیں چاہتا تھا، اگر رسول اللہؐ نے ان سے نکاح نہ کر لیا ہوتا تو میں اس کے لیے آمادہ تھا[1]

حضرت حفصہؓ آخر حضرت عمرؓ کی بیٹی تھیں، اس لیے مزاج میں ذرا تیزی تھی، صحیح بخاری میں واقعہ ایلاء کے متعلق خود حضرت عمرؓ کا بیان ہے کہ "ہم لوگ زمانۂ جاہلیت میں عورتوں کو کوئی چیز نہیں سمجھتے تھے ایک دن کسی معاملہ میں غور کر رہا تھا، اتفاق سے میری بی بی نے مجکو مشورہ دیا، میں نے کہا تم کو ان معاملات میں کیا دخل ہے، بولیں کہ تم میری بات پسند نہیں کرتے، حالانکہ تمھاری بیٹی رسول اللہ کو برابر کا جواب دیتی ہے، میں اٹھا اور حفصہؓ کے پاس آیا میں نے کہا بیٹی! تم رسول اللہ کو جواب دیتی ہو، یہانتک کہ آپ دن بھر رنجیدہ رہتے ہیں، بولیں ہاں ہم ایسا کرتے ہیں میں نے کہا خبردار میں تمھیں عذاب الٰہی سے ڈراتا ہوں، تم اس کے گھمنڈ میں نہ آجانا جس کے حسن نے رسول اللہ کو فریفتہ کر لیا ہے[2]" (یعنی عائشہ)

ترمذی میں ہے کہ ایک دفعہ حضرت صفیہؓ رو رہی تھیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور رونے کی وجہ پوچھی، انھوں نے کہا مجکو حضرت حفصہؓ نے کہا ہے کہ "تم یہودی کی بیٹی ہو" آپ نے فرمایا تم نبی کی بیٹی ہو، تمھارا چچا پیغمبر ہے، اور پیغمبر کے نکاح میں ہو، حفصہ تم پر کس بات میں فخر کر سکتی ہے[3]"

ایک بار حضرت عائشہؓ اور حفصہؓ نے حضرت صفیہؓ سے کہا کہ ہم رسول اللہ کے نزدیک تم سے زیادہ

---

[1] بخاری ج ۲ ص ۵۶۰، [2] صحیح بخاری ج ۲ ص ۷۳۰، [3] ترمذی ص ۶۳۸ کتاب المناقب،

معزز ہیں، ہم آپ کی بیوی بھی ہیں اور چچازاد بہن بھی"۔ حضرت صفیہؓ کو ناگوار گذرا، انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اسکی شکایت کی، آپ نے فرمایا کہ تم نے یہ کیوں نہیں کہا کہ تم مجھ سے زیادہ کیونکر معزز ہوسکتی ہو، میرے شوہر محمدؐ، میرے باپ ہارونؑ اور میرے چچا موسیٰؑ ہیں"۔

حضرت عائشہؓ اور حضرت حفصہؓ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کی بیٹی تھیں، جو تقرب نبوی میں دوش بدوش تھے، اس بنا پر حضرت عائشہؓ اور حضرت حفصہؓ دیگر ازواج کے مقابلہ میں باہم ایک تھیں، لیکن کبھی کبھی خود بھی باہم رشک و رقابت کا اظہار ہوجایا کرتا تھا، ایک مرتبہ حضرت عائشہؓ اور حضرت حفصہؓ دونوں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سفر میں تھیں، رسول اللہؐ راتوں کو حضرت عائشہؓ کے اونٹ پر چلتے تھے، اور ان سے باتیں کرتے تھے، ایک دن حضرت حفصہؓ نے حضرت عائشہؓ سے کہا کہ آج رات کو تم میرے اونٹ پر اور میں تمھارے اونٹ پر سوار ہوں تاکہ مختلف مناظر دیکھنے میں آئیں، حضرت عائشہؓ راضی ہوگئیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عائشہؓ کے اونٹ کے پاس آئے جس پر حفصہؓ سوار تھیں، جب منزل پر پہنچے اور حضرت عائشہؓ نے آپ کو نہیں پایا تو اپنے پاؤں کو اذخر (ایک گھاس ہے جس میں سانپ بچھو رہتے ہیں) کے درمیان لٹکا کر کہنے لگیں "خداوندا! کسی بچھو یا سانپ کو متعین کر جو مجھے ڈس جائے"۔

وفات | حضرت حفصہؓ نے ۴۵ھ میں جو امیر معاویہؓ کی خلافت کا زمانہ تھا، وفات پائی، وفات سے پیشتر اپنے بھائی عبداللہ بن عمرؓ سے اس وصیت کی تجدید کی جو حضرت عمرؓ نے انکو کی تھی، کچھ جائداد بھی وقف کی اور کچھ مال صدقہ میں دیا، مروان بن حکم نے جو اس وقت مدینہ کا گورنر تھا، نماز جنازہ پڑھائی اور

۱؎ اس امر کا خاص طور پر لحاظ رکھنا چاہیے کہ ازواج مطہرات میں اس قسم کی روایتیں صرف حفصہؓ و حضرت عائشہؓ کے متعلق مذکور ہیں، اسکے اسباب کی تلاش کرنی چاہیے، حضرت ابوبکرؓ و حضرت عمرؓ کیساتھ منافقین کو جو عداوت تھی وہ قابل لحاظ ہے،

کے گھر سے مغیرہ بن شعبہ کے گھر تک جنازہ کو کاندھا دیا، یہاں سے قبر تک حضرت ابوہریرہؓ جنازہ کو لے گئے، انکے بھائی عبداللہ، عاصم، سالم، عبداللہ، حمزہ، عبداللہ بن عمرؓ کے لڑکوں نے قبر میں اتارا،[1]

حضرت زینب ام المساکینؓ

زینب نام تھا، چونکہ فقراء و مساکین کو نہایت فیاضی کے ساتھ کھانا کھلاتی تھیں، اس لیے ام المساکین کی کنیت کیساتھ مشہور ہوگئیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے عبداللہ بن جحشؓ کے نکاح میں تھیں، عبداللہ بن جحش نے جنگ احد ۳ھ میں شہادت پائی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی سال ان سے نکاح کر لیا، نکاح کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس صرف دو تین مہینے رہنے پائی تھیں کہ انکا انتقال ہوگیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں حضرت خدیجہؓ کے بعد صرف یہی ایک بی بی تھیں جنھوں نے وفات پائی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود نماز جنازہ پڑھائی، اور جنۃ البقیع میں دفن ہوئیں، وفات کے وقت انکی عمر ۳۰ سال کی تھی،

حضرت ام سلمہؓ

ہند نام، ام سلمہ کنیت تھی، باپ کا نام سہیل اور ماں کا عاتکہ تھا، پہلے عبداللہ بن عبدالاسد کے نکاح میں تھیں جو زیادہ تر ابوسلمہ کے نام سے مشہور ہیں، اور جو ان کے چچازاد اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے رضاعی بھائی تھے، اپنے شوہر ہی کے ساتھ اسلام لائیں اور ان ہی کے ساتھ سب سے پہلے حبشہ کی طرف ہجرت کی، چنانچہ سلمہ

---

[1] حضرت حفصہؓ کے بھی سنہ وفات میں اختلاف ہے، ایک روایت ہے کہ انھوں نے جمادی الاول ۴۱ھ میں وفات پائی، اسوقت ۵۹ سال کا تھا، لیکن اگر سنہ وفات ۴۵ھ قرار دیا جائے تو ان کی عمر ۶۳ سال کی ہوگی، ایک روایت ہے کہ انھوں نے حضرت عثمانؓ کی خلافت میں ۲۷ھ میں انتقال کیا، یہ روایت اس بنا پر کہی گئی کہ وہبؓ ابن مالک سے روایت کی کہ جس سال افریقہ فتح ہوا حفصہ نے اسی سال وفات پائی اور افریقہ حضرت عثمانؓ کی خلافت میں ۲۷ھ میں فتح ہوا لیکن یہ سخت غلطی ہے، افریقہ دو مرتبہ فتح ہوا ہے، اس دوسری فتح کا فخر حضرت معاویہؓ بن خدیج کو حاصل ہے اور یہ فتح ۵۰ھ میں ہوئی، وہب بن مالک نے حفصہ کا سال وفات اسی فتح کے سنہ کو قرار دیا

ان کے بیٹے حبشہ ہی میں پیدا ہوئے، حبشہ سے مکہ میں آئیں، اور یہاں سے مدینہ کو ہجرت کی، ہجرت میں انکو یہ فضیلت حاصل ہوئی کہ اہل سیر کے نزدیک وہ پہلی عورت ہیں جو ہجرت کرکے مدینہ میں آئیں۔

ان کے پہلے شوہر ابو سلمہؓ بڑے شہسوار تھے، مشہور غزوات بدر و احد میں شریک ہوئے، غزوۂ احد میں چند زخم کھائے جن کے صدمہ سے جانبر نہ ہو سکے، اور جمادی الثانی ۴ھ میں وفات پائی، ان کے جنازہ کی نماز نہایت اہتمام سے پڑھی گئی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ۹ تکبیریں کہیں، لوگوں نے نماز کے بعد پوچھا یا رسول اللہ! آپ کو سہو تو نہیں ہوا، فرمایا یہ ہزار تکبیر کے مستحق تھے۔

ابو سلمہؓ کی وفات کے وقت ام سلمہؓ حاملہ تھیں، وضع حمل کے بعد جب عدت گذر گئی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے نکاح کرنا چاہا تو انھوں نے چند عذر پیش کیے:۔

۱۔ میں سخت غیور عورت ہوں،

۲۔ صاحب عیال ہوں،

۳۔ میرا سن زیادہ ہے،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سب زحمتوں کو گوارا کیا،

وفات | اہل سیر متفق اللفظ ہیں کہ ازواج مطہراتؓ میں سب کے بعد حضرت ام سلمہؓ نے وفات پائی لیکن ان کے سنہ وفات میں نہایت اختلاف ہے، واقدی نے ۵۹ھ بتایا ہے، ابراہیم حربی کے نزدیک ۶۲ھ ہے، اور تقریب میں اسی کو صحیح کہا ہے، امام بخاری نے تاریخ کبیر میں لکھا ہے کہ ۵۸ھ میں وفات پائی، بعض روایتوں میں ہے کہ ۶۱ھ میں جب امام حسینؓ کی شہادت کی خبر آئی اس وقت ان کا انتقال ہوا ہے، ابن عبد اللہ نے اس روایت کی تصحیح کی ہے،

اس اختلافِ روایت کی حالت میں سنہ وفات کی تعیین مشکل ہے، تاہم یہ یقینی ہے کہ وہ واقعۂ حرہ تک زندہ تھیں، مسلم میں ہے کہ حارث بن عبداللہ بن ابی ربیعہ اور عبداللہ بن صفوان ام سلمہؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور اس لشکر کا حال پوچھا جو زمین میں دھنس جائے گا یہ سوال اس وقت کیا گیا تھا جب یزید نے مسلم بن عقبہ کو لشکر شام کے ساتھ مدینہ کی طرف بھیجا تھا، اور واقعہ حرہ پیش آیا تھا، واقعہ حرہ ۶۳ھ میں پیش آیا ہے، اس لیے اس سے پہلے ان کی وفات کی تمام روایتیں صحیح نہیں۔

ابن عبدالبر نے لکھا ہے کہ حضرت ام سلمہؓ کی وصیت کی بنا پر سعید بن زید نے نماز جنازہ پڑھائی لیکن اس روایت کی صحت میں کلام ہے، سعید بن زید نے باختلاف روایت ۵۱ھ یا ۵۲ھ یا ۵۸ھ میں انتقال کیا ہے، اور یہ یقینی طور پر ثابت ہے کہ اس وقت ام سلمہؓ زندہ تھیں، واقدی نے لکھا ہے کہ ابوہریرہؓ نے انکا جنازہ پڑھایا، مگر انکی وفات کے وقت سعید بن زید زندہ ہوتے تو حضرت ابوہریرہؓ خلاف وصیت کیونکر نماز جنازہ پڑھ سکتے تھے، بہرحال ازواج مطہرات میں سب کے بعد حضرت ام سلمہؓ نے وفات پائی، اور وفات کے وقت ان کی عمر ۸۴ سال کی تھی۔

فضل وکمال ازواجِ مطہرات میں حضرت عائشہؓ کے بعد فضل وکمال میں ان ہی کا درجہ ہے، ابن سعد نے طبقات میں اسکی تصریح کی ہے، روایت حدیث اور نقل احکام میں حضرت عائشہؓ کے سوا اور تمام بی بیوں پر ان کو فضیلت حاصل ہے، صلح حدیبیہ میں جب صحابہ کو مکہ سے باہر حلق اور قربانی میں تامل تھا، تو حضرت ام سلمہؓ ہی کی تدبیر سے یہ مشکل حل ہوئی اور ان کی یہ دانشمندی اور عقل و ذہانت کی سب سے بہتر مثال ہے، یہ واقعہ صحیح بخاری میں بہ تفصیل موجود ہے،

حضرت زینب رض

ازواج مطہرات میں جو بیبیاں حضرت عائشہ رض کی ہمسری کا دعویٰ رکھتی تھیں ان میں حضرت زینب رض بھی تھیں، خود حضرت عائشہ رض کہتی ہیں کانت تسامینی یعنی وہ میرا مقابلہ کرتی تھیں اور ان کو اسکا حق بھی تھا، نسبی حیثیت سے وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپھی زاد بہن تھیں، جمال میں بھی ممتاز تھیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی ان سے نہایت محبت تھی زہد و ورع میں یہ حال تھا کہ جب حضرت عائشہ رض پر اتہام لگایا گیا اور اس اتہام میں خود حضرت زینب رض کی بہن حمنہ شریک تھیں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے حضرت عائشہ رض کی اخلاقی حالت دریافت کی تو انھوں نے صاف لفظوں میں کہدیا۔

ما علمت الا خیراً — مجکو حضرت عائشہ رض کی بھلائی کے سوا کسی چیز کا علم نہیں

حضرت عائشہ رض کو ان کے اس صدق و اقرار حق کا خود اعتراف کرنا پڑا۔

عبادت میں نہایت خشوع و خضوع کے ساتھ مشغول رہتی تھیں، جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم انکو عقد میں لانا چاہا تو انھوں نے کہا کہ میں بغیر استخارہ کے کوئی رائے قائم نہیں کرتی،

ایک دفعہ آپ مہاجرین پر کچھ مال تقسیم کر رہے تھے، حضرت زینب رض اس معاملہ میں کچھ بول اٹھیں، حضرت عمر رض نے ڈانٹا، آپ نے فرمایا ان سے درگذر کرو، یہ اواہ ہیں (یعنی خاشع و متضرع ہیں)

نہایت قانع اور فیاض طبع تھیں، خود اپنے دست و بازو سے معاش پیدا کرتی تھیں، اور اس کو خدا کی راہ میں لٹا دیتی تھیں، ایک دفعہ حضرت عمر رض نے ان کا سالانہ نفقہ بھیجا، انھوں نے اس پر ایک کپڑا ڈالدیا اور برزہ بنت رافع کو حکم دیا، میرے خاندانی رشتہ داروں اور یتیموں کو تقسیم کردو، برزہ نے کہا آخر ہمارا بھی کچھ حق ہی، انھوں نے کہا کہ کپڑے کے نیچے جو کچھ ہے وہ تمھارا ہی دیکھا تو پچاسی درہم نکلے جب تمام

مال تقسیم ہو چکا تو دعا کی کہ خدایا اس سال کے بعد میں عمرؓ کے عطیہ سے فائدہ نہ اٹھاؤں، یہ دعا مقبول ہوئی اور اسی سال ان کا انتقال ہو گیا۔

وفات | آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ازواج مطہرات سے فرمایا تھا،

اسرعکن لحاقابی اطولکن یدا — تم میں مجھ سے جلد وہ ملے گی جس کا ہاتھ لمبا ہوگا،

یہ استعارۃً فیاضی کی طرف اشارہ تھا، لیکن ازواجِ مطہرات اسکو حقیقت سمجھیں، چنانچہ باہم اپنے ہاتھوں کو ناپا کرتی تھیں، حضرت زینبؓ اپنی فیاضی کی بنا پر اس پیشینگوئی کا مصداق ثابت ہوئیں، ازواج مطہرات میں سب سے پہلے انتقال کیا، کفن کا خود سامان کر لیا تھا، اور وصیت کی تھی کہ حضرت عمرؓ بھی کفن دیں تو ان میں سے ایک صدقہ کر دینا، چنانچہ یہ وصیت پوری کی گئی، حضرت عمرؓ نے نماز جنازہ پڑھائی، اس کے بعد ازواج مطہرات سے دریافت کیا کہ کون قبر میں داخل ہوگا۔ انھوں نے کہا وہ شخص جوان کے گھر میں داخل ہوا کرتا تھا (چنانچہ اسامہؓ، محمد بن عبداللہ بن جحش، عبداللہ بن ابی احمد بن جحش نے ان کو قبر میں اتارا)

۲۰ھ میں انتقال کیا اور ۵۳ برس کی عمر پائی، واقدی نے لکھا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے جس وقت ان کا نکاح ہوا اس وقت ۳۵ سال کی تھیں۔

حضرت جویریہؓ

حضرت جویریہؓ حارث بن ضرار کی بیٹی تھیں، قبیلۂ بنی مصطلق کا سردار تھا، مسافع بن صفوان سے شادی ہوئی تھی، جو غزوۂ مریسیع میں قتل ہوا، اس لڑائی میں کثرت سے لونڈی غلام مسلمانوں کے ہاتھ آئے، ان ہی لونڈیوں میں حضرت جویریہؓ بھی تھیں، جب مالِ غنیمت کی تقسیم ہوئی تو وہ ثابت بن

قیسؓ بن شماسؓ انصاری کے حصہ میں آئیں،

اسلام میں اگر آقا راضی ہو تو لونڈی غلام کچھ رقم ادا کر کے آزاد ہو سکتے ہیں، اس طریقہ کو فقہاء کی اصطلاح میں کتابت کہتے ہیں، اسی اصول کے موافق حضرت جویریہؓ مکاتبہ بن گئیں، ان کو شرط کے موافق ۹ اوقیہ سونا ادا کرنا تھا، لیکن یہ رقم ان کی استطاعت سے بہت زیادہ تھی، وہ رسول اللہ کے پاس آئیں اور کہا یا رسول اللہ! میں مسلمان کلمہ گو عورت اور جویریہ حارث کی بیٹی ہوں جو اپنی قوم کا سردار ہے، مجھ پر جو مصیبتیں آئی ہیں، وہ آپ سے مخفی نہیں، میں ثابت بن قیس کے حصہ میں آئی اور ۹ اوقیہ سونے پر ان سے عہد کتابت کیا، یہ رقم میرے امکان میں نہ تھی، لیکن میں نے آپ کے بھروسہ پر اسکو منظور کر لیا اور اب آپ سے اسکا سوال کرنے کے لیے آئی ہوں" آپنے فرمایا تو کیا تم کو اس سے بہتر چیز کی خواہش نہیں"؟ انھوں نے کہا وہ کیا چیز ہے؟ آپنے فرمایا میں یہ رقم ادا کر دیتا ہوں اور تم سے نکاح کر لیتا ہوں، وہ راضی ہو گئیں، آپنے ثابت بن قیس کو بلایا، وہ بھی راضی ہو گئے آپنے رقم ادا کی اور ان کو آزاد کر کے نکاح کر لیا یہ خبر پھیلا تو لوگوں نے قبیلۂ بنی مصطلق کے تمام لونڈی غلاموں کو اس بنا پر آزاد کر دیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان لوگوں سے رشتۂ مصاہرت قائم کر لیا، آزاد شدہ غلاموں کی تعداد ایک روایت میں سات سو بتائی گئی ہے حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ "جویریہ کی برکت سے سیکڑوں گھرانے آزاد کر دیے گیے"! بعض روایتوں سے آگیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے خود حضرت جویریہؓ نے یہ خواہش ظاہر کی تھی، اور آپنے تمام قیدیوں کو ان پر ہبہ کر دیا تھا۔

حضرت جویریہؓ نے ۵۰ھ میں وفات پائی اور جنۃ البقیع میں دفن ہوئیں، اس وقت انکا سن ۶۵ برس کا تھا،

حضرت ام حبیبہؓ

رملہ نام اور ام حبیبہ کنیت تھی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے ۱۷ سال پہلے پیدا ہوئیں، اور عبید اللہ بن جحش کی

عقد ہوگیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے تو دونوں مشرف باسلام ہوئے اور حبشہ کی طرف ہجرت ثانیہ کی ایک روایت ہے کہ انکی بیٹی حبیبہ جنکی کنیت کے ساتھ وہ مشہور ہیں حبشہ ہی میں پیدا ہوئیں حبشہ میں جاکر عبید اللہ ابن حجش نے عیسائیت قبول کرلی لیکن ام حبیبہ رض اسلام پر قائم رہیں، اختلاف مذہب کی بناپر عبید اللہ ابن حجش نے ان سے علیحدگی اختیار کی، اور اب وہ وقت آگیا کہ انکو اسلام اور ہجرت کی فضیلت کے ساتھ ام المومنین بننے کا شرف بھی حاصل ہو چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عمرو بن امیۃ الضمری کو نجاشی کی خدمت میں بغرض نکاح بھیجا جب وہ نجاشی کے پاس پہنچے تو نجاشی نے ام حبیبہ رض کو اپنی لونڈی ابرہہ کے ذریعہ سے پیغام دیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مجکو تمہارے نکاح کے لیے لکھا ہے، انھوں نے خالد بن سعید اموی کو وکیل مقرر کیا اور اس مژدہ کے صلہ میں ابرہہ کو چاندی کے دو کنگن اور انگوٹھیاں دیں، جب شام ہوئی تو نجاشی نے جعفر بن ابی طالب رض اور وہاں کے مسلمانوں کو جمع کرکے خود نکاح پڑھایا[1]، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے چارسو دینار مہر ادا کیا[2]،

تمام لوگوں کے سامنے خالد بن سعید کو یہ رقم دیگئی تو لوگوں نے بعد نکاح اٹھنا چاہا، لیکن نجاشی نے کہا دعوت ولیمہ تمام پیغمبروں کی سنت ہے ابھی بیٹھنا چاہیے" چنانچہ کھانا آیا، لوگ دعوت کھاکے رخصت ہوئے، جب مہر کی رقم ام حبیبہ رض کو ملی تو انھوں نے پچاس دینار ابرہہ کو دیے لیکن اس نے اس رقم کو

---

[1] سال نکاح میں اختلاف ہے، مشہور یہ ہے کہ ۶ھ میں نکاح ہوا لیکن بعض روایتوں میں ۷ھ بھی بیان کیا گیا ہے، ممکن ہو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عمرو بن الضمری کو بغرض نکاح بھیجا ہو، اور ۷ھ میں نکاح پڑھایا گیا ہو، اس میں بھی اختلاف ہے کہ نکاح کہاں ہوا، اور کس نے پڑھایا لیکن صحیح یہ ہے کہ حبشہ میں نکاح ہوا اور نجاشی نے نکاح پڑھایا

[2] صحیح روایت یہی ہے لیکن اور بھی مختلف تعدادیں بیان کی گئی ہیں بعض روایتوں میں ۹۰۰ سو دینار ہیں، بعضوں کے نزدیک چار ہزار دینار ہیں، ابوداؤد میں دینار کے بجائے چار ہزار درہم ہے، زہری کی روایت میں چالیس اوقیہ کی تعداد کا ذکر ہے، اس لیے اگر چاندی ہوگی تو اس کے سولہ سو درہم ہوتے ہیں۔

اس کنگن کے ساتھ جو پہلے دیے گئے تھے، یہ کہکر واپس کر دیا کہ بادشاہ نے مجکو منع کر دیا ہے، دوسرے روز ان کی خدمت میں عود، زعفران، عنبر وغیرہ لے کر آئی، جن کو وہ اپنے ساتھ رسول اللہ کی خدمت میں لائیں، جب نکاح کے تمام رسومات ادا ہو گئے، تو نجاشی نے ان کو شرحبیل بن حسنہ رضی کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں روانہ کیا۔

ام حبیبہ رضی نے ۴۴ھ میں وفات پائی، اور مدینہ میں دفن ہوئیں۔

حضرت میمونہ رض

میمونہ نام، باپ کا نام حارث، اور ماں کا نام ہند تھا، پہلے مسعود بن عمرو بن عمیر الثقفی کے نکاح میں تھیں، مسعود نے طلاق دیدی، تو ابورہم بن عبدالعزیٰ نے نکاح کر لیا، ابورہم کے انتقال کے بعد رسول اللہ صلعم کے نکاح میں آئیں، نکاح کے متعلق مختلف روایتیں ہیں، ایک روایت یہ ہے کہ انھوں نے اپنے آپ کو ہبہ کیا۔

دوسری روایت یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ سے اپنے غلام ابورافع کو اوس بن خولی کے ساتھ وکیل بناکر بھیجا، اور انھوں نے ایجاب و قبول کیا، لیکن صحیح روایت یہ ہے کہ حضرت عباس رضی نے اس نکاح کی تحریک کی اور ان ہی نے نکاح پڑھایا۔

وفات یہ عجیب حسن اتفاق ہے کہ مقام سرف میں انکا نکاح ہوا تھا اور سرف ہی میں انھوں نے انتقال بھی کیا، حضرت عبداللہ بن عباس رضی نے جنازہ کی نماز پڑھائی اور قبر میں اتارا، صحاح میں ہے

۱؎ بعضوں نے سال وفات ۶۳ھ لکھا ہے، ابن ابی خیثمہ کے نزدیک ان کا سال وفات ۵۹ھ ذلیعض لوگوں نے ۶۰ھ اور بعضوں نے ۵۵ھ بیان کیا ہے، ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ دمشق میں مدفون ہوئیں،

جب انکا جنازہ اٹھایا گیا تو حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے کہا، یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بی بی ہیں، جنازہ کو زیادہ حرکت نہ دو، بہ ادب آہستہ سے چلو۔

سال وفات کے متعلق اگرچہ اختلاف ہی لیکن صحیح یہ ہی کہ انھوں نے ۵۱ھ میں وفات پائی۔

حضرت صفیہؓ

صفیہ اصل نام نہ تھا، زرقانی نے لکھا ہے کہ عرب میں مال غنیمت کا جو بہترین حصہ امام یا بادشاہ کے لیے مخصوص ہوجاتا تھا، اس کو صفیہ کہتے تھے، چونکہ وہ جنگ خیبر میں اسی طریقہ کے موافق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح میں آئی تھیں، اس لیے صفیہ کے نام سے مشہور ہوگئیں، ورنہ اصلی نام زینب تھا باپ کا نام حیی بن اخطب اور ماں کا نام ضرہ تھا حضرت صفیہؓ کو باپ اور ماں دونوں کیجانب سے سیادت حاصل تھی، باپ قبیلہ بنو النضیر کا سردار اور ماں قریظہ کے رئیس کی بیٹی تھی۔ حضرت صفیہؓ کی شادی پہلے سلام بن مشکم القرظی سے ہوئی تھی، ابن مشکم نے طلاق دی تو کنانہ بن ابی الحقیق کے نکاح میں آئیں، کنانہ جنگ خیبر میں مقتول ہوا، حضرت صفیہؓ کے باپ اور بھائی بھی کام آئے، اور خود بھی گرفتار ہوئیں، جب خیبر کے تمام قیدی جمع کیے گئے تو دحیہ کلبیؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک لونڈی کی درخواست کی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انتخاب کرنے کی اجازت دی، انھوں نے حضرت صفیہؓ کو منتخب کیا، لیکن ایک صحابی نے آپ کی خدمت میں آکر عرض کی کہ آپ نے رئیسۂ بنو نضیر و قریظہ کو دحیہ کو دیدیا، وہ تو صرف آپکے قابل ہی، آپنے حکم دیا کہ دحیہ اس عورت کے ساتھ حاضر ہوں، وہ صفیہ کو لیکر آئے تو آپنے ان کو دوسری لونڈی عنایت فرمائی، اور صفیہ کو آزاد کر کے نکاح کر لیا، خیبر سے روانہ ہوئے تو مقام صہبا میں رسم عروسی ادا کی، اور جو کچھ سامان لوگوں کے پاس تھا اس کو

جمع کرکے دعوت ولیمہ فرمائی، وہاں سے روانہ ہوئے تو آپ نے ان کو خود اپنے اونٹ پر سوار کرلیا، اور اپنے عبا سے ان پر پردہ کیا، یہ گویا اس بات کا اعلان تھا کہ وہ ازواج مطہرات میں داخل ہوگئیں۔

حضرت صفیہ رضؓ کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو نہایت محبت تھی، اور ہر موقع پر ان کی دلجوئی فرماتے تھے، ایک بار آپ سفر میں تھے، ازواج مطہرات بھی ساتھ تھیں، حضرت صفیہ رضؓ کا اونٹ سو اتفاق سے بیمار ہوگیا، حضرت زینب رضؓ کے پاس ضرورت سے زیادہ اونٹ تھے، آپ نے ان سے کہا کہ ایک اونٹ صفیہ کو دیدو، انھوں نے کہا کہ کیا میں اس یہودیہ کو اپنا اونٹ دوں؟ اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان سے اس قدر ناراض ہوئے کہ دو مہینے تک ان کے پاس نہ گئے۔

ایک بار آپ حضرت صفیہ رضؓ کے پاس تشریف لے گئے، دیکھا کہ رو رہی ہیں، آپ نے رونے کی وجہ پوچھی، انھوں نے کہا کہ عائشہ رضؓ اور زینب رضؓ کہتی ہیں کہ "ہم تمام ازواج میں افضل ہیں، ہم آپ کی زوجہ ہونے کے ساتھ آپ کی چچازاد بہن بھی ہیں" آپ نے فرمایا تم نے یہ کیوں نہ کہہ دیا کہ ہارون میرے باپ، موسیٰ علیہ السلام میرے چچا اور محمد میرے شوہر ہیں، اس لیے تم لوگ کیونکر مجھ سے افضل ہوسکتی ہو"؟

حضرت صفیہ رضؓ نے ۵۰ھ میں وفات پائی اور جنۃ البقیع میں دفن ہوئیں۔

اولاد

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد کی تعداد میں سخت اختلاف ہے متفق علیہ روایت یہ ہے کہ آپ کے چھ اولادیں تھیں، قاسم، ابراہیم، زینب، رقیہ، ام کلثوم، فاطمہ، ان تمام لڑکیوں نے اسلام کا زمانہ پایا اور ہجرت سے شرف اندوز ہوئیں، لیکن ابن اسحاق نے دو صاحبزادوں کا نام اور لیا ہے، طاہر طیب، اس بنا پر اولاد ذکور کی تعداد لڑکیوں کے برابر ہو جاتی ہے۔

اس بارہ میں تمام ... اقوال کے جمع کرنے سے ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بارہ اولادیں تھیں، جن میں آٹھ لڑکے اور چار لڑکیاں تھیں، لڑکیوں کی تعداد میں کسی قسم کا اختلاف نہیں البتہ صاحبزادوں کی تعداد میں سخت اختلاف ہے، مجموعی تعداد آٹھ تک پہنچتی ہے، جن میں قاسم اور ابراہیم پر تمام راویوں کا اتفاق ہے، حضرت ابراہیم ماریہ قبطیہ رضی سے اور بقیہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے تھیں[1]۔

حضرت قاسم رض

آپ کی اولاد میں سب سے پہلے حضرت قاسم رض پیدا ہوئے (اور غالباً نبوت سے گیارہ برس پہلے پیدا ہوئے ہوں گے) مجاہد کے نزدیک، یہ صرف سات دن زندہ رہے، ابن سعد کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ دو سال تک زندہ رہے، ابن فارس نے لکھا ہے کہ سن تمیز کو پہنچ گئے تھے۔

(آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد میں جس طرح یہ سب سے پہلے پیدا ہوئے تھے، اسی طرح سب سے پہلے انتقال بھی کیا) عام روایت یہ ہے کہ قبل بعثت وفات پائی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کنیت ابو القاسم ان ہی کے انتساب سے ہے، آپ اس کنیت کو بہت پسند فرماتے تھے، صحابہ بھی جب آپ کا محبت سے نام لیتے ابو القاسم ہی کہتے، ایک دن

[1] زرقانی ص ۲۲۱

آپؐ بازار سے گذر رہے تھے کہ پیچھے سے کسی نے یا ابا القاسم کہکر آواز دی، آپنے مڑ کر دیکھا تو اس نے کہا یا رسول اللہ! میں اسی نام کے ایک اور شخص کو پکار رہا ہوں، رفع اشتباہ کیلئے پھر آپنے منع فرمایا کہ کوئی یہ کنیت نہ رکھے

حضرت زینبؓ

اہل سیر کا اتفاق ہے کہ لڑکیوں میں سب سے بڑی تھیں، زبیر بن بکار کا قول ہے کہ حضرت قاسم کے بعد پیدا ہوئیں، لیکن ابن کلبی کے نزدیک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سب سے پہلی اولاد حضرت زینبؓ ہی ہیں، بعثت سے دس برس پہلے جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر ۳۰ سال کی تھی، پیدا ہوئیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب مکہ معظمہ سے ہجرت فرمائی تو اہل و عیال مکہ میں رہ گئے تھے حضرت زینبؓ کی شادی ان کے خالہ زاد بھائی ابو العاص بن ربیع لقیط سے ہوئی، غزوۂ بدر میں ابو العاص گرفتار ہو گئے، جب رہا کیے گئے تو ان سے وعدہ لیا گیا کہ مکہ جا کر حضرت زینبؓ کو بھیجدینگے ابو العاص نے مکہ جا کر اپنے بھائی کنانہ کیساتھ ان کو مدینہ کی طرف روانہ کیا، چونکہ کفار کے تعرض کا خوف تھا، کنانہ نے ہتھیار ساتھ لے لیے تھے، مقام ذی طوی میں پہنچے تو کفار قریش کے چند آدمیوں نے تعاقب کیا، ہبار بن اسود نے حضرت زینبؓ کو نیزے سے زمین پر گرا دیا، وہ حاملہ تھیں حمل ساقط ہو گیا، کنانہ نے ترکش سے تیر نکالے اور کہا کہ اب اگر کوئی قریب آیا تو ان تیروں کا نشانہ ہوگا" لوگ ہٹ گئے تو ابوسفیان سرداران قریش کے ساتھ آیا، اور کہا "تیر روک لو ہم کو کچھ گفتگو کرنی ہے" انھوں نے تیر ترکش میں ڈالدیے، ابوسفیان نے کہا "محمدؐ کے ہاتھ سے جو مصیبتیں پہنچی ہیں تم کو معلوم ہیں، اب اگر تم علانیہ ان کی لڑکی کو ہمارے قبضہ سے نکال لے گئے تو لوگ کہیں گے کہ ہماری کمزوری ہے، ہم کو زینب کے روکنے کی ضرورت نہیں، جب شور و ہنگامہ کم ہو جائے، اسوقت چوری چھپے لیجانا

کنانہ نے یہ رائے تسلیم کی اور چند روز کے بعد انکو رات کے وقت لیکر روانہ ہوئے، زید بن حارثہؓ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے سے بھیجدیا تھا، وہ بطن یاجج میں تھے، کنانہ نے زینبؓ کو انکے حوالے کیا، وہ انکو لیکر روانہ ہوگئے۔

حضرت زینبؓ مدینہ میں آئیں اور اپنے شوہر ابو العاص کو حالتِ شرک میں چھوڑا، ابو العاص دوبارہ ایک سریہ میں گرفتار ہوئے[1] اسوقت بھی حضرت زینبؓ نے انکو پناہ دی، مکہ جاکر انھوں نے لوگوں کی امانتیں حوالے کیں، اور اسلام لائے، اسلام لانے کے بعد ہجرت کرکے مدینہ آئے، حضرت زینبؓ نے انکو حالتِ شرک میں چھوڑا تھا، اس لیے دونوں میں باہم تفریق ہوگئی تھی، وہ مدینہ آئے تو حضرت زینبؓ دوبارہ ان کے نکاح میں آئیں، ترمذی وغیرہ میں حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ کوئی جدید نکاح نہیں ہوا لیکن دوسری روایت میں جدید نکاح کی تصریح ہے حضرت عبد اللہ بن عباسؓ کی روایت کو اگرچہ اسناد کے لحاظ سے دوسری روایت پر ترجیح ہے لیکن فقہانے دوسری روایت پر عمل کیا ہے اور حضرت عبد اللہؓ ابن عباسؓ کی یہ تاویل کی ہے کہ نکاح جدید کے مہر اور شرائط وغیرہ میں کسی قسم کا تغیر نہ ہوا ہوگا اس لیے حضرت عبد اللہ بن عباسؓ نے اسکو نکاح اول سے تعبیر کیا، ورنہ بعد تفریق نکاح ثانی ضروری ہے،

ابو العاص نے حضرت زینبؓ کے ساتھ نہایت شریفانہ برتاو کیا، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انکے شریفانہ تعلقات کی تعریف کی، نکاح جدید کے بعد حضرت زینبؓ بہت کم زندہ رہیں، ۷ھ یا ۸ھ میں (باختلاف روایت) ابو العاص اسلام لائے تھے، اور اسی لیے ۸ھ میں حضرت زینبؓ نے انتقال کیا، ام ایمنؓ

---

[1] اصابہ میں ہے کہ ابو العاص قریش کے ایک قافلہ کے ساتھ جمادی الاول ۶ھ میں روانہ ہوئے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے زید بنؓ حارثہ کو، ۱۷۰ سواروں کے ساتھ بھیجا، مقام عیص میں قافلہ ملا، کچھ لوگ گرفتار کیے گئے اور مال و اسباب لوٹ میں آیا، ان ہی میں ابو العاص بھی تھے، ابو العاص آئے تو حضرت زینبؓ نے انکو پناہ دی اور انکی سفارش سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انکا مال بھی واپس کر دیا۔

حضرت سودہ بنت زمعہ اور ام سلمہ رضؓ نے غسل دیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز جنازہ پڑھائی، ابوالعاص اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قبر میں اتارا،

حضرت زینب رضؓ نے دو اولاد چھوڑی، امامہ اور علی، علی کی نسبت ایک روایت ہے کہ بچپن میں وفات پائی، لیکن عام روایت یہ ہے کہ سن رشد کو پہنچے، ابن عساکر نے لکھا ہے کہ یرموک کے معرکہ میں شہادت پائی،

امامہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو نہایت محبت تھی، آپ انکو اوقات نماز میں بھی جدا نہیں کرتے تھے، صحاح میں ہے کہ آپ انکو کاندھے پر رکھ کر نماز پڑھتے تھے، جب رکوع میں جاتے تو دوش مبارک سے اتار دیتے، جب سجدے سے سر اٹھاتے تو پھر سوار کرا لیتے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک مرتبہ کسی نے کچھ چیزیں ہدیے میں بھیجیں، جنمیں ایک زریں ہار بھی تھا، امامہ ایک گوشہ میں کھیل رہی تھیں، آپ نے فرمایا، میں اسکو اپنی محبوب ترین اہل کو دوں گا، ازواج نے سمجھا کہ یہ شرف حضرت عائشہ رضؓ کو حاصل ہوگا، لیکن آپنے امامہ کو بلا کر وہ ہار خود ان کے گلے میں ڈالدیا، ابوالعاص نے حضرت زبیرؓ بن عوام کو امامہ کے نکاح کی وصیت کی تھی، حضرت فاطمہ رضؓ کا انتقال ہوا تو انھوں نے حضرت علی رضؓ سے انکا نکاح کر دیا، حضرت علی رضؓ نے شہادت پائی تو مغیرہ کو وصیت کر گئے کہ امامہ سے نکاح کر لیں، مغیرہ نے نکاح کیا، اور ان سے ایک بچہ پیدا ہوا جسکا نام یحییٰ تھا، لیکن بعض روایتوں میں ہے کہ امامہ کے کوئی اولاد نہیں ہوئی، امامہ نے مغیرہ کے ہاں وفات پائی،

حضرت رقیہ رضؓ

جرجانی نے لکھا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی لڑکیوں میں سب سے چھوٹی تھیں لیکن مشہور روایت یہ ہے کہ حضرت زینب رضؓ کے بعد ۳۳ سنہ قبل نبوت میں پیدا ہوئیں، پہلے ابولہب کے بیٹے عتبہ سے شادی ہوئی، ابن سعد نے لکھا ہے کہ یہ شادی قبل نبوت ہوئی تھی،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دوسری صاحبزادی ام کلثومؓ کی شادی بھی ابولہب کے دوسرے لڑکے عتیبہ سے ہوئی تھی، جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی اور آپ نے دعوتِ اسلام کا اظہار کیا، ابولہب نے بیٹوں کو جمع کر کہا "اگر تم محمد کی بیٹیوں سے علیحدگی اختیار نہیں کرتے تو تمھارے ساتھ میرا سونا بیٹھنا حرام ہے" دونوں فرزندوں نے باپ کے حکم کی تعمیل کی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت رقیہؓ کی شادی حضرت عثمانؓ سے کر دی

دولابی نے لکھا ہے کہ حضرت عثمانؓ کے ساتھ انکا نکاح زمانہ جاہلیت میں ہوا لیکن خود ایک روایت حضرت عثمانؓ سے مروی ہے جسمیں زمانۂ اسلام کی تصریح ہے، نکاح کے بعد حضرت عثمانؓ نے حبش کی طرف ہجرت کی، حضرت رقیہؓ بھی ساتھ گئیں، مدت تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو انکا کچھ حال معلوم نہ ہوا ایک عورت نے آکر خبر دی کہ میں نے ان دونوں کو دیکھا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا دی اور فرمایا کہ ابراہیم اور لوط کے بعد عثمان پہلے شخص ہیں جنھوں نے بی بی کو لیکر ہجرت کی ہے۔

حبش میں حضرت رقیہؓ کے ایک بچہ پیدا ہوا جس کا نام عبداللہ تھا، لیکن صرف ۶ سال زندہ رہا، حضرت عثمانؓ حبش سے مکہ کو واپس آئے اور وہاں سے مدینہ کی طرف ہجرت کی، حضرت رقیہؓ مدینہ میں آکر بیمار ہوئیں، یہ غزوۂ بدر کا زمانہ تھا حضرت عثمانؓ انکی تیمارداری کی وجہ سے شریکِ جہاد نہ ہو سکے، عین اسی دن جس روز زیدؓ بن حارثہ نے مدینہ آکر فتح کا مژدہ سنایا، وفات پائی، غزوۂ بدر کی وجہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کے جنازہ میں شریک نہ ہو سکے۔

حضرت ام کلثومؓ

کنیت ہی کے نام سے مشہور ہیں، ۳ھ میں جو غزوۂ بدر کا سال تھا جب حضرت رقیہؓ کا انتقال ہوا تو ربیع الاول میں حضرت عثمانؓ نے حضرت ام کلثومؓ کیساتھ نکاح کر لیا، بخاری میں ہے کہ جب

حضرت حفصہؓ بیوہ ہوئیں تو حضرت عمرؓ نے حضرت عثمانؓ کے ساتھ نکاح کا پیغام دیا حضرت عثمانؓ نے تامل کیا لیکن دوسری روایتوں میں ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ خبر ہوئی تو آپ نے حضرت عمرؓ سے کہا میں تم کو عثمانؓ سے بہتر شخص کا پتہ دیتا ہوں، اور عثمانؓ کیلئے تم سے بہتر شخص ڈھونڈھتا ہوں، تم اپنی لڑکی کی شادی مجھ سے کر دو اور میں اپنی لڑکی کی شادی عثمان سے کر دیتا ہوں" بہرحال نکاح ہوا، اور نکاح کے بعد حضرت ام کلثومؓ ۶ برس تک حضرت عثمانؓ کے ساتھ رہیں، شعبان ۹ھ میں انتقال کیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز جنازہ پڑھائی اور حضرت علیؓ، حضرت فضل بن عباسؓ، حضرت اسامہ بن زیدؓ نے قبر میں اتارا

حضرت فاطمہ زہراؓ

فاطمہ نام، زہرا لقب، سن ولادت میں اختلاف ہے، ایک روایت ہے کہ سنہ بعثت میں پیدا ہوئیں، ابن اسحاق نے لکھا ہے کہ ابراہیم کے علاوہ آپ کی تمام اولاد قبل نبوت پیدا ہوئی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت چالیس سال کی عمر میں ہوئی تھی، اس بنا پر بعضوں نے دونوں روایتوں میں تطبیق دی ہے کہ سنہ بعثت کے آغاز میں حضرت فاطمہؓ پیدا ہوئی ہوں گی اور چونکہ دونوں کی مدت میں بہت فاصلہ ہے اسلئے اختلاف روایت ہوگیا ہوگا، ابن جوزی نے لکھا ہے کہ بعثت سے پانچ برس پہلے جب خانہ کعبہ کی تعمیر ہو رہی تھی پیدا ہوئیں، بعض روایتوں میں ہے کہ نبوت سے تقریباً ایک سال پیشتر پیدا ہوئیں۔

حضرت فاطمہؓ کا اگر ان کا سال ولادت سنہ ۱ بعثت صحیح تسلیم کر لیا جائے جب پندرہ سال ساڑھے پانچ مہینے کی ہوئیں تو ۲ھ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ کے ساتھ نکاح کر دیا، اس وقت حضرت علیؓ کا سن ۲۱ برس پانچ مہینے کا تھا[1]، حضرت فاطمہؓ سے عقد کی درخواست سب سے پہلے حضرت ابوبکرؓ اور

[1] حضرت علیؓ کے متعلق ایک روایت ہے کہ ۸ برس کی عمر میں اسلام لائے، انکی تعیین اسی روایت کی بنا پر ہے لیکن قول راجح یہ ہے کہ وہ دس سال کی عمر میں مشرف با اسلام ہوئے، اس روایت کی رو سے ان کا سن ۲۴ سال ڈیڑھ مہینہ کا تھا۔

ادا، انکے بعد حضرت عمر رضؓ نے کی تھی لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ جواب نہیں دیا، حضرت علیؓ نے خواہش کی تو آپنے فرمایا تمھارے پاس مہر ادا کرنے کو کچھ ہے؟ بولے ایک گھوڑا اور زرہ کے سوا کچھ نہیں، آپنے فرمایا گھوڑا تو لڑائی کے لیے ضروری ہے، زرہ فروخت کر ڈالو، حضرت عثمانؓ نے ۴۸۰ درہم پر خریدی، اور حضرت علی رضؓ نے قیمت لاکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ڈالدی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بلال رضؓ کو حکم دیا کہ بازار سے خوشبو لائیں، عقد ہوا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جہیز میں ایک پلنگ اور ایک بستر دیا، اصابہ میں لکھا ہے کہ "آپنے ایک چادر، دو چکیاں اور ایک مشک بھی دی" اور یہ عجیب اتفاق ہے کہ یہی دو چیزیں عمر بھر انکی رفیق رہیں۔

نکاح کے بعد رسم عروسی کا وقت آیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ سے کہا کہ ایک مکان لے لیں چنانچہ حارث بن النعمان کا مکان ملا، اور حضرت علی رضؓ نے حضرت فاطمہ رضؓ کے ساتھ اس میں قیام کیا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ حضرت علیؓ اور حضرت فاطمہ رضؓ کے تعلقات میں خوشگواری پیدا کرنیکی کوشش فرماتے تھے، چنانچہ جب حضرت علیؓ اور حضرت فاطمہ رضؓ میں کبھی کبھی خانگی معاملات کے متعلق رنجش ہو جاتی تھی، تو آنحضرتؐ دونوں میں صلح کرادیتے تھے، ایک مرتبہ ایسا اتفاق ہوا، آپ گھر میں تشریف لے گئے اور صفائی کرادی، گھر سے مسرور نکلے، لوگوں نے پوچھا آپ گھر میں گئے تھے، تو اور حالت تھی، اب آپ اسقدر خوش کیوں ہیں، فرمایا میں نے ان دو شخصوں میں مصالحت کرادی جو مجھکو محبوب تر ہیں۔

ایک مرتبہ حضرت علی رضؓ نے ان پر کچھ سختی کی، وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس شکایت لیکر چلیں پیچھے پیچھے حضرت علیؓ بھی آئے، حضرت فاطمہ رضؓ نے شکایت کی، آپنے فرمایا "بیٹی تم کو خود سمجھنا چاہیے کہ کون شوہر اپنی بی بی کے پاس خاموش چلا آتا ہے" حضرت علیؓ پر اس کا یہ اثر ہوا کہ انھوں نے حضرت فاطمہ رضؓ سے کہا "اب میں تمھارے خلاف مزاج کوئی بات نہ کروں گا"

(ایک دفعہ حضرت علیؓ نے ایک دوسرا نکاح کرنا چاہا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہوا تو سخت برہم ہوئے، آپ نے مسجد میں خطبہ دیا، اس میں اپنی ناراضی ظاہر کی، فرمایا "میری لڑکی میرا جگر گوشہ ہے جس سے اس کو دکھ پہنچے گا، مجھے بھی اذیت ہوگی" چنانچہ حضرت علیؓ اس ارادہ سے باز آگئے اور حضرت فاطمہؓ کی زندگی تک پھر کبھی دوسرا نکاح نہیں کیا"[1])

حضرت فاطمہؓ کے پانچ اولادیں ہوئیں حسنؓ، حسینؓ، محسنؓ، ام کلثومؓ، زینبؓ، محسن نے بچپن ہی میں انتقال کیا، حضرت زینبؓ، امام حسنؓ، امام حسین علیہما السلام اور ام کلثومؓ ہم واقعات کی لحاظ سے تاریخ اسلام میں مشہور ہیں

حضرت فاطمہؓ نے رمضان ۱۱ھ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال کے ۶ ماہ بعد[2] وفات پائی، اس وقت ان کا سن ۲۹ سال تھا سن کی تعیین میں سخت اختلاف ہے بعضوں نے ۲۴ سال بعضوں نے ۲۵ سال اور بعضوں نے ۳۰ سال بتایا ہے لیکن زرقانی نے لکھا ہے کہ پہلی روایت زیادہ صحیح ہے، اگر ۱ھ کو سال ولادت قرار دیا جائے تو اسوقت انکا یہ سن نہیں ہو سکتا تھا، البتہ اگر ۲۴ سال کی عمر تسلیم کیجائے تو اس سن کو سال ولادت قرار دیا جا سکتا ہے لیکن اگر یہ روایت صحیح مان لیجائے کہ وہ ۵ برس قبل نبوت میں پیدا ہوئیں تو اسوقت انکا سن ۲۹ سال کا ہو سکتا ہے،

حضرت ابراہیمؓ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سب سے آخری اولاد ہیں، ذیحجہ ۸ھ بمقام عالیہ جہاں ماریہ قبطیہؓ رہتی تھیں پیدا ہوئے، اس بنا پر لوگ عالیہ کو مشربۂ ابراہیم بھی کہنے لگے تھے، ابورافع کی بی بی سلمیٰ نے جو آنحضرت

---

[1] صحیح بخاری ذکر اصہار النبی صلی اللہ علیہ وسلم [2] اسمیں بھی اختلاف ہے بعضوں نے لکھا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد صرف تین دن زندہ رہیں، بعضوں نے چار مہینے بتایا ہے بعضوں کے نزدیک دو مہینے کے بعد انتقال ہوا کسی نے ایک مہینہ کسی نے تین مہینے بعد اور بعضوں نے ۳ مہینے ۵ دن بعد لکھا ہے، لیکن صحاح میں حضرت عائشہؓ کے ذریعہ سے ۶ مہینے والی روایت مذکور ہے،

یا آپ کی پھوپھی صفیہ کی لونڈی تھیں، دایہ گیری کی خدمت انجام دی، ابو رافع نے جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو انکی ولادت کا مژدہ سنایا تو آپنے اس کے صلہ میں ایک غلام عطا فرمایا، ساتویں دن عقیقہ ہوا، آپنے تمام بال کے برابر چاندی خیرات کی، اور حضرت ابراہیمؑ کے نام پر نام رکھا، دودھ پلانے کے لیے انصار نے خواہش کی لیکن آپنے ان کو ام بردہ خولہ بنت زید الانصاری کے حوالہ کیا اور اسکے معاوضہ میں کھجور کے چند درخت دیئے بخاری میں حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ آپنے یہ خدمت ام سیف کے متعلق کی، قاضی عیاض نے لکھا ہے کہ ام سیف اور ام بردہ ایک ہی ہیں، یہ تاویل کچھ مستبعد نہیں لیکن انکے شوہر کا نام براء بن اوس بتایا جاتا ہے، اور ابو سیف کی کنیت ساتھ مشہور نہیں، ام سیف حوالی مدینہ میں رہتی تھیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرط محبت سے وہاں جاتے حضرت ابراہیمؓ کو گود میں لیتے اور چومتے، ام سیف کے شوہر لوہار تھے، اس لیے گھر دھوئیں سے بھرا رہتا تھا لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم باوجود نظافت طبع گوارا فرماتے۔

ابراہیم نے ام سیف ہی کے یہاں انتقال کیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر ہوئی تو عبدالرحمن بن عوفؓ کے ساتھ تشریف لائے، نزع کی حالت تھی، گود میں اٹھا لیا، آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے، عبدالرحمن بن عوفؓ نے کہا یا رسول اللہ آپ کی یہ حالت ہے، آپنے فرمایا یہ رحمت ہے۔

عرب کا خیال تھا کہ جب کوئی بڑا شخص مرجاتا ہے تو چاند میں گہن لگ جاتا ہے، اتفاق سے جس روز حضرت ابراہیم نے وفات پائی، سورج میں گہن لگ گیا تھا، عام طور پر مشہور ہو گیا کہ یہ ان کی موت کا اثر ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہوا تو فرمایا چاند اور سورج خدا کی نشانیاں ہیں، کسی کی موت سے ان میں گہن نہیں لگتا۔

چھوٹی سی چارپائی پر جنازہ اٹھایا گیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود نماز جنازہ پڑھائی، عثمانؓ بن مظعون کی قبر کے متصل دفن ہوئے، قبر میں فضل بن عباسؓ اور اسامہؓ نے اتارا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قبر کے کنارے کھڑے تھے، قبر پر پانی چھڑکا گیا اور اس پر ایک امتیازی علامت قائم کی گئی،

ابوداؤد اور بیہقی کی روایت کے موافق دو مہینے دس دن کی عمر پائی، ذیحجہ ۸ھ میں پیدا ہوئے تھے، اس روایت کی بنا پر ۹ھ میں انتقال ہوا، واقدی کے نزدیک ماہ ربیع الاول ۱۰ھ میں وفات کی، اس لحاظ سے تقریباً پندرہ مہینے زندہ رہے، بعض روایتوں میں ہے کہ ۱۷ مہینے آٹھ دن کی عمر پائی، بعض لوگوں نے مدت حیات ایک برس دس ماہ چھ دن لکھی ہے، لیکن صحاح میں حضرت عائشہؓ سے روایت ہی کہ ابراہیم ۱۷ یا ۱۸ مہینے تک زندہ رہے۔

……………………

ازواج مطہرات کے ساتھ معاشرت

ازواج مطہرات کی تعداد ۹ تک پہنچی تھی، ان میں عام اصول فطرت کے موافق ہر مزاج اور ہر طبیعت کی عورتیں تھیں، باہم رشک اور منافست بھی تھی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ ہمیشہ فقر و فاقہ سے بسر کرتے تھے انکی خورد و پوشش کا انتظام بھی خاطر خواہ نہیں ہو سکتا تھا، اس لیے ان کو شکایت کا موقع ملتا تھا، ان تمام حالات کے ساتھ آپ کی جبین خلق پر کبھی شکن نہیں پڑتی تھی،

حضرت خدیجہ رضؓ کے ساتھ آپ کو بے انتہا محبت تھی، جب وہ عقد نکاح میں آئیں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ریعان شباب اور ان کا بڑھاپا تھا، تاہم آپ نے ان کی وفات تک کوئی شادی نہیں کی وفات کے بعد بھی جب کبھی ان کا ذکر آجاتا تو جوشِ محبت سے بیتاب ہو جاتے تھے، (تفصیل اوپر گذر چکی ہے)

حضرت خدیجہ رضؓ کے بعد حضرت عائشہ رضؓ ازواجِ مطہرات میں سب سے محبوب تر تھیں لیکن محبت کے اسباب وہ نہ تھے جو عام انسانوں میں پائے جاتے ہیں، حسن صورت میں حضرت صفیہ رضؓ ان سے بڑھکر تھیں اور کمسن بھی تھیں، دیگر ظاہری محاسن میں بھی دیگر ازواج ان سے کم نہ تھیں لیکن حضرت عائشہ رضؓ کی قابلیت، ذہانت، قوتِ اجتہاد، دقتِ نظر، وسعتِ معلومات ایسے اوصاف تھے جو انکی ترجیح کا اصلی سبب تھے،

ایک دفعہ چند ازواج مطہرات نے حضرت فاطمہ زہرا رضؓ کو سفیر بنا کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بھیجا، جناب سیدہ رضؓ خدمت اقدس میں حاضر ہوئیں، دستور کے موافق پہلے اذن طلب کیا، اجازت ملی تو سامنے آ

اور عرض کی کہ ازواجِ مطہرات نے مجکو وکیل بناکر بھیجا ہے کہ آپ ابوبکر کی بیٹی کو ہم پر کیوں ترجیح دیتے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جانِ پدر! کیا تم اس کو نہیں چاہتیں جس کو میں چاہتا ہوں جنابِ سیدہؓ کے لیے اتنا کافی تھا، واپس جاکر ازواجِ مطہرات سے کہا میں اس معاملہ میں دخل نہ دونگی۔

اب اس خدمت (سفارت) کے لیے حضرت زینبؓ انتخاب کی گئیں کیونکہ ازواج میں سے حضرت زینبؓ کو خصوصیت کے ساتھ حضرت عائشہؓ کی ہمسری کا دعویٰ تھا۔ اس لیے وہی اس خدمت کے لیے زیادہ موزوں تھیں، انھوں نے یہ پیغام بڑی دلیری سے ادا کیا، اور بڑے زور کے ساتھ یہ ثابت کرنا چاہا کہ حضرت عائشہؓ اس رتبہ کی مستحق نہیں ہیں، حضرت عائشہؓ چپ سن رہی تھیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرہ کی طرف دیکھتی جاتی تھیں، حضرت زینبؓ جب تقریر کر چکیں تو مرضی پاکر کھڑی ہوئیں اور اس زور شور کے ساتھ تقریر کی کہ حضرت زینبؓ لاجواب ہو کر رہ گئیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیوں نہ ہو ابوبکر کی بیٹی ہے"[1]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ شادی کرنے کے لیے عورت کا انتخاب چار اوصاف کی بنا پر ہو سکتا ہے، مال، نسب، حسن، دینداری، سو تم دیندار عورت تلاش کرو، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ہر کام میں سب سے مقدم جو چیز پیش نظر ہوتی تھی، وہ دین ہوتا تھا، اس لیے ازواج میں بھی وہی زیادہ منظور نظر ہوتی تھیں جن سے دین کی خدمت زیادہ ادا ہو سکتی تھی، ازواج مطہرات کو باریابی کا زیادہ موقع ملتا تھا، وہ خلوت و جلوت کی شریک صحبت تھیں، اس لیے مذہبی احکام و مسائل کے علم و اطلاع کا بھی انکو سب سے زیادہ موقع

---

[1] یہ واقعہ پوری تفصیل کیساتھ بخاری اور دیگر احادیث کی کتابوں میں ہے، الفاظ روایت سے بظاہر تبادر ہوتا ہے کہ دونوں فریق نے صرف نکتہ چینی اور ایک دوسرے کی کسر شان کی تھی جیسا کہ عام طور پر سوکنیں باہم خانگی جھگڑوں میں کرتی ہیں، لیکن یہ کم نظری ہے حضرت عائشہؓ نے اپنی ترجیح کی وہ مسکت دلیلیں بیان کی ہونگی جس کا جواب سکوت کے سوا کچھ نہ ہو سکتا ہوگا۔ ۲ کتاب النکاح بخاری شریف

مل سکتا تھا، لیکن ساتھ ہی اس کی ضرورت تھی کہ مسائل کے سمجھنے اور نکاتِ شریعت کی تہ تک پہنچنے کی قابلیت جس قدر زیادہ ہوتی اسی قدر زیادہ تمتع اٹھا سکتا تھا۔

حضرت عائشہؓ مجتہدانہ دل و دماغ رکھتی تھیں، اس لیے قربِ صحبت سے اس قدر فائدہ اٹھا سکیں کہ بڑے بڑے نازک اور دقیق مسائل میں وہ اکابر صحابہ سے مخالفت کرتی تھیں۔ اور انصاف بالائے طاعت است اکثر مسئلوں میں انکی فہم و دقتِ نظر کا پلہ بھاری نظر آتا ہے، چنانچہ اسکی کسی قدر تفصیل حضرت عائشہؓ کے حالات میں گذر چکی ہے۔

معمول تھا کہ ہر روز آپ تمام ازواج مطہرات کے گھروں میں (جو پاس پاس تھے) تشریف لیجاتے ایک ایک کے پاس تھوڑی دیر ٹھہرتے، جب انکا گھر آجاتا جنکی باری ہوتی تو شب کو وہیں قیام فرماتے، یہ ابوداؤد کی روایت ہے، زرقانی میں حضرت ام سلمہؓ کے حال میں لکھا ہے کہ عصر کا وقت ہوتا تھا، اور ابتدا حضرت ام سلمہؓ سے ہوتی تھی، بعض روایتوں میں ہے کہ جنکی باری ہوتی تھی ان ہی کے گھر پر تمام ازواج مطہرات آجاتی تھیں، اور دیر تک صحبت رہتی تھی، کچھ رات گئے سب رخصت ہو جاتی تھیں، اس سے ظاہر ہوگا کہ گو ازواج میں کبھی کبھی منافست کا اظہار ہوتا تھا، لیکن دل صاف تھے اور باہم مل کر لطفِ صحبت اٹھاتی تھیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے شرفِ صحبت نے جس طرح ان آئینوں کو جلا دی تھی، اسکا اندازہ افک کے واقعہ سے ہو سکتا ہے، جسمیں جناب عائشہؓ کو منافقین نے متہم کیا تھا، اس سے بڑھکر حریفوں کیلئے انتقام کا کیا موقع مل سکتا تھا، لیکن باوجود اس کے کہ غیر متعلق لوگ تہمت لگانے میں آلودہ ہو گئے تھے، تاہم ازواج مطہرات کا دامن صاف رہا، حضرت عائشہؓ کی بڑی حریف حضرت زینبؓ تھیں لیکن جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے استفسار فرمایا تو انھوں نے کانوں پر ہاتھ رکھا کہا کہ حاشا، یہ محض تہمت ہے۔

حضرت عائشہؓ جب واقعۂ افک کا ذکر کرتی تھیں تو ہمیشہ حضرت زینبؓ کی پاک باطنی کی شکر گذاری ظاہر کرتی تھیں، چنانچہ بخاری کی متعدد روایتوں میں تفصیلاً مذکور ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جس طرح ازواجِ مطہرات کی خاطر داری فرماتے اور انکی نازک مزاجیاں برداشت کرتے تھے، اس کا اندازہ ذیل کے واقعات سے ہوگا۔

ایک دفعہ ازواجِ مطہرات سفر میں تھیں، ساربان اونٹ کو تیز ہانکنے لگے، آپنے فرمایا:

"دیکھنا یہ آبگینے (شیشے) ہیں"۔

حضرت صفیہؓ کھانا نہایت عمدہ پکاتی تھیں، ایک دن انھوں نے کھانا پکا کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بھیجا، آپ اس وقت حضرت عائشہؓ کے گھر میں تشریف رکھتے تھے، حضرت عائشہؓ نے خادم کے ہاتھ سے پیالہ چھینکر زمین پر دے مارا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پیالے کے ٹکڑے چن چن کر یکجا کیے اور انکو جوڑا، پھر دوسرا پیالہ منگوا کر واپس کیا۔[1]

ایک دفعہ حضرت عائشہؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے برہم ہو کر بلند آواز سے باتیں کر رہی تھیں، اتفاقاً حضرت ابوبکرؓ آگئے، حضرت عائشہؓ کو پکڑ کر تھپڑ مارنا چاہا کہ تو رسول اللہ سے چلا کر بولتی ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بیچ میں آگئے، اور حضرت عائشہؓ کے آڑے آگئے، حضرت ابوبکرؓ غصہ میں بھرے ہوئے باہر چلے گئے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہؓ سے کہا کیوں؟ کس طرح تم کو بچالیا، چند روز کے بعد حضرت ابوبکرؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے تو وہ حالت بدل چکی تھی، بولے کہ مجکو بھی صلح میں شریک کیجئے جیسا کہ اس موقع پر میں نے جنگ میں شرکت کی تھی، آپنے فرمایا ہاں اور ہاں۔[2]

---

[1] بخاری میں یہ روایت کتاب النکاح کے ذیل میں ہے لیکن ازواج کے نام نہیں، نسائی میں نام کی تصریح ہے لیکن روایت میں کسی قدر اختلاف ہے [2] ابوداؤد کتاب الادب باب ماجاء فی المزاج،

ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ رضؓ سے فرمایا کہ تو مجھ کو جب ناراض ہوتی ہی تو میں سمجھ جاتا ہوں"۔ بولیں کیونکر؟ ارشاد ہوا جب تو خوش رہتی ہے (اور کسی بات پر قسم کھاتی ہوتی ہی تو یوں قسم کھاتی ہی" محمد کے خدا کی قسم اور جب ناراض ہو جاتی ہے تو کہتی ہی" ابراہیم کے خدا کی قسم حضرت عائشہ رضؓ نے کہا "ہاں یا رسول اللہ میں صرف آپ کا نام چھوڑ دیتی ہوں"[۱]

حضرت عائشہ رضؓ شادی کے وقت بہت کمسن تھیں اور لڑکیوں کے ساتھ کھیلا کرتی تھیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اتفاقاً آجاتے تو لڑکیاں بھاگ جاتیں، آپ انکو بلا کر حضرت عائشہ رضؓ کے پاس بھیجدیا کرتے۔[۲]

حبشی ایک چھوٹا سا نیزہ رکھتے ہیں، جسکو حراب کہتے ہیں، اور جس طرح ہمارے ملک میں پٹہ ہلاتے ہیں، حبشی اس سے کھیلتے ہیں، ایک دفعہ عید کے دن حبشی یہ تماشا دکھا رہے تھے، حضرت عائشہ رضؓ نے دیکھنے کی خواہش ظاہر کی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم آگے کھڑے ہو گئے، حضرت عائشہ رضؓ دوش مبارک پر رخسارے رکھ کر تماشا دیکھنے لگیں اور دیر تک دیکھتی رہیں، یہانتک کہ آپ نے فرمایا کیوں ابھی تک تم سیر نہیں ہوئیں؟ بولیں نہیں، آپ چپ رہے، یہانتک کہ خود تھک کر ہٹ گئیں۔

ایک دفعہ حضرت عائشہ رضؓ گڑیوں سے کھیل رہی تھیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم باہر سے تشریف لائے، گڑیوں میں ایک گھوڑا بھی تھا جس کے پر بھی تھے، آپنے فرمایا یہ کیا ہی؟ بولیں کہ حضرت سلیمانؑ کے گھوڑوں کے پر بھی تھے، آپنے تبسم فرمایا، عوام میں مشہور ہی کہ پہلے گھوڑوں کے پر ہوتے تھے، حضرت سلیمانؑ نے اس بنا پر کہ گھوڑوں کی سیر میں ان کی نماز قضا ہو گئی تھی، پر کٹوا دیے، اس وقت سے پر جاتے رہے، لیکن نشان ابھی باقی ہے، حضرت عائشہ رضؓ نے اسی واقعہ کی طرف اشارہ کیا تھا۔[۳]

ایک دفعہ آپنے حضرت عائشہ رضؓ سے کہا کہ آؤ تیز قدمی میں مقابلہ کریں"۔ حضرت عائشہ رضؓ اسوقت تک

[۱] صحیح مسلم [۲] ایضاً [۳] ابو داؤد کتاب الادب۔

دبلی پتلی تھیں، آگے نکل گئیں، جب سن زیادہ ہوا، اور پرُ اندام ہوگئیں تو پھر مسابقت کی نوبت آئی، اب کی وہ پیچھے رہ گئیں، آپنے فرمایا یہ اس دن کا جواب ہے۔[1]

ازواج مطہرات اور اہل وعیال کی سادہ زندگی

(انسان بذاتِ خود فاقہ کشی کرسکتا ہی سخت سے سخت تکلیفیں اٹھا سکتا ہے زخارفِ دنیوی کو کلیۃً چھوڑ سکتا ہے، لیکن وہ اپنے اعزہ واقربا یا مخصوص عزیز ترین اولاد کو اس قسم کی سادہ اور متقشفانہ زندگی بسر کرنے پر مجبور نہیں کرسکتا، یہی وجہ ہے کہ دنیا میں جن لوگوں نے راہبانہ زندگی بسر کی ہے انھوں نے اپنے آپ کو ہمیشہ اہل وعیال کے جھگڑوں سے الگ رکھا ہے، دنیا کی مذہبی تاریخ میں صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی اس کلیہ کی ایک مستثنیٰ مثال ہے آپکے ۹ بیبیاں تھیں جنمیں بعض ناز ونعمت میں پلی تھیں اکثر معزز گھرانوں سے تعلق رکھتی تھیں، اس لیے ان کا قدرتی میلان غذاہائے لطیف اور لباس ہائے فاخرہ کی طرف ہوسکتا تھا، متعدد صغیر السن بچے تھے جنکو کھانے پہننے کی ہر خوشگوار اور خوشنما چیز اپنی طرف مائل کرسکتی تھی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جیسا کہ اوپر کے واقعات سے معلوم ہوا ہوگا، اعزہ اولاد اور ازواج مطہرات کے ساتھ سخت محبت تھی آپنے رہبانیت کا بھی قلع قمع کر دیا تھا، اور فتوحات کی کثرت مدینہ میں مال وزر کے خزانے لٹا رہی تھی لیکن بااینہمہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ذات کی طرح انکو بھی زخارفِ دنیوی کا خوگر نہیں بنایا، بلکہ ہر موقع پر روک ٹوک کی، اس بنا پر آپکے تمام خاندان کی زندگی آپکے اسوۂ حسنہ کا اعلیٰ ترین مظہر بن گئی۔

حضرت فاطمہؓ آپ کی محبوب ترین اولاد تھیں لیکن انھوں نے آپکی محبت سے کوئی دنیوی فائدہ نہیں اٹھایا، انکی عام خانگی زندگی یہ تھی کہ اسقدر چکی پیستی تھیں کہ ہاتھوں میں چھالے پڑ گئے تھے، بار بار مشک میں پانی بھر بھر کر لانے سے سینے پر گھٹے پڑ گئے تھے، گھر میں جھاڑو دیتے دیتے کپڑے چیکٹ ہوجاتے تھے، چولھے کے پاس بیٹھتے بیٹھتے کپڑے دھوئیں سے سیاہ ہوجاتے تھے[2]

[1] ابو داؤد [2] ایضاً

لیکن باایں ہمہ جب انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک بار گھر کے کاروبار کے لیے ایک لونڈی مانگی اور ہاتھ کے چھالے دکھائے تو آپ نے صاف انکار کر دیا کہ یہ فقرا اور یتامیٰ کا حق ہے۔

ایک دفعہ حضرت فاطمہؓ کے پاس آئے، دیکھا کہ انھوں نے ناداری سے اس قدر چھوٹا دوپٹہ اوڑھا ہے کہ سر ڈھانکتی ہیں تو پاؤں کھل جاتے ہیں، اور پاؤں چھپاتی ہیں تو سر برہنہ رہ جاتا ہے۔[1]

صرف یہی نہیں کہ خود عام طریقۂ اظہار محبت کے خلاف ان کو آرائش یا زیب و زینت کی کوئی چیز نہیں دیتے تھے، بلکہ اس قسم کی جو چیزیں ان کو دوسرے ذرائع سے ملتی تھیں، ان کو بھی ناپسند فرماتے تھے، چنانچہ ایک دفعہ حضرت علیؓ نے ان کو سونے کا ایک ہار دیا، آپ کو معلوم ہوا تو فرمایا کیوں فاطمہ! کیا لوگوں سے یہ کہلوانا چاہتی ہو کہ رسول اللہ کی لڑکی آگ کا ہار پہنتی ہے، چنانچہ حضرت فاطمہؓ نے اس کو فوراً بیچکر اس کی قیمت سے ایک غلام خرید لیا۔[2]

ایک دفعہ آپ کسی غزوہ سے تشریف لائے، حضرت فاطمہؓ نے بطور خیر مقدم کے گھر کے دروازوں پر پردہ لگایا، اور امام حسن و امام حسین علیہما السلام کو چاندی کے کنگن پہنائے، آپ حسب معمول حضرت فاطمہؓ کے یہاں آئے تو اس دنیوی ساز و سامان کو دیکھ کر واپس گئے، حضرت فاطمہؓ کو آپکی ناپسندیدگی کا حال معلوم ہوا تو پردہ چاک کر دیا اور بچوں کے ہاتھ سے کنگن نکال ڈالے، بچے آپ کی خدمت میں روتے ہوئے آئے، آپ نے فرمایا "یہ میرے اہلبیت ہیں، میں یہ نہیں چاہتا کہ وہ ان زخارف دنیا سے آلودہ ہوں، اس کے بدلے فاطمہ کے لیے ایک عصب کا ہار اور ہاتھی دانت کے دو کنگن خرید لاؤ۔"[1]

ازواج مطہرات کے ساتھ آپ کو جو محبت تھی، اس کا اظہار کبھی دنیادارانہ طریقہ سے نہیں

---

[1] ابوداؤد [2] نسائی کتاب الزینۃ۔

ہوتا تھا، چنانچہ ازواجِ مطہرات نے جب اچھے کھانے اور اچھے لباس کی خواہش ظاہر کی تو آپ نے ان سے ایلاء کر لیا،

تمام ازواج میں آپ کو حضرت عائشہ رض سب سے زیادہ محبوب تھیں، لیکن یہ محبت رنگین لباسوں اور سنہرے زیوروں کی صورت میں کبھی نہیں ظاہر ہوئی، تمام بی بیوں کا جو لباس تھا وہی حضرت عائشہ رض کا تھا، چنانچہ وہ خود فرماتی ہیں:۔

ما کانت لاحد انا الا ثوب واحد — ہم تمام بی بیوں کے پاس صرف ایک ایک جوڑا کپڑا تھا۔ (بخاری جلد اول ص ۵۰۴)

اگر کبھی اس کے خلاف ان کے بدن پر دنیوی آرایش کے سر و سامان نظر آتے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کو منع فرماتے، ایک مرتبہ انھوں نے سونے کے کنگن پہنے (مسکۃ) آپ نے فرمایا اگر ورس کے کنگن زعفران سے رنگ کر پہنتیں تو بہتر ہوتا؛

تمام اہل و عیال و خانوادۂ نبوت کو ممانعت تھی کہ وہ پُر تکلف ریشمی لباس اور سونے کے زیورات استعمال کریں، آپ ان سے فرمایا کرتے تھے کہ اگر تم کو اس کی تمنا ہے کہ یہ چیزیں جنت میں ملیں تو دنیا میں ان کے پہننے سے پرہیز کرو۔

انتظامِ خانگی، اگرچہ ازواجِ مطہرات کی تعداد ایک زمانہ میں ۹ تک پہنچ گئی تھی، اور اس وجہ سے خانہ داری کے بہت سے بکھیڑے تھے، تاہم آپ کو خود بہ نفسِ نفیس ان چیزوں سے سروکار نہ تھا، اپنی ذات کی نسبت تو التزام تھا کہ جو کچھ آتا دن کے دن صرف ہو جاتا، یہانتک کہ اگر دے دلا کر کچھ باقی رہ جاتا تو آپ اُس وقت تک گھر میں نہ جاتے، جب تک وہ بھی کارِ خیر میں صرف نہ ہو جاتا، لیکن ازواجِ مطہرات

اور مہمانوں کے کھانے پینے رہنے سہنے کا انتظام حضرت بلال رضؓ کے متعلق تھا۔ ابو داؤد میں عبداللہ ہوزنی کی روایت ہے کہ میں نے حضرت بلال رضؓ سے پوچھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خانگی انتظام کا کیا حال تھا؟ انھوں نے کہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا تمام کاروبار میرے سپرد تھا، اور آغاز سے اخیر زمانۂ وفات تک میرے ہاتھ میں رہا، معمول تھا کہ جب کوئی نادار مسلمان آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا تو مجھکو ارشاد ہوتا، میں جاکر کہیں سے قرض لاتا اور اس کے کھانے کپڑے کا انتظام کر دیتا۔[1]

اہل و عیال کے مصارف کا انتظام ازواج مطہرات کے لیے یہ انتظام تھا کہ بنو نضیر کے نخلستان میں انکا حصہ مقرر کر دیا گیا تھا، وہ فروخت کر دیا جاتا جو سال بھر کے مصارف کے لیے کافی ہوتا۔[2] خیبر فتح ہوا تو ازواج کے لیے فی کس ۸۰ وسق کھجور اور ۲۰ وسق جو سالانہ مقرر ہو گیا، وسق ۶۰ صاع کا ہوتا ہے، حضرت عمر رضؓ کے زمانہ میں بعض ازواج نے جن میں حضرت عائشہ رضؓ بھی تھیں، پیداوار کے بدلے میں زمین لے لی۔[3]

---

[1] جلد دوم باب فی الامام یقبل ہدایا المشرکین [2] بخاری ص ۸۰۶ [3] بخاری کتاب المزارعہ ج اول ص ۳۱۳

تم المجلد الثانی من السیرة النبویة علی صاحبها الصلوٰة والتحیة

دار المصنفین کے تین اہم سلسلے

دار المصنفین اپنے آغازِ قیام سے لیکر اس وقت تک مختلف علوم و فنون پر ۳۵ کتابیں شائع کرچکا ہے، ان میں سلسلۂ سیرۃ النبی، سلسلۂ سیر الصحابہ اور سلسلۂ تاریخ اسلام جن میں سے ہر ایک متعدد جلدوں پر مشتمل ہے، بہت مقبول ہیں، اور ان کے لاتعداد اڈیشن نکل چکے ہیں، سیرۃ النبی کی بعض جلدوں کا ترکی و فارسی و تامل زبانوں میں ترجمہ بھی ہوچکا ہے، ان کے علاوہ اور دوسری زبانوں میں ابھی ہورہا ہے،

سلسلۂ سیرۃ النبیؐ

حصہ اول (ولادت سے فتحِ مکہ تک) لعہ

حصۂ دوم (اخلاق و عبادات) ہے

حصہ سوم (معجزات) عہ

حصہ چہارم (منصب نبوت) عہ

حصہ پنجم (عبادات) عہ

حصۂ ششم (اخلاق) للعہ

سلسلۂ سیر الصحابہؓ

خلفائے راشدین صہ

مہاجرین جلد اول (عشرہ مبشرہ) ہے

" " دوم (فتحِ مکہ سے پہلے کے صحابۂ کرام) صہ

سیر انصار اول ہے

سیر انصار دوم للعہ

سیر الصحابہ جلد ششم: (حضرات حسینؓ کے حالات) للعہ

سیر الصحابہ جلد ہفتم: (فتحِ مکہ کے بعد کے صحابۂ کرام) صہ

سیر الصحابیات: ازواج و بنات طاہراتؓ وغیرہ کے حالات ہے

اسوۂ صحابہؓ اول: (صحابہ کے عبادات، اخلاق) للعہ

اسوۂ صحابہؓ دوم: (صحابہ کے سیاسی انتظامی کارنامے) ہے

سلسلۂ تاریخ اسلام

تاریخ اسلام حصہ اول (عہدِ رسالت، خلافتِ راشدہ) ہے

" " حصہ دوم (بنی امیۂ دمشق) صہ

" " حصہ سوم (خلافتِ عباسیہ کی تاریخ سفاح سے متقی باللہ تک) عہ

" " حصہ چہارم (مستکفی باللہ تک عباسیہ کے زوال و خاتمہ کی تاریخ اور ان کے تمدنی کارنامے) صہ